ابھی سُن لو مجھ سے

(خود نوشت)

کلیم عاجز



www.taemeernews.com

ابھی سُن لو مجھ سے

کلیم عاجز

www.taemeernews.com

ب

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

بار اول
۱۴۱۳ھ - ۱۹۹۲ء
صفحات : ۴۲۸

کاتب : ابوالکلام عزیزی
طابع : CITY PRINTS Delhi
پرنٹر و پبلشر :
قیمت :

باہتمام
ڈاکٹر صغیر الدین

ملنے کا پتہ
کلیم احمد عاجز، بی۔ ان کالج کے سامنے، پٹنہ۔۴

www.taemeernews.com

ج

یہ بیانِ حال یہ گفتگو۔ ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سُن لو مجھ سے کہ پھر کبھو نہ سنو گے ایسی کہانیاں

کلیم عاجز

www.taemeernews.com

اُن شہیدوں کے نام جن کے لہو کی اشرفیاں
چھَن چھَن میری زبان و قلم سے نکلتی ہیں۔

کلیم عاجز

www.taemeernews.com

ز

پیش لفظ

یہ کتاب کیا ہے؟

ایک پکار ہے :

پکاروں ہوں لیکن نہ باز آئے ہے
یہ دنیا کہاں ڈوبنے جائے ہے

ایک دعویٰ ہے :

اگرچہ عشق میں مرنے کا خطرہ ہی زیادہ ہے
مگر مرنے کے ڈر سے مرنے والے کم نہیں ہوں گے

ایک دعوت ہے :

فکر و فن میرا دنیا کو آئینہ ہے
اپنی زلفیں اِسی میں سنوارا کرے

کلیم احمد عاجز

www.taemeernews.com

۱

"ابھی سن لو مجھ سے" کا مقدمہ، دیباچہ، پیش لفظ لکھنے بیٹھا ہوں۔ آج صبح نماز پڑھ کر معمولات سے فارغ ہونے کے بعد بغیر ارادہ، بغیر کسی خیال آنکھیں ڈبڈبانے لگیں، چونکا آخر بات کیا ہے؟ تہجد پڑھ کر دعا کے لئے ہاتھ اُٹھایا تو اپنے گناہ یاد آئے، گناہ یاد آئے تو گناہ بخشنے والے کے کرم یاد آنے لگے، مہربانیاں اور بخششیں یاد آنے لگیں تو رویا اور خوب رویا، طبیعت صاف ہوگئی۔ پھر یہ ڈبڈباہٹ آنکھوں میں کیسے آگئی؟ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسٹیج کے پردے بجلی کی سرعت سے کھنچنے لگے۔ ایک کے بعد ایک بچپن، جوانی اور آج تک کے کچھ مناظر سامنے گذرنے لگے تو حیرت ہوئی کہ خیال اور یادیں بعد میں آتی ہیں یادوں کا اثر پہلے آجاتا ہے؟ آنسو پہلے آگئے آنسوؤں کے اسباب بعد میں یاد آئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ عمر کے پینسٹھ چھیاسٹھ سال گذر گئے کوئی فرق نہیں؟ کوئی تبدیلی نہیں، کوئی پختگی نہیں؟ کوئی کٹھل پن نہیں؟ ایک درخت برسہا برس سے جھوم رہا ہے، بہار آرہی ہے جارہی ہے خزاں آرہی ہے سیلاب آرہے ہیں طوفان آرہے ہیں سکھاڑ آرہا ہے، لُو چل رہی ہے، برف باری ہے سنگ باری ہے لیکن جڑ اب تک موٹی نہیں ہوئی شاخیں اب تک سخت نہیں ہوئیں، پتوں پر نشان نہیں آئے، رگیں اب تک اُبھری نہیں ویسی ہی جیسے ابھی پہلی خزاں گئی ہو پہلی بہار آئی ہو وہی نرمی وہی ملائم پن، چاک کے لئے مٹی گوندھی گئی چاک پر چڑھی شکل بنی پھر نقشے بنے دھوپ لگی آگ پر سینکی گئی بھٹی میں پکائی گئی مگر اب تک

www.taemeernews.com

ویسی گیلی کی گیلی ؟ پانچ سال سے لے کر پینسٹھ سال تک سفر ہوگیا پورب پچھم اُتر دکھن کہاں کہاں کی منزلوں سے گذر گیا کتنی ٹھوکریں لگیں کتنے اتار چڑھاؤ آئے۔ بھوک پیاس دھوپ چھاؤں تکان اور شکستگی مگر جیسے ابھی سفر شروع ہی ہورہا ہے یا ہوا ہے۔ محمودہ باجی ختنہ میں جوڑا پہنارہی ہیں پگڑی باندھ رہی ہیں گیت گارہی ہیں منھ چوم رہی ہیں محمودہ باجی کا منھ دیکھ رہا ہوں ٹکٹکی بندھی ہے۔ اس کو ساٹھ سال ہوگئے؟ جیسے ابھی دیکھ ہی رہا ہوں۔ اور وہ گیت گارہی ہیں پیار کررہی ہیں۔ شادی ہوئی چار پانچ سال زندہ رہیں شوہر نے وہ دلداری نہیں کی سختیاں کیں دوسرا بچہ ہوتے ہوئے اپنے گھر سے دور پردیس میں ختم ہوگئیں۔ میں کلکتہ سے آیا دس بارہ سال کی عمر اماں مجھے بغل میں لئے بیٹھی ہیں۔ دایاں ہاتھ میرے کندھے پر ہے بائیں ہاتھ سے ناک صاف کررہی ہیں آنچل سے آنسو پونچھ رہی ہیں۔ داماد کی سختیوں کا بیٹی کی مظلومی کا ذکر کررہی ہیں ..... " میری بیٹی کا دل پانی ہوگیا ..... میری بیٹی کا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ میری بیٹی نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پردیس میں دم توڑ دیا۔" اماں سسکنے لگیں۔ میں اماں سے چمٹ گیا۔ اُن کے منہ سے منہ سٹ کر رونے لگا۔ چند ماہ بعد اکرام بھائی پھر تیلہاڑہ میں آکر رہنے لگے۔ الگ مکان بنا کر مطب کرنے لگے۔ ایک روز انہوں نے چپکے سے اپنی سالی میری دوسری بہن سعیدہ کو لکھا کہ میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی ایک چیخ ماری سعیدہ چوکی پر پچھاڑ کھا رہی تھی۔ ایک پرزہ پڑا تھا میں نے اماں کو جا کر دے دیا۔ وہ پڑھ کر پلنگ پر تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اعظم نانا آگئے۔ شاہ عبدالحفیظ صاحب آگئے۔ پرزہ پڑھا گیا اکرام بھائی کو ایسی ڈانٹ پڑی کہ وہ تیلہاڑہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ یہ سب یادیں آنے لگیں۔ میں نے قلم اٹھایا کہ " ابھی سن لو مجھ سے " کا دیباچہ لکھ لوں۔ آنسو آنکھوں میں کیوں آگئے؟ کیا اب تک وہی کلیم ہے کہ پچاس سال پہلے اسکول سے چھٹیوں میں تیلہاڑہ آکر شکستہ شاہی پل پر بیٹھا ہے، تنہائی ہے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کو دیکھ کر کلیم گنگنانے لگا۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

www.taemeernews.com

۳

آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے کلیم حیران ہوگیا .... وہ تو غزل گا رہا تھا غالب کی غزل گنگنا رہا تھا .... یہ آنسو کیسے ؟ یہ ڈبڈباہٹ کیسی ؟ آج بھی آنسو آ گئے اور آنسوؤں کے ساتھ پچھلے پچاس سال یاد آنے لگے۔

ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی
یہ اپنے وقت کی گڈری میں لال ہے پیارے

واقعی کلیم کو اب تک نہیں پہچانا گیا۔ زمانہ اپنی مستی میں رہا .... اپنی انگڑائیوں میں رہا .... کلیم بھی اپنی سرشاری میں رہا اپنے نشۂ غم میں رہا .... دل ایسی چیز کو ٹھکرا دیا نخوت پرستوں نے ..... کلیم اس عصر کا دل ہے۔ اِس عصر کا سینہ دل سے خالی ہوگیا تھا۔ کلیم اس میں دل بن کر دھڑک رہا ہے، زندگی دل سے ہے دنیا نے زندگی دماغ سے سمجھی ہے۔ ایک سے ایک اسکیمیں، ایک سے ایک منصوبے ایک سے ایک نقشے ایک سے ایک چوکھٹے۔ کھانے کے اور پہننے کے اور مکانوں کے اور صوفوں کے اور کرسیوں کے آئینوں کے سنگار دانوں کے ریفریجریٹر کے ٹیلی ویژن کے ریڈیو کے کاروں کے کرسیوں کے اقتداروں کے لیڈری کے افسری کے۔ اِن ساری پلانگوں میں انسان کھوگیا ہے اپنی دھڑکنوں سے بے خبر اپنے دل کے اشاروں سے بے نیاز ہوگیا ہے اور کلیم کہتا ہے ؎

اس کے سوا اوروں کی سن کر خود کو رسوا مت کرنا
دل کی ہر اک دھڑکن کہہ دے گی کیا کرنا کیا مت کرنا

لیکن اس نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ نقارخانے ختم ہوجائیں گے طوطی کی آواز گونجتی رہے گی۔ کل کچھ نہیں رہے گا صرف اسی طوطی کے بول اور آواز رہے گی۔ میں نے دنیا کو جن آنکھوں سے دیکھا۔ بچپن سے جوانی جوانی سے اس عمر تک دنیا کو جن آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اور جن آنکھوں سے دیکھتا ہوا گذر رہا ہوں شاید چالیس پینتالیس سال پہلے سے دنیا نے وہ آنکھیں موندلی ہیں۔ تقسیم کے بعد دل کی آنکھیں بند ہوگئیں غم نے سب کے دل پتھر کردئے سب اور آنکھوں سے دنیا کو دیکھتے جا رہے ہیں۔ میں چیخ رہا ہوں پکار رہا ہوں آواز دے رہا ہوں

www.taemeernews.com

دیکھو آنکھیں کھولو آگے بہت بڑا گڑھا ہے گرو گے تو ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی۔

پکاروں ہوں لیکن نہ باز آئے ہے
یہ دنیا کہاں ڈوبنے جائے ہے

پکارتا رہوں گا..... میری شادی ہو چکی تھی میری شادی کے بعد میرے چھوٹے بھائی علیم احمد کی شادی ہوئی۔ وہ حفظ کر کے فارغ ہوئے تھے۔ تیلہاڑہ کی جامع مسجد میں قرآن سنا یا ختم قرآن کا جلسہ ہوا۔ پہلی بار میری زبان کھلی خدا جانے کیا کیا کہہ گیا۔ اماں مسجد سے باہر بیٹھی تھیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ خدا جانے رونے کی باتیں رونے کے قصے رونے کی تصویریں مجھے کیوں اتنی پسند ہیں کیوں اتنی یاد ہیں۔ حدیث شریف کا مفہوم سنا کہ اکثر روتے رہو رونے سے دل یوں صاف ہوتا ہے جس طرح برسات میں بارش کے بعد چاند دھل کر شفاف ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم پچیس تیس سال بعد سنا مگر عمل پچیس تیس سال پہلے سے تھا۔ باہر نکلا تو اماں نے گلے لگایا۔ ہمارے رشتہ کے نانا سید شاہ بشیر اکبری بھی چائے میں موجود تھے۔ اماں سے اپنی نواسی کا رشتہ علیم مرحوم سے پیش کیا اماں نے منظور کر لیا۔ اسی کمسنی میں ان کی شادی بھی ہو گئی۔ ایک سال بعد بیمار پڑے۔ ایسا معصوم لڑکا۔ چہرے پر ایسی سادگی دشمن بھی دیکھے تو پیار آجائے۔ بیمار پڑے اور بجلی کی رفتار سے بیماری بڑھنے لگی۔ اس وقت کہاں دوائیں تھیں کہاں انجکشن تھا۔ آناً فاناً مرض الموت میں گرفتار ہو گئے۔ میں چاروں طرف خس کی ٹٹیاں لگاتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد انہیں پانی سے بھگوتا اور ان کا چہرہ دیکھتا جاتا۔ معصومیت اور مرض کا یہ حال دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا جاتا بستر پر بیٹھ کر ان کا سر سہلاتا۔ اماں آکر بیٹھیں میں باہر چلا گیا اور ایک دوست گھڑی ساز کے کمرے میں جا کر روتے روتے سو گیا۔ واپس ہوا تو معلوم ہوا علیم مرحوم نے کہا اماں بہت نیند آرہی ہے۔ اماں نے کہا سو رہو بیٹا۔ کاہے تکلیف اٹھاتے ہو۔ کمرے میں کفن کی تیاری ہو رہی تھی۔ باہر دروازے کے پاس علیم مرحوم کی دلہن نفیسہ کھڑی تھیں۔ ٹھوڑی پر انگشت شہادت۔ خاموش۔ مجھے ایسا لگا کہ سنگ مرمر کا ایک مجسمہ ترشا ہوا کھڑا ہے۔ خاموش بے حس و حرکت سفید براق۔ یہ تصویر دل میں بیٹھ گئی اور ابھی سامنے دیکھ رہا ہوں.....

www.taemeernews.com

۵

اے میری کتاب پڑھنے والو .... اپنے دل کو ٹٹولو شعور کی تلاشی لو۔ ایسا یا اِس قسم کا منظر تمہاری آنکھوں میں ہے؟ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں نہیں ہے۔ تم نے ان آنکھوں سے دنیا کو دیکھا ہی نہیں ہے۔ افسانے پڑھتا رہا، ناولیں پڑھتا رہا۔ یہ آنکھیں نظر نہ آئیں۔ یہ آنکھیں خواجہ حسن نظامی اپنے ساتھ لے گئے، راشد الخیری ساتھ لے گئے۔ ملا رموزی، اشرف صبوحی اپنے ساتھ لے گئے، فرحت اللہ بیگ ساتھ لے گئے۔ اور یہ کہتے ہوئے ساتھ لے گئے۔

اب اور کسی کو کیا دیکھیں نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں

اور جاتے جاتے یہ آنکھیں مجھے دے گئے۔ لیکن کچھ کہہ نہیں گئے۔ زمانے سے کہہ گئے۔ ہواؤں کو سمجھا گئے، ستاروں کو بتا گئے۔ اب یہ زمانے، یہ مٹی اور یہ خاک، یہ ہوائیں، یہ ستارے ہمیشہ اور ہر وقت میرے ساتھ رہتے ہیں مجھے بھٹکنے نہیں دیتے۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے پہنچا دیتے ہیں اور کسی کو نہیں پہنچاتے۔ کوئی ریلیف لے کر جاتا ہے امداد لے کر جاتا ہے بانٹتا ہے اخباریں نکالتا ہے یہ دیا وہ دیا یہ بنایا وہ تیار کیا۔ یہ ٹھیک کیا وہ درست کیا۔ کیا بگڑا تھا، کیسے بگڑا تھا، کون بگڑا تھا؟ کیسے بنایا؟ جمشید پور میں ایک مکان میں چند لوگ جمع ہیں۔ ایک حسین نوجوان شیروانی پہنے پگڑی باندھے دستار میں دو تین پھول لگائے۔ دو زانو بیٹھا ہے چہرے سے نور کی بارش ہے آنکھوں میں تبسم ہونٹوں پر خاموشی۔ سامنے مولانا بیٹھے ہیں، باراتی نوجوان جوان بچے۔ نکاح ہو رہا ہے۔ لقمے تقسیم ہو رہے ہیں کہ شور ہوا۔ ایک ہجوم آگیا۔ چھریوں سے کٹاریوں سے ڈنڈوں سے سیخوں سے لاٹھیوں سے ہواؤں میں نقشے بناتا ہوا۔ شور گرج اور نعرے ــــ باراتیوں کو ڈھونڈھے نہ پایا گیا۔ مولانا کدھر تشریف لے گئے؟ سنسان نشست میدان صاف۔ تنہا نوجوان دو زانو بیٹھا رہا۔ مجمع پھاٹک کھولنے لگا۔ نوجوان دو زانو سے اکڑوں ہوا پھر کھڑا ہوا۔ کمرے سے سائبان میں آیا۔ سائبان سے صحن میں آیا۔ اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا۔ کچھ نہیں ہر طرف گملے پھول اور پودے نہ کوئی لاٹھی نہ ڈنڈا نہ تیر نہ تلوار نہ چھری نہ کٹاری نہ کھرپی نہ ہنسوا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹا سا درخت کیلے کا کھڑا تھا۔ مہندی لگی ہوئی ہاتھوں نے کیلے کے درخت کی جڑ تھامی۔ یا اللہ کہا۔ درخت اُکھڑ کر ہاتھوں میں آگیا۔ مجمع میں گھس گیا۔ اس

www.taemeernews.com

کیلے کے درخت کو گھمانا اور چلانا شروع کیا۔ کسی کے سر پر لگا، کسی کی پیٹھ پر لگا۔ یہ گرا وہ گرا۔ اِدھر چھری چلی۔ اُدھر کٹاری چلی۔ اِدھر سے سیخ اُدھر سے لاٹھی۔ نرغے میں کافروں کے اکیلے امام پر چند منٹ میں سب گذر گیا۔ دامن چاک، گریباں چاک، سینہ چاک۔ پھول ادھر، دستار اُدھر اور درمیان میں ؟

زخموں کی عبا پہنے ہے سہرا ہے لہو کا
نوشاہ بنا بیٹھا ہے دیوانہ کسی کا

لڑکی چند منٹ میں بیوہ ہوگئی اور لڑکے کا نکاح فرشتوں کے مجمع میں حوروں سے ہوگیا۔ یہ لڑکا رشتے کی ایک میری بھتیجی کا شوہر اور ۱۹۶۴ء کے جمشید پور فساد کا پہلا شہید تھا۔

جب اس نے بلایا ہے پھر کیسی فراموشی
یوں آتے ہیں ہوش اکبر یوں جاتی ہے بیہوشی

میری بیوی کی بڑی بہن کی بیٹی اُن کی بھانجی بھی ہوئی۔ اور اُن کا جھوٹھا دودھ پیا تو دودھ بہن بھی ہوئی۔ شادی ایک ایسے لڑکے معین الدین احمد عرف کجو سے ہوئی جو میرا سسرالی عزیز بھی تھا اور ایسا پیارا کہ شاید نانھیالی، دادھیالی، شہری، ملکی، قومی، بین الاقوامی عزیز بنانے میں مجھے تو دریغ اور پس و پیش ہوتا ہی نہیں کسی کو بھی نہیں ہوتا، اُسے بھائی اور دوست بنانے پر سب تیار ہوتے اور وہ جن سے ملا واقعی وہ دوست بن گیا اور دوست بنالیا گیا۔ چہرہ بھی دوست جیسا، مزاج بھی دوست جیسا آنکھیں بھی دوست جیسی کہ سب کو مسکراتی اور اشارا کرتی ہوئی معلوم ہوتیں اور باتیں بھی دوست جیسی کہ پتھر ہاتھ میں ہو تو اپنے سر پر مار کر اس کے لئے پھول تلاش کرتا پھرے۔ معمولی پڑھا لکھا شاید میٹریکولیشن پاس ہو لیکن اپنی محبوبیت اور اپنی مخلصانہ کارکردگی کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے فورمین کے عہدے پر پہنچ رہا تھا۔ مجھ سے سسر کا رشتہ نہ رکھ کر چھوٹا ہم زلف بننا اُسے محبوب تھا۔ خط لکھتا تو جیسے میرا عاشق، ادب ایسا جیسے میرا مرید، ساتھی ایسا جیسے سایہ، بے غرض ایسا جیسے خادم۔ زاہد نہ رند واعظ نہ محتسب، مومن نہ کافر شاعر

www.taemeernews.com

نہ ادیب دین دار نہ دنیا دار لیکن وہ سب تھا۔ زاہد اسے زاہد سمجھتا، رند اسے رند، واعظ اسے واعظ سمجھتا۔ مومن مومن سمجھتا اور کافر کافر، شاعروں میں شاعر، ادیبوں میں ادیب، دنیادار میں دنیادار، دین داروں میں دین دار۔ کیا ایسا بننا آسان ہے؟ لیکن وہ تھا ایسا۔ لیکن یہ دور یہ زمانہ کسی کی شناخت باقی نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ ملک ایسا نہ تھا لیکن ایسا ہو گیا ایسا بنانے والے ہم ہی لوگ ہیں۔ اس کے دوست سب تھے، محلے ٹولے والے بھی، بازار والے بھی، کارخانے والے بھی، مزدور بھی اور مالک بھی۔ لیکن اغراض کا چشمہ جب چل پڑتا ہے تو اس کی نقلی گنگناہٹ اس کی چھوٹی لچک اور چمک اور ٹھمک گھر گھر کی نالیوں کو اپنے ساتھ ملا لیتی ہے اس طرح چشمہ نہر، نہر ندی، ندی دریا بن جاتی ہے اور اس کا سیلاب شہر شہر اور ملک ملک کو ڈبونے لگتا ہے۔ پھر گھر گھر کی سوچ ایک ہو جاتی ہے اور رکشہ والے سے لے کر مل کے مالک تک سیاسی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ انفرادی زندگی کی تمام نعمتیں اور صفتیں فراموش ہو جاتی ہیں سب پارٹی اور جماعت کی سوچ اختیار کر لیتے ہیں جو لیڈر صاحب بول رہے ہیں وہی صحیح ہے جو صدر صاحب کہہ رہے ہیں وہی ٹھیک ہے جو سکریٹری صاحب کہہ رہے ہیں وہی اصل ہے وہی درست ہے اُسی میں دھرم ہے اسی میں مہانتا ہے۔ پھر کیا ہے ــــ ۱۹۶۹ء میں جمشید پور میں فساد ہوا بغل میں پانڈے جی اِدھر ورما جی اُدھر سنہا جی صبح و شام کے ملنے والے رات دن کے کھلانے کھانے پینے والے کچھ تیور بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ کچھ اپنے عزیزوں رشتہ داروں نے دوسرے محلوں سے اصرار کیا دباؤ ڈالا۔ معین الدین کجو مرحوم بغل کے محلے میں ایک عزیز کے یہاں چلے گئے۔ دو چار چھ دن پر حالات سنبھل گئے۔ بیوی آسما سے کہا اب تو سب ٹھیک ہے چلو ذرا اپنے کوارٹر میں چلیں۔ ذرا آرام سے چائے بنا کر پی لیں نہا لیں کچھ مل لیں پھر چلے آئیں گے۔ ایک ہی مکان میں بہت سے رشتہ مند جمع ہو گئے تھے۔ بیوی بھی تیار ہو گئیں۔ میاں بیوی اپنے کوارٹر میں جو اپنی پناہ گاہ سے دو چار سو قدم ہی پر تھا آگئیں۔ راستے میں صاحب سلامت ہوئی .. "کہئے پانڈے جی سب ٹھیک ہے نا؟" ... "ہاں کجو بھائی سب ٹھیک ہے

www.taemeernews.com

کہاں چلے گئے تھے بیکار چلے گئے "۔۔ "کہئے ورما صاحب سب ٹھیک ٹھاک ؟"۔۔۔
"ہاں کجّو بھائی سب ٹھیک ٹھاک ہے آجائیے یہاں کیا ہو سکتا ہے" دونوں میاں بیوی اپنے کوارٹر میں آئے قفل کھولا۔ بیوی کو اندر بھیجا کہ چائے بنا کر لاؤ پھر ذرا غسل کر لیں۔ وہیں سائبان میں بیٹھ گئے۔ بیوی اندر گئیں گیس کا چولہا سلگایا کیتلی چڑھائی دو تین منٹ میں چائے کا پانی گرم ہو گیا۔ پیالی دھوئی، شکر ڈالی، چائے پیالی میں بنا کر سائبان میں لائیں ـــــ تو سائبان میں کرسی خالی ـ کہاں گئے ؟ اجی کہاں چلے گئے ؟ " اجی کہاں چلے گئے۔" چائے کی پیالی ہاتھ میں لئے آسمار پکار رہی ہے ۔ وہ اندر چائے بنانے گئی ادھر سے پانڈے جی نکلے ..... "آئیے نا کجّو بھائی (بغل میں دو تین کوارٹر کے بعد سڑک تھی) نکڑ پر ایک ایک سگریٹ ہو جائے"۔۔ "ہاں ہاں پانڈے جی مجھے تو سگریٹ پینا ہی ہے" نکڑ پر بیس پچیس قدم پر آئے ۔سگریٹ لیا سلگایا۔ پانڈے جی نے اشارا کیا ۔چار پانچ لونڈوں نے کجّو کو پکڑ لیا ۔۔۔ "ارے کیا ہے ؟ ارے پانڈے جی کیا ہے؟" "پانڈے جی ... آہ آہ ... آہ ۔ پانڈے جی ۔ آہ "۔ کچھ بغل سے پار ہوا کچھ سینے کے پار ہوا کچھ حلق کے پار ہوا ۔

آہ ! کجّو وہ ہنس مکھ وہ شیریں گفتار ۔۔۔ وہ محبت کا بازار ۔پریم کا خریدار چشم میگسار، حضرت شیخ کا برخوردار اور برہمنوں کے گلے کا ہار ـ چار پانچ منٹ کے اندر بیوی چائے کی پیالی لے کر نکل رہی ہے ۔ چھروں کے زخموں سے داغدار کر کے نالے میں ڈال دیا گیا ..... آسمار بیس منٹ تک دوڑتی رہی "ہائے کہاں گئے جی ' کہاں گئے جی"۔ ...."کہاں گئے جی" دوڑتی روتی بدحواس چائے کی پیالی پھینک کر پناہ گاہ میں آئی کہ شاید یہیں آگئے ہوں ... اس کے بعد سے بہت دنوں تک وہ چائے بنا کر کوارٹر کے اندر سے باہر آتی رہی اور پکارتی رہی "کہاں گئے جی ... آئیے نا جی ۔ چائے بن گئی جی "۔۔

www.taemeernews.com

میرے ایک چچیا سسر شاہ عبدالحمید صاحب کے دو صاحب زادے شمیم احمد انشورنس میں آفس منیجر ہیں چھوٹے بھائی محمد سعید کچھ دنوں بحرین میں انجینئر رہے پھر کرنافولی پیپر مل چٹاگانگ میں انجینئر ہو گئے۔ شادی اُسی جمشید پور کے شہید نوشے کی بہن سے ہوئی بڑا نازک مہین چھریرا لڑکا۔ آٹھ دس سال چٹاگانگ میں رہے۔ ہر سال آتے۔ بیوی پھول پھول اور ماں آنو مچی باغ باغ ہو جاتیں اتنا نازک اور کمسن دیکھنے میں نہ لگتا کہ دو بچیوں کا باپ ہے۔ بیوی بھی ایسی ہی نفی منی دونوں کسی اسکول یا کالج کے طالب العلم معلوم ہوتے۔ بول چال سے بھی، قد و قامت سے بھی، صورت مورت سے بھی ۱۹۷۱ء میں انقلاب آیا۔ کرنافولی پیپر مل کے کوارٹر کیمپس میں دو دو چار چار شریف زادے جہاں جہاں بہاریوں کے کوارٹر تھے دروازے پر آئے۔ دستک دی کنڈی کھٹکھٹائی۔

"آشن آشن ایک ٹا کاج آچھے"۔ (آیئے آیئے ایک ضروری کام ہے)

"کی کاج آچھے؟" (کیا کام ہے؟)

"ایک ٹا جروری پرآمش" (ایک بہت ضروری مشورہ)

کارخانے ہی کے کام کرنے والے تھے۔ ہر کوارٹر سے نکال لئے گئے۔ الگ الگ راستے سے ایک مقام پر لائے گئے۔ شمار ہوئے تو اسّی نوجوان بہاری انجینئر تھے۔ ہاتھ پیچھے سے باندھ دیئے گئے۔ اور ایک ایک بانس کا ستون نصب کر کے اسّی نوجوانوں کو کس دیا گیا۔ نہ مشورہ نہ گفتگو نہ جواب نہ سوال نہ جرم نہ تحقیقات نہ اعلان نہ اقرار اسّی بندوقیں کھنچ گئیں ون، ٹو، تھری.... سر لڑھک گئے اور خون کی شاخیں تیزی سے پھیل کر گل بوٹے کھلا گئیں۔ اسّی پھلجھڑیاں ایک ساتھ چھوٹیں۔ ماں کی اُمیدوں، بیوی کے ارمانوں، بچوں کی تمناؤں کی چنگاریاں بس ایک بار اُڑ کر ہمیشہ کے لئے خاک ہو گئیں۔

تری اک نظر نے کیا قتل عالم
کسی نے نہ دیکھا تماشہ کسی کا

ایک سال تک ماں اور بیوی.... پورب سے آنے والی راہ کو یوں تکتی تھیں، اور پورب سے

www.taemeernews.com

آنے والی ہواؤں کی طرف، یوں کان لگاتی تھیں، پورب سے آنے والی آوازوں کو یوں سنتی تھیں جیسے اُن کی زندگیاں ان کے جسموں سے سمٹ کر صرف آنکھوں اور کانوں میں آگئی ہیں اور دونوں کا رُخ صرف پورب کی طرف ہے ... دروازہ کھٹکا اور بیوی دوڑی کہ سعید آئے ..... قدموں کی چاپ آئی اور ماں پکاریں سعید آیو ؟ ... سعید بابو آیو ؟

ایک سال کے بعد بیوی کو یقین آگیا کہ اب سعید کبھی نہ آئیں گے .... چوڑیاں ٹوٹ گئیں، کانوں سے بالیاں اُتر گئیں ... اور ننھی منّی سی کمسن طالب العلم لگنے والی بیوی .... ایک ہمیشہ کی نا امیدی .... اور زندگی بھر کے ماتم کو صبر کی چادر کی طرح اوڑھکر اپنی دو بچیوں کو گود میں لے کر پہلی مرتبہ بوڑھی ماں بن گئی ۔

..... لیکن ماں کو دنیا کی کوئی خبر دنیا کی کوئی آواز، کوئی اخبار کوئی تاریخ کی کتاب حالات کا کوئی انقلاب، وقت کی کوئی تبدیلی، بیداری لی کوئی حقیقت اور خوابوں کا کوئی افسانہ، مشرقی پاکستان کا انجام، بنگلہ دیش کا آغاز تمام مل کر یہ یقین نہ بدل سکے کہ سعید اب آرہا ہے .... کوئی گھر میں آتا .. تھوڑی دیر کے بعد پوچھ بیٹھتیں ... سعید راستے میں ملا تھا ؟ سعید آج آنے والا ہے سعید اب آرہا ہے ۔ کہیں جاتیں تو تھوڑی دیر کے بعد بول اُٹھتیں ۔ آج سعید آنے والا ہے نا .... ذرا جلدی گھر جائیں گے ..... بیمار ہوئیں تو رہ رہ کے پوچھتیں .... سعید آیا ؟ .... کہاں رہ گیا .... اتنی دیر ہوگئی .... اب تک آیا نہیں کہاں ٹھہر گیا ..... مرتے مرتے بولتی رہیں .... سعید آیا ہے ؟.... ذرا بلاؤ نا سعید کو ..... سعید نہیں آیا .... جہاں سعید تھا وہاں سعید کی ماں پہونچ گئیں .....

"تیں کہاں رہ گیا تھارے" .... "ایسا بھی بے سلا لڑکا ہووے ہے" امنو چچی نے ہنس کے مسکراتے ہوئے بیٹے کو سینے سے سات لیا ..... منکر نکیر حیران کہ سوال کس سے کریں ۔ اِدھر تو کوئی دیکھتا ہی نہیں ۔

تو میں .... "ابھی سُن لو مجھ سے" کا دیباچہ لکھنے بیٹھا ہوں .... ابھی تک کیا لکھا ؟.... کون جاہل کہے گا کہ یہ دیباچہ ہے .... شاید ساری دنیا میں ایک جاہل ہے ... جو کہے گا کہ ہاں یہ دیباچہ ہے اور وہ جاہل ہے کلیم ۔ اور جو آگے آئے گا وہ بھی دیباچہ ہے اور اس کے آگے جو کچھ کتاب میں ہے سب دیباچہ ہے .... اور یہ جاہل کہتا ہے کہ اب تک جتنی کتابیں لکھیں، جتنی شاعری

www.taemeernews.com

کی، جتنی غزلیں لکھیں نظمیں لکھیں نثر لکھی سوانح لکھی، سفرنامے لکھے۔ سب دیباچہ ہی تو ہے۔ سب پیش لفظ ہی تو ہے مقدمہ ہی تو ہے تو پھر کتاب کہاں ہے ؟ .... کتاب بھی سامنے ہے ... کتاب کا نام ہے کلیم .... کتاب آپ نے پڑھی ؟ .... نہیں پڑھی .... اسی لیے تو کہتا ہوں کہ .... ابھی کلیم کو پہچانتا نہیں کوئی ..... لہٰذا ابھی سب دیباچہ ہی پڑھیے جس دن کلیم کو پڑھ لیجئے گا کلیم کو پہچان لیجئے گا۔ عبدالغفار بھائی اخبار فروش ہوں ... یا اشفاق صاحب کتب فروش، بالمکند قلی ہو یا مصرا جی کھڑاؤں والے :

ہمیں تم پیرہن کیا کیا بدل کے
چھپے رہتے ہیں پردے میں غزل کے

جو عبدالغفار بھائی کو پہچان لے گا، مصرا جی کو پہچان لے گا، بالمکند کو پہچان لے گا۔ کلیم کو پہچان لے گا۔ شاعر، ادیب فنکار کی پہچان بہت سہل اور بہت دشوار۔ جس نے بات پہچان لی، بات والے کو پہچان لیا۔ جس نے کلام کو پہچانا متکلم کو پہچان لیا۔ اب تو نہ کوئی بات پہچانتا ہے، نہ کلام۔ اس لیے کہ باتوں کی انتہا نہیں نظم میں نثر میں نئے نئے پیرائے ہیں، نئی نئی ہئیت ہیں۔ اب لوگ پیرایۂ ہیئت ہی چاہتے ہیں۔ کوئی نئی چیز چاہیے۔ اس نئی چیز سے جتنا لوگوں کو چاہیے بیوقوف بنا لیجئے، رباعی نہیں، بیت نہیں، قطعہ نہیں دوہا نہیں تو اب "ہاکو" لائیے۔ نام بھی ایسا کہ لوگ چونک پڑیں .... اب جناب "ہاکو" ہے .... تو لیجئے جناب یہ آزاد غزل ہے، لیجئے جناب" یہ مختصر افسانہ" ہے۔ تو جناب یہ طویل" مختصر افسانہ ہے"۔ ... بس یوں سمجھئے کہ برسہا برس سے پینٹ دیکھتے تھے، ہم سے پہلے برسہا برس سے لوگ پینٹ پہنتے آرہے تھے۔ اس کا ایک کٹ تھا، ایک تراش تھی۔ پتلے آدمی بھی پہنتے تھے اور موٹے بھی، زیسکو بھی اور عمران خاں بھی۔ مگر تراش ایک ہی تھی۔ مسٹر چیمبرلن کو پہنتے دیکھا وہی ہٹلر کو دیکھا، وہی مسولینی کو، وہی مسٹر چرچل کو اور پنڈت نہرو کو بھی اور مسٹر جناح کو لیاقت علی خاں اور فیروز خاں نون کو بھی۔ ۱۹۳۷ء میں مسٹر سہروردی کو بھی وہی پینٹ پہنے دیکھا۔ پھر بیس سال پچیس سال پہلے پینٹ کی تراش" ہاکو" والوں اور آزاد غزل والوں اور طویل مختصر افسانہ اور مختصر طویل افسانہ والے قسم کے لوگوں کو ہاتھ لگ گئی۔ تو جناب وہ وہ رنگ بدلا کہ مہری چھوٹی ہوتے ہوتے بالکل کمر سے ٹخنے تک چست ہوگئی۔ اور ٹیڈی بوائز کی اصطلاح نکل گئی۔ اب جدھر دیکھئے بانس

www.taemeernews.com

میں خول لپٹا ہوا چل رہا ہے۔ لڑکے ہیں تو لڑکے، لڑکیاں ہیں تو لڑکیاں، اماں ہیں تو اماں، بیٹی ہیں تو بیٹی، ابا ہیں تو ابا، بیٹا ہیں تو بیٹا گھر سے باہر محلے سے شہر ہر جگہ مساوات ہی مساوات۔ اے جناب بانس سے خول ڈھیلا ہونے لگا تو ڈھیلا ہوتے ہوتے اِتنا ڈھیلا ہوا کہ دونوں میں مستقل ایک ایک، عدد بکری کا بچہ کو لے کر سردی سے محفوظ لئے پھرا جا سکتا ہے۔ پھر جناب ہاکوے رنگ بدلا تو ہاتھی کا پاؤں دو ٹکڑے ہو گیا۔ ٹخنے سے گھٹنے تک ہاتھی کا پاؤں اور گھٹنے سے کمر تک ساری کا ..... اب صاحب کے پینٹ اور میڈم کے غرارے میں بس صرف رنگ ہی فرق رہ گیا۔ اور مرد بھی دونوں ٹانگوں میں پتنگ باندھے اُڑنے لگے .... وہ اُڑان ختم ہوئی تو آہستہ آہستہ اب ڈھلوان کی طرف قدم بڑھنے لگا اور پینٹ رفتہ رفتہ اپنے اوریجنل ڈھنگ پر اور صحیح شکل میں آنے لگی۔ اے چلتے چلتے ایک قلابازی اور آئی۔ اور پینٹ اپنی شکل میں کمر سے گھٹنوں کے اوپر تک رہا اور نیچے تنگ شلوار کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اور کسی نے تو مہری میں پلاسٹک لگوالی کہ ٹخنوں پر چُست ہی ہو جائے۔ مختصر یہ کہ تغیر اور ارتقا جو قانون فطرت ہے اور اسی قانونی تعاون پر بشر کا کل سے آج روشن تر ہوتا ہے اور آج سے آنے والا کل روشن ترین ہونے کی بشارت رکھتا ہے۔ وہ تغیر اور ارتقا آپس میں دست و گریباں ہو گئے ہیں۔ دائرے کے اندر ہی کشتی ہو رہی ہے۔ ارتقا کا قدم دائرے سے باہر نہیں آتا۔ ارتقا بس تغیر ہی کی بھول بھلیوں میں پھنسا ہوا ہے۔ بشر کا ارتقا بس دسترخوان میں مکان میں ساز و سامان میں دامان و گریبان میں، چال میں اُڑان میں کہاں سے کہاں پہونچا مگر انسان کہاں سے کہاں گرا۔ میں ارتقا کا قائل ہوں صرف تغیر کا نہیں۔ لباس میں، خوراک میں مکان میں سواری میں ارتقا الگ چیز ہے تغیر الگ چیز۔ انسانی ضرورت خواہ وہ مادی ہو یا روحانی ارتقا کا سبب ہے۔ ضرورت کے بغیر صرف تغیر انسان کی ذہنی عیاشی ہے ارتقا سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لباس میں صرف اس لئے تغیر کہ اب اس ڈیزائن سے جی بھر گیا۔ یا اب اس کھانے سے جی بھر گیا یا اب اس صوفے سے اس قالین سے اکتا گیا۔ دوسرا صوفہ لاؤ، دوسرا قالین لاؤ۔ میں نے یورپ میں، امریکہ میں دیکھا۔ نفس پسندی کے نتیجے میں تغیر کا مرض وہاں کے انسانوں کو مادی اور روحانی دونوں اعتبار

www.taemeernews.com

سے بے وزن بے قیمت بے لذت بنا دیا ہے۔ بھرپور لباس میں تبدیلی کرتے کرتے ننگے ہو جاتے ہیں اور پھر بھرپور لباس کی طرف چلتے ہیں۔ حسن کی تلاش میں بدصورتی تک پہونچتے ہیں اور کراہیت کی حد تک بدنمائی تک چلے جاتے ہیں اور پھر پیچھے ہٹتے ہیں۔ ابھی اخباروں میں پڑھا کہ یورپ بالخصوص فرانس کے ماہرین فیشن اب سر پر ہاتھ رکھ کر رونے کے قریب ہیں کہ فیشن اور تغیر کا طوفان دھیما ہوتا جاتا ہے اور سیلاب تھمتا جاتا ہے۔ لوگ اب مراجعت کرنے لگے ہیں اور فیشن کا کاروبار مندا ہو رہا ہے۔

تو خیر یہ دیباچہ ایک نالۂ درد ہے ایک آہِ سرد ہے ایک صدائے اضطراب ہے۔ انسان کی ذہنی اور فکری بیماری کے مشاہدہ کے بعد خطرے کا ایک اعلان ہے جو یہ بیماری انسان کو ہر طرف سے نرغے میں لے رہی ہے۔ ایک تنبیہہ ہے اس انجام کی جو اسے دبوچنے والا ہے تمام عالم اس خطرے میں مبتلا ہو چکا ہے اور عالم اسلام اس خطرے سے قریب ہو چکا ہے اور ہمارا ملک تو اس خطرے میں پڑ چکا ہے۔ ہمیں اپنا غم ہے اور اپنے ملک کا غم بھی ہے۔ ہم نے اس ملک کو سنوارا ہے' اِسے چار چاند لگائے ہیں' اِسے سجایا ہے بنایا ہے۔ ہم نے خود کو کھو کر اسے پایا ہے۔ اب یہ بھی کھو جانے والا ہے۔ اور ہماری صدیوں کی محنت اکارت ہونے والی ہے۔ اور اسے غارت کرنے میں' اسے اکارت کرنے میں ہم بھی شامل ہیں۔ اس سے بڑھ کر ذلت ہمارے لئے نہیں ہے کہ ہم ہی اسے بنائیں سنواریں ہم ہی اسے پائیں اور پھر ہم ہی اسے کھو دیں۔ اردو ادیب اور شاعر کی برادری سے میں متعلق ہوں۔ یہ برادری اپنی حیثیت بالکل فراموش کر چکی ہے۔ دکھنی اور ولی سے میرؔ تک' میرؔ سے اقبالؔ تک یہ منصب ذہن کے گوشوں میں محفوظ تھا۔ اقبالؔ کے بعد یہ تجوری کھل گئی۔ اس کی اشرفیاں لٹنے لگیں اور کوئلے اس میں جگہ بنانے لگے۔ کوئلے کوئلے بھر گئے چہروں کے ساتھ ہاتھ پاؤں کالے ہونے لگے اور ہم ان سے سج دھج کر بازار میں نکلنے لگے اور نعرہ لگانے لگے کہ اصل رنگ تو یہ ہے اصل حسن تو یہ ہے۔ انسان چند ہیروں میں مقید تھا چند سونے کے ڈھیلوں میں اسیر تھا۔ ہم اسے قید سے' اسیری سے پابندی سے نکال کر کوئلے کے وسیع عریض طویل اور بلند کانوں میں لائے ہیں۔ اسی میں گھومو' اچھلو' دوڑو' آزادی سے

www.taemeernews.com

لیٹو کروٹیں لو، چہروں کو، بدن کو، ہاتھ پاؤں کو اِس وافر ذخیرے سے کالے کرو اور دکھاؤ کہ اسے کہتے ہیں آزادی اِسے کہتے ہیں فراخی، اسے کہتے ہیں وسعت، اسے کہتے ہیں رنگت، اسے کہتے ہیں لذت، اسے کہتے ہیں انسانیت۔ میر کیا کہہ گئے، اقبال کیا کہہ گئے، تلسی داس کیا کہہ گئے۔ میرا بائی کیا کہہ گئیں۔ کبیر کیا کہہ گئے، بھگت سورداس کیا کہہ گئے، ہریش چندر کیا کہہ گئے۔ اب انہیں کیا دیکھتے ہو۔ اب دیکھو امرتا پریتم کیا کہتی ہیں، منٹو کیا کہتے ہیں، عصمت چغتائی کیا کہتی ہیں، قرۃ العین حیدر کیا کہتی ہیں۔ صدیوں کے جکڑ بندیوں سے نکلو، سمندر کی تہوں سے نکلو، سطح پر آؤ اور پھر دیکھو چاند، دیکھو سورج، دیکھو ستارے، دیکھو سینتا سنی ساوتری، پدمنی، پاربتی کو کیا دیکھتے ہو ہالی وڈ جاؤ باندرہ جاؤ جوہو دیکھو۔ کتنی سیتائیں ملیں گی جو ہو کے بیچ میں نیم برہنہ چھلانگ لگاتی ہوئی۔ کتنی مناکشیاں ملیں گی، کتنی شیش دھاریاں ملیں گی۔ پرانی جہالت کی معاشرت سے نکل کر کھلی ہوا میں تیرنے والی اُڑنے والی۔ سگریٹ پینے والی شراب اُڑانے والی۔ اِس گود سے اُس گود میں، اِس پہلو سے اُس پہلو میں بیٹھنے والیاں۔ وہ زبان کیا بولتی ہو جو گھروں میں امی جان سے اور ابا جان سے اور بھائی جان سے اور آپا جان سے اور منّا سے اور منّی سے بولا کرتی تھیں۔ اِس حفظ و مراتب کے قید و بند میں کب تک رہوگی۔ آؤ باہر نکلو دیکھو مہترانیاں اور کنجڑنیاں اور خوانچہ والیاں اور مچھلی والیاں کس آزادی سے کس بے تکلفی سے، شوہروں سے اور بیٹوں سے اور بیٹیوں سے، بازار والیوں سے اور بازار والوں سے باتیں کرتی ہیں۔ پردہ پوشی، پردہ داری حسنِ ظن حسنِ خیال حسنِ نظر کا کوئی وجود اِن کی ننگا ہوں میں نہیں۔ یہ صفات ملکوتی ہیں اور انہیں ملکوتیوں ہی تک موقوف اور محدود رکھا جائے۔ انسان تو حقیقت پسند ہے۔ باپ ہوں چاہے ماں ہو۔ بیٹی ہو بہو ہو بھائی ہو بہن ہو انہیں ننگا کر کے بازار میں کھڑا کر دینا ہی حقیقت پسندی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے، راشد الخیری نے پریم چند نے، مرزا رسوا نے، آغا حشر نے اور خود اُن کے بھائی عظیم بیگ چغتائی نے اپنی تصنیفات میں جو نسوانی کردار پیش کیا ہے اور ان کی نمائندہ شخصیتیں جو ہمارے سامنے گذریں۔ بی اماں، بیگم حسرت موہانی، بیگم ابوالکلام آزاد اور ایسی سینکڑوں اور ہزاروں شخصیتیں، وہ شخصیتیں جو میں نے "جہاں خوشبو ہی خوشبو" میں پیش کی ہیں اور جو اس کتاب میں

www.taemeernews.com

پیش کر رہا ہوں یہ اصلی شخصیتیں تھوڑی ہی ہیں ؟ یہ تو نقلی ہیں اصلی کردار تو وہ ہیں جو "لحاف" میں پیش ہوئے ہیں ۔ قدروں کا جنازہ نکال کر ۔ انسان کو بے قیمت، بے قدر، بے وزن بنا کر جو انعام انہوں نے حاصل کیا ہے ۔ اور انعام حاصل کر کے جس قدر سُرخ رو یہ بنے ہیں وہ المناک اور عبرت ناک ہے ۔ مزدکیت نے تھوڑے ہی عرصہ میں زمانے کو اپنا دشمن بنا لیا اور وہ تحریک ایک کہانی بن کر رہ گئی ۔ لیکن ترقی پسندی اور حقیقت پسندی کے دوست ہر طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں ۔ اِن کی مدح سرائی میں قلم ٹوٹ رہے ہیں، روشنائی ختم ہو رہی ہے ۔ کاغذ کے کاغذ سیاہ ہو رہے ہیں اور ایسے ڈھیٹ بن کر ان کی عظمت کا راگ الاپ رہے ہیں جیسے صدیوں کے سماج نے جو تاریخ بنائی ہے جو آئیڈیل بنایا ہے ۔ آدرش کا جو چمکتا ہوا سورج پیش کیا ہے جس کی روشنی آج بھی کروڑوں گھر میں پہونچکر ان کی زندگیوں کو منور کر رہی ہے ۔ اُسی سورج سے یہ اندھے ہیں اور دنیا بھر کو اندھا سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا اندھی نہیں ہے مگر قلم ان کے ہاتھ میں ہے media ان کے اختیار میں ہے ۔ یہ media جن کے ہاتھوں تک پہنچتا ہے جن کی نگاہوں سے گذرتا ہے ان کی اکثریت اندھی نہیں ہے مگر اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت ان کو اس لئے نہیں ہے کہ جس دنیا سے وہ خود وقتی فائدہ اٹھا رہے ہیں جسے وہ خود کسی نہ کسی حد تک اپنی روزی کی توسیع کا ذریعہ سمجھتے ہیں اسے کیسے چیلنج کریں ۔ توسیع کے رُک جانے کا خطرہ ہے اور رُک جانے سے آرام طلبی اور تن آسانی سے ہاتھ اُٹھانا پڑے گا ۔ مشقت میں پڑنا پڑے گا اور یہ اب اُن کے بس کا نہیں چنانچہ وقتی اور بے ضرورت مفاد کی قربان گاہ پر یہ اپنی نسلوں کو بھینٹ چڑھ جانے سے روک نہیں سکتے ۔

لیکن میں تو چیلنج کر رہا ہوں اور اس چیلنج کے پیچھے عالمگیر سچائی ہے، آفاقی حقیقت ہے ۔ یہ عالم اور آفاق جس کا ہے اس کی طاقت میرے ساتھ ہے ۔ ہنڈیا ڈوئی اسی کا ہے، جسے لوگ اپنی ملکیت سمجھتے ہیں بہت سے گھروں میں tres pass ہوتا ہے لیکن یہ وقتی ہے گھر والا آ ہی جائے گا اور چوروں کو بھاگنا ہی ہوگا یا پکڑا کر پولس کے حوالہ ہوں گے ۔

"جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" "ابھی سن لو مجھ سے" اچھی اور سچی تصویروں کا البم ہے ۔

www.taemeernews.com

یہ تصویریں پیاری ہیں، محبوب ہیں۔ دل پسند ہیں دلکش اور دلنواز ہیں۔ یہ جہاں بھی رہیں گی، پیار کی جائیں گی۔ کوئی انسان انہیں ٹھکرا نہیں سکتا، روند نہیں سکتا۔ مخالفت اسی نوعیت کی ہوگی جیسے ابوجہل عتبہ اور دوسرے سرداران مشرکین قریش کرتے تھے کہ شب کے سناٹے میں چھپ کر چپکے سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر کی دیواروں سے کان لگا کر حضرت صدیقؓ کی تلاوت قرآن پاک کی آواز سنتے تھے جھومتے تھے اور دن کو بیت اللہ کے قریب جا کر حضرت صدیقؓ اور مسلمانوں کے خلاف اسکیمیں بناتے تھے۔ اس لئے کہ یہاں بھی توسیع رزق اور اقتدار کا مسئلہ تھا۔

"جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" اور "وہ جو شاعری کا سبب ہوا"۔ وغیرہ وغیرہ کے سب کے دل کی آواز اور چاہت کا یہ عالم رہا کہ دس دس بار پڑھا اور مستقل پڑھتے رہتے ہیں۔ بعضوں کے سرہانے کتاب رہتی ہے۔ مطالعہ کرتے ہیں تو سوتے ہیں لیکن آج تک اِن کتابوں کے متعلق کوئی مضمون، کوئی تحریر، کوئی تبصرہ پوری اُردو دنیا میں شاید کہیں شائع نہیں ہوا۔

کتابوں کی دھجیاں تک نہ بچیں۔ بعض لوگوں نے جن کے پاس فاضل جلدیں تھیں انہوں نے "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کی ایک ایک جلد پانچ پانچ ہزار روپئے کو فروخت کیں۔ مضمون شائع ہونا کوئی علامت یا دلیل مقبولیت کی ہرگز نہیں بالکل نہیں بلکہ نامقبولیت کی علامت ہے۔ لیکن ہم تو اہل قلم کا دل دیکھنا چاہتے تھے سو دیکھ چکے جان چکے تول چکے پرکھ چکے۔ میں اس کا فخر اور اس کی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میری کتابوں نے بھرپور اثرات دلوں پر کئے ہیں اور اردو دنیا کی ایک اچھی خاصی موثر اور نمایاں تعداد میری ہم خیال ہم مزاج اور ہم نظر ہو چکی ہے۔ یہ چراغ ان کی مجلسوں میں ان کے گھروں میں جل چکے ہیں وہاں اور کوئی چراغ اب روشن نہیں ہو سکتا چاہے فیض کا ہو یا فراز کا، عصمت کا ہو یا منٹو کا، قرۃ العین کا ہو یا امرتا پریتم کا۔

سچ کی آواز دبتی ہے بند نہیں ہوتی۔ جھوٹ کی انگلیاں ان کا گلا دباتی ہیں لیکن جلد ہی مفلوج ہو کر گر پڑتی ہیں۔ عالمگیر سچائی پر جن کا ایمان ہو وہ پروپیگنڈہ اور پبلسٹی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ہوا بھرے ہوئے بیلون ہیں۔ ایک دن ہوا نکل جائے گی اور یہ پھٹ کر بے جان ہو کر گر پڑیں گے اور ہوائیں انہیں خس و خاشاک کے ڈھیر پر اُڑا کر ڈال دیں گی۔ میری کتابیں

www.taemeernews.com

جس آب و تاب اور جس اشتیاق سے شائع ہوئیں، جیسی محنت اور جیسی محبت اور جیسی فکر اس میں لگی اور حوصلہ اور جو سخاوت اور دریا دلی اور جو ہمت ان کی اشاعت میں صرف ہوئی وہ اردو دنیا میں بے مثال ہے اس لیے کہ دنیا اہل درد سے خالی نہیں اور مجھے اہل ہوس اور اہل غرض سے سروکار نہیں۔ سینہ چاک چمن سے سینہ چاک چمن ہی ملتا ہے۔ اہل طرہ و دستار تماشہ بینوں میں ہیں اور ہم زخم خوردگان محبت رقص بسمل میں مصروف ہیں ہماری آواز اِن تماشہ بینوں کے سروں سے گذر کر اپنی آرام گاہوں تک پہنچ جاتی ہے مجھے یہ تسلی کہ میری آواز راستے میں رُکی نہیں رہی، اپنی منزلوں تک پہنچی اور میرے اہل درد ساتھیوں کو یہ تشفی اطمینان اور خوشی کہ اس آواز کو پہنچانے میں تن من دھن بازی پر لگا دیا۔ بس اس کے سوا ہم اور وہ کچھ نہیں چاہتے۔ اب

تم چاہو تو تلوار چلاؤ یا چاہو تو جام چلے
ہم تو پیارے درد محبت کا دیکر پیغام چلے

طالب الدعا

www.taemeernews.com

تیس پینتیس سال پہلے میرے یہاں آنے والے دوستوں نے بزرگوں نے دیکھا ہوگا کہ بہار نیشنل کالج کے ٹھیک سامنے ایک چھوٹا سا غیر اہم ایک منزلہ مکان۔ منڈیر پر بڑا سا سائن بورڈ گدے اور تکیے کی تصویر بنی ہوئی اور نیچے لکھا ہوا "جنرل بیڈنگ اسٹور" دو چھوٹے چھوٹے اور ایک بڑے دروازے کی دوکان اندر ایک طرف مختلف قماش تراش اور سائز کی پرانی تین چار الماریاں دوسری طرف دیوار پر بدخوارہ ٹیڑھے تختوں کے چار پانچ ریک (Rack) ۔ اس پر کچھ توشک، کچھ تکئے کچھ کوشن اور الماریوں میں کچھ چادریں، کچھ دریاں، تکیوں کے غلاف، مچھر دانیاں اور بستر بند وغیرہ۔ درمیان میں نیچے پایوں کی چوکیوں پر پرانی دریوں کا فرش اس پر معمولی مارکین کی رنگی ہوئی چاندنی۔ اس کی ایک طرف تین چار کرسیاں جو اپنا شباب کب کی کھو چکی تھیں۔ رگیں ابھر آئی تھیں، جھریاں پڑ رہی تھیں اور جلد کی رونقیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ یہ کرسیاں مختلف قبیلوں اور خاندانوں کی تھیں جو لاوارث یتیموں کی طرح کسی یتیم خانے میں جمع تھیں اور ان کے ساتھ ایک لمبا بنچ جو انہیں کرسیوں کے عمر اور زمانے کا تھا اور ہمدرد غمگسار پا کر ان کا ہم نشیں اور ہم بغل تھا۔

میں اسی بنچ پر ایک کنارے اس کے بازو سے ٹیک لگائے ایک پاؤں نیچے ایک پاؤں بنچ پر رکھے اپنے بے داغ سفید سفید کرتے پاجامے اور سیاہ ٹوپی میں سڑک کی طرف رُخ کئے اپنے خیال میں کھویا فکر میں ڈوبا بیٹھا رہتا۔ ایک طرف مشین پر عبدالشکور خلیفہ پچاس سالہ دیہات کا خیاط مارکین کی لنگی، مارکین کا کرتہ مارکین کی ٹوپی پہنے پرانی سنگر مشین پر سر جھکائے مچھر دانی کی سلائی میں مصروف ہوتا اور اسی کے قریب چوکی پر دھوتی اور موٹا پنجابی کرتہ پہنے بالوں میں تیل ڈالے ماتھے پر چندن لگائے کبھی کوئی کپڑا اتراشتے ہوئے کبھی بائیں ہتھیلی پر کھینی کے ٹکڑوں کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ملتے ہوئے منشی شیوپوجن سنگھ بیٹھے ہوتے۔

یہ تصویر ہے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے اس غریب دوکان کی جس کا نام سنتے ہی

www.taemeernews.com

امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، عرب اور پاکستان کے اکثر رہنے والوں کو غموں کا جلایا دکھوں کا ستایا کلیم عاجز یاد آجاتا ہے اور اُس کے اس قسم کے پُرانے نئے اشعار ذہنوں میں شہنائیاں بجانے لگتے ہیں :

سخن عاجز کا کیوں پیارا لگے ہے
یہ کوئی درد کا مارا لگے ہے

بیاں جب کلیم اپنی حالت کرے ہے
غزل کیا پڑھے قیامت کرے ہے

۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۵ء تک جب میں کالج جانے لگا تھا اور پٹنہ کے مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگا تھا تو سننے والے پُرانے ارباب ذوق قاضی عبدالودود صاحب، جسٹس انوار احمد ڈاکٹر نول کشور پرشاد، اُن کے بھائی جسٹس براج کشور پرشاد، جسٹس بھونیشور پرشاد سنہا، جسٹس جوالہ پرشاد اور نول کشور ایڈوکیٹ نمبر ایک، نول کشور ایڈوکیٹ نمبر دو وغیرہ ایسی معمولی دکان میں معمولی بنچ پر بیٹھ کر مزاج پرسی کر لیتے اور پڑھائی کے حال چال پوچھ لیا کرتے ۔ انہیں اس ٹوٹی پھوٹی چھوٹی دکان میں اُن کا درد آشنا دل کھینچ لاتا جو چھوٹا جانتا ہے نہ بڑا نہ غریب جانتا ہے نہ امیر، ہندو جانتا ہے نہ مسلمان، نہ اونچ جانتا ہے نہ نیچ، نہ کرسی جانتا ہے نہ چٹائی ۔ انہیں اس سے اچھا سامان اس سے اچھی دکان میں نہایت آسانی سے مل جاتا، گدے دار نفیس کرسیاں بیٹھنے کو مل جاتیں، بجلی کے پنکھے مل جاتے ۔ ہٹو بچو کہنے کو خوش پوش لچھے دار باتیں کرنے والے سیلس مین مل جاتے، جھک کر فرشی سلام مل جاتا ۔ لیکن وہاں کلیم عاجز نہیں ملتا ۔ اور وہ چیزیں لینے سے زیادہ کلیم عاجز سے ملنے آتے ۔ اس کے دل میں اُترنے، آنکھوں میں جھانکنے اُس کی دھیمی نیچی آواز سننے آجاتے ۔

تو میں ایک دن اسی بنچ پر اسی انداز میں سڑک کی جانب رُخ کئے، بنچ کے بے رنگ بازو سے ٹیک لگائے ایک پاؤں بنچ پر رکھے دوسرا زمین پر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے اپنے

www.taemeernews.com

خیالات میں گم بیٹھا تھا۔ کالج سے کلاس کر کے آیا تھا۔ یاد آرہا تھا کہ کلیم اور کالج ؟ پندرہ سولہ سال پہلے گردنی باغ کے ایک کوارٹر میں اپنے بہنوئی سے فرسٹ بک، دوبارہ شروع کیا تھا۔ پہلے کلکتہ میں شروع کیا تھا بھول گیا، اسکول بھول گیا کلکتہ سے بھاگ آیا۔ پھر دوبارہ پڑھنا آغاز ہوا میرے بہنوئی حمایت حسین مرحوم سکریٹریٹ میں تھے۔ وہ مجھے انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کے ایک دوست مسٹر تاج الدین بھی سکریٹریٹ میں ملازم تھے۔ انہوں نے کوارٹر نہیں لیا تھا۔ پرانی وضع کے اپٹوڈیٹ گریجویٹ تھے۔ بچوں کو شہر میں رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ شاید سیوان کے رہنے والے تھے، حمایت حسین صاحب ہی کے کوارٹر میں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ زیادہ تر میری پڑھائی کی طرف وہی توجہ دیتے۔ بہت گورے خوش رُو آدمی، بے حد سنجیدہ چہرہ بہت صفائی پسند، کم سخن، سیدھی سادی وضع کرتہ پاجامہ انگریزی کوٹ، شو اور سیاہ ٹوپی یہی دفتری لباس یہی گھریلو لباس یہی تقریبی لباس، بڑے دیندار اور نہایت مخلص اور دلیر صاف گو۔ بڑی محنت سے پڑھاتے اور بالکل چھوٹے بھائی کی طرح سختی کرتے تنبیہہ بھی کرتے اور کبھی کبھی گوشمالی بھی۔ حالانکہ میں اس وقت عمر کے اعتبار سے بارہ تیرہ سال کا تھا اور قدوقامت کے اعتبار سے پندرہ سولہ سال کا۔ اُن کی اور میری جسامت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ لیکن پڑھائی کے دوران وہ مجھے ڈانٹتے اور سختی سے تنبیہہ کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ زیادہ ناراض ہوتے تو کان زور سے اینٹھ دیتے اور اس کے بعد میرا منہ دیکھتے میرے چہرے پر کوئی علامت ناراضگی کی یا گرانی کی نہ دیکھ کر وہ مسکرا اُٹھتے اور پھر خاموشی سے پڑھانے میں لگ جاتے۔ چھ سات سال کی عمر میں مکتب نشیں ہوتے وقت سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک مجھے پیار سے اور بے تکلفی سے پڑھانے والا کوئی نہ ملا۔ خواہ میرے نانا مولوی ضمیر الدین صاحب ہوں۔ میرے کلکتہ کے ماسٹر ترپاٹھی جی ہوں یا تاج الدین صاحب ہوں۔ حالانکہ یہ سب مجھے اتنا پیار کرنے والے اتنا چاہنے والے تھے کہ مجھے ان کے پیار اور چاہ کی داستان دہرانے میں بڑی تفصیل سے کام لینا پڑے گا۔ مختصراً میرے پہلی سوانح میں کچھ اشارے آگئے ہیں۔ میں نے صرف اس لئے لکھا کہ یہ باتیں دہرانے میں مجھے فخر ہے کہ میں جو کچھ بھی ہوں اس ہونے میں اور میرے پاس جو کچھ بھی ہے چاہے وہ میرا مزاج ہو یا میرا ذوق میرا علم ہو یا میرا فن یا میری شخصیت۔ ان سب کے ہونے میں اِن لوگوں کا

www.taemeernews.com

حصہ ہے۔ میری مکمل تعمیر میں ان کا حصہ ہے تشکیل اور تزئین میں اِن کا حصہ ہے ..... چنانچہ ایک روز بنچ پر بیٹھا میں سوچ رہا تھا۔ مکتب سے کالج تک پہونچنے میں کن کن منزلوں سے گذرا کن کن کی رفاقت میں کن کن کی رہبری میں۔ میرے بنانے میں سختیوں کا کتنا حصہ ہے نرمیوں کا کتنا تلخیوں کا کتنا شیرینیوں کا کتنا پھولوں کا کتنا کانٹوں کا کتنا دشمنیوں کا کتنا دوستیوں کا کتنا پیار کا کتنا اور مار کا کتنا اور کیا یہ پیار اور مار۔ دوستیاں اور دشمنیاں، تلخیاں اور شیرینیاں سختیاں اور نرمیاں الگ ذریعوں، راستوں اور سرچشموں سے آئیں یا ان کا کوئی ایک ہی سرچشمہ تھا؟ کیا میری تعمیر میں ماں کا پیار باپ کی مار الگ الگ چیزیں ہیں؟ ذہن ماسٹر ترپاٹھی کی طرف گیا۔ وہ اس زور سے میرے کان مروڑتے کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آتے اور پھر ماسٹر ترپاٹھی بھی آبدیدہ ہو جاتے۔ تاج الدین صاحب زور سے کان مروڑتے اور پھر میری بشاشت دیکھ کر مسکرا پڑتے اور فوراً خاموش اور سنجیدہ ہو جاتے۔ کیا ان سب کے مختلف پردہ ہائے رنگارنگی میں کوئی ایک معشوق تھا؟ تاج الدین صاحب کا خیال آیا تو دیر تک سوچنے لگا۔ تاج الدین صاحب کہاں گئے۔ وہ پاکستان کے بڑے سخت حامی تھے۔ کیا وہ پاکستان چلے گئے۔ سولہ سال ہو گئے۔ گردنی باغ سے مسلم اسکول آجانے کے بعد پھر تاج الدین صاحب کا خیال آیا۔ نہ ان سے ملاقات ہوئی۔

میرے بہنوئی حمایت حسین بھی سکریٹریٹ کی ملازمت ترک کر کے ریلوے میں ایک اچھے عہدے پر چلے گئے اس لئے تاج الدین صاحب سے ربط نہیں رہا۔ پھر ملک تقسیم ہوا۔ میرے بہنوئی مشرقی پاکستان چلے گئے۔ تاج الدین صاحب کہاں گئے؟ میں نے میٹرک میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی۔ تاج الدین صاحب کو نہیں معلوم ہو سکا افسوس۔ معلوم ہوتا تو وہ کتنا خوش ہوتے۔ ان کی گوشمالی مجھے کہاں پہونچا گئی۔ آئی۔ اے۔ کر لیا۔ بی۔ اے آنرس کر لیا۔ کتنے گولڈ مڈل لئے۔ تاج الدین صاحب کتنے خوش ہوتے؟ .....

سوچتے سوچتے بات آگے چلی گئی۔ تیلہاڑہ اور پانکڑ کا درخت اور مجلسیں اور شفقتیں اور محبتیں اور پھر مشقتیں اور مصیبتیں اور آفتیں ..... آنکھیں سامنے کھل گئیں اور سامنے کا منظر غائب ہو گیا۔ خلا میں نگاہیں دوڑنے لگیں اور یک بیک کوئی سایہ سا آنکھوں کے سامنے

www.taemeernews.com

سے گذرا اور میں چونک کر بنچ سے کھڑا ہوگیا اور بے تحاشہ سڑک کی طرف لپکا۔ دکان کے نیچے آیا۔ اور دائیں طرف دوڑ پڑا۔ آگے ایک صاحب خالتہ پاجامہ، سفید قمیص، سیاہ انگریزی کوٹ سیاہ ٹوپی اور شو پہنے ہوئے جارہے تھے مری طرف پشت تھی۔ میں دوڑ پڑا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ گھوم پڑے۔ سرخ سپید چہرہ اور سیاہ گھنی داڑھی۔ میرے منہ سے نکل گیا۔

"تاج الدین صاحب؟"

وہ حیرت سے ٹھٹھک گئے۔ "آپ کون؟"

"میں کلیم احمد۔"

"کون کلیم احمد؟"

"آپ کے دوست حمایت حسین کا عزیز۔ گردنی باغ کوارٹر میں آپ سے پڑھتا تھا۔"

اُن کی آنکھیں بھر آئیں اور وہیں سڑک پر لپٹ گئے۔

میں اُنہیں دکان میں لایا۔ انہیں بٹھایا اور دائیں جانب میں بیٹھا۔ اُن کی صورت دیکھی۔ داڑھی خاصی خوبصورت تھی۔ وہ خود بھی پہلے سرخ و سپید تھے۔ سرخی اور سپیدی پر داڑھی کی سیاہی غزل کی پرانی کیفیت تازہ کررہی تھی۔ تاج الدین صاحب جوانی کی حد سے گذر تو ضرور رہے تھے لیکن قدم حدود کے اندر ہی تھا۔ یہ وہ عمر ہے جب انسان نزاکتِ حیات سے آشنا تو ہوتا ہے۔ خوشی اور مسرت، رنج و راحت کے متضاد لذتوں سے باخبر تو ہوتا ہے مگر زندگی کی فکر اور فلسفہ کا یہ جزو نہیں بن پاتے۔ عام طور سے یہی ہوتا ہے۔ میں ایک حد تک استثنا تھا اس لئے کہ میرے ساتھ شدید حادثات کا ایسا سلسلہ چند برسوں کے اندر ہی گذرا کہ رنج و خوشی صرف احساسات کی سطح سے گذر کر فکر اور فلسفہ زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ اب میں حالات سے متاثر تو بہت ہونے لگا تھا ہنسنے کا موقع بے ساختہ آئے تو میں ہلکی سی مسکراہٹ پر قناعت کرتا ہوں اور رونے کا تقاضہ شدت سے آجائے تو اِسے تنہائی کے لئے ضبط کرلیتا ہوں اور خلوت ہو تو جی بھر کے رولیتا ہوں ورنہ وقتی طور پر آنسو گھونٹ لیتا ہوں۔

تاج صاحب بیٹھے۔ میں نے چائے وغیرہ منگوائی۔ وہ میرے حالات سے واقف نہیں تھے۔

www.taemeernews.com

سنہ ۴۶ء کے فسادات کے بعد وہ پٹنہ سے کہیں منتقل ہو چکے تھے۔ اور اب پاکستان میں رہ رہے تھے۔ مجھ سے میرے گھر بار کا حال پوچھا اور مسلسل پوچھا تو میں نے بہت کم لفظوں میں حادثات کا خلاصہ دہرا دیا۔ وہ غم سے ایسے بے قابو ہوئے کہ مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ بڑی مشکلوں سے میں نے ان کو معمول پر لایا پھر وہ خاموش ہوئے۔ رفتہ رفتہ باتوں کا رخ بدلا۔ میری شاعری کا ذکر آگیا شاید انہوں نے کچھ سُنا ہو۔ دو ایک شعر میں نے سنائے۔ آدمی سمجھدار تھے۔ اور کسی حد تک باذوق تھے۔ جھومے تعریف کی اور انگریزی میں بول اُٹھے:

"How you manage to catch such thoughts?"

میں بھی جوش میں آکر انگریزی میں بول اُٹھا:

"A army of thoughts and sentiments always follow me."

بس سننا تھا کہ تاج الدین صاحب نے ٹھیک اسی طرح جس طرح پندرہ سولہ سال پہلے پڑھاتے میرے کان پکڑ لیا کرتے تھے بے ساختہ غصہ میں آکر میرا کان اتنے زور سے مروڑا کہ میں رونے کے قریب ہو گیا اور وہ بولے:

Kalim! A army or An army?

اور میں بھی ٹھیک پہلے کی طرح سنجیدہ ہو گیا ہلکی سی یادوں کی مسکراہٹ میرے لبوں پر آگئی۔ تاج الدین صاحب نے بھی میرے منہ کی طرف جھانکا جیسے سولہ سال پہلے پڑھاتے ہوئے کان مروڑتے ہوئے جھانک کر میرے منہ کو دیکھ لیتے تھے۔ اور انہیں بھی یاد آگیا اور مجھے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر زور سے ہنس پڑے۔

"کلیم، واقعی نہ تم بدلے نہ ہم بدلے"

کیا واقعی نہ ہم بدلے نہ وہ بدلے؟ تغیر سے کیا مراد ہے؟ تغیر تو اس کائنات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ بدلنا تو تقاضائے فطرت ہے ہر شخص بدلتا ہے ہر چیز بدلتی ہے یہاں تک کہ موسم اور چیزوں کی خاصیتیں بھی بدلتی ہیں۔ مزا بدلتا ہے اثرات بدلتے۔ لیکن ہر چیز

www.taemeernews.com

بالکل نہیں بدلتی۔ کبھی برسات سویرے آتی ہے کبھی دیر سے۔ گرمی اور سردی کے مہینے بھی کچھ بدلتے رہتے ہیں۔ ساون کی جھڑی اب نہیں لگتی۔ اکبر کا یہ شعر اب بدلا نظر آتا ہے کہ

پڑ جائیں وہیں آبلے اکبر کے بدن پر
پڑ دھوپ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون

حالانکہ اب تو اپریل میں کچھ خنکی رہتی ہے۔ جون میں اب لُو نہیں چلتی۔ اور جولائی اگست کی گرمی مئی جون کی گرمی کو شرما دیتی ہے۔ ان کے بدلنے کے یا کم بدلنے کے اسباب ہیں اُن قوانین کو لوگ مانتے ہیں ہیں اس سے بحث نہیں۔ انسان بھی بدلتا ہے۔ کچھ لوگ کم بدلتے ہیں کچھ لوگ بالکل بدل جاتے ہیں اور کچھ لوگ بالکل نہیں بدلتے۔ کچھ لوگ کم بدلتے ہیں۔ اس لئے کہ بدلنے والے اثرات ان تک کم پہونچے۔ گرچہ ان میں بالکل بدل جانے کے امکانات قوی تھے۔ اب بھی ایسے مقامات تہذیب کے اثرات سے دور ملیں گے جہاں اب بھی لوگ ویسا ہی سوچتے ہیں کرتے ہیں بولنے پسند کرتے ہیں ناپسند کرتے ہیں اس لئے کہ ان کا مقابلہ تغیر سے نہیں ہوا۔ وہی لوگ جب بدلنے والے اثرات کے قریب ہو گئے۔ مقابلہ نہیں کیا یا مقابلہ کی طاقت نہیں تھی۔ وہ بالکل تغیر کی زد میں آ گئے۔ نہ وہ بول رہا نہ وہ سوچ رہی نہ وہ عمل رہا نہ وہ خیالات رہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ گرچہ ایسے بہت کم ہوتے ہیں۔ شاید گنتی میں بھی نہیں آئیں۔ جو حالات اور تغیر سے مقابلے کی پوری توانائی رکھتے ہیں۔ ان میں ترک اور اختیار کی پوری تمیز رہتی ہے۔ کیا ترک کرنا ہے کیا اختیار کرنا ہے یہ تمیز انہیں بدلنے نہیں دیتی۔ مثلاً رنگوں میں سائنسی دور میں کچھ ایسے اجزا بھی ہوتے ہیں جو سُرخی کو اور زیادہ سُرخ کر دیں۔ سُرخی کے حُسن کو بڑھا دیں۔ وہ اجزا اگر سُرخی کے عام رنگوں میں ملا دئے جاتے ہیں تو سُرخی زیادہ پسندیدہ ہو جاتی ہے اور اس کا بنیادی تاثر اور بڑھ جاتا ہے۔ لیکن وقت نے ایسے اجزا بھی پیدا کر دئے ہیں جو سُرخی کو زیادہ مائل کر دیں اور سُرخی کے سیاہی مائل ہونے کی تمیز نہ رہے۔ ترک و اختیار کی تمیز نہ ہونے کی وجہ سے اضافۂ حسن کے بجائے زوال حسن کے اجزا ملا دئے گئے تو وہ سرخی سیاہی مائل اور ناخوشگوار ہو گئی۔ یہ ترک و اختیار کی تمیز انسان کی بنیادی حسن میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔

www.taemeernews.com

میں کچھ اسی قسم کے لوگوں میں تھا اور تاج الدین صاحب بھی۔ تاج الدین صاحب تنبیہہ اور اصلاح کے لئے کان مڑوڑتے تھے لیکن اِن کی رحم دلی کان مڑوڑنے کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اس کے بغیر عموماً اصلاح بھی مشکل ہے اس لئے کان مڑوڑ کر وہ دیکھتے تھے کہ برداشت کر لیا گیا تو وہ اور خوش ہو جاتے تھے۔ اور زیادہ سنجیدہ ہو کر پڑھانے لگتے تھے۔ ان کے برعکس ماسٹر ترپاٹھی جو مجھے اور کمسنی میں پڑھایا کرتے تھے وہ کان زور سے مڑوڑتے تو بچپنا تکلیف برداشت کرنے نہیں دیتا۔ میرے آنسو نکل پڑتے تو ماسٹر ترپاٹھی صاحب بھی آبدیدہ ہو جاتے مگر کان مڑوڑنا نہ چھوڑتے۔ تاج الدین صاحب جب پڑھاتے تھے تو میرا بچپنا ختم ہو چکا تھا۔ وہ کان مڑوڑتے تو میں جانتا تھا کہ کان مڑوڑنے والا کون ہے۔ نانا جان یا والد صاحب یا اُستاد۔ میں ان کا رتبہ جان گیا تھا مجھے بتا دیا گیا تھا تو مرتبہ کا احساس مجھ میں ردعمل ہونے نہیں دیتا۔ تکلیف برداشت کر لیتا۔ مجھ میں پندرہ سولہ سال بعد بھی یہ احساس وضبط باقی رہا اور تاج الدین صاحب ہیں وہ پندرہ سال والا احساس اور خیال باقی رہا۔ وہ بھی نہیں بدلے میں بھی نہیں بدلا۔

لیکن کیا تغیر جسے ہم ارتقا کہتے ہیں ہر حال میں مستحسن ہے؟ اور کیا تغیر اور ارتقا ہر حال میں قبول ہے؟ نہیں قبول ہے۔ مگر ارتقا اور تغیر کے سامنے انسان مجبور ہے۔ کوئی بوڑھا ہونا نہیں چاہتا مگر انسان مجبور ہے۔ حالات کے سامنے سپر ڈالنے پر۔ جب تک جھیل لے مقابلہ کر سکے کر لے۔ تغیر کو شکست دیتا رہے مگر آخر انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ سرخ رنگ کی بات آئی تو سن لیجئے۔ رنگوں کی بات آئی تو سن لیجئے۔ آج سے پچاس سال پہلے سرخی کا ایک اور عمومی اور دیہاتی نام تھا "یک رنگا" شاید کچھ لوگوں کو یاد ہو۔ میں ایسی سُرخی جسے یک رنگا کہتے تھے اب نہیں دیکھتا۔ اور اس یک رنگے کا حسن بھی اب نہیں دیکھتا۔ سرخی نے بہت رنگ بدلا ہے چہروں پر بھی کپڑوں پر بھی پھول اور پھلوں پر بھی مگر "یک رنگا" یک رنگا ہی رہا۔ اس کی سرخی کو کوئی سرخی آج تک نہیں پا سکی۔ دیہاتوں میں بھی اور شہروں میں "یک رنگا" کی ایک بات تھی۔ ایک طاقت تھی ایک حکومت تھی ایک جادو تھا جس کے آگے سب مات ہو جاتے تھے سب گردن جھکا دیتے تھے سب مسحور ہو جاتے تھے اور سب دل دے بیٹھتے تھے۔ کیا شہری کیا دیہاتی کیا پڑھا کیا بے پڑھا

www.taemeernews.com

کیا عالم، کیا جاہل کیا مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھا - دیہاتوں میں مثلاً میرے گاؤں میں پرشادی ساؤ بزاز، ہرنام سنگھ بزاز اپنے کپڑوں کی دکان میں "یک رنگا" کو خاص قسم کے کاغذ میں لپیٹ کر رکھتے تھے۔ یہ یک رنگا موٹا بھی ہوتا، مہین اور باریک بھی ہوتا اور ریشمی بھی۔ جمائن بھی خریدنے آتی دوسادھن بھی، پنڈتائن بھی اور راجپوتنی بھی گوالن بھی اور للائن بھی۔ مولے زادن بھی اور کنجڑینی بھی۔ ملکائن بھی اور شیخائن بھی۔ ساری اور شلوکہ کے لئے گلابی کپڑے بھی تھے پیلے بھی بیگنی بھی نیلے بھی لیکن سب سب دیکھ داکھ کر آواز آتی۔

"ساؤ جی یک رنگا دکھائیے"

کوئی نہیں کہتا لال کپڑا لائیے۔ سرخ رنگ لائیے۔ بس آواز آتی "یک رنگا نکالئے"۔ اور ہرنام سنگھ اندر جاتے اور کاغذ میں لپٹا ہوا تھان لاتے، بڑے اہتمام سے کھولتے۔ اور کاغذ کی تہوں سے یک رنگا نکلتے ہی پوری دکان میں سُرخی پھیلا دیتا۔ کپڑوں کے ڈھیر پر بھی اور بیچنے والے اور خریداروں کے چہروں پر بھی۔ گالوں کی سُرخی بھی بڑھ جاتی اور آنکھوں کے سُرخ ڈوروں پر لہک بڑھ جاتی اور خریدنے والیاں اپنی سمجھ اور سطح کے اعتبار سے مختلف انداز اور زاویے سے کپڑے کی جانچ پرکھ کرتیں۔ کوئی کپڑوں کی تہہ کے اندر اپنی کلائی ڈال کر انگلیوں سے کپڑے کی تہہ کو حرکت دیتی۔ اور انگلیوں کی سرخی میں جو اضافہ ہو جاتا اُسے بھی دیکھتی۔ کوئی تھان سے ایک تہہ کھینچ کر اپنی کلائی اور کہنیوں کے درمیان یک رنگا کو پھیلا کر اُس پس منظر میں اپنے جسم اور بازوؤں کو دیکھتی اور جناب یک رنگا منتخب کر لیا جاتا۔ اور اس کے ساتھ ایک دوسرا یک رنگا تھا۔ اور ارشاد ہوتا شلوکہ کے لئے "یک رنگا" لائیے اور ہرنام سنگھ اور پرشادی ساؤ خوب واقف تھے کہ یہ "یک رنگا" کسے کہتے ہیں چنانچہ دوبارہ اندر جا کر ایک دوسرا لپٹا ہوا تھان لے آتے۔ اسے کھولا جاتا تو چمکتا ہوا بھڑکتا ہوا سیاہ بلبل برآمد ہوتا۔ یہ بلبل میرے زمانے میں ایک خاص قسم کا سوتی اور ریشم کے درمیان کریپ کی قسم کا کپڑا ہوتا جسے دیکھتے ہی خیالات میں کاکل اور کاجل اور سرمہ اور مستی کے تمام تصورات جاگ اُٹھتے اور شاعری بیدار ہو کر انگڑائیاں لینے لگتی۔

اسی سُرخ یک رنگے کی ساری اور سیاہ بلبل کے شلوکے کا ذکر اوسیوا کی سرگذشت میں

www.taemeernews.com

کیا ہے۔ میں ارتقا کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا مگر ارتقا کی باگ ڈور بھی انسان ہی کے اختیار میں ہے یہ قانون فطرت ضرور ہے۔ مگر اس کا رُخ اس کی لگام انسان ہی کے اختیار میں ہے۔ ارتقا کو جس رُخ پر لے جائے اور جس طرح موڑے لگام سخت رکھے یا ڈھیلی ارتقا منشارِ فطرت کے موافق ہو یا مخالف اس کا مجاز انسان ہی بنایا گیا ہے۔ یہ فیصلہ اس کے اختیار میں ہے۔ اگر انسان اس اختیار کو منشار فطرت کے موافق استعمال کرتا ہے تو ارتقا صحتمند ہے خوشگوار ہے مفید ہے اور دیرپا ہے۔ یعنی ارتقا کے ہر زینہ پر انسان لطف لیتا ہوا لذت لیتا ہوا اس لذت اور لطف کو اپنے تصور میں احساس میں تجربہ میں ذہن میں رچاتا بساتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھنا شرط ہے۔ صرف تغیر شرط نہیں صرف تغیر کو ارتقا نہیں کہتے۔ ہر چیز کو ایک سطح سے اٹھا کر اسکی اوپری سطح تک پہونچانا ارتقا ہے صرف بدل دینا ارتقا نہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے لکھنو میں لحاف کے فرد چھپا کرتے تھے۔ شاید اب نہیں چھپتے۔ چالیس سال پہلے تک میں نے خریدا تھا۔ اس زمانے میں پانچ چھ روپیہ کو ایک فرد ملا کرتا تھا۔ تین گز لمبا اور تقریباً دو گز چوڑا۔ مارکین پر یا لٹھے پر چھپتا تھا۔ چھپے ہوئے فرد کو کھول کر ذرا دور پھیلا دو تو پچیس تیس فٹ کی دوری سے ایسا معلوم ہو کہ ایک پردے پر مختلف رنگوں کے اور مختلف ناپ اور سائز کے نگینے جڑے ہوئے ہیں۔ روشنی نہ ہو تو بھی ان کی چمک آنکھیں محسوس کرتی تھیں۔ نزدیک سے دیکھو تو ایسی حسین نقاشی کی چھاپ کہ حیرت ہونے لگے کہ ایسے باریک اور مہین ٹھپے بھی ہاتھوں سے بنائے جا سکتے ہیں۔ قدیم کتابوں پر ہاتھوں کے بنے ہوئے سنہرے روپہلے نقوش دیکھ کر انسانوں کی کاریگری پر حیرت زدہ ہو کر اس کی قیمت ہزاروں لاکھوں میں لوگ لگاتے ہیں۔ ویسے ہی ملتے جلتے ہوئے نقوش لحاف کے معمولی پانچ چھ روپے کے کپڑے کے فرد پر دیکھ کر انسان متعجب ہوتا تھا اور میں تو ہوتا ہی تھا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں دھونے کی محفوظ مشینیں نہیں تھیں کہ رنگ کی صفتوں، خوبصورتیوں، آب و تاب اور چمک دمک دُھلنے کے بعد بھی باقی رہے۔ یہیں دیہات کی کپڑا دھونے والی بھٹیوں میں وہ ڈال دیئے جاتے۔ اور فرد بیچنے والے لکھنو کے کاریگر اور دکان دار کہا کرتے تھے کہ اگر بھٹی میں بھی دُھلکر چھپائی کی آب و تاب پہلے سے زیادہ نہ ہو جائے اور ہر دھلائی کے

www.taemeernews.com

بعد پہلے سے زیادہ نہ ہو تو فرد واپس لیتے آنا اور پیسے واپس لے جانا۔ اور ان آنکھوں نے دیکھا کہ دعویٰ ڈینگ نہیں تھا حقیقت تھی۔

دیکھا تو نہیں سُنا کہ کشمیر کی ایک مکمل شال انگوٹھی کے سوراخ سے کھینچ لی جاتی تھی۔ اِن آنکھوں نے یہ دیکھا کہ کلکتہ میں بالاپوش بنانے والے (سردیوں میں اوڑھنے کی دُلائی) بہت باریک قسم کے سفید کپڑے تین گز لمبے اور ڈیڑھ گز چوڑے ہوتے۔ ان کی دو تہوں کے اندر دو ڈھائی یا تین چھٹانک روئی کو دھن کر یوں پھیلا دیتے کہ پورے کپڑے پر روئی کی مہین تہہ جم جاتی جس کے اندر سے کپڑا نظر نہیں آتا۔ اس پر دوسری تہہ کپڑے کی ڈال دی جاتی اور وہ دونوں تہیں اور روئی کی ایک تہہ مل کر تینوں اس طرح آپس میں جُڑ جاتے کہ پھر انہیں علاحدہ کرنا مشکل ہوتا۔ اُس استر پر دونوں طرف نہایت حسین اور ایسی باریک ململ کہ ان کے دھاگوں کو معمولی نظروں سے دیکھنا مشکل تھا۔ بہترین قسم کے سُرخ رنگ (وہی یک رنگا) یا کاکریزی رنگ میں رنگ کر دونوں طرف جما دیتے اب پانچ تہیں ہوگئیں دو تہیں سفید باریک کپڑے کی جن کے اندر ایک تہہ روئی بھی اُن پر پھر دونوں طرف کا کریزی ململ اُن کی چاروں طرف اسی رنگ کے ساٹن کی گوٹ۔ اس گوٹ کی تیاری کا میں کیا نقشہ پیش کروں جس عجلت کے ساتھ میں لکھ رہا ہوں اس عجلت میں گوٹ (مغزی) کی تیاری کا نقشہ پیش کرنا مشکل ہے۔ مختصر یوں سمجھ لیجئے کہ دو انگل یا دو انچ چوڑی ساٹن کی دو پٹیاں انہیں آپس میں ایک تیسری پٹی میں اندر روت کی پتلی ڈوری ڈال کر جوڑ دیجئے۔ اب دو پٹیاں دو رنگ کی ایک تیسری پٹی کے ذریعہ جڑ کر ایک ہوگی انہیں موڑ کر اُن کے دونوں کناروں پر بھی ایک دوسرے رنگ کے ساٹن ڈال دیجئے۔ اب دونوں ساٹن کی پٹیوں کے بیچ میں بھی اور دونوں کناروں پر بھی ایک دوسرے رنگ کے ساٹن کی مہین مغزی لگی ہوتی ہے۔ دونوں پٹیوں کو موڑ دیجئے اور ان کے اندر بالاپوش کنارے ڈال کر مہین سوئی سے پیوند دیجئے۔ اب بالاپوش تیار ہوگیا۔ تین گز لمبا، ڈیڑھ گز چوڑا۔ ململ کے اندر روئی چھپائے ہوئے سفید استر رنگین مہین ململ کے اندر یوں چمکتے جیسے رنگین بادلوں کے اندر سے دھوپ یا سورج کی شعاعیں چھن رہی ہیں۔ یہ بالاپوش کندھوں پر شال کی جگہ رکھی جاتی تھی ان کا حُسن چہرے کے حسن اور کپڑوں کے حسن کو دوبالا کر دیتا اور یہ

www.taemeernews.com

بالاپوش جناب برسہابرس کندھے پر رہتی شام سے شال کی طرح اوڑھی جاتی۔ اُنہیں کندھوں سے گھما کر چادر کی طرح اوڑھ کر بنگالی اور مسلمان رؤسا گھومتے پھرتے۔ آٹھ دس سال بعد اگر ان بالاپوشوں کو دھوبی کے یہاں مع روئی استر اور مغزی کے ساتھ دھلوایا جاتا تو خشک ہونے کے بعد بھی ایسی ہی لگتا کہ ابھی نیا ہی خرید کر لائے ہیں۔ کیا لوگ تھے۔ وہ لوگ جو ایسے کپڑے بنتے تھے اور کیا رنگساز تھے وہ لوگ جو کپڑے ایسا رنگتے تھے اور کیا دُھنئے تھے وہ لوگ جو دُھائی چھٹانک روئی یوں دُھنتے تھے اور کیا کاریگر تھے وہ لوگ جو مغزیاں ایسی سیتے تھے۔ اور کیا لوگ تھے وہ دھوبی جو یوں کپڑے دھوتے تھے۔ شاید ایسی ہی لوگوں کے متعلق اس قسم کے شعر کہے جاتے تھے کہ

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پچاس ساٹھ سال پہلے ایسے بالاپوش دس پندرہ روپئے سے سوسوا سو روپئے کی قیمت تک ملتے تھے۔ جنہیں اوڑھ کر غریب بھی بادشاہ نظر آنے لگتے تھے اور آج قیمتی سے قیمتی شال اوڑھ کر بادشاہ اٹھائی گیرا لگتا ہے۔

نہ بدلنے کے شواہد اور بھی ہیں کہ ۱۹۳۸ء میں جب میں اسکول کی آٹھویں جماعت کا طالب العلم تھا۔ سبزی باغ کے ایک کمرے میں کچھ دنوں کے لئے مقیم تھا۔ اسکول کی تعطیل کا انتظار تھا کہ گھر جاؤں۔ وہ گھر جس کی جلوۂ گریزاں کی تصویر جہاں خوشبو تھی میں پیش کر چکا ہوں جو اس چودھویں یا بیسویں صدی میں تعلق اور محبت کی ایسی تصویر ہے جو آج بھی دردمندوں کو رات رات بھر رلا دیتی ہے۔ تو سفر کی لذت میں تعطیل بند ہونے کا منتظر تھا۔ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہو رہا تھا۔ مسٹر عبدالعزیز مرحوم بیرسٹر اور ان کے مخلص ساتھیوں کے اخلاص اور محنت برگ و ثمر لا رہی تھی۔ مسٹر محمد علی جناح ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلم زعما اور مسلم عمائدین ملک کے ساتھ پٹنہ میں مقیم تھے۔ میں کہ کسی سیاسی تحریک سے کبھی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اور ذہنی اور فکری طور پر اس قابل بھی نہ تھا۔ مگر مجھ سے بہت چھوٹے چھوٹے طالب العلم

www.taemeernews.com

اور عوام کے بچے مسلم لیگ تحریک کی گرمی سے مجسم شعلۂ عریاں بنے ہوئے تھے۔ جھنڈیوں اور نعروں سے شہر سج رہا تھا اور گونج رہا تھا۔ یہ مسلم لیگ تحریک کی گرمی کیسی تھی؟ سچ پوچھئے تو اِس تحریک کی گرمی بنگال میں چاہیئے تھی، پنجاب میں چاہیئے تھی۔ سرحد اور سندھ میں چاہیئے تھی۔ وہی پاکستان کے خاکے میں شامل تھے وہیں حکومت بننے والی تھی جھنڈا لہرانے والا تھا۔ وہیں چراغاں ہونے والا تھا۔ وہیں زندگیاں بدلنے والی تھیں کیچلی اُترنے والی تھی اور تندرست و توانا اور تر و تازہ جسم وہیں انگڑائیاں لے کر اُٹھنے والا تھا۔ اُنہیں لقب ملنے والا تھا۔ اُنہیں اقتدار کرسی مقام اور منصب ملنے والا تھا۔ وہاں کیا ہو رہا ہے مگر پٹنہ ایسا گرم تھا جیسے وہی پاکستان کا مرکز تھا۔

www.taemeernews.com

تو میں سبزی باغ کے مکان میں تنہا پڑا تھا۔ کیوں؟ — یہ میں خود نہیں کہہ سکتا۔ یہ بات نہیں کہ میں مسلم لیگ تحریک کا مخالف تھا۔ اس وقت مخالفت، یا موافقت کی اتنی تمیز کہاں تھی، لیکن خدا جانے سیاست سے کہاں کا بیر اور کہاں کی دشمنی گھٹی میں پڑی تھی کہ گھٹی کا وہ قطرہ اب قطرے سے چشمہ، چشمے سے ندی، ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بن چکا ہے اور یہ سن کر لوگوں کو حیرت ہوگی کہ عمر کے پچپن ۵۵ سال گذر گئے جس میں ۴۴ سال تو صرف پٹنہ میں گذرے مگر میں کسی نوعیت کی کسی پارٹی کی کسی تحریک کے سیاسی جلسے میں آج تک شریک نہیں ہوا بجز ایک جلسے کے جسے آگے بیان کروں گا۔ اور جس دن مسلم لیگ سیشن کا دوسرا جلسہ شباب پر تھا اسکول بند ہوگیا تھا اور میں اپنی ماں سے ملنے تیلہاڑا جا رہا تھا۔

لیکن دوسری طرف یہ حال بھی دیکھئے کہ مسلم اسکول میں پڑھتے ہوئے میں گردنی باغ میں مقیم تھا۔ اور پٹنہ ہائی اسکول کے استاد ماسٹر نظام الدین بلخی مرحوم سے دو چار دن جغرافیہ کا سبق لیا تھا۔ انہوں نے ایک دن بلا کر کہا۔

"میاں کلیم! رضاکار بنو گے؟"

"کس کام کے لئے ماسٹر صاحب؟"

"مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو رہی ہے اور ملک کے تمام ماہرین تعلیم، اساتذہ اور ادیب تشریف لا رہے ہیں۔ اُن کی خدمت کے لئے رضاکاروں کی ضرورت ہے۔ تم تندرست جسم اور دراز قد ہو تم کو رضاکاروں کی ایک پارٹی کا افسر بنانا چاہتا ہوں۔"

ماسٹر نظام الدین صاحب مجھے پھلواٹوی کے ایک کشادہ مکان میں لائے۔ وہ مکان مسٹر اختر حسین صاحب مرحوم کا تھا جو اس وقت غالباً پٹنہ یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے (ساری باتیں حافظے سے کہہ رہا ہوں)

www.taemeernews.com

ایک دُبلے پتلے گندمی رنگ، رئیس قسم کے انسان تھے۔ صاف کرتہ پاجامہ خوش مزاج اور خوش گفتار۔ لمبی آرام کرسی پر نیم دراز بڑی شستہ اور نرم گفتگو کرتے۔ ہنس مکھ اور کشادہ مزاج نظر آئے مختصر یہ کہ مجھے رضاکاروں کی ایک ٹولی کا ذمہ دار بنایا گیا۔ بڑا سا بلّا میرے گرم کوٹ پر لگا دیا گیا۔ اور ایک صبح مہمانوں کے استقبال کے لئے ہم لوگوں کی ڈیوٹی پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر لگا دی گئی ـــــ پلیٹ فارم پر شیروانیوں میں اتنے لوگ تھے کہ اب عیدین کی نمازوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ شیروانی ایک مخصوص تہذیب کی علامت اور معیارِ شرافت تھی۔ امیروں کو چھوڑیئے۔ کالر پٹا ہوا ہے، آستین نکلی ہوئی ہے، بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔ دامن سکڑا ہوا ہے مگر شیروانی ہے۔ شیروانی کے بغیر اچھائی کا تصور کہاں؟ آپ کو شاید حیرت ہو... "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی"۔ میں عید کی صبح تیلہاڑہ کی عیدگاہ کے دروازے کے سامنے پانکڑ کی جڑ پر بیٹھے ہوئے علی الصباح تہدو میاں کی شہنائی کا ذکر پڑھا ہوگا۔ وہ شہنائی بجاتے تھے۔ میاں جی کے میاں جی، بجنیا کے بجنیا تھے.... وہ پیشے کے اعتبار سے اس سے بھی نیچے تھے ان کا خاندان پیشے کے اعتبار سے بہتر تھا جس کا کام پاخانہ صاف کرنا ہے ـــــ اور میں نے ایک دن حکیم سید شاہ بشیرالدین صاحب کو جب وہ میرے یہاں آئے ہوئے تھے تہدو میاں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ۔ "تہدو میاں آپ حلال خور ہیں۔ بہت سے نام کے شریف حرام خوروں کے درمیان شرفِ امتیاز ہیں"۔ وہ بھی عید کے دن شیروانی پہنا کرتے تھے اور شہنائی بجایا کرتے تھے ـــــ ہائے رے وقت تجھے کیا ہو گیا؟ ابھی تو سامنے تھا۔ یکایک تجھے آسمان کھا گیا، زمین نگل گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ تو تھا ہی نہیں۔ حالانکہ تو تھا اور جس کے سامنے کہہ میں گواہی دینے کو تیار ہوں کہ بہت دن نہیں گذرے کہ تو شیروانی اور ٹوپی کے ساتھ موجود تھا۔

جی ہاں! تو پلیٹ فارم شیروانیوں اور ترکی سیاہ مخملی ٹوپیوں سے تیلہاڑہ کی عیدگاہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے بھی گرم کوٹ اتار کر شیروانی پہن لی تھی سادہ اور سینے پر گول چوڑا رضاکاری بلّا لگا لیا تھا اور تمام شیروانی والوں سے آگے تھا۔ جن میں وہ بھی تھے جنھیں میں اس وقت پہچان رہا تھا اور وہ بھی جنھیں بعد میں پہچانا۔

اختر حسین صاحب صدر مجلسِ استقبالیہ کا بیج لگائے ہوئے تھے۔ ماسٹر نظام الدین بلخی کی

www.taemeernews.com

کالی شیروانی ان کے گھٹنوں سے کچھ نیچے آرہی تھی۔ کوتاہ قامتی پر دراز شیروانی پہنے اور شیروانی پر رضاکاروں کے جنرل کمانڈنگ آفیسر کا بیج لگائے تقریباً پچاس سال کی عمر میں بلخی صاحب پورے پلیٹ فارم پر سب سے زیادہ تیز سب سے زیادہ مستعد اور سب سے زیادہ چوکنا نظر آرہے تھے۔ وہ واقعی جنرل کمانڈنگ آفیسر تھے۔ تیز چلتے مگر ٹھہر ٹھہر کر۔ تیز آواز میں بولتے۔ دُبلے پتلے، سینہ اندر گھسا ہوا۔ چھوٹی آنکھیں بھاری پپوٹوں کے نیچے پوری کھل نہیں پاتیں مگر ادھ کھلی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لیتے جو دوسرے پوری آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اور جتنا دیکھ سکتے تھے اس سے بھی زیادہ وہ سمجھ لیتے تھے۔ ہم رضاکاروں کو وہ بڑی پھرتی سے وہ مختلف مقامات پر یوں کھڑا کر رہے تھے جیسے میدانِ جنگ میں مختلف محاذ پر چابک دستی اور حاضر دماغی کے ساتھ فوجوں کے دستے متعین کیے جاتے ہیں۔ ان کا آرڈر مختصر ہوتا مگر جامع ہوتا اور قابلِ قبول ہوتا اور یہ بات ظاہر ہوتی کہ مسلمان ہر محاذ پر فٹ ہے۔ وہ کم سخن تھے، کم آمیز تھے، اسکول ٹیچر تھے اور ہر موضوع پڑھا سکتے تھے اور پڑھائے تھے۔ ادیب تھے، شاعر تھے، معاملہ فہم تھے، سپاہی تھے اور آزمودہ کار جنرل تھے جس کا مظاہرہ پلیٹ فارم پر ہو رہا تھا۔

کلکتہ سے دہلی اکسپریس آیا۔ جہاں وہ کھڑے وہیں اپنی بغل میں انہوں نے مجھے کھڑا کر رکھا تھا۔ اور ٹھیک ان کے سامنے فرسٹ کلاس کا ایک کمپارٹمنٹ لگا۔۔۔۔ اس کا دروازہ کھلا اور سفید بُراق شیروانی، سفید خالتہ پاجامہ اور سُرخ ترکی ٹوپی میں ایک حبشی طویل عریض جسیم حبشی مسکراتا ہوا کھڑا تھا۔ اور پورا پلیٹ فارم ایک عجیب نعرے سے گونج گیا۔۔۔۔ شیرِ بنگال زندہ باد۔۔۔۔ شیرِ بنگال زندہ باد۔۔۔ شیرِ بنگال زندہ باد۔۔۔۔ اور وہ مسکراتا ہوا حبشی بے انتہا سنجیدہ ہو گیا۔ اور سیاہی کے باوجود جوش اور جذبے سے چہرہ اتنا سُرخ ہو گیا کہ جیسے اب خون پھوٹ کر نکل پڑے گا۔۔۔۔ خون نہیں نکلا مگر آنکھوں سے کئی بوند آنسو کی نکل پڑی۔ جسے بغیر پونچھے ہوئے وہ شخص پلیٹ فارم پر کود گیا۔ اور سب سے پہلے ماسٹر نظام الدین بلخی صاحب سے اور پھر مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور پھر گلے ملنے کا سلسلہ دو تین منٹ تک رہا ـــــ یہ تھے مسٹر ابوالقاسم فضل الحق وزیر تعلیم بنگال۔ اور جب مسٹر اے۔ کے فضل الحق پلیٹ فارم پر اسٹیشن سے باہر کی طرف جانے لگے تو اپنی قامت جسامت اور سن و سال کے باوجود

www.taemeernews.com

اتنے تیز رفتار تھے کہ ان کے میزبانوں کو تقریباً دوڑنا پڑتا تھا۔ جیسے ان کے سامنے بہت کام ہوں اور سارا کام جلدی ختم کرنا چاہتے ہوں ؎

کام دنیا میں تھے بہت، پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

پھر مغرب سے گاڑی آئی۔ اور ایک ہی فرسٹ کلاس ڈبے سے دو حضرات برآمد ہوئے۔ — ایک صاحب ترکی ٹوپی پہنے ..... میری تمام تحریروں میں جب کسی کا ذکر آتا ہے تو اکثر ترکی ٹوپی بھی سامنے آجاتی ہے۔ آج کی نسل میں بہت سے جوانوں نے شاید ترکی ٹوپی کا نام بھی نہیں سنا ہو۔ اور ان سے زیادہ جوانوں کی تعداد ایسی ہوگی جنہوں نے ترکی ٹوپی دیکھی نہیں ہوگی۔ یہ اُس وقت کی کلاہ ہے جب خلافت قائم ہوئی تھی، اور خلافت ٹوٹنے ختم ہونے کے بعد بھی بہت دنوں تک رہی۔ اور ہندوستانی آزادی کی ایک ضمنی تحریک ۔ تحریکِ خلافت ۔ میں تو یہ تحریکی علامت بن گئی تھی۔ جب مولانا شوکت علی اور محمد علی مرحوم و مغفور ترکی ٹوپی میں چاند تارا کا نقرئی مونوگرام بھی لگاتے تھے۔ یہ کلاہِ افتخار تھی، کلاہِ امتیاز تھی یہ بانکپن کی علامت بھی تھی۔ کج کلاہی کی اصطلاح اس نے عام کی تھی۔ یہ ایک وضعِ مردانہ بھی تھی اور وضعِ مومنانہ بھی۔ اس ٹوپی نے جینے کا سلیقہ بھی نکالا تھا اور مرنے کی ادا بھی ایجاد کی تھی۔ یہی جنرل عثمان کے سر پر تھی اور جنرل انور بیگ کے مرنے تک زیبِ سر تھی جسے مصطفےٰ کمال پاشا نے ترک کیا۔ جس وقت مصطفےٰ کمال انگریزوں کو سرزمین ترک سے نکالنے کی جنگ کر رہے تھے اس وقت تک یہ ٹوپی ان کے سر پر تھی اور اقبال نے اسی سے "طلوعِ اسلام" کا تصور لیا اور نظم لکھی اور کہا ؎

افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

اور کہا کہ

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اور بشارت دی کہ

خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

www.taemeernews.com

اور متنبہ کیا کہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور جو از نکالا کہ

جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

یہ سب ترکی ٹوپی سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ ترکی ٹوپی نے اور ترکی ٹوپی کے اندر والی روایت اور عقائد نے جب، سرزمین ترکی سے انگریزوں کو نکال دیا تو پھر اسے بھی ترکی سے نکال دیا گیا۔ محفل میں ہماری ضرورت رہ کیا گئی ؎

اب سنورنا تجھکو اے گیسوئے یار آ ہی گیا

اور جو انگریز قوم انور بیگ کی ترکی ٹوپی کی دشمن تھی۔ اس انگریز قوم نے اپنے ابتدائی دشمن مصطفےٰ کمال کے سر پر ہیٹ رکھ کر دشمن کو دوست بنالیا اور گلے سے لگالیا۔ اور ترکی میں ترکی ٹوپی نے جتنا کچھ سنوارا تھا ایک ٹوپی کے بدل جانے سے سب کچھ بدل گیا اور مسلمانوں کے نکل جانے سے اسپین کی جو پوزیشن ہوئی وہی ترکی ٹوپی کے نکل جانے سے ترکی کی ہوگی۔ نہ اسپین کی کوئی اہمیت ہے نہ ترکی کی ـــــ اتنی دور کیوں جائیے ـــــ پینتس چالیس سال پہلے کے دیکھنے والے جو ہوں گے انہوں نے دیکھا ہوگا کہ پٹنہ ججی عدالت میں صف اول کے بنچ پر صرف سیاہ شیروانی اور ترکی ٹوپی کی قطار ہوتی تھی۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب وکیل۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب وکیل۔ مولوی شاہ رشید اللہ صاحب وکیل۔ مولوی امتیاز کریم صاحب وکیل۔ مولوی بشارت کریم صاحب وکیل۔ مولوی سید محمد صاحب وکیل اور کتنے جونیر سینیر وکیل۔ بس معلوم ہوتا تھا کہ کورٹ کے سامنے گلِ لالہ ہی کی بہار ہے اور انگریز جج سے گرما گرم بحث ہوتی رہتی اور بحث کی ٹھیک شدت کی گرما گرمی میں مولوی عبدالحفیظ صاحب یا شاہ رشید اللہ صاحب جیب سے گھڑی نکال کر دیکھتے اور کہتے کہ :

"Sir, now this is the time of our afternoon prayer."

اور جج صاحب یہ کہتے ہوئے فائل بند کر دیتے :

www.taemeernews.com

"O, yes, so then we will resume
the argument after your prayer."

یہ اسی پٹنہ میں ہوتا تھا۔ اور یہی نہیں بانکی پور لان کے قریب سے بڑی دوکانوں کی طرف دیکھنا شروع کیجیے تو عبدالحق اینڈ سنس اور احمد علی اینڈ سنس۔ مکرم علی اینڈ سنس اور بشیر حسن اینڈ سنس اور قطب الدین اینڈ سنس اور ابراہیم بمبئی والا اینڈ سنس اور خدا جانے اور کون اینڈ سنس دیکھتے جائیے۔ ترکی ٹوپی اور شیروانی۔ ترکی ٹوپی اور شیروانی۔ اب دیکھئے تو موڈرن ٹیلرنگ اور لیبرٹی ٹیلرنگ اور کون واچ اور کون واچ نہ نام آشنا نہ کام آشنا نہ صورت آشنا نہ وضع آشنا، سب ناآشنا۔

معاف کیجئے میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ جی ہاں تو ایک ہی فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے دو صاحب برآمد ہوئے۔ ایک صاحب گداز بدن قدرے دراز قامت بہت ہلکی سی بلکہ غیر نمایاں توند، مہین لکیروں کی ہلکے رنگ کی شیروانی علی گڈھ تراش پاجامہ، ترکی ٹوپی، بہت ہلکی خشخشی ڈاڑھی، گندمی رنگ چہرہ کچھ سنجیدہ کچھ متبسم۔ ہاتھ میں چھڑی پاؤں میں سیاہ شُو۔ لوگوں نے نعرے نہیں لگائے مگر احترام سے جُھک گئے۔ اور جُھک جُھک کر اظہارِ عقیدت کی آمیزش سے مصافحہ کرنے لگے۔

یہ تھے جناب ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ مشہور عالم ریاضی داں، علی گڈھ یونیورسٹی کے معزز استاد۔ میں نے چہرہ دیکھا، مصافحہ کیا اور ان کے متعلق جو ایک بات سنی تھی۔ انہماک کی اور غفلت اور بے خودی کی یا اپنے فن میں استغراق کی وہ ان پر جچتی نظر نہیں آئی کہ کبھی کبھی سر ضیاء الدین صاحب کو یوں دیکھا گیا کہ باہر سے اپنے گھر آئے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ صوفے پر چھڑی رکھ دی اور خود چھڑی بن کر کونے میں کھڑے ہو گئے۔ سر ضیاء الدین بہت ہشیار مگر سنجیدہ۔ خاموش مگر ذہین نظر آئے۔ بولتے کم تھے مگر اندازہ ہوتا تھا کہ بہت کچھ بولنے کے لئے رکھتے ہیں مگر ان کا کام بغیر بولے چل جاتا ہے یا بولنے کا کام کسی اور ذریعہ سے لے لیتے ہیں۔ کچھ آنکھیں کام کرتی ہوں گی، کچھ انگلیاں اور کچھ اشارے —— دوسرے صاحب برآمد ہوئے۔

www.taemeernews.com

میں نے بہت آدمی دیکھے چھوٹے بھی بڑے بھی۔ معمولی بھی اعلیٰ بھی۔ دنیا کے ماہر بھی اور دین کے اُستاد بھی۔ بے وضع بھی اور وضع دار بھی۔ ہنس مکھ بھی سنجیدہ بھی۔ مشہور بھی گمنام بھی۔ نرم دل بھی سنگ دل بھی۔ ظالم بھی مظلوم بھی۔ مگر کسی کو دیکھ کر جو تاثر قلب پر یا ذہن پر ہوا۔ اُسے سمجھنے اور اسی وقت یا بعد میں ظاہر کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ لیکن میں نے اُس شخص کو پہلی مرتبہ اُس دن دیکھا۔ اور دو روز تک دیکھتا رہا۔ اور پوری کانفرنس میں اکثر اور دیر تک قریب رہا ضرورتاً اور بے ضرورت بھی۔ دوسروں کے کہنے سے بھی اور خود اپنے جی کے تقاضے سے بھی۔ خوب دیکھا۔ جی بھر کے دیکھا۔ دیکھنے کی بہت خواہش ہوتی رہی اور وہ خواہش پوری بھی ہوتی رہی۔ اور پھر اکثر انہیں تصور کی آنکھوں سے دیکھتا رہا' یاد کرتا رہا۔ ان کے متعلق کبھی کبھی کہیں کہیں کوئی تحریر پڑھتا رہا۔ مضامین پڑھتا رہا۔ مگر اب تک وہ سمجھ میں اتنا نہیں آسکے جتنا اور لوگ آگئے اور آتے رہے ـــــ وہ شخص برآمد ہوا۔ اتنا لمبا کہ شاید ریل کے ڈبے کے دروازے کے قریب اُسے جھکنا پڑا۔ چھ فٹ سے کچھ زیادہ ہی قد ہوگا اس پر اونچی عنابی ترکی ٹوپی اور ہلکے زرد رنگ کی زمین پر عنابی بوٹی دار کسی قیمتی کپڑے کی شیروانی' چھوٹی مہری کا سفید حیدرآبادی پاجامہ۔ بہت چمک دار اور بڑا لمبا بادامی شو۔ سیاہ خوبصورت داڑھی' گندمی رنگ' آنکھیں بڑی اور سیاہ مگر فکر کی شکنیں تمام پپوٹوں پر پڑی ہوئیں جن سے بڑی آنکھیں بھی چھوٹی معلوم ہوتی تھیں پیشانی بہت کشادہ۔ اتنی کشادہ کہ ترکی ٹوپی پہننے کے بعد بھی چار پانچ انگل پیشانی کھلی ہوئی جس پر لمبی شکنیں چھائی ہوئیں۔ ہونٹ لمبے لیکن نہ بہت موٹے نہ بہت پتلے۔ گال ہموار مجموعی حیثیت سے چہرہ بہت بارعب کلاسکی اور تاریخی مدبروں اور فوجی جنرلوں جیسا۔ دراز قامتی کے سبب قد ذرا جھکا ہوا' ہاتھ میں خوبصورت چھڑی۔ خاموش لب' خاموش آنکھیں جن میں سینکڑوں کہانیاں چھپی نظر آئیں۔ عشق کی کہانیاں' درد کی کہانیاں۔ اپنی کہانیاں' دوسروں کی کہانیاں۔ انفرادی کہانیاں اجتماعی کہانیاں۔ بس چہرہ کہانیوں کی کتاب یا کتابوں کی دوکان نظر آتا تھا ـــــ چھڑی پر دباؤ ڈال کر بہت سنبھل کر مگر تیز چلتے ہوئے۔ کبھی سر جھکائے کبھی سر اُٹھائے۔ جیسے ایک سن رسیدہ' جہاں دیدہ' سرد و گرم چشیدہ بہت کچھ کمایا ہوا اور بہت کچھ لٹایا ہوا انسان اور لٹانے کے بعد

www.taemeernews.com

بھی بہت کچھ رکھنے والا۔ اس بہت کچھ میں سے شاید اب کوئی نظر نہ آتا ہو۔ جیسے جلوۂ طور تو موجود ہو موسیٰ ہی نہ ہو۔ یہ تھے ــــ خان بہادر نواب حبیب الرحمٰن خان شیروانی ــــ مدبر بھی رئیس بھی ادیب بھی، ادیب نواز بھی۔ اتنا تو سب لوگ جانتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تھے جو ممکن ہے لوگ جانتے ہوں نہ جانتے ہوں۔ میں نے جتنا بھی جانا اسے اتنا ہی سمجھا سکتا ہوں جتنا اوپر کی سطروں میں سمجھایا۔ جی کہتا ہے وہ دو روز کی ملاقات بہت کچھ سمجھا گئی ہے۔ مگر کیا سمجھا گئی ہے یہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ شیروانی صاحب کو دیکھ کر یہ میرا تاثر ہے جسے تھوڑی بہت ٹوٹی پھوٹی زبان اب دے سکا ہوں۔ اس وقت تو وہ مجھے ایک بہت حسین اور بہت دلچسپ پہیلی جس کا لطف تھوڑا سمجھ لینے میں اور بہت کچھ بے سمجھا چھوڑ دینے میں ہے۔ یہ باتیں آج کی سائنسی دور میں عجیب اور بے معنی معلوم ہوں گی۔ مگر میاں یہ معنویت تم کیا سمجھو گے۔ بس گنتے رہو، جوڑتے رہو۔ گھٹاتے رہو ضرب دیتے رہو تقسیم کرتے رہو تمہاری دنیا بس یہی چار خانوں میں ہے۔ زندگی کی بھول بھلیوں میں مت داخل ہو ورنہ گم ہو جاؤ گے ــــ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ ــــ یہ مقامِ شوق ہے۔ یہ قدسیوں کے بس کا نہیں ہے۔ تمہارے بس کا کیا ہوگا۔

نواب صفدر یار جنگ، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور مسٹر فضل الحق کا قیام کہاں رہا یہ یاد نہیں ہے۔ وھیلر سینٹ ہال میں کانفرنس ہوئی۔ یہ کانفرنس آج جیسی کانفرنس نہیں تھی جہاں بچے بھی ہیں نوجوان بھی ہیں۔ ہنگامے بھی ہیں شور بھی ہیں، تالیاں بھی ہیں چیخیں بھی ہیں۔ سمجھ دار لوگوں کا مجمع تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ تقریریں بھی تھیں۔ مجمع سے بھی کوئی رائے کبھی مانگ لی جاتی تھی جو بڑی شائستگی سے دی جاتی تھی۔ مخالفت اور موافقت میں ہاتھ بھی اٹھائے جاتے تھے۔ ہاتھ گنے جاتے تھے۔ فیصلے ہوتے تھے۔ تردید ہوتی تھی تائید ہوتی تھی مخالفت بھی موافقت بھی۔ تقریریں سب نہیں کر رہے تھے۔ آئے ہوئے معززین اور ماہرین سب مائک پر نہیں آ رہے تھے۔ کچھ بیرون پردہ تھے دونوں کام کر رہے تھے۔ بیرون پردہ والے بول رہے تھے۔ تقریریں کر رہے تھے۔ پس پردہ والے مواد مہیا کر رہے تھے۔ فکر، دانش مندی، دور اندیشی، معاملہ فہمی، رمز شناسی کا ذخیرہ پس پردہ زیادہ تھا۔ سامنے والوں کی زبان تھی، اندازِ بیان تھا، طرزِ پیش کش تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی اہمیت سمجھ

www.taemeernews.com

رہے تھے ۔ سمجھنے والے تھے، قدر کرنے والے تھے ۔ اپنے اپنے دائرے میں اپنی اپنی حدود میں دونوں تھے کوئی باہر نہیں آرہا تھا ۔ یہ حسن، یہ سلیقہ پہلے تھا، اب کہاں ؟ اب نہ کوئی دائرہ ہے نہ کوئی حد ہے ۔ سب حد سے باہر ہیں ۔

سب سے پہلے میں نے دیکھا کہ ہمارے کمانڈنگ افسر یا کمانڈر جنرل ماسٹر نظام الدین بلخی صاحب نے استقبالیہ نظم پڑھی ۔ وہ شاعر تھے یہ میں جانتا تھا ۔ داغ دہلوی کے شاگرد ہیں یہ بھی جانتا تھا ۔ کیسے شاعر ہیں کیسا کہتے ہیں کیسا پڑھتے ہیں یہ نہیں جانتا تھا ۔ کیسے شاعر کیسا کہتے ہیں یہ تو پرکھنے اور جانچنے کی عمر ہی نہ تھی ۔ پسند کرنے کی عمر تھی ۔ کسی حد تک داد دینے کا سلیقہ بھی تھا ۔ اس سے پہلے بھی مشاعرہ سُن چکا تھا ۔ اچھے بُرے کا کچھ اندازہ بھی کر سکا تھا ۔ مگر کسوٹی دوسروں کی تھی اپنی نہیں تھی بہرکیف ماسٹر نظام الدین بلخی صاحب مائک پر کھڑے تھے ۔ منحنی جسم میں تیز اور موثر آواز، آواز میں جوش، جذبہ اور فکر کی بھرپور آمیزش کوئی نظم تھی ۔ جو موقع محل اور حالات سے مناسبت رکھتی تھی ۔ خدا جانے ماسٹر صاحب کا کلام شائع ہوا یا نہیں، شائع ہوا تو وہ نظم ہے یا نہیں ۔

گریباں کی خبر رکھتے ہو کچھ اے چاک دامانو ؟

یہی بحر تھی، یہی موضوع ۔ وہ بھرپور جوش میں تھے اور عالمِ جوش میں اس سے بے خبر تھے کہ ان کے سامعین کس رُخ پر ہیں ۔ وہ مائک پر پڑھتے پڑھتے شمال جنوب مشرق مغرب ہر طرف گھوم جاتے تھے ۔ مائک کبھی سامنے رہتا کبھی دائیں بازو پر کبھی بائیں بازو پر اور کبھی بالکل پشت پر ہو جاتا ۔ جوش اور جذبے سے کبھی ان کی آواز بھرّا جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ اب رو پڑیں گے ۔

مجھے کسی کی تقریر یاد نہیں ۔ تقریریں علمی تھیں جن کا موضوع عموماً زبان تھا ۔ چونکہ کسی نہ کسی نوعیت سے سیاست کی آمیزش تھی اس لئے میری دلچسپی کم تھی ۔ ہاں ایک بات یاد ہے اور شاید وہ بات یاد رکھنے کی تھی ۔ ممکن ہے کسی کو یاد ہو یا نہ ہو ۔ مسٹر فضل الحق بولنے کو مائک پر آئے ۔ تالیاں بجیں ۔ تالیوں سے وہ متاثر نہیں ہوئے ۔ بنگالی آدمی گرچہ اُردو داں تھے اور صاف اردو زبان میں تقریر کر رہے تھے لیکن بنگال کا لہجہ صاف نمایاں تھا ۔ تقریر کرتے کرتے انہوں نے اپنی ترکی ٹوپی سر سے اُتار کر ہاتھ میں لے لی ۔ چہرے پر گہری سنجیدگی کے ساتھ جوش بھی تھا اور انہوں نے کہا :

www.taemeernews.com

"لوگ کہتے ہیں اردو ہندوستان کی زبان نہیں ہے ؟ یہ ہندوستانی
مسلمانوں کی مادری زبان کہاں ہے ؟ میں کہتا ہوں یہ ہندوستان کی زبان ہے
ہماری زبان ہے ۔ ہماری مادری زبان نہ سہی، ہماری پدری زبان تو ہے ۔"

اور جملہ پورا کرتے ہوئے اپنی ترکی ٹوپی زور سے تقریر والے ڈیسک پر پٹک دیا۔ اور سارے مجمع میں اس جملے نے سناٹا پیدا کر دیا۔ اور اس کے بعد "خوب خوب" اور "سبحان اللہ" سے ہال گونج گیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اس سن و سال میں بھی سیماب پا تھے وہ ڈائس پر کم بیٹھتے مشوروں میں، گفتگو میں شامل رہتے مگر تقریروں کے وقت وہ اسٹیج پر کم بیٹھتے۔ مجمع میں، ہال میں، تنہا ہر جگہ وہ نمایاں رہتے۔ اپنی دراز قامتی سے، اپنی منفرد وضع قطع سے، اپنی کچھ جھکی کچھ سیدھی گردن سے، متفکر چہرے بشرے سے، کبھی سمٹی کبھی پھیلی آنکھوں سے اور اپنی جھومتی ہوئی چال سے وہ لوگوں کو بہت جلد متوجہ کر لیتے۔ تقریر کے دوران وہ اکثر دھیلر سینٹ ہال کے باہر وسیع برآمدے میں چھڑی پر ٹیک لیتے ہوئے خاموش چہل قدمی کرتے رہتے کبھی کبھی کسی سے باتیں کرتے مگر بیشتر اور اکثر خاموش رہتے۔ میں بھی اکثر ان کے پیچھے پیچھے چہل قدمی کے لئے شامل رہتا رضاکار کی حیثیت سے ـــــ ممکن ہے انہیں کوئی ضرورت ہو۔ وہ کوئی حکم کریں۔ کوئی خدمت چاہیں۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں ان میں کوئی خاص کشش پاتا تھا۔ جیسے وہ میرے گھر کے میرے خاندان کے ہوں۔ مجھے جانتے ہوں پہچانتے ہوں۔ کوئی چیز ہم میں ان میں مشترک ہو۔ ان کی کم سخنی سب سے زیادہ کشش کا سبب تھی ـــــ اس چیز نے مجھے چھیڑا۔ مجھے بے تاب کیا اور میں نے ان کے پیچھے چلتے چلتے ان کے قریب ہو کر ایک بار پوچھ لیا۔

"حضور! آپ بہت خاموش رہتے ہیں کیوں ؟"

وہ مجھ سے بے نیاز تھے، بے خبر تھے، بے پروا تھے۔ لیکن اس سوال نے انہیں ٹھٹکا دیا، اور وہ بالکل ٹھہر کر میرا چہرہ دیکھنے لگے جیسے انہیں بہت تعجب ہوا ہو کہ ایک لڑکے نے ان سے اتنا سنجیدہ سوال کر دیا ؟ ـــــ پھر میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کی آنکھیں دیکھیں جو پھیل گئی تھیں جیسے سانپ اپنی کچلی سے نکل آیا ہو ـــــ پھر ان کی سمندر کی سی گہری اتھاہ آنکھوں میں ایک موج

www.taemeernews.com

اُٹھی ـــــ فراست، کی، پہچان کی، ہم آہنگی کی، قربت، کی ـــــ وہ چند سکنڈ دیکھتے رہے۔ اس طرح جس طرح کوئی نجومی کسی بند کتاب کے اندر کی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو ـــــ پھر عجیب بات بول گئے۔

"جان لوگے ـــ جان لوگے ـــ میاں جان لوگے وقت آنے دو"

اور میں تو کتابیں کافی پڑھ چکا تھا مجھے ایک لطیفہ کی کتاب یاد آگئی جس میں ایک جھکے ہوئے بوڑھے سے چند شریر لڑکوں نے ٹھٹھول کرتے ہوئے مسخرا پن سے پوچھا تھا کہ

"بڑے میاں، یہ کمان کتنے کو خریدی ہے؟"

اور اس نے برجستہ جواب دیا تھا کہ

"میاں وقت آنے دو مفت مل جائے گی۔"

وقت آیا تو میں نے ان کی اور اپنی خاموشی کا کچھ راز پالیا ـــــ مجھے تو خیر وقت نے آکر بتایا۔ ـــــ وقت سے پہلے ان کو کس نے بتا دیا؟ ـــــ میں نے ایک عمر گذاری۔ منزلوں سے گذرا تو ایک بات پائی جو ایک زندگی سے آئی لیکن اس آنے والی زندگی کے قدموں کی چاپ شاید شیروانی صاحب نے پہلے سن لی۔ کیا واقعی وہ کوئی بزرگ تھے؟ ـــــ مولانا ابوالکلام آزاد نے زمانہ قید و بند میں اپنا غبار خاطر نکالا ـــــ لیکن نکالا کس پر؟ ـــــ ہزاروں پڑے تھے۔ اہلِ ذوق اہل ادب اہل فکر اہل سخن۔ ـــــ یہ "غبار خاطر" حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام کیوں نکلا ـــــ بس ـــــ دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے ـــــ دیوانہ ہی دیوانے کو پہچانتا بھی ہے۔

میر تقی میرؔ صاحب نے اپنی سوانح "ذکر میر" میں لکھا ہے کہ ان کے والد میر علی تقی۔ جو بڑے خدا رسیدہ بزرگ درویش اور صوفی تھے۔ ایک روز جب میرؔ سات آٹھ سال کے تھے میرؔ صاحب کا بازو پکڑ کر کچھ ویران کا چہرہ دیکھتے رہے پھر کہنے لگے کہ ـــــ "بیٹا یہ کیسی چمک ہے جو تیری پیشانی سے نمایاں ہے۔ اور یہ کیسی چنگاریاں ہیں جو تیری آنکھوں سے نکل رہی ہیں اور یہ کیسی حرارت ہے جو تیری سانسوں سے خارج ہو رہی ہے"؟ حالانکہ یہی علی متقی کبھی اپنے بیٹے میرؔ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کرتے تھے کہ بیٹا عشق کیا کر، عشق کے بغیر زندگی نامکمل اور ناقص اور بے لذت ہے۔

زندگی کام کی بنتی نہیں بے سوز جگر ❖ شمع بننے کی تمنا ہو تو پروانہ بنے

www.taemeernews.com

تیلہاڑا میں اطہر نا کی دوسری شادی موضع کرجرا بہار شریف کے قریب ایک سادات کی بستی میں ہوئی تھی۔ اُن کے بڑے سالے سید سہیل احمد بڑے لاابالی انسان تھے۔ تعلیم گھر کی کچھ اسکول کی تھی۔ زندگی بزرگوں کی صحبتوں میں گذری اس لئے تعلیم سے زیادہ انہیں عملی تربیت حاصل ہوئی تھی۔ کتابوں کا مطالعہ اور بڑے لوگوں کی صحبت اُن کی مخصوص عادتیں تھیں ۔ لیکن بڑے لاپروا آدمی تھے۔ سیاہ فام ناک نقشہ بہت بھدا۔ منھ میں چیچک کے داغ، دبلے پتلے۔ لیکن اللہ جانے کدل کتنا حسین تھا۔ ریشم جیسا، مخمل جیسا، اطلس اور تنزیب جیسا۔ حریر اور پرنیاں جیسا۔ چمبیلی کے پھول جیسا نرم نازک لطیف گداز۔ ایسا لگتا تھا کہ گوشت کا لوتھڑا ہی نہیں بس کوئی پگھلی ہوئی رقیق چیز ہے جس کی ڈھلک معلوم ہوتی ہے۔ اور جو پگھلا ہوا مادہ بار بار حلق تک آجاتا ہو اور واپس جاتا ہوا۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ بس تنہا رہتے تھے۔ کم لوگوں سے ملتے تھے۔ کم بولتے تھے اور بہت ہنستے تھے لیکن آواز سے نہیں۔ بولی بھی دھیمی آواز والی اور ہنسی تو بالکل بے آواز والی اور کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا تھا کہ ہنس رہے ہیں یا رو رہے ہیں۔ روتے تو انہیں کبھی نہیں دیکھا مگر ان کی ہر بات رونے ایسی تھی۔ شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق اور شاید زندگی میں یہی ایک ذوق تھا جب کسی کی زبان سے کوئی نیا اور اچھا شعر سنتے تو یوں جھوم جاتے جیسے سجدہ میں جانے والے ہیں اور حلق سے ایسی آواز نکلتی جیسے دم گھٹ رہا ہو۔ کبھی غصہ نہیں کبھی تیز آواز نہیں کبھی کسی کا ذکر بہ بدی نہیں تو کہنے کا یہ مطلب ہے کہ سہیل صاحب اکثر بہسی ضلع موتی پور میں ندی سے سیپ نکلوانے اور اس سے بٹن بنوا کر سپلائی کا کام کرتے تھے بہت کم کہیں آتے تیلہاڑہ آتے تو شاہ بدرالدین عرف دمو ماموں کی طرح میرے ساتھ ساتھ سائے کی طرح رہتے۔ بڑی آرزو سے مجھے کوئی غزل سنانے کو کہتے۔ غالب کی، میر کی، شاد کی۔ اور غزل سنتے ہوئے بس میرا منہ دیکھتے رہتے اور سننے کے بعد بھی دیکھتے رہتے۔ اور پھر کہہ اُٹھتے کہ تمہاری آنکھوں میں غزل پڑھتے ہو تو کیا چیز تیرنے لگتی ہے اور تمہاری آواز میں کیا چیز گونجتی رہتی ہے۔ کوئی اجنبی جیسی چیز۔ جیسے اُفق میں بادلوں کے بیچ کوئی چیز چھپی ہوئی ہو جھانکنے کی کوشش کرتی ہو لیکن بادل اسے جھانکنے نہ دیتے ہوں۔ بادل چھٹنے کا انتظار ہو۔ کب بادل چھٹے اور کب وہ چیز سامنے آجائے ۔ وہ اپنے انداز میں بات کہتے۔ میں اپنے انداز میں کہہ رہا ہوں۔۔۔

www.taemeernews.com

کبھی کبھی وہ غزل سنتے سنتے سر کو زمین پر ٹپک دیتے اور دونوں ہاتھوں کے مکّے زمین پر مارتے رہتے جیسے کوئی شخص نہایت سخت قسم کے درد کی اذیت میں ہو۔ اور ٹھیک اسی قسم کی حرکت مجھ سے اس دن سرزد ہوگئی جس دن تیلہاڑہ کے حادثے کی اطلاع مل کر میں گم سم ہوگیا تھا اور حکیم سید محمد صالح صاحب کو دیکھ کر دل کا لاوا پھوٹ گیا تھا ـــــ سہیل صاحب کو کوئی چیز میری آنکھوں میں نظر آتی جو خود آنکھ والے کے علم میں نہ تھا۔ سوائے آنسوؤں کے جن کی جگہ ہی آنکھیں ہیں۔ جن کا گھر ہی آنکھیں ہیں۔ یہ البتہ ہوتا تھا کہ گھر سے لوگ وقت پر باہر آتے ہیں۔ آنسو آنے کے لئے وقت بے وقت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ممکن ہے سہیل صاحب کو میری آنکھوں میں وہ آنسو بھی کہیں بے نام گوشے میں چمکتے نظر آئے ہوں جو بعد میں غزل بننے والے تھے۔

جو قطرے لہو کے نہ آنکھوں سے ڈھلکے
بنے ہیں وہ اشعار میری غزل کے

اکثر ایسی آنکھ والے ہوتے ہیں۔ ان کے آنکھ والا ہونے کا ایک ثبوت اور بھی ملا تھا ـــــ جب تیلہاڑہ میں میرے والد کا انتقال ہوا اس روز بھی وہ موجود تھے۔ اس زمانے میں وہ سیپ کے بٹنوں کی سپلائی کا کام چھوڑ کر مدراس کے کسی کپڑے کی فیکٹری کے ایجنٹ بن گئے تھے۔ چار پانچ روز والد پر جو ہلکے نزع کی کیفیت رہی ان دنوں میں تو بہت اطمینان اور ہمت سے میں ان کی تیمارداری میں لگا رہا۔ جیسا کہ میں نے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں لکھا ہے۔ جب بارہ بجے شب میں والد کا وصال ہوگیا۔ تب مجھ پر گریہ کا غلبہ ہوا۔ سہیل صاحب میرا بازو پکڑ کر اپنے یہاں لے گئے۔ سمجھاتے رہے، دلاسا دیتے رہے۔ عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں دنیا کے فانی ہونے کی توضیح کرتے رہے اور

غم کو خوشی بنا کوئی پہلو نکال کے

پر عمل کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ پھر اپنے پلنگ کے قریب چوکی پر لٹا کر اپنا بکس کھولا۔ کپڑوں کے سیمپل کے چھوٹے چھوٹے گتے بنے ہوئے تھے دکھاتے رہے شرٹنگ کے سوٹنگ کے شیروانی کے ـــ اور آخر میں کہا۔ میاں پسند کرو۔ آخر تو خریدنا ہی ہے جلد ہی تمہاری شادی ہوگی ـــــ اور مجھے کچھ غصہ اور کچھ حیرت ہوئی کہ ابھی والد کا انتقال ہوا ہے ابھی شادی کی بات یہ کیا کر رہے ہیں اور پھر

www.taemeernews.com

اس کمسنی میں میری شادی کا بھلا ابھی کیا سوال ہو سکتا ہے ـــــ مگر سہیل صاحب نے جو کہا تھا وہی ہوا اور والدہ کے اصرار سے تین چار ماہ بعد ہی میری شادی ہو گئی۔

یہ جو کہہ دیتے ہیں اکثر وہی ہو جاتا ہے
یہ شکستہ دل و احوالِ پریشاں والے

سہیل صاحب کہاں گئے کہاں مرے کب مرے کیسے مرے مجھے پتہ نہیں۔ یہی اکثر ہوتا ہے ـــــ دوسروں کو ان کا پتہ دینے والے خود بے پتہ گذر جاتے ہیں یا یہ کہ جو دوسروں کو ان کا پتہ بتا دیتے ہیں خود اپنا پتہ نہیں رکھتے۔ جو خود اپنا پتہ کھوتا ہے وہی دوسرے کا پتہ پاتا ہے ـــــ "عشق میں کھو جاؤ گے تو بات کی تہہ کو پاؤ گے" ـــــ

حال ہمارا جانو گے جب دل کو کہیں لگاؤ گے

اب دل کون لگاتا ہے۔ دلگی سب کرتے ہیں۔ دل لگی سستی ہے دل لگانا مہنگا ہے۔ اس لئے نہ کوئی کھوتا ہے نہ پاتا ہے۔

زندہ رہنا اور زندہ رہنا بھی ایک فن ہے یہ بھی سیکھا جاتا ہے۔ ہر زندہ رہنے والے کو۔ کھانے پینے والے کو۔ لکھنے پڑھنے والے کو بولنے چاہنے والوں کو زندہ نہیں کہتے اور یہ بھی نہیں کہ جسے لوگ زندہ کہیں وہی زندہ ہو۔ یہ بھی نہیں کہ غالب جسے روشناس خلق کہتے ہیں وہی زندہ ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

عمرِ جاوداں زندگی کے لئے ضروری نہیں اور نہ روشناس خلق ہونا زندگی کی علامت ہے ـــــ اور یہ بھی نہیں کہ زندہ وہی ہے جو زندگی کی کچھ باتیں کہہ جائے جیسے غالب یا میر یا اقبال ـــــ غالب یا میر یا اقبال زندگی کی علامتیں بتاتے ہیں اس لئے یہ بھی زندہ نہیں۔ لیکن زندہ ایسے لوگ بھی ہیں، جو شعر نہ کہہ سکے، زندگی کی علامت نہ بتا سکے، روشناس خلق نہیں ہوئے لیکن عمرِ جاوداں پا گئے۔ ہائے ان کی عمرِ جاوداں کی گواہی دینے والا ایک ہی ہو جیسے میں۔ یا ایک بھی نہ ہو تو ایسے لوگوں کا جس کا کوئی نہیں اس کا خدا بس ہے اور کافی ہے۔ مثلاً غالب کہتے ہیں:

www.taemeernews.com

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

یہ زندگی کی علامت ہے لیکن کیا غالب نے واقعی زندگی کے کسی موڑ پر، کسی منزل پر، کسی مقام پر برق سے شمع ماتم خانہ روشن کی ؟ لیکن دنیا میں ایسے لوگ گذرے جنھوں نے واقعی یہ کام کیا۔ اور روشناس خلق بھی نہیں ہوئے لیکن وہ زندہ رہ گئے اور زندگی کر گئے۔ میں نے زندگی بھر یہی دیکھنے کی کوشش کی یہی سمجھنے کی کوشش کی کہ زندگی کرنا کسے کہتے ہیں ـــــ میں نے ہر قدم یہی ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ اسی کی جستجو کی، اسی کی تلاش کی۔ مجھے اپنی تلاش کبھی نہیں رہی۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کے واقعات کی کھیتوں کرنا زندگی دیکھنا یا زندگی دکھانا نہیں ہے۔ زندگی تو خش وخاشاک ہی زیادہ رکھتی ہے۔ گھاس پھونس کو تولتے رہنا بیل کی سانی کے لئے ہو سکتا ہے۔ انسان کی زندگی کے لئے اس میں کیا ہے ؟ اس گھاس پھونس میں سے کہیں ایک پھول نکال کر دکھاؤ زندگی مہک اُٹھے گی، ایک چنگاری نکال لو زندگی چمک اُٹھے گی۔ ایک چنگاری بھی زندگی میں نکل آئی تو زندگی سوارت ہے ـــــ امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے پاس کسی مہم سے ایک جماعت واپس آئی۔ آپ نے کارگذاری پوچھی۔ آنے والوں نے کہا : "فلاں صاحب یوں شہید ہوئے اور فلاں صاحب یوں شہید ہوئے۔ اور بہت سے شہید ہوئے جنھیں ہم نہیں جانتے" ـــــ امیرالمومنین نے فرمایا۔ "تم نہیں جانتے تو کیا اور عمر فاروقؓ انھیں نہیں جانتا تو کیا۔ اللہ انھیں جانتا ہے پہچانتا ہے اس کا جاننا بہت کافی ہے" ـــــ ایسے ہی لوگ ہیں جو روشناسِ خلق نہیں ہو کر بھی لاکھوں مردہ نما زندوں میں زندہ ہیں ـــــ انہیں کی تلاش مجھے اپنی تلاش سے زیادہ محبوب ہے۔ میں نے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں بہت سی ایسی زندگیوں کی طرف بہت ہلکے اشارے کئے ہیں۔

کاش وقت، ماحول اور حالات اس کی اجازت دیتے کہ میں اشاروں کی وضاحت کر سکتا۔ قاضی سراج الحق اور ان کے ساتھ ایک واقعہ کا اشارہ آیا ہے تھوڑی سی وضاحت اس کی سن لیجئے کہ فسادات میں لڑتے رہے۔ اسی عالم میں بے موقع پکڑا گئے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ گھسو خلیفہ کے

www.taemeernews.com

شاگردِ رشید ہیں۔ رستم خانی ٹھاٹ، جانتے ہیں، علی مردی پینترہ جانتے ہیں، بھنڈارے کی تراش جانتے ہیں، جینو کی مار جانتے ہیں، کنپٹی کا ہاتھ جانتے ہیں۔ لیکن وقت آیا اور ایسے بے موقع پکڑا گئے کہ جینو اور بھنڈارہ کمر تراش اور کنپٹی کا ہاتھ کچھ کام نہ آیا۔ گرے اور دو چار تلواریں دو چار ٹکڑے کر دینے کو اُٹھ چکی تھیں ــــ کہ لوگ آ گئے جنھیں غمِ اِک نفس بھی نہیں تھا اور جو برق سے شمع ماتم خانہ روشن کرنا جانتے تھے ــــ ایک طرف سے چوڑیاں کھنکیں، آنچل لہرائے، پائل بجے اور سراج کے گرے ہوئے بدن پر پلک جھپکاتے سراج کی کمسن دُلہن اور سراج کی جوان بھابھی سراج کو دبوچ کر بیٹھ گئیں اور کتنی تلواریں بیک وقت پڑیں اور دونوں کو کتنے ٹکڑے کر گئیں۔

مجھے ہوسِ سیر و تماشہ کبھی نہیں رہی۔ اس کے باوجود کم تماشے میری آنکھوں سے بچ کر گذر سکے۔ تماشے کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک۔ اسٹیج پر پردے کے باہر ایک پردے کے پیچھے۔ MOTIVE پردے کے پیچھے رہتا ہے۔ WORK پردے کے باہر۔ پردے کے پیچھے کچھ بولا جاتا ہے اور پردے کے باہر اسے دُہرایا جاتا ہے DIRECTION اندر سے آتا ہے ACTION باہر ہوتا ہے۔ اکثر میں نے ACTION سے گذر کر DIRECTION دیکھنے کی کوشش کی اور دکھانے کی کوشش کی۔ ACTION دکھاتے ہوئے DIRECTION کی طرف نظروں کو پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

والد کا انتقال ہو گیا تو دو ماہ کے بعد والدہ نے مجھے کلکتہ بھیجا وہاں ڈاک خانے میں والد کی کافی رقم تھی۔ پاس بک وغیرہ لے کر میں آیا۔ پٹنہ میں جج کے یہاں ہم سب بھائی بہنوں کی دلی والدہ بنیں SUCCESSION CERTFICATE کی درخواست دی گئی جس کے حصول میں دو تین سال لگ گئے۔ پچاسوں ہزار کی رقم تھی۔ سرٹیفکٹ مل گئی تو والدہ کو لے کر میں کلکتہ گیا۔ گھر میں میری شادی شدہ بہن تھی۔ بہنوئی تھے اور چھوٹے بھائی بہن۔ بہن کی گود میں ایک حسین لڑکا تھا۔ ایک سال کی عمر تھی۔ طفیل احمد نام تھا۔ والدہ سے بہت مانوس تھا اسے چھوڑ کر جانا والدہ کو گراں تھا لیکن اسے لے کر جانا بھی ممکن نہ تھا۔۔۔۔ ہم لوگ کلکتہ پہونچے دو تین ہفتہ وہاں رہنا پڑا۔ اتفاق سے اس وقت کلکتہ کے اس

www.taemeernews.com

پوسٹ آفس جہاں رقم تھی، کے بڑے ڈاک بابو ایک مسلمان تھے۔ بنگالی مسلمان۔ دیندار اور پابند شریعت پاجامہ شیروانی پہنتے تھے داڑھی رکھتے تھے مگر سرکاری نوکر تھے۔ اصول کے بہت پکے سرکاری قاعدے اور قانون میں سرمو کمی بیشی نہیں کرتے۔ کام درجہ بدرجہ قاعدے سے ہوتا رہا اور اندازہ تھا کہ دو تین ہفتہ اور وہاں رہنا پڑے گا۔ جس دن تمام کاروائیاں مکمل ہو جائیں گی، والدہ کو ڈاک خانہ لے جانا ہوگا۔ تمام کاغذات پر دستخط ہوں گے۔ گواہیاں ہوں گی پھر رقم ملے گی۔ ہمارے ساتھ براہل جی اور ایک، دو آدمی اور بھی گھر سے کام اور دیکھ بھال کے لئے آئے تھے۔ سب دوڑ دھوپ کر رہے تھے ـــــ ایک دن والدہ بہت سُست اور خاموش ہو گئیں۔ گھر سے خط آیا تھا کہ طفیل کو کچھ بخار آگیا ہے ـــــ دوسرے دن وہ رونے لگیں اور مستقل روتی رہیں۔ دوپہر کو مجھے کہا کہ میں گھر جاؤں گی ـــــ "گھر جائیے گا؟ کیوں؟" "میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ ہم اب یہاں نہیں رہیں گے۔" "یہ کیسے ہوگا اماں؟ پھر روپیہ کیسے ملے گا اور کس کو ملے گا؟" "بلا سے نہ ملے گا۔ ہم نہیں رہیں گے" ـــــ بس وہ روتی رہیں۔ براہل جی سے کہا "ٹکٹ منگوالو ہم آج جائیں گے"۔ ان کے انداز سے پتہ چلا کہ واقعی وہ نہیں رہیں گی۔ میں سخت حیران ہوا کہ کیا کروں ـــــ اسی وحشت میں ڈاک خانہ گیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب سے حالات بیان کئے۔ وہ بول اُٹھے کہ "میں کیا کروں ـــــ جاتی ہیں تو جائیں۔ رقم ملنے میں تو ابھی ہفتوں دیر ہوگی" ـــــ مجھے پوری باتوں کی سمجھ نہیں۔ کیا کروں۔ کیا نہ کروں۔ عجیب عالم میں خاموش کھڑا تھا .... وہ بولے "جاؤ، یہاں کیوں کھڑے ہو" ـــــ

"جا کر اماں کو روکو ـــ کم از کم دس دن وہ اور ٹھہر جائیں"

"وہ تو کچھ سنتی ہی نہیں ہیں۔ بس روئے جا رہی ہیں"

"روئے جا رہی ہیں؟ کیوں کیا بات ہے؟"

"وہ کچھ نہیں بتاتیں۔ کہتی ہیں میرا جی بہت گھبرا رہا ہے بس رو رہی ہیں نہ کچھ کھا رہی ہیں نہ کچھ پی رہی ہیں"

"رونے سے کیا ہوگا۔ جی کیوں گھبرا رہا ہے؟ ان کو تو رہنا ہی ہوگا" انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر

www.taemeernews.com

سمجھاتے ہوئے کہا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ اپنے فائلوں میں مشغول رہے۔ دو ایک بار مجھے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ پھر مشغول ہو گئے۔

بار بار قلم دانتوں میں پکڑ کر دو چار سکنڈ کچھ سوچتے۔ پھر فائل دیکھنے لگتے۔

"کتنی دور رہتے ہو؟"

"یہاں سے قریب پاؤ میل پر ایک مکان میں۔"

انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ شاید ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ پھر کچھ سوچا۔ یک بیک کرسی سے اُٹھے، کھونٹی سے شیروانی اتار کر پہنی۔ چھڑی اُٹھائی اور کہا "چلو"۔

"کہاں چلوں؟"

"تم جہاں رہتے ہو ـــ تمہاری ماں سے باتیں کروں گا۔"

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ ڈیوٹی چھوڑ کر میرے یہاں جائیں گے؟ بڑے پوسٹ ماسٹر صاحب؟

وہ باہر آئے۔ اپنی فٹن منگوائی۔ مجھے ساتھ بٹھایا۔ میرے گھر آئے۔ باہر بیٹھے۔ کمرے میں اماں تھیں۔ ان کے رونے کی آواز آ رہی تھی ـــ وہ کچھ بولے نہیں۔ اپنی ٹھوڑی چھڑی پر ٹیکے خاموش بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بیٹھے رہے۔ نہ کچھ پوچھا نہ کچھ کہا۔ کئی بار کمرے کے دروازے کی طرف جہاں اماں بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں۔ نظر اٹھائی پھر چھڑی پر ٹھوڑی ٹیک لی۔ خاموش۔ مجھے بھی حیرت کہ وہ نہ کچھ پوچھ رہے ہیں نہ سوال کر رہے ہیں نہ سمجھا رہے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ یونہی بغیر کچھ بولے اُٹھے فٹن پر بیٹھ گئے مجھے ساتھ لیا اور روانہ ہو گئے ـــ ڈاک خانہ آئے۔ وضو کیا ظہر کی نماز پڑھی میں بھی وضو کر کے شریک ہو گیا۔ نماز پڑھ کر کلرک کو بلوایا۔ فائل نکلوا کر کہا ابھی فوراً سارا کام Complete کرو۔ کلرک ہمی منہ دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولے ابھی آدھ گھنٹے میں سامنے کاغذات درست کرو۔ کاغذات مکمل ہو گئے۔ رقم طے ہو گئی۔ ہیڈ کلرک کو بلایا۔ کاغذات دیئے دستخط کئے۔ ہیڈ کلرک سے دستخط کرائے۔ رقم نکلوائی تھیلے میں رکھی۔ ہیڈ کلرک کو شامل لیا۔ فٹن پر بیٹھے میرے گھر آئے۔ کمرے کے دروازے پر پردہ گرا کر بیٹھے۔ کاغذات نکالے خود سے پردے کے

www.taemeernews.com

اندر بڑھا دیا کہ اس پر دستخط کر دیجئے۔ والدہ دستخط کر سکتی تھیں۔ اور ان کا دستخط Attest بھی ہو چکا تھا۔ والدہ اسی عالمِ اضطراب اور بیقراری میں دستخط کرتی رہیں۔ اور والدہ کے ہر دستخط کو پوسٹ ماسٹر صاحب شناخت کرتے رہے۔ کاغذات مکمل ہو گئے۔ انہوں نے تھیلی پردے کے اندر بڑھا دی۔ "گن لیجئے یا گنوا لیجئے۔ پوری رقم ہے۔" پھر اُٹھے دو چار منٹ کھڑے رہے پھر بولے۔ "اچھا تو میں جاتا ہوں۔ میرا سلام قبول کیجئے۔ آپ آج ہی جا سکتی ہیں۔" اور پھر وہ فٹن کی طرف بڑھے میں نے ساتھ جانا چاہا۔ انہوں نے پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "جاؤ۔ روانگی کی تیاری کرو اور اماں سے کہو میرے لئے دعا کریں۔"

ہم لوگ اسی روز شام کو گھر کے لئے روانہ ہو گئے۔ گھر پہونچے تو سناٹا تھا۔ معلوم ہوا طفیل کل ہی مر چکا ہے۔ اسے بخار آیا نمونیہ ہوا اور دو روز میں ختم ۔ والدہ کو آدھی سے زیادہ پہلے ہی خبر ہو چکی تھی ۔ گھر آ کر اس کی تصدیق ہو گئی۔ پھر وہ نہیں روئیں بلکہ میری بہن کو تسلی دینے لگیں۔

وہ پوری رقم والدہ کے ساتھ ہی رہی۔ انہوں نے کہا بھی کہ بنک میں رکھوا دو۔ مگر ان کی دلدہی کے لئے ہم نے ان کے پاس ہی وہ رقم رہنے دی۔ اور ایک سال بعد پوری رقم ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

زندگی اور ادب کا کیا رشتہ ہے؟ میں نے اس پر غور نہیں کیا ہے تحقیق نہیں کی ہے، مطالعہ نہیں کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ مجھے جس چیز سے بھی تعلق رہا ہے میں نے اس کی ماہیت نوعیت اور حیثیت جاننے کی، سمجھنے کی، تحقیق کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ خدا جانے یہ مرض ہے یا صحت مندی ہے۔ مثلاً آپ یوں سمجھئے کہ کھانا ہر شخص کھاتا ہے اور کھانے کی لذت جانتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ کھانے کا نام اور اس کا تجزیہ بھی جانتا ہے۔ معمولی بھات روٹی کو چھوڑ کر میں نہیں جانتا کہ بریانی یا پلاؤ کے اجزا کیا ہیں۔ نان اور باقرخوانی کے اجزا کیا ہیں۔ قورمہ کسے کہتے ہیں اور کیوں، دوگوشتہ نام کس وجہ سے ہے۔ گولر کباب اور شامی کباب میں کیا فرق ہے۔ ماقوتی اور فیرنی میں کیا فرق ہے۔ بچپن سے کھا رہا ہوں مگر آپ پوچھئے تو کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔ حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں تقریباً ہر اوسط درجے کا انسان جانتا ہے۔ اسی طرح اور تمام چیزوں کا حال ہے

www.taemeernews.com

جو زندگی کے روزمرہ میں شامل ہیں۔ بس میں استعمال کرنا جانتا ہوں، لذت خوب پہچانتا ہوں، اچھا ہے یا بُرا ہے یا بہت اچھا ہے کیسا ہے سب بتا دوں گا لیکن کیوں اچھا ہے کیوں بُرا ہے، کیوں ایسا ہے یہ بتا نہیں سکتا۔ ادب سے خوب واقف ہوں۔ اس کی شکل صورت رنگ آہنگ، کیفیت کمیت، لذت، چاشنی، وزن، قدر، قیمت خوب سمجھتا ہوں، اس کی مختلف سطح، اس کے معیار مقدار کو خوب پہچانتا ہوں مگر تجزیہ نہیں کر سکتا اس لئے کہ ہر چیز کی لذت تجزیے سے فنا ہو جاتی ہے۔ موسم کا حسن، پھول کا حسن، خوشبو کا رنگ کا حُسن تجزیے سے ختم ہو جاتا ہے اس کی لذت ختم ہو جاتی ہے۔ مذہب ایک فطرت بھی ہے اور منطق بھی۔ یہ علم بھی ہے اور عمل بھی لیکن مذہب کے بہت زیادہ واقف کاروں کو اور اس کے علم کے ماہرین کو مذہب سے وہ شغف اور وہ ربط اور وہ وابستگی نہیں دیکھی جو سیدھے سادے ناواقفوں میں پائی۔ حسن کا سائنٹفک تجزیہ حسن کو غارت کر دیتا ہے۔ چاند پر جانے والوں سے اب چاند کی اور اس کی چاندنی کی لذت اور کیفیت کسی مقیاس الحرارت سے جاننے کی کوشش کر سکئے تو دیکھئے گا کہ درجۂ حرارت بہت نیچے آگیا ہے۔ میں اسی طرح چیزوں کی لذت اور کیفیت میں اتنا منہمک، اتنا غرق رہتا ہوں کہ میں نے کسی چیز کی تحقیق کبھی نہیں کی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ محققین اور ناقدوں کی زندگی دیکھ کر رحم آیا اور ان کی محرومی پر افسوس آیا۔ میں یہ بات لکھ کر بہت سوں کو چونکا گیا ہوں گا کچھ لوگوں کو غصہ دلا گیا ہوں گا۔ مگر کیا کیجئے حقیقتِ حال یہی ہے۔ مانو چاہے نہ مانو۔

چنانچہ ادب اور زندگی کا کیا رشتہ ہے تحقیق نہیں کی۔ مگر رشتہ وہی نظر آیا جو عشق اور ادب کا ہے جسے میر صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

دور بیٹھا غبار میر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

جس طرح بغیر عشق ادب نہیں آتا اسی طرح بغیر ادب زندگی نہیں آتی۔ جس طرح ذرے کا دل چیرنے پر خورشید کا لہو نکلے گا، زندگی کا دل چیرو تو کسی نہ کسی گوشے میں کسی نہ کسی مقدار میں کسی نہ کسی صورت میں کسی نہ کسی پیمانے میں ادب ضرور ملے گا۔ کم یا بیش۔ جس طرح بقدر پیمانۂ تخیل ہر دل

www.taemeernews.com

میں خودی کا سرو سلازمی ہے اسی طرح بقدر پیمانۂ ذوق ادب کا کیف بھی ہر زندگی میں یقینی ہے چاہے وہ زندگی انسان کی ہو، حیوانات کی ہو نباتات کی ہو ورنہ پھر دم نکل جائے آدمی کا۔ دم نکل جانے کے معنی مرجانے کے نہیں ہیں۔ جی کر بھی انسان مرا ہوا ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس پر متفق ہیں کہ مرا ہوا انسان بھی زندہ کہا جا سکتا ہے تو ہمیں اس پر بھی اتفاق کرنا ہوگا کہ زندہ انسان بھی مرا ہوا ہو سکتا ہے۔ تو مختصر یہ کہ ادب سے میرا بھی تعلق غیر شعوری اور شعوری دونوں ہے اور رہا ہے۔ اس وقت بھی جب ادب کا نام نہیں جانتا تھا اس کو پہچانتا نہیں تھا مگر اس سے لذت اس وقت بھی حاصل ہوتی تھی اور اس کی کیفیت اس وقت بھی محسوس ہوتی تھی ـــــ آج سے چھیالیس سال پہلے کا ایک منظر دکھاؤں جو صرف حافظے میں نقش ہے کسی تحریر میں نہیں کسی کتاب میں بھی نہیں ـــ جمیل مظہری صاحب کی اٹھتی جوانی تھی اور اٹھتی جوانی یوں تھی کہ دبلے پتلے، نحیف و ناتواں۔ سینہ اندر دھنسا ہوا، قد کچھ جھکا ہوا دق کے مریض معلوم ہوتے تھے ـــ کلکتہ کے ادب نوازوں اور ادب پسندوں کے محبوب تھے محمد علی پارک کلکتہ میں اردو لٹریری کانفرنس ہو رہی تھی جس کے منتظمین میں جمیل صاحب نمایاں تھے۔ میری عمر دس گیارہ سال ہوگی۔ محمد علی پارک سجا ہوا تھا۔ پنڈال کے درمیان میں اسٹیج اور چاروں طرف منتخب سامعین کا مجمع۔ آئیے سامعین سے کچھ تعارف حاصل کیجئے۔ نواب سلیم اللہ صاحب ڈھاکہ ہلکے براؤن رنگ کی شیروانی رنگ گندمی بدن بہت گداز عمر تقریباً پینتالیس سال آنکھیں بڑی بڑی گال بھرے بھرے، ترکی ٹوپی، چست پاجامہ ہاتھ میں حسین چھڑی اپنے خاندان کے اور افراد کے ساتھ ایک سمت نمایاں حیثیت سے زینت افروز تھے۔ ایک طرف سر سید اللہ آسام کے معزز رہنما سیاہ شیروانی ترکی ٹوپی۔ شاید بہت ہلکی داڑھی سر پہ بال بہت کم عمر پچاس سے اوپر بہت بے تکلفی سے دوسرے آسامی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ رونق افروز تھے۔ انہیں کی بغل میں اے کے فضل الحق اور سہروردی برادرس ـــ ایک بار پورے مجمع میں ہلچل ہوئی۔ تمام اہل پنڈال کھڑے ہو گئے اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر سے پوری فضا گونج گئی ـــ اور ایک شخص بہت لمبا تڑنگا اور بہت تنومند بھرپور سفید اور کچھ سیاہ داڑھی۔ سرخ و سفید رنگ، ساٹھ سے کچھ اوپر عمر بہت بارعب بہت وجیہہ اور بہت مقدس شخصیت، سیاہ شیروانی سرخ ترکی ٹوپی جس پر طلائی "چاند تارہ" کا مونوگرام بنا ہوا ہاتھ میں مضبوط چھڑی۔ چھڑی پر بوجھ

www.taemeernews.com

ڈالے ہوئے چلتا ہوا۔ دایاں ہاتھ سر سے پاؤں تک سیاہ برقعے میں پوشیدہ ایک خاتون کے کندھے پر رکھے ہوئے پنڈال کے گیٹ سے داخل ہو کر اشارے سے سلام کرتا ہوا اور سلام لیتا ہوا ڈائس کی طرف بڑھ رہا تھا اور مجمع نعرہ لگا رہا تھا۔ "رئیس الاحرار مولانا شوکت علی زندہ باد"، "بی اماں زندہ باد"۔ اور دونوں شخصیتیں اسٹیج کی دائیں طرف امتیازی مقام پر رونق افروز ہو گئیں۔ ایک صاحب پنڈال میں داخل ہوئے۔ میانہ قد گداز بدن، ابھی ہوئی داڑھی۔ ناک پر چھوٹی سی سلواری عینک، کچھ پرانی قسم کی ترکی ٹوپی اور کچھ پرانی ہی قسم کی سیاہ شیروانی، شکن آلود سفید پاجامہ اور پاؤں میں معمولی قسم کا جوتا۔ بہت سے لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جمیل صاحب نے لپک کر استقبال کیا ڈائس پر لا کر بٹھایا۔ آپ تھے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی صاحب۔ ایک طرف مجنوں گورکھ پوری نہنی سے دبلے پتلے آدمی ننگے سر بادامی شیروانی۔ دوسری طرف خان بہادر رضا علی وحشت، سفید بڑے بڑے بال اس پر سیاہ کشتی نما ٹوپی، سیاہ شیروانی، لانبے آدمی۔ ایک صاحب آئے سفید براق دھوتی اور کرتے کی بہت اچھے زرد رنگ کے کپڑے کی قمیص ننگے سر پاؤں میں بادامی پمپ۔ آپ تھے پنڈت سدرشن گورے چٹے اسمارٹ قسم کے آدمی۔

جلسہ شروع ہوا۔ صدارت نواب سلیم اللہ صاحب کی تھی۔ کسی کی تقریر کا انداز مجھے یاد نہیں۔ میرے ذوق سے الگ چیز تھی۔ ہاں ایک چیز یاد ہے کہ پنڈت سدرشن تقریر کر رہے تھے جس میں انہوں نے اردو والوں کے آپس کے اختلاف کی ایک تشبیہ دی۔ کسی بڑے گولے کی سی چیز ہے جو لڑھک رہی ہے اور اس کے اندر سے مختلف قسم کی آوازیں نکل رہی ہیں۔ کچھ اسی قسم کی تشبیہ تھی جس پر پورا مجمع جھوم گیا اور تعریف سے پنڈال گونجنے لگا۔ مجنوں گورکھ پوری صاحب نے چالیس لمبے صفحات کا ایک مقالہ پڑھا جسے سب نے بہت سکون سے مکمل سنا۔

رات کو مشاعرہ شروع ہوا۔ اور بڑی رات تک ہوتا رہا۔ حضرت وحشت کلکتوی کا حلقہ جس میں جمیل صاحب، عباس علی بیخود صاحب، آصف بنارسی وغیرہ ـــ اور آرزو لکھنوی کا حلقہ جس میں نواب دہلوی، جرم محمد آبادی، جوان سندیلوی وغیرہ۔ دس گیارہ سال کی عمر میں یہ پہلا مشاعرہ میں نے سنا۔ ادب سے کیا تعلق ہے اور کتنا تعلق ہے چھیالیس سال بعد حافظے سے دہرا رہا ہوں کہ آصف بنارسی کے

www.taemeernews.com

شاگرد وحشت نے اسٹیج پر یہ مطلع اور مقطع پڑھا ؎

بیچ میں سلسلۂ قصۂ غم توڑ دیا
تیرے عاشق نے جوانی ہی میں دم توڑ دیا
تیغ ابروئے ہلالی کی صفت میں آصف
تم نے لکھا ہے وہ مصرع کہ قلم توڑ دیا

مجھے بھی مزا آیا اور پنڈال بھی تعریف میں گونج پڑا۔ اور جب نواب دہلوی نے غزل شروع کی تو مطلع پر تو بہت زیادہ تعریف نہیں ہوئی۔

ظاہر ہے آگ دل کی دیکھو کہاں کہاں سے
پھینکتا ہے ہر بُنِ مو سوزِ غم نہاں سے

لیکن جب انہوں نے یہ شعر پڑھا تو جمیل صاحب اُچھل پڑے اور مجمع بھی دیر تک تعریف کرتا رہا۔

سونے کا بھی اگر ہو پھر بھی قفس قفس ہے
بہتر کبھی نہ ہوگا تنکوں کے آشیاں سے

شعر اُس وقت بھی پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ میں جذبۂ غلامی کے مخالف اور تحریکِ آزادی کے موافق ایک نعرۂ اجتہاد ہوں۔ جمیل مظہری صاحب اسی لئے پھڑک اٹھے اور مجمع اسی لئے تڑپ اٹھا۔ اس مشاعرے میں پہلی بار میں نے شاعر کو ترنم سے پڑھتے سنا۔ نواب دہلوی کا ترنم ہلکا تھا مگر موثر تھا۔ اور اسی مشاعرہ میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ کلکتہ کے ادبی اور شعری حلقے میں جمیل صاحب کتنے مقبول ہیں کہ درمیانِ مشاعرہ ہی مجمع سے مطالبہ ہوا کہ جمیل صاحب اپنا کلام سنائیں۔ جمیل صاحب انکار کرتے رہے کہ میں انتظامیہ میں ہوں نہیں پڑھوں گا۔ مگر اصرار جاری رہا تو جمیل صاحب نے صرف ایک مطلع پڑھا اور ڈائس سے اتر گئے۔ اور وہ مطلع یہ تھا ؎

گر خاک ہی ہونا تھا مجھ کو تو خاکِ سرِ صحرا ہوتا
اِک کوششِ پیہم تو ہوتی اٹھتا ہوتا گرتا ہوتا

www.taemeernews.com

بہت سے دن ہوئے شاید میں اسکول میں پڑھتا تھا تو اکثر ایک خواب دیکھتا۔ کہ میں کہیں سے گذر رہا ہوں۔ کچھ سنسان سی جگہ ہے۔۔۔ میرے ساتھ ایک عورت چل رہی ہے۔ شاید جوان ہی ہے۔ میں عمر کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا چہرہ میرے سامنے نہیں ہے۔ وہ میری بغل میں ذرا سا مجھ سے آگے ہے۔ لباس کچھ سفید ہی سا ہے۔ کچھ بول رہی ہے۔ بڑے پیار سے بڑی محبت سے۔ جیسے کوئی تسلی دیتا ہو دلاسا دیتا ہو۔ وہ مستقل میری بغل میں مجھ سے ذرا آگے آگے دیر تک اور دور تک چل رہی ہے۔ مجھے اس کے جسم سے بڑے پیار کی خوشبو آتی۔ کچھ دیر کے بعد خواب ختم ہو جاتا۔ یہ خواب مستقل آتے رہتے۔ میں کبھی کبھی اسکول میں بڑے ساتھیوں سے اس خواب کا تذکرہ کرتا تو وہ چٹکیاں لیتے اور کہتے تم پر کوئی عاشق ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے خواب میں آتی ہے۔ ایک بار میں نے اپنے ایک بزرگ حکیم سید شاہ ظہیر احسن بلسوی کو جو بڑے خدا رسیدہ متقی اور اہل حال و اہل قال بزرگ تھے، پٹنہ سے یہ خواب خط میں لکھ کر بلسہ بھیجا۔ انہوں نے جواب دیا ــــ "عزیزم بہت اچھا خواب ہے۔ درود شریف خوب پڑھا کرو۔" وہ پڑھتا ہی تھا، پڑھتا رہا۔ خواب آتے رہے اور مجھے اس خواب کا انتظار رہتا۔ خواب سمجھ میں نہیں آتا۔ سنسان راستے میں ایک قدم آگے آگے بغل میں چلتی، ہوئی اس عورت کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ بس ایک اندرونی کیفیت ہوتی۔ دل کشادگی کی، دلجمعی کی، دل افروزی کی، ایک خاص قسم کی مستی ہوتی، سرشاری ہوتی، بے فکری ہوتی۔ دل اس کی طرف کھنچتا اور کھنچتا چلا جاتا۔ نہ راستے کے سنسان پن کا احساس ہوتا نہ دوری کا نہ دیری کا۔ گفتگو میں اس عورت کی انگلیاں، ہاتھ متحرک رہتے۔ جیسے کوئی بات سمجھانے اور زور دے کر دل میں اتارنے کی کوشش میں کوئی کرتا ہے۔ ایسا کرتے کرتے اس عورت کے آدھے چہرے کی ہلکی سی جھلک نظر آجاتی مگر صورت کبھی واضح نہیں ہوتی۔ مبہم ہوتی چہرے کے نقوش ظاہر نہیں ہوتے۔ مگر گفتگو سے، اشارے سے، بدن کی حرکت سے، سر کی ہلکی گردشوں سے، اس کے حسین سفید لباس سے، اعضا سے محبت

www.taemeernews.com

پھوٹ پھوٹ کر نکلتی اور کوٹ کوٹ کر دل میں پہنچتی . . . بھر انقلابات شروع ہوئے ۔ میں نے میٹرک پاس کیا ۔ والد علیل ہوئے رخصت ہوئے ۔ علیم میرے بھائی بیمار ہوئے رخصت ہوئے ۔ فسادات ہوئے اور سب رخصت ہو گئے ۔ وہ خواب پھر کبھی نظر نہیں آئے ۔ لیکن خواب کے اثرات آج تک ہیں ۔ تقریباً چالیس سال ہوئے ۔ بیداری کی نہیں ۔ خواب کی مبہم تصویر ذہن میں اسی طرح آویزاں ہے، جیسا زندگی کا کوئی اہم واقعہ بیداری کی کوئی حقیقت تصویر بن کر نظروں کے سامنے ہر وقت کھڑی رہتی ہے ۔ ابھی چند برسوں قبل مجھے ایک دن کا ایک واقعہ یاد آیا ۔ میں نے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں لکھا ہے ۔ میٹرک کا امتحان دے کر والد کے سخت علیل ہو جانے کی خبر سن کر میں پٹنہ سے کلکتہ چلا گیا ۔ اور دوسرے تیسرے دن والدہ بھی تلہاڑہ سے کلکتہ پہونچ گئیں ۔ چند روز وہاں رہیں ۔ جب والد سفر کے قابل ہوئے تو انہیں لے کر گھر واپس چلی گئیں ۔ انہیں دنوں جب اماں وہاں تھیں مجھے کچھ بخار آ گیا ۔ حکیم صاحب کے یہاں سے دوا آئی ۔ مجھے یاد ہے دو قسم کے جوشاندے تھے ۔ صبح و شام کے لئے اور ایک دوا گلقند تھی ۔ رات کو گلقند دوا کھائی ۔ اجابت ہوئی، طبیعت ہلکی ہوئی اور مجھے گہری نیند آ گئی ۔ نیند میں ایسا لگا جیسے کوئی نغمہ کانوں میں گونج رہا ہے ۔ اور وہ نغمہ زندگی بن کر، طاقت و توانائی بن کر جسم کے تمام اعضا میں منتقل ہو رہا ہے ۔ نغمہ تیز ہوتا گیا اور میری زندگی ہلکی ہوتی گئی . . . اور بہت ہلکی ہو گئی ۔ اور کان میں اس نغمہ کے بول واضح الفاظ بن کر سمانے لگے ۔

"اٹھو بابو ۔ اٹھو نے بابو ۔ اٹھو نے بیٹا ۔ نماز کا وقت گذر رہا ہے ۔" میں بالکل تندرست اور مستعد انسان کی طرح اٹھ کر بیٹھ گیا ۔ دیکھا تو اماں سرہانے بیٹھی ہوئی ہیں ۔ زری کے بیل کی سفید ساڑی پہنے اور سفید شلوکہ (سہاگن ہونے کے دوران بھی یہ ان کا محبوب لباس تھا) میں اٹھ بیٹھا تو وہ مسکرا اٹھیں ۔ "نماز نہیں پڑھو گے ؟ دیکھو اب آفتاب نکلنے والا ہے ۔" میں جلدی سے تیاری کرنے لگا ۔ میں یہ واقعہ بھول گیا تھا . . بیس برس پہلے اچانک یہ واقعہ بہت واضح ہو کر سامنے آیا اور ساتھ ساتھ فوراً ہی ذہن اس سے بیسوں برس پہلے والے ان خوابوں کے سلسلے کی طرف منتقل ہو گیا اور جیسے دل و دماغ میں بجلی

www.taemeernews.com

کوند جاتی ہے۔ روشنی ہوئی۔ خواب والی تصویر سامنے آئی۔ زری کے بیل کی سفید ساڑی، سفید شلوکہ، حرکت کرتی ہوئی انگلیاں اور ہاتھ غیر مبہم نصف چہرہ۔ پھر ابہام بالکل ہٹ گیا.....
وہ خواب میں آنے والی عورت، خوشبوؤں اور نغموں والی عورت، طاقت و توانائی والی عورت، محبت کی مستی اور سرشاری والی عورت، دلجمعی آسودگی اور دل کشادگی کا نوں کے راستے دل میں اتارنے والی عورت، زندگی بھر کی سناٹجی اور مشقتِ حیات کو خوشگوار، دل آویز اور دل افروز بنا دینے کا حوصلہ دینے والی عورت ـــــ میری ماں تھی۔ امت فاطمہ ـــــ پردہ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بہت سی باتیں خاموشی سے فطرت کا جزو بن جاتی ہیں، زندگی بن جاتی ہیں۔ شعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ کوئی ضرورت خاص نہیں کہ انسان ان ابتدائی باتوں کی ماہیت بھی جانے اور اسباب سے بھی واقف ہو۔ لیکن قدرت کبھی کبھی انسانوں کی رہنمائی کر دیتی ہے۔ اور کسی واقعہ کی علت اس کا سبب اور اس کے آغاز کی ماہیت اور نوعیت یک بیک ذہن پر کھول دیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تاکہ میں آپ کے سامنے کھول دوں... آج کتنے نوجوان یا جوان ہوں گے، جن کے باپ خود پنج وقتہ نمازی نہ ہوں، لیکن اپنی اولاد کے لئے نمازی ہونے کی تمنا کرتے ہوں۔ اس کے لئے سختی کرتے ہوں پٹائی کرتے ہوں۔ میرے والد ـــــ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں لکھا ہے ـــ پنج وقتہ نمازی نہیں تھے۔ جمعہ کا بڑا اہتمام کرتے تھے اور رمضان میں دنیا کو بھول جاتے تھے اور سوائے نماز اور تلاوت کے کوئی مشغلہ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اولاد کے حافظ ہونے کی، نمازی ہونے کی، متقی ہونے کی تمنا رکھتے تھے۔ اور کوشش میں باپ بیٹے کا رشتہ بھول جاتے تھے۔ ایک دن ایسا طمانچہ مارا کہ میں سائبان سے نیچے گر کر یم۔ بیہوش ہو گیا۔ ایسا بھی ہوا کہ ہاتھ بھی باندھ دیئے، پاؤں بھی باندھ دیئے اور پتلی سی چھڑی سے پٹائی شروع کر دی۔ میں رو رہا ہوں، آنسو جاری ہیں اور آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔ لیکن آنسو روکے ہوئے ہیں، پٹائی چل رہی ہے۔ کوئی غلطی ہو گئی ہے اور والد سے پٹائی کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ جلدی سے لوٹا لے کر وضو کرنے بیٹھ گیا۔ والد سامنے سے آئے، دیکھا اور مسکراتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔

www.taemeernews.com

ان کے تمام بیٹے بیٹیاں نمازی ہوئیں اور الحمدللہ آج جو اولاد ان کی بچ رہی ہے' نمازی ہے۔ ایک بزرگ پٹنے میں ہیں۔ ان سے ملاقات ہوتی ہے اور ملاقات بہت قدیم ہے۔ واقعی بزرگ ہیں۔ بزرگ صورت' بزرگ سیرت' پابند شریعت' عبادت گذار' بہت موٹے دانوں کی بڑی تسبیح عموماً ہاتھوں میں رہتی ہے۔ الحمدللہ بیٹے بھی کئی ہیں۔ ایک بیٹے پر دین کا اثر ہوا۔ اس نے داڑھی رکھ لی۔ مجھ سے ایک دن ملاقات ہوئی۔ باتیں ہوتی رہیں۔ ان بیٹے کا حال پوچھا۔ کہاں ہے؟ "یہیں تو ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں؟ میں نے تو کہا کہ ارے بیوقوف' ابھی سے داڑھی رکھ لی ہے؟ نہ نوکری ہوئی ہے نہ شادی ہوئی ہے۔ بعد میں رکھ لیتا۔" کچھ دنوں بعد دیکھا واقعی سعادت مند بیٹے نے داڑھی منڈا دی۔

بات پاجامہ کرتے پر چلی تھی۔ اسی میں اختر صاحب مرحوم کا ذکر آیا۔ صدرالدین صاحب کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا ذکر آیا۔ مقصد نہ پاجامے کرتے کی صرف بات کرنا' نہ ڈاکٹر صاحب کی بات کرنا ہوتا ہے۔ مقصد تو "ابھی سن لو مجھ سے" ہے مجھ سے اس لئے کہ شاید یہ باتیں اوروں کے ذہنوں میں نہیں۔ یا ہیں تو کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ ہمت بھی کسی ذریعہ سے آتی ہے۔ اس ہمت کا بھی ایک پس منظر ہوتا ہے۔ اس کی بھی تاریخ ہوتی ہے۔ ہر شخص کا جدا پس منظر ہوتا ہے۔ یاد ہی جو میں نے یہ سلسلہ شروع ہونے سے پہلے عرض کیا کہ ہر انسان کا الگ ماڈل ہے اور الگ کارخانہ۔ چاہے وہ کارخانہ ہاتھ کا ہو یا مشین کا ہو۔ چاہے سوت چرخے پر کاتا گیا ہو یا بجلی کی مشین پر۔ چرخے پر بھی مہین سوت کاتا جاتا ہے جو بہت قیمتی بکتا ہے۔ چرخہ اور مشین کے فرق پر کچھ منحصر نہیں ہے۔ قیمت سوت کی لگتی ہے۔ میں اپنے کو چرخے ہی کا سوت سمجھتا ہوں۔ شاد مرحوم کے زمانے میں شاید کسی نے کوئی نظم لکھی تھی یا مضمون لکھا تھا یا کتاب لکھی تھی۔ اب دیکھئے نا میری جہالت ملاحظہ فرمائیے کہ نہ یہ یاد ہے کہ مضمون' نظم تھی یا کتاب تھی۔ اس اعتبار سے جہالت کا اعتراف ہے۔ لیکن میں پیالے کی اہمیت نہیں سمجھتا۔ دودھ چاہے مٹی کے پیالے میں پیو' چاہے کاٹھ کے پیالے میں پیو یا سونے کے پیالے میں پیو' پیالہ باہر ہی رہے گا۔ دودھ جسم کے اندر جائے گا اور اس سے سب کچھ حاصل ہوگا۔ بات چاہے سونے

www.taemeernews.com

کے حرف سے لکھی گئی ہو، سنہرے کاغذ پر لکھی گئی ہو یا کوئلے کے ٹھیکرے پر لکھی گئی ہو۔ کام بات کرے گی۔ سونا یا سنہرا کاغذ نہیں کرے گا۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ خلیفۂ وقت اپنے کچے مکان کی دیوار لیپ رہے تھے۔ ایک شہر سے فریادی آیا۔ آپ نے کام کرتے ہی ہوئے اس کی فریاد سن کر ایک ٹھیکرا اٹھایا۔ اس پر کوئلے سے کچھ لکھ دیا، کہا ــ "جاکر اس شہر کے قاضی کو دو، تمہارا کام ہو جائے گا۔" وہ فریادی گیا۔ قاضی کو دیا۔ قاضی صاحب اٹھ گئے۔ حاکم شہر کو بلایا۔ حکم دیا اور اسی وقت دادرسی ہو گی۔ سنا کہ راسخ عظیم آبادی مرحوم میر تقی میرؔ سے ملنے کے اشتیاق اور عقیدت میں دہلی گئے۔ میرؔ کے مکان پر پہنچے۔ خبر آئی کہ ایک مسافر ملنے کو آیا ہے۔

بھلا میرؔ صاحب کب کس سے ملتے تھے۔ جواب دے دیا ملنے کی فرصت نہیں۔

راسخ نے زمین سے ایک ردی پرزہ اٹھایا اور یہ شعر لکھ دیا:

خاک ہوں پر تو تیا ہوں چشم مہر و ماہ کا
آنکھ والا رتبہ سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

میرؔ صاحب ہاتھ میں پرزہ لیے بے تابانہ نکل آئے۔ کہاں سے آئے ہو؟ عظیم آباد سے آیا ہوں اور شاگردی کی تمنا لے کر آیا ہوں۔ تم اور میرے شاگرد؟ تم خود استاد ہو۔ راسخ نے بہت اصرار کیا۔ میرؔ صاحب راسخ کو گھر لے گئے۔ رہے اور اصرار پر ایک غزل کے مطلع میں ایک لفظ بدل دیا۔ اور راسخ اسی ایک لفظ کی تبدیلی سے میرؔ کی شاگردی پر فخر کرتے رہے۔ یوں ہوتے تھے پہلے مرتبہ شناس اور قدرداں۔ وہ لفظ تو مجھے معلوم نہیں مگر وہ مطلع یہ ہے:

تا خواب مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر
نیند آ گئی ہمیں تو اسی داستان پر

---

www.taemeernews.com

تقسیم ہند کو تقریباً پینتیس سال گذر گئے۔ میری عمر کے یہ پینتیس سال شہر میں گذرے ہیں کوٹھے اور محلات میں یا ان سے بہت قریب ـــــ سیمنٹ کی سڈول اور ہموار چھت۔ سنگ سرخ اور سنگ سفید کے فرش۔ خوبصورت اور پھولدار ٹائل سے سجی دیواروں کے پاس گذرے تیز سفید روشنی، مرکری اور جدید جھاڑ اور فانوس سے آنکھیں ہر وقت مانوس ہیں۔ صاف اور شفاف وسیع اور عریض سڑکیں پھسلتی ہوئی سیمنٹ کی گلیاں۔ قدموں کے نیچے رہتی ہیں۔ خوبصورت اشیا سے آراستہ، حسین اور دلربا روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی دوکانیں ہر وقت پیش نظر ہیں۔ صاف دھلے ہوئے۔ پاؤڈر اور سرخی سے رنگیں چہرے۔ سجے ہوئے بال۔ سنوری ہوئی زلفیں، چست اور حسین پوشاک، پتلون، بش شرٹ، کوٹ ٹائی، ہیٹ، بوٹ، بابری اور روغن سے جھل جھل کرتے ہوئے بال، پان سے سرخ ہونٹ، اور سگریٹ کی کثرت سے مٹیالے دانت۔ کلائی میں ڈھیلی یا چست جگمگاتی ہوئی رنگ برنگ کی گھڑیاں، انگلیوں میں سگریٹ، زبان پر فلمی گانے۔ آنکھوں میں بڑے بڑے شیشوں کے چشمے ـــــ یہی شہری زندگی ہے۔ اور اسی زندگی کی اتنی بھیڑ ہے۔ کہ سڑکوں پر رکشوں کی ٹن ٹن، رکشہ والوں کی چیخ، ٹم ٹم والوں کی ہٹو بچو، موٹر کاروں کے ہارن اور انسانوں کی جم غفیر میں چلنے کو رستہ نہیں ملتا۔ سب اپنی دھن میں مگن اپنے خیال میں مست اپنے منصوبوں میں غرق، اپنی احتیاج اپنی ضرورت اپنی ہوس میں محو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سب اپنی اپنی جنت یا جہنم کی طرف تیزی سے پل صراط پر گذر رہے ہیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں کسی کو کوئی پہچانتا نہیں۔ پہچانتا ہے تو دب کر نکل جانا چاہتا ہے۔ موٹروں کی قطاریں، ان پر زرق برق لوگ، زرق برق عورتیں، کپڑوں کا حسن ان کے عجیب عجیب رنگ، ان کی نئی نئی تراش۔ بالوں کے نئے نئے فیشن، نئے نئے انداز کے جوڑے اور چوٹیاں، میک اپ، برقعوں کے نئے نئے رنگ، نئی نئی وضع، نئے نئے ڈیزائن، جوتوں اور سنڈلوں اور چپلوں کے نئے نئے کٹ، نئے نئے شیپ،

www.taemeernews.com

نئی نئی رفتار، نئی نئی چال، نئی نئی لچک اور ٹھمک یہ سب پینتیس سال سے دیکھ رہا ہوں جو کل دیکھا وہ آج نہیں، ترقی کی نئی راہیں جن کی اکبر نے پیشین گوئی کی تھی سب نظر کے سامنے آرہی ہیں۔ ہر آدمی وضع میں لباس میں جدت میں ندرت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ جس کے پاس کم ہے زیادہ والوں کو للچائی نگاہوں سے دیکھتا ہے اور اسی کی نقل کرنے کے لئے جو نہ چاہئے وہ بھی کر بیٹھتا ہے۔ اسی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لئے روز نئے نئے اسکول نئے نئے کالج تعلیمی ادارے کھل رہے ہیں، سوسائٹیاں بن رہی ہیں کیسے لباس میں ہم آگے بڑھ جائیں، وضع میں دوسروں کو پیچھے کردیں۔ پینتیس سال سے ترقی کی رفتار پسنجر سے اکسپرس، اکسپرس سے میل، میل سے سوپر اکسپرس، سوپر میل آگے بڑھ کر ہوائی جہاز اور راکٹ کی تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان، انسان کا سامان اور مکان کا حسن کاغذ کا تراشا ہوا رنگین پھول بنتا جارہا ہے نئے نئے گلاب، موتیا، جوہی، چمبیلی۔ لیکن خوشبو سے محروم۔ ہر چیز مصنوعی ہر چیز نقلی معلوم ہوتی ہے۔ اور پینتیس سال کے عرصے میں ایک دن بھی، ایک لمحہ بھی۔ نگاہ پینتیس سال پہلے کی زندگی سے نہ اچٹ سکی۔ خیال کا رخ نہ مڑ سکا۔ دل کے ہاتھوں سے پینتیس سال والی پہلی زندگی کا دامن نہیں چھوٹا۔ جب مٹی کے مکانات تھے جن کے بعض دروازوں میں چوکھٹ اور کیواڑ بھی نہیں رہتی تھی بس دروازے کے برابر بڑا سوراخ ہوا کرتا تھا۔ جہاں دیواروں پر صرف چکنی مٹی کی صاف سوندھی لیوڑا ہوتی تھی۔ جس پر کہیں داغ نظر نہیں آتا تھا اور ہر دو چار روز پر نئی لیواڑ اور نئی لیپ ہوتی تھی۔ دیواروں سے خوشبو آتی تھی مٹی کی ــ پاک اور اصلی مٹی کی خوشبو۔ ــ جس سے انسان بنا ہے اور جس سے انسان قیامت تک بنتا رہے گا ــــ ابلیس نے اپنی بزرگی جتائی کہ میں آگ سے بنا ہوا ہوں۔ آدم مٹی سے بنا ہے۔ لیکن اس مٹی کے آدم نے ابلیس کے چھکے چھڑا دیئے اور ابلیس کہا کرتا تھا کہ ان ننگے بدن والوں نے میری کمر توڑ دی۔ جو انسان مٹی کی صحبت میں تھا۔ مٹی سے قریب تھا۔ مٹی سے اسے محبت تھی۔ مٹی کی خوشبو اس کی ناک میں تھی۔ مٹی کا حسن اس کی نگاہوں میں تھا۔ وہ مٹی جس پر تیمم کرکے انسان جنابت سے بھی پاک ہوجاتا تھا۔ مٹی ہاتھ اور منہ پر مل کر خدا کے سامنے کھڑا ہوتا تھا تو خدا اس پر فریفتہ ہوجاتا تھا۔ اور کہتا تھا

www.taemeernews.com

کہ مانگ کیا مانگتا ہے، بول کیا چاہتا ہے ـــــ خدا اُس کے مٹی ملے ہوئے ہاتھ کا شریک بن جاتا تھا اور کہتا تھا کہ "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ" خدا کا ہاتھ اس کے ہاتھ کے اوپر ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

ایسے ہاتھ سے جب خدا کے ایک بندے نے چند کنکریاں اُٹھا کر باطل کی فوج پر پھینکیں تو تاریخ کا عظیم الشان فیصلہ ہوگیا اور خدا بول اٹھا کہ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ تم نے کنکری نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

ان مٹی کے گھروں میں گیس نہیں ہوتے تھے، بجلی نہیں ہوتی تھی۔ خاص کاٹھ کے چراغ دان پر خالص مٹی کے دیئے میں خالص سرسوں کا تیل اور خالص روئی کی بتّی سے نرم دھیمی زرد روشنی پھوٹتی در و دیوار کچھ روشن ہوتے کچھ اندھیرے ہوتے ـــ کچھ اندھیرا کچھ اُجالا۔ کچھ امید کچھ خوف میں کچھ بندے اور کچھ خدا کی باتیں ہوتیں۔ اِن دھیمی، نرم اور لطیف روشنی میں کتابیں پڑھی جاتیں۔ تعلیم ہوتی، تربیت ہوتی اور کتابیں حروف، معانی اور مطالب کے ساتھ دل میں اتر جاتیں۔ روح میں داخل ہوجاتیں، رگ و ریشے میں گھل مل جاتیں، نگاہوں میں سما جاتیں زبانوں پر بکھر جاتیں پھر کتابوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی، پڑھنے والے مجسم کتاب بن جاتے۔ جو بول دیتے وہ سبق ہوجاتا جو اشارہ کردیتے وہ تربیت کر جاتا جو کہہ دیتے وہ علم بن جاتا۔ ان چراغوں کی آغوش میں پلنے والی نگاہیں۔ اس عالمِ رنگ و بو سے اُٹھ کر جہان بے کاخ و کو تک پہنچ جاتیں۔ آج برق و بخارات سے کھیلنے والا انسان ہزار ہزار وولٹ کی روشنی میں کام کرنے والا۔ دو عینکیں لگاتا ہے۔ پہلے لوگ صرف دو آنکھوں سے گھر بیٹھے بیٹھے زمین و آسمان کے پوشیدہ مقامات کی خبر لے آتا تھا۔ اب آدمی چار اور چھ آنکھوں سے ہوائی جہاز اور راکٹ پر اڑ کر اپنے بدن کو بھی نہیں دیکھ پاتا کہ وہ کتنا بدخوارہ ہوتا جارہا ہے۔ صابن لگا کر، پوڈر مل کر بالوں کو کندھوں تک سجا کر رنگین چھینٹ کے بش شرٹ اور کمر سے رانوں تک کسا ہوا زمین میں جھاڑو

www.taemeernews.com

دیتا ہوا پینٹ پہن کر بھی اپنی عورت کو نہیں بھاتا اور کل جو مرد داغ کی زبان میں کہتا پھرتا۔ آج اُس کی عورت کہتی پھرتی ہے کہ

تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

اور کل اُسی مرد کے داڑھی بھرے چیچک آلود چہرے کو مرتے مرتے بھی بوسہ دیکر اس کی عورت کہتی تھی کہ اچھا تو کل جنت میں ملاقات ہوگی اور مرد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسکراتی ہوئی رخصت ہو جاتی تھی۔

مجھے ۱۹۶۵ء میں جب استادی اختر اورینوی مرحوم اپنے شعبہ میں لے آئے تو وہ اور استادی ڈاکٹر صدرالدین فضا مرحوم نے کئی بار کہا کہ کلیم صاحب کم از کم دو عدد پینٹ اور بش شرٹ سلوا لیجئے۔ کرتہ پاجامہ پہن کر کلاس کیسے لیں گے؟ ـــــ میں نے کہا انشاءاللہ کرتہ پاجامہ پہن کر ہی کلاس لوں گا اور آج نہیں تو کل انشاءاللہ آپ بھی کرتہ پاجامہ پہن کر کلاس لینے لگیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا ـــــ تو میرا دل کبھی نہیں للچایا۔ زمانے کے رنگ میں آہنگ میں اس کی لچک اور ٹھمک میں اس کی چال ڈھال میں مجھے کبھی کوئی کشش نظر نہیں آئی ـــــ اور مجھے زندگی میں کسی وقت نشیب میں، فراز میں، دُکھ میں، سُکھ میں، پسماندگی میں، افتادگی میں، خلوت میں، جلوت میں، محفل میں، انجمن میں اپنوں میں یا غیروں میں کسی لمحہ کسی پل احساس کمتری اپنا شکار نہ بنا سکا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم گورنر بہار بن کر آئے تو میں بزم ادب پٹنہ یونیورسٹی کا سکریٹری تھا۔ بزم کی طرف سے انہیں دعوت دینے کے لئے مجھے بھیجا گیا۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر صاحب ملیٹری سکریٹری نے وقت دیا۔ میں راج بھون میں پہنچا۔ تو پاؤں میں چمڑے کی معمولی چپل تھی پاجامہ تھا اور مونڈھے پر کچھ پھٹا ہوا سفید ململ کا کرتہ تھا اور مخمل کی سیاہ ٹوپی۔ ہاتھ میں بیگ۔ گورنمنٹ ہاؤس کے اردلی کراہیت اور بے نیازی سے مخاطب ہوئے۔ میرے پاس ملاقات کا پروانہ تھا۔ بھٹناگر صاحب کے کمرے میں مجھے پہونچا دیا گیا۔ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ ہلکی رسمی محبت سے مجھے بٹھایا۔ گورنر صاحب کو اطلاع دی پھر مجھے ڈاکٹر صاحب کے کمرے کے دروازے تک خود پہونچا دیا جو اندر سے بند تھا میں نے انگلی سے دو تین ٹھوکر دروازے پر دی اور بیک بیک اندر سے دروازہ کھلا پھر آواز

www.taemeernews.com

آئی "ذاکر حسین"۔ تب نظر پڑی کہ دروازے کا ہینڈل تھامے خود گورنر صاحب کھڑے ہیں۔ کوئی چپراسی نہیں کوئی اردلی نہیں۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب کی اس بے تکلفی اور سادگی پر چند لمحے کے لئے متحیر ہوگیا۔ پھر ڈاکٹر صاحب مجھے صوفے تک لائے۔ بیٹھئے، مجھے بھی بٹھایا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ اور پندرہ منٹ کے طے شدہ اور مقررہ وقت ملاقات نے پینتیس منٹ لے لئے۔ بار بار بھٹناگر صاحب دروازے پر آتے رہے اور ہم دونوں کو گرم گفتگو دیکھ کر واپس جاتے رہے۔ آخر میں ہی تکلفاً اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب بھی کھڑے ہوگئے، دروازے تک آئے . . . . لیکن باتیں جاری رہیں اور دروازے کا ہینڈل تھامے تھامے بھی ذاکر صاحب سے کھڑے کھڑے دس منٹ تک اور باتیں ہوتی رہیں۔ corridor میں بھٹناگر صاحب، دوسرے اور آئے ہوئے ملاقاتی مہمان، چپراسی اور اردلی حیرت سے تعجب سے اس غیر معمولی منظر کو دیکھتے رہے۔ آخر میں رخصت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے دہلیز دروازے پر مصافحہ کیا اور مصافحہ کرتے ہوئے نیم خم ہوگئے ــــ اور میں رخصت ہوا اور آنکھوں کو گوشۂ چشم سے اور پشت پر لگی ہوئی چشم احساس سے یہ نظر آیا کہ ہر شخص متحیر تھا۔ اور جب تک گیٹ سے باہر نہ ہوگیا لوگ دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم بھی اسی مٹی کے مکان اور تیل کے چراغ کی روایت کے پروردہ۔ شیروانی اور پاجامے کی آغوش میں پلے تھے۔ جوان ہوئے تھے اسی میں ڈاکٹر بھی بنے تھے وائس چانسلر بھی بنے تھے اور اسی شیروانی پاجامے کی آغوش میں بوڑھے ہوکر گورنر بنے تھے اور اسی شیروانی پاجامے کی آغوش میں نائب صدر اور صدر جمہوریہ بن کر دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ وہ پاجامے کو جانتے تھے پہچانتے تھے۔ پھٹے کرتے کے سوراخ سے انہیں اور بھی کچھ نظر آیا ہوگا۔ چمڑے کی معمولی چپل نے بھی کچھ کہا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب تمام زبان سمجھتے تھے۔ وہ زبان بھی جو بولی ہے اور وہ زبان بھی جو نہ نظر آتی ہے نہ بولی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ چہرے سے بھی پہچانا، کچھ لباس کی بے تکلفی اور سادگی سے بھی جانا اور کچھ میری زبان اور میری گفتگو سے بھی سمجھا۔

دیوانہ ہی سمجھے ہے جو دیوانہ کہے ہے

رانچی ریڈیو کے مشاعرے کے وقت ڈاکٹر صاحب وہیں گرمیاں بسر کر رہے تھے۔ مشاعرے سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ میں اسی کرتے پاجامے اور ٹوپی چپل میں تھا۔ رانچی کے اس دور کی

www.taemeernews.com

ہلکی خنکی کی مدافعت کے لئے کاندھے پر ہلکے زرد رنگ کی سمولی بھاگل پوری چادر ڈال لی تھی۔ جس کا ایک سرا کندھے سے ہو کر پشت سے گذر کر کمر کے نیچے لٹک رہا تھا۔ ڈنر کے بعد ڈاکٹر صاحب میرے قریب آئے باتیں کرتے رہے۔ اور باتیں کرتے کرتے دروازے کی طرف بڑھے ... ساغر نظامی صاحب بھی تھے، عرش ملسیانی صاحب بھی تھے، شاید جگن ناتھ آزاد صاحب بھی تھے اور بہت سے تھے۔ ڈاکٹر صاحب آگے آگے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے باتیں کر رہے تھے۔ "اچھے تو ہو؟" وہ میری مصیبتوں اور میرے حادثات سے بھی واقف ہو گئے تھے۔ وہ کہتے رہے ــــ "اچھے تو ہو؟۔ اچھے رہو، ہمت سے رہو۔ ماں باپ کس کے رہے ہیں؟ دھن دولت کس کا رہا ہے؟" یکساں کس کے حالات رہے ہیں؟ ہمت سے تعلیم حاصل کرو، بھروسے اور اعتماد سے زندگی گذارو" ــــ ڈاکٹر صاحب دلاسا دیتے رہے، تسلی دیتے رہے، ہمت بندھاتے رہے۔ ہال سے سیڑھیوں تک آئے، صرف مجھی سے بولتے رہے۔ میرا ہی حال پوچھتے رہے۔ پھر ہم سب سے مصافحہ کیا اور رخصت ہوئے ــ اسی رات کو ہال میں رانچی ریڈیو کا مشاعرہ ہوا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہی صدارت کر رہے تھے۔ اس سے پہلے میں مشاعروں میں غزلیں ہی پڑھتا تھا۔ وہاں پہلے پہل ایک نظم پڑھی جس کا عنوان "مسافر" تھا جو بہت مشہور ہوئی بہت پڑھی گئی اور بہت چھپی وہ مکمل نظم آگے تحریر کروں گا۔ مال کے نشہ پر، اقتدار کے نشہ پر تنقید ہے۔ اہل غم، اہل دل، اہل نگاہ، اہل درد کی تائید ہے۔ مشاعرہ ختم ہوا دوسرے دن میں واپس ہو گیا۔ دو تین ہی دن بعد ڈاکٹر صاحب کا خط رانچی سے آیا۔ نظم کی بہت تعریف کی اور میرا ایک شعر:

ارباب ذی وقار کا تو پوچھنا ہی کیا
جتنے بلند بام ملے تنگ در ملے

لکھ کر بے تکلفانہ شوخی سے تحریر فرمایا تھا کہ "کیا اس کا اشارہ میری طرف ہے"۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب خوب سمجھ رہے ہیں کہ اشارہ ان کی طرف نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ دانائے راز سخن فہم اور حال آشنا تھے مگر میں نے وہ راز فاش کیا جو اس سے پہلے نہ اس کے بعد کسی پر فاش ہوا۔ اور اس نظم کے تمام جاننے والے یاد رکھنے والے بھی نہیں جانتے۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے

www.taemeernews.com

آگاہ کیا۔ اور آج اپنے تمام سامعین اور قارئین کو بھی آگاہ کرتا ہوں۔ میں نے انہیں لکھا کہ حضرت یہ نظم آپ ہی کو سنانے کے لئے اب سے دو تین سال پہلے لکھی گئی تھی۔ گرچہ اس میں کہیں آپ کا نام نہیں ہے مگر اشارہ مکمل ہے، جب آپ بزم سخن کے جلسے میں تشریف لا رہے تھے اور میں یہ نظم پڑھنا چاہتا تھا۔ بزم سخن کی طرف سے اردو زبان کی طرف سے حسنِ طلب کے انداز میں یہ مطالبہ تھا کہ آپ گورنر ہو کر آئے ہیں تو اردو زبان کے لئے، اردو ادب کے لئے آپ اپنے دور اقتدار میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کریں تو آپ کی محبت، آپ کا احسان، نہ کریں تو شکریہ۔ ہم تو کر ہی رہے ہیں اور کرتے ہی رہیں گے ـــــ مگر کیا بات ہوئی کہ میں نہیں پڑھ سکا۔ شاید اس لئے کہ لوگ اشاروں کو نہ سمجھ سکیں اور آپ کی بلا مبالغہ واقعاتی اور حقیقی تعریف جو اس نظم کے بعض اشعار میں ہے، وہی موضوعِ نظم سمجھ لیا جائے۔ میں نے ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اشعار حذف کر دیئے اور دو تین سال بعد "مسافر" کے عنوان سے پڑھی اور چھپی ـــــ وہ مکمل نظم یہ ہے :۔

یوں تو قدم قدم پہ شریکِ سفر ملے
رہ رو ملے رفیق ملے راہبر ملے

گو شیخ زادے اور برہمن پسر ملے
سب آستیں دراز ملے کم نظر ملے

جتنے بلند جتنے تناور شجر ملے
بے شاخِ سایہ دار ملے بے ثمر ملے

جتنے رفاہِ عام کے پیغام بر ملے
خود بین و خود نواز ملے خود نگر ملے

اہلِ خبر تو اور بھی کچھ بے خبر ملے
نزدیک تر جو سمجھے گئے دور تر ملے

اربابِ ذی وقار کا تو پوچھنا ہی کیا
جتنے بلند بام ملے تنگ در ملے

ملنے کو اک نظر بھی نہ درد آشنا ملی
کہنے کو کیسے کیسے وسیع النظر ملے

مدت سے کاروانِ جنوں کی تلاش تھی
اک رہبر جنوں ملے اور معتبر ملے

مدت پہ جستجوئے نظر کامراں ہوئی
مدت پہ اک قدر شناسِ گہر ملے

اب ایک دھوم قافلے والوں میں ہے کہ ہاں
ایسا ملے رفیق کسی کو اگر ملے

اس کی نگاہ دور بیں کا ہے نہ جسے
سیدؔ کی بارگاہ سے فکر و نظر ملے

www.taemeernews.com

جس کو رہا ہو خاکِ علی گڈھ سے واسطہ
اس شعلۂ عظیم سے جس کو شرر ملے
جس کو وہاں کی دھوپ حرارت دے شوق کی
جس کو وہاں کی چھاؤں سے ذوقِ سفر ملے
جس کو وہاں کی خلوت و جلوت نصیب ہو
جس کو وہاں کی شام وہاں کی سحر ملے
رہبر ہو جس کا اکبر و اقبال کا شعور
حالی سے جس کو تحفۂ سوز جگر ملے
جس میں مسیح ملک نے پھونکی ہو روحِ فن
جس کو ابوالکلام سے درسِ ہنر ملے

ہم تو کشادہ دل ہیں کشادہ مزاج ہیں
ہم کو تو راہ میں جو ملا دوڑ کر ملے
ہم چاندنی کے شوق میں پھرتے ہیں بیقرار
شاید کہیں سے کوئی شعاعِ قمر ملے
اس ظلمتِ جمود میں تکتے ہیں ہر طرف
دیکھیں کہاں چراغِ سرِ رہ گذر ملے
ہم تو فقیرِ عشق گدائے خلوص ہیں
اس کی ہوس نہیں زر و لعل و گہر ملے
ہم کو تو اتنا اپنی جسارت پہ ہے غرور
ٹھوکر لگا دیں دولتِ قارون اگر ملے
مرتے ہیں اس لئے کہ رہے زندہ نامِ عشق
اس واسطے نہیں کہ کوئی نوحہ گر ملے
دشواریٔ حیات کا شکوہ ہو کیوں ہمیں
ہم کو ملا ہے سر تو کسے دردِ سر ملے
غم تو غذائے روح ہے اس سے گریز کیا
جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے
دیتے ہیں ایک بار صدائے دعا ضرور
جس کا بھی آستاں ملے جس کا بھی در ملے
اپنا تو کام ہے کہ جلاتے چلو چراغ
رستے میں خواہ دوست کہ دشمن کا گھر ملے

مقطع میں اور کچھ مجھے کہنا نہیں ہے ہاں
غالبؔ کا شعر پڑھ دوں اجازت اگر ملے
"ساقی گری کی شرم کرو آج - ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

---

www.taemeernews.com

ڈاکٹر صاحب کے خطوط پھر آتے رہے مگر اس نظم کا یا اس سلسلہ کی بات کا کوئی تذکرہ انہوں نے نہیں کیا۔ اور آہستہ آہستہ یہ بات میری سمجھ میں آتی رہی کہ یہ توقعات رائیگاں جائیں گی، اور ڈاکٹر صاحب کو اس کا احساس ہے کہ وہ توقع کے شایانِ شان کچھ نہیں کر سکیں گے اور واقعی وہ کچھ نہیں کر سکے۔ پھر وہ نائب صدر ہوئے۔ اور اسی دوران میں بھٹناگر صاحب کی لڑکی کی شادی میں وہ پٹنہ تشریف لائے۔ تقریب ہی میں مجھ سے ملاقات ہوئی۔ گرم جوشی اور محبت تو وہی تھی جو پہلے تھی مگر کچھ شرمایا سا انداز بھی تھا۔ پھر وہ صدر جمہوریہ بھی منتخب ہوئے۔ پھر میں نے بھی کوئی خط نہیں لکھا۔ ان کا بھی کوئی خط نہیں آیا۔ لال قلعہ اور ڈی۔ سی۔ ایم کے مشاعروں میں دہلی میں جاتا رہا، شریک ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال برابر رہا۔ ان کی یاد مستقل رہی۔ ان کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات دل میں ہر وقت رہیں۔ مگر میں ان سے جا کر ملنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اپنے سے زیادہ ان کا خیال تھا۔ فراق صاحب برابر راشٹرپتی بھون جا کر ان سے ملتے رہے اور دو تین بار فراق صاحب نے مجھ سے کہا کہ ذاکر صاحب تمہیں یاد کر رہے تھے اور تمہاری خیریت پوچھ رہے تھے ـــ اقتدار اور مال میں ولی اور قطب بھی سنبھل نہیں سکے۔ ڈاکٹر صاحب تو ولی قطب نہیں تھے۔ وہ باتیں بھی ہوئیں جو ان سے متوقع نہیں۔ مگر ان کی جگہ میرے دل میں ہے اور ان کے لئے دعا میری زبان پر۔ وہ ایک نہایت شریف انسان اور بڑے انسان دوست تھے۔ ان کے علم ان کی صلاحیت سے قطع نظر وہ ایک ایسے آدمی تھے جن سے ہر آدمی کو محبت ہونی چاہئے۔ انسان سے زیادہ خدا کی نگاہ میں۔ انسان کی توانائیاں اور کمزوریاں ہیں۔ خدا کا معاملہ خدا کے علم کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ ہمارے علم اور ہماری واقفیت کے اعتبار سے نہیں۔

کل ایک دوست نے پوچھا۔ "آئندہ قسطیں ابھی سن لو مجھ سے" کی کب آ رہی ہیں؟" میں نے کہا "میں خود نہیں جانتا۔ جو لکھا تھا وہ بھیج دیا۔" وہ بولے "فلاں کے متعلق نہیں لکھو گے اور فلاں صاحب کے متعلق کیا لکھو گے؟" میں نے کہا "میں خود نہیں جانتا کس کے بارے میں لکھوں گا۔ کیا لکھوں گا۔" وہ بولے "نہیں بھائی ایک Plan بنا لو۔ خاکہ درست کر لو۔" میں نے کہا "چالیس پینتالیس سال ہوش سنبھالے ہو گئے، آج تک نہیں جانا Plan کسے کہتے ہیں۔ خاکہ کس چیز

www.taemeernews.com

کا نام ہے ۔ صبح ہوئی تو شام تک کا خاکہ نہیں جانا ۔ شام ہوئی تو رات کیسے گذرے گی نہیں سمجھا ۔ جو کچھ گذر چکی وہ خاکے اور پلان کے مطابق کہاں گذری ایسا ہوتا تو غزل کیسے ہوتی اور ایسا ہوتا تو کیا "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" وہ ہوتی جو ہے ؟ اور "ابھی سن لو مجھ سے" وہ ہوگی جو شاید ہونے والی ہے ؟ چوکھٹا بنا نہیں کہ تصویر گئی ۔ خاکہ تیار ہوا نہیں کہ حسن رخصت ہوا ۔ مصور کا قلم اور خاکہ ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ لیونارڈو ڈاونسی نے "مونالی سا" کا خاکہ تھوڑا ہی تیار کیا ہوگا ۔ "مونالی سا" اس کی روح میں اتر گئی تھی ۔ روح نے ہاتھ کو متحرک کیا ۔ ہاتھ نے قلم پکڑا ۔ قلم نے رنگ لیا ۔ روح خاکہ بناتی رہی قلم رنگ بھرتا گیا ۔ روح کے اجزا ہاتھ قلم اور رنگوں کے سہارے منتقل ہوتے رہے روح میں اُتری ہوئی صورت کا آخری حصہ جس وقت منتقل ہوا خاکہ اسی وقت مکمل ہوا اور تصویر تیار ہوگئی ۔

آج دو تین ہفتہ کے بعد پھر لکھنے بیٹھا ہوں ۔ کل دو مجلسوں میں شرکت ہوئی ۔ صبح کو ایک غم کی مجلس تھی، دنیا سے رخصت ہو جانے والی ایک روح کو ایصال ثواب کیا جا رہا تھا ۔ یہ معاملہ سب کے ساتھ ہونے والا ہے یہ منزل سب کے سامنے آنے والی ہے ۔ ایسی مجلسوں میں عموماً دل کثافتوں سے پاک ہو جاتے ہیں ۔ مجلس کے بعد بہت سے بزرگ ملے ۔ کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھا کسی نے گلے لگایا ۔ کسی نے دعائیں دیں ـــــ "بڑا جی خوش ہوا کلیم ۔ بس معلوم ہوتا ہے میرے ہی جی کی بات لکھ رہے ہو ۔ میرے ہی آنکھوں کا منظر پیش کر رہے ہو ۔ میرے ہی خیال کی ترجمانی کر رہے ہو" ۔

"ہاں کلیم ۔ اتنی دیر دیر پر لکھو گے ۔ میاں زندگی مختصر ہے داستان طویل ہے رکو مت لکھے جاؤ" ۔ سب کی آنکھوں میں محبت کی چمک شفقت کی مہک ۔ میں نے کہا "بیشک آپ ہی کی چیزیں پیش کر رہا ہوں ۔ آپ ہی لوگوں سے سیکھی ہیں ۔ فرق یہ ہے کہ میں نے انہیں یاد رکھا ہے ۔ یہ سعادت بھی بزور بازو نہیں ہے ۔ یہ بھی کسی بخشنے والے ہی کا فیض ہے" ـــــ یہ بزرگوں کی مجلس تھی ۔

شام کو جوانوں کی نوجوانوں کی مجلس تھی ۔ ادیبوں کی شاعروں کی، سخن نوازوں کی، سخن پسندوں کی، سخن فہموں کی، ترقی پسندوں کی، جدت پسندوں کی ۔ وہاں کچھ بزرگ بھی تھے، حق پسند بھی تھے، کسی نے کہہ دیا ۔ "میاں کلیم ۔ میاں کیا لکھتے ہو ۔ ہائے میاں کیا لکھتے ہو ۔ کیا

www.taemeernews.com

زبان ہے، کیا انداز ہے، کیا قلم ہے۔" جیسے میر صاحب نے اپنی شاعری کے سلسلہ میں کہا ہے کہ ؎

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا ؟
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

اور دیکھا تو کچھ چہرے بجھ گئے، کچھ چہرے تیز ہو گئے، کچھ آنکھیں مرجھا گئیں کچھ آنکھیں آگ برسا گئیں اور مجھے کسی کا شعر یاد آگیا کہ ؎

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے
نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے

لیکن پیدائش پر کس کا اختیار اور مرنے پر کس کا زور ہے یا کسی چیز ہی پر کس کا اختیار ہے ؟ زندگی تو دریا ہے بہتا چلا جاتا ہے کسی کو پہاڑیوں سے گذرنا ہے کسی کو جھاڑیوں سے اور گذرنا ہی پڑے گا۔ کسی کو وادیوں میں مست خرامی کرنا ہے۔ پھولوں سے، پودوں سے خوش کلامی کرنا ہے کسی کو پتھروں سے ٹکرانا ہے کانٹوں سے بدن چھلنی کرانا ہے مگر بہرحال بہنا ہے۔ دریا دیکھئے میں سب ایک ہی ہیں۔ لیکن جو دریا کے ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ دریا دور سے کچھ اور ہے، نزدیک سے کچھ اور۔ کہیں کچھ اور ہے کہیں کچھ اور کسی کو کیا معلوم کہ میں نے زندگی کے پچپن سال کیوں کر گذارے۔ میں نے کل ہی غزل کا مقطع پڑھا کہ ؎

نام دنیا نے دیا ہم کو پیمبر کا کلیم
کام تقدیر میں لکھا تھا عنادل والا

مقطع کانوں سے سرسری گذر گیا ہوگا پیمبر اور عنادل کے استعاروں کو سمجھنے والے بھی کتنے ہیں اور جو ہیں وہ اس روایت میں حقیقت ڈھونڈنے کی کوشش کہاں کرتے ہیں اور حقیقت ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جانے والے بھی اس حقیقت کی لذت سے کتنے آشنا ہیں۔ کون جانے کہ درد سر اور درد دل کے یک جا ہو جانے کا مقام کیا ہے۔ آج نہ تو درد دل کا مزا کوئی جانے ہے نہ درد سر کا آج شاعری میں درد سر زیادہ ہے وہ بھی اپنا نہیں پرایا۔ اصل کا نہیں نقل کا۔

کیا جران کو کہ دل ہاتھوں سے تھامے تھامے وہ جو انگاروں میں رکھتے ہیں قدم کیسے ہیں ؟

www.taemeernews.com

دردِ دل میں کچھ لوگ اپنے کو قتل کر دیتے ہیں اور درد سر میں دوسروں کو قتل کر دیتے ہیں۔ لیکن درد دل اور درد سر دونوں ہو جائے تو نہ اپنے کو قتل کرتے بنے ہے نہ دوسروں کو۔ یہ خدائی اور بندگی کا امتزاج ہے۔ اقبال نے کہا ہے

خدائی انتظامِ بحر و بر ہے
خداوندا خدائی درد سر ہے
مگر یہ بندگی اللہ اکبر
یہ دردِ سر نہیں درد جگر ہے

اقبال درد جگر کے بارے میں کہتے ہیں۔ اگر انہیں درد سر بھی مل جاتا تو پھر دیکھتے کیا قیامت آتی۔ بہرحال خیریت ہی رہی۔ میر بے چارہ دونوں سوغات اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ بہتر نشتروں میں ہمیں دے گیا۔ اتنا سا جو دے گیا ہے اسی پر کہتا ہے کہ ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

سب دے جاتا تو کیا قیامت ہوتی۔ یہ عقل و جنوں کا فلسفہ یہ عقل و عشق کا فلسفہ، پڑھنے پڑھانے والوں کے لئے فلسفہ ہی رہ گیا تھوڑا بہت جانتے ہیں تو انہیں اشعار کے ذریعہ ؎

باچنیں جوش جنوں پاس گریبا داشتم
در جنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

بیشک کار ہر دیوانہ نہیں ہے۔ نہ جیا جائے نہ مرا جائے۔ ہر دیوانے کے بس کا کہاں؟ جو فلسفہ جانتے ہیں وہ اس طرح جینا نہیں جانتے۔ جو اس طرح جینا جانتے ہیں وہ فلسفہ نہیں جانتے۔ فلسفہ سب جان لیتے ہیں ایسی زندگی کو کون جانتا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ پچھلے چالیس برسوں میں میری بند آنکھوں پر کبھی آفتاب طلوع ہوا۔ لوگ میری شاعری سے سمجھتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء سے زندگی شروع ہوئی۔ شروع تو کب کی ہو چکی تھی۔ اس وقت تو شباب کو پہونچی۔ ایسی بات نہیں کہ میں بڑا خدا پرست ہوں، عبادت گذار ہوں اس لئے شب زندہ دار ہوں۔ میاں آنکھوں کی

www.taemeernews.com

کی نیند تو دل کے چین پر منحصر ہے۔ روح مضطرب ہو تو آنکھ مطمئن کہاں۔ قلب کی ناآسودگی، آنکھوں کی ناآسودگی میں جھانکتی ہے۔ یہ ناآسودگی کیسی ہے کیوں ہے مجھے خود پورا پتہ نہیں۔ اور اچھا ہے کہ پتہ نہیں ورنہ پھر میں بھی فلسفی ہو جاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ نہیں ہوں۔ یہ ناآسودگی "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" کے پس پردہ کہیں جھانکتی ہے۔ اس میں بھی چھپ کر رہتی ہے کھل کر سامنے نہیں آتی۔ یہاں تک کہ میرے سامنے بھی چلمن سے لگی بیٹھی رہتی ہے۔

---

www.taemeernews.com

پٹنے کالج میں داخلہ تو میں نہیں لے سکا لیکن پٹنہ کالج کو پہلی بار کب دیکھا اس کا دھندلا خاکہ ذہن میں اس وقت آرہا ہے۔ دھندلا اس لئے کہ اس واقعہ کو میں نے کبھی یاد نہیں کیا، دہرایا نہیں یاد نہ کرنے اور نہ دہرانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد پٹنہ کالج سے اچھا خاصہ تعلق رہا۔ میرے بہت سے قرابت کے نوجوان پٹنہ کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ مجھے کھینچ کھینچ کر پٹنہ کالج لے جاتے اور مجھے پس پردہ رکھ کر میری موزونیٔ طبع سے فائدہ اٹھاتے۔ گرچہ مجھے وہ شاعر نہیں سمجھتے تھے اور میں بھی ہرگز اپنے کو شاعر نہیں سمجھتا تھا مگر شعر و شاعری سے طبیعت کو مناسبت اتنی تھی۔ اور اس مناسبت سے مزاج اتنا شاعرانہ تھا اور زبان اتنی بے ساختہ تھی، طبیعت اتنی موزوں تھی کہ مشق نہ ہونے کے باوجود اور شعر کہنے کا شوق نہ ہونے کے باوجود لوگ مجھ سے شعر کہلوا لیتے اور گاہے بہ گاہے حالات اور تقاضوں سے متاثر ہو کر میں بھی شعر کہہ لیتا۔

ہاں تو پٹنہ کالج کی چہار دیواری کے اندر میرا پہلا قدم کیسے گیا سنئے۔۔۔۔ گرین میڈیکل ہال جو گورنمنٹ اردو لائبریری کے سامنے ہے، میں اکثر جایا کرتا تھا۔ میرے ایک رشتہ کے نانا وہاں کمپونڈر تھے۔ اور کمپونڈر اس طرح کہ وہی دواخانے کے انچارج تھے۔ ڈاکٹر عبدالغفور صاحب نے پوری ذمہ داری ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ دواخانے میں بھی اور دواخانے سے باہر بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ابھی چند دنوں پہلے ڈاکٹر مسعود الحق صاحب سے ان کا تذکرہ نکل آیا اور انہوں نے میرے خیال کی تائید کی۔ ان کا نام منشی لیاقت حسین تھا۔ پٹنہ میں اسکول کی تعلیم کے دوران لیاقت نانا ہی میرے ولی اور گارجین تھے۔ اس لئے تقریباً روزانہ ان کے یہاں میری ڈیوٹی تھی۔ وہ مجھ پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ اسی دواخانے میں ایک دوسرے کمپونڈر ظفر صاحب تھے جن کا لڑکا مہدی میرا ہم سبق یا ہمعصر تھا۔ ظفر صاحب مہدی کے ساتھ بڑی رعایت کا معاملہ کرتے۔ کسی قسم کی کوئی گرفت ان پر نہیں ہوتی تھی۔ آزادی سے گھومنا پھرنا، سیر و تفریح، سنیما،

www.taemeernews.com

تماشے ان کے معمولات تھے۔ اس کے برعکس صبح و شام کی حاضری میری روزانہ کی ذمہ داری تھی۔ گرچہ لیاقت نانا میرے عادات و اطوار، مزاج اور معمولات سے خوب واقف تھے۔ مگر وہ شہر کے عمومی ماحول کے خطرات بھی جانتے تھے اور اس کی حفاظت میں وہ خود بھی شریک رہنا چاہتے تھے۔

ایک شام ان کے یہاں حاضری کے بعد میں گرین میڈیکل ہال سے نکل رہا تھا۔ لیاقت نانا بھی میرے ساتھ تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کچھ حال پوچھتے ہوئے اور کچھ ہدایتیں دیتے ہوئے برآمدے سے سڑک پر میں اُترنے والا تھا کہ انہوں نے کندھے پر رکھے ہوئے اپنے ہاتھ سے کندھا زور سے دبایا اور سامنے اشارہ کر کے کہا۔

"ان کو سلام کرو۔"

میں نے دیکھا، ایک انگریز، تقریباً چالیس سال کی عمر، تندرست اور بلند و بالا، تیر کی طرح سیدھا، منھ چوڑا، کتابی چہرہ، سرخ و سپید، سر پر ہلکے بال، ہاتھ میں ایک کتاب لئے مغرب کی جانب سے آرہا ہے۔ میں نے کہا، "میں کیوں سلام کروں؟"

وہ بولے "سلام کرو، پڑھے لکھے آدمی کو سلام کرنا چاہیے۔ ممکن ہے یہ تمہارے استاد بنیں۔"

وقت اتنا نہیں تھا کہ مزید استفسار ان سے کرتا۔ میں سڑک پر کود گیا اور ہاتھ پیشانی تک لے جا کر اشارے سے میں نے اس گذرتے ہوئے انگریز کو سلام کیا ــــ وہ چلتے چلتے رُک گیا۔ میری طرف دیکھا۔ مسکرایا اور تیزی سے جھٹکے کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ اور سامنے کھڑے ہوئے لیاقت نانا کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اُنہیں بھی سلام کیا۔ لیاقت نانا نے انگریزی میں کہا، "میرا ناتی ہے" ــــ "My Grandson"

"اوہو اوہو" کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایسی انگریزی بولا، ایسے لہجے میں انگریزی بولا کہ میں سمجھ نہ سکا۔ کچھ اس قسم کے الفاظ میرے کانوں میں آئے۔

"DA, YA, NO, HO, FA, PAT, CO"

میں کچھ ندامت اور کچھ الجھن میں اس انگریز کا منہ دیکھتا رہا اور وہ انگریز دوبارہ مصافحے میں پکڑے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے، جھک کر میری طرف دیکھتے ہوئے پھر وہی الفاظ دہرائے

www.taemeernews.com

اور یونہی دُہرائے اور میں پھر بھی نہیں سمجھ سکا۔ وہ پھر اور زیادہ کھل کر مسکرایا اور یونہی جھکے جھکے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اپنا جملہ یوں دہرایا۔

"Do you know how far is Patna college?

میں سمجھ گیا اور خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں اور میں نے بے ساختہ کہا۔ "yes sir"

"All right, then show me, the away."

لیاقت نانا کھڑے رہے، مسکراتے رہے اور میں اس انگریز کو لے کر پٹنہ کالج کی طرف بڑھا۔ پٹنہ کالج گیٹ تک آیا۔ انہیں اندر کی عمارت بتائی اور کھڑا ہو گیا۔ اس انگریز نے میرا ہاتھ پکڑا اور گیٹ کے اندر داخل ہوا۔ مجھے یہ بات عجیب لگی مگر میں نے مدافعت نہ کی۔ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ ایک اجنبی سیاح نے ایک جگہ کا پتہ پوچھا، میں نے وہ جگہ ہی ساتھ آکر دکھا دی۔ اب آگے میری کیا ضرورت؟ مگر وہ عمارت کی طرف بڑھتا رہا۔ دوسری بات یہ عجیب لگی کہ سامنے سے آتے ہوئے لوگ، جن میں طلبا بھی ہوں گے اور شاید کالج کے اساتذہ بھی، سب اس انگریز کو سلام کر رہے تھے۔ یہ بات بھی مجھے غیر معمولی نظر آئی۔ ایک سیاح کا یہ اکرام؟ پھر سوچا ملک انگریزوں کا ہے۔ اس وقت کا ادب عالم گیر حیثیت رکھتا ہے۔ مگر جنگ آزادی بھی چھڑی ہوئی تھی اور جنگ عظیم بھی۔ اس کشمکش سے ہندوستانی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس تمام پس منظر میں اس انگریز کا وجود، اس کی اجنبیت اور پٹنہ کالج کے اندر آتے ہوئے جاتے ہوئے لوگوں کا اکرام اور ادب کے ساتھ اس انگریز سے متوجہ ہونا میرے ذہن کو الجھا رہا تھا اور میں جلد ہاتھ چھڑا کر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ پورٹیکو کے قریب آکر وہ رک گیا۔ عمارت کی چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور بول اُٹھا۔

"So, this is Patna college!"

پھر مجھ سے اس نے پوچھا، میں کس کلاس میں پڑھتا ہوں اور کہاں پڑھتا ہوں۔ میں نے جواب دیا مسلم اسکول کے میٹرک کلاس میں۔ اس نے کہا۔

"Sooner or later you are to come to this college, but I am leaving this

www.taemeernews.com

college and I love this college."

الفاظ بدلے ہوئے ہوں گے۔ مافی الضمیر یہی تھا۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

"Do you know me my boy?"

میں نے جواب دیا، میں آپ کو نہیں جانتا۔ اس نے کہا۔

"My name is Hill. I am professor of English in this college. Now go tell my SALAM to your Grand father."

میں متحیر ہو کر اس کے سامنے کھڑا رہا اور وہ ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں اسی وقت لیاقت نانا کے پاس آیا۔

"کیا آپ مسٹر ہل کو پہچانتے تھے؟"

"خوب پہچانتا ہوں، جانتا ہوں، ملتا رہتا ہوں، اسی لئے تمہیں سلام کرنے کے لئے کہا۔ وہ تم سے ایک تازہ وارد کی طرح ملے۔ یہ بڑے لوگوں کی بڑائی ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ، جوانوں کے ساتھ جوان، بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے، یہ استادوں کی شان ہے، یہ زندگی کا سلیقہ ہے، جو مشکل سے آتا ہے۔"

بعد میں سنا کہ پروفیسر ہل نے فوج میں داخلہ لے لیا اور محاذ جنگ پر چلے گئے۔ قوموں کی ترقی من حیث القوم بے وجہ نہیں ہوتی۔ ان میں کچھ انفرادی ایسی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو ترقی کا سبب بن جاتی ہیں۔ وہ خوبیاں اور صفات اجتماعی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں تو قوم بلندی پر پہنچ جاتی ہے۔ انگریزوں نے جس وقت ہندوستان پر تسلط حاصل کیا وہ دور انگریزوں کے زوال کا آغاز تھا اور ہندوستان سے اس کا انخلا اس زوال کا شباب۔ وہ اجتماعی خوبیاں کم ہوتے ہوتے انفرادی بن گئیں۔ اور انفرادی صفات سے قوموں کو عروج حاصل نہیں ہوتا۔ مسٹر ہل جیسے لوگ کم ہوں گے جنہیں ہندوستان سے بھی محبت ہو، پٹنہ کالج سے بھی محبت ہو اور اپنے قومی فرض منصبی سے بھی اسی درجے کا عشق ہو جو محبت والی جگہ محبت والے ماحول سے چھڑا کر زندگی کو آگ میں جھونک دینے کے لئے بلا تکلف

www.taemeernews.com

آمادہ کردے ۔

مسٹر ہل کا ذکر آیا تو ایک انگریز کا ذکر اور کردوں ۔ یہ فسادات بہار سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے ۔ جنگ شاید ختم ہو چکی تھی یا ختم ہونے والی تھی، مجھے یاد نہیں ۔ کانگریس اور مسلم لیگ تحریک شباب پر تھی ۔ ۱۹۴۲ء کا "ہندوستان چھوڑو" تحریک میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ۔ سکریٹریٹ کی فائرنگ اور فائرنگ کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد لاشوں کے ساتھ اسپتال کی طرف جاتا ہوا جلوس اپنی آنکھوں سے دیکھا، جس کے آگے آگے پٹنہ ضلع کی بھدول بستی کے رہنے والے میرے ایک بزرگ مسٹر علی رضوی بھدولی نعرہ لگاتے ہوئے جا رہے تھے ۔

"پٹنہ کی پہلی قربانی"

"ہندوستان کی آزادی کے لئے پٹنہ کی پہلی قربانی"

شاید رضوی صاحب کو یاد نہیں رہا ہو کہ اس سے پہلے ہندوستان کی آزادی کے لئے پٹنہ قربانیاں دے چکا تھا اور شاید اس سلسلے کی سب سے پہلی قربانی گورہٹہ محلہ پٹنہ سیٹی کے ایک مولوی کتب فروش پیر علی کی تھی ۔ بہرحال تو ۱۹۴۲ء کی تحریک دیکھی جب بی ۔ این کالج اور ہوسٹل میں کینڈین فوج کی چھاؤنی تھی ۔ فوجی ٹرک کے آنے جانے سے کالج اور ہوسٹل کے درمیان والی سڑک جُتی ہوئی کھیت بن گئی تھی ۔ یہاں گڈھا، یہاں ٹیلہ ۔ اپنے بھائیوں کی بے دردی بھی دیکھی جب دو امریکن یا کینڈین شہری کے پیٹ میں بھالا مارا گیا اور ان امریکن یا کنیڈین کی بہادری بھی دیکھی کہ سگریٹ پیتے جاتے تھے اور اپنے پیٹ سے بھالا نکالتے جاتے تھے اور شاید سگریٹ پیتے ہوئے گرے ۔ تو یہ سب دور گذر چکا تھا ۔ ہندوستان چھوڑنے کی مصالحتی گفتگو چل رہی تھی ۔ میں بی ۔ این کالج کے قریب ایک مکان میں تھا ۔ ہاں اب یاد آیا ۔ جنگ عظیم جاری تھی اور تمام ہندوستان میں اور پٹنہ میں "ڈیفنس آف انڈیا رول" جاری تھا ۔ میرے مکان مالک نے مکان خالی کرنے کی تحریک شدت سے چلائی ۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا ۔ علیم مرحوم علیل تھے ۔ نسیم سلمہٗ پٹنہ بی این کالج میں زیر تعلیم تھے ۔ علیم مرحوم کے علاج کے لئے ہم لوگ کا قیام پٹنہ ہی میں تھا ۔ کرایہ بڑھانے پر مکاندار خالی کرانے پر مصر تھا ۔ چونکہ House control کا قانون بن چکا تھا ۔ اس لئے بآسانی

www.taemeernews.com

خالی کرنا مشکل تھا۔ مکاندار کا ایک لڑکا فوج میں نیا نیا کپتان بحال ہوا تھا' اس نے فوجی سطح پر کاروائی کی۔ فوجی سپلائی کا کنٹراکٹر بن کر کلکٹر کے یہاں درخواست دی کہ فوجی سپلائی کا سامان رکھنے کے لئے مجھے مکان کی ضرورت ہے' میرا مکان خالی کرا کے مجھے دے دیا جائے۔ کلکٹر نے آرڈر دے دیا کہ پندرہ دنوں کے اندر مکان خالی کر دیا جائے۔ بالا بالا کاروائی کر کے ایک ہفتہ قبل مجھے نوٹس ملی۔ میں وکیلوں کے پاس گیا۔ سب نے کہا اس میں کوئی قانونی کاروائی ممکن ہی نہیں یہ سرکاری Requisition order ہے اس کی اپیل نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ کلکٹر انگریز ہے اسی نے Requisition کیا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے سادہ کاغذ پر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں درخواست لکھی۔ اپنی مجبوری، کمسنی اور سرپرست یعنی والد کا انتقال، بھائی کی سخت علالت' جو کچھ بن سکا' سچے دل سے لکھا۔ صبح ۹ بجے کلکٹر کے بنگلے پر تنہا حاضر ہوا۔ کچھ دیر بعد اجازت ملی۔ ملاقات کے کمرے میں گیا۔ دیکھا سامنے ایک انگریز میانہ قد' گول بدن، گول چہرہ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں، گھنی بھنویں، موٹے موٹے ہونٹ، بھرے بھرے کلّے، نیم آستین کی سفید قمیض پہنے بیٹھا ہے۔ کھلا ہوا ہاتھ بھورے بالوں سے بھرا ہوا ہے۔ انگلیوں میں قلم ہے جسے دانتوں سے آہستہ آہستہ چبا رہا ہے۔ اور سامنے دروازے پر نگاہ ہے۔ یہ تھے مسٹر J. S. Hardman کلکٹر پٹنہ۔ میں نے اسی طرح ہاتھ اٹھا کر بے آواز سلام کیا۔ ٹیبل کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ نوٹس اور آرڈر کی نقل کے ساتھ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر ان کے سامنے بڑھا دی وہ انہماک سے پڑھنے لگا۔ پھر نوٹس دیکھا۔ پھر اپنا آرڈر دیکھا۔ پھر دوبارہ میری درخواست پڑھنے لگے۔ سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر پڑھنے لگے ـــ پڑھنے کے بعد پھر قلم چبانے لگے ـــ اور یک بیک ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں مجھ سے پوچھا۔

"مکان میں کتنا کمرہ ہے؟"

"چار کمرے نیچے ہیں، تین اوپر۔" میں نے کہا۔

"آپ کو کتنا کمرہ ضروری ہے۔"

حقیقت حال یہ تھی کہ میری ضرورت کے لئے تین چار کمرے کافی تھے۔ میں نے سچائی سے

www.taemeernews.com

عرض کردیا ۔

"تین چار کمروں سے میرا کام چل جاسکتا ہے ۔"

کلکٹر صاحب نے آگے اور کوئی سوال کئے بغیر فوراً مختصر آرڈر لکھا' جو تاریخی آرڈر ہے ۔ اور جس نے سنا سب نے کہا کہ ایسا ہونا اس جنگی صورتحال میں ممکن نہ تھا ۔ ریکوزیشن آرڈر میں کبھی ترمیم نہیں ہوتی ۔ نہ اس کی اپیل ہوتی ہے ۔ یہ بات مرحوم مغفور مولوی عبدالحفیظ صاحب وکیل نے بھی فرمائی ۔ جو اس زمانے میں بقید حیات تھے ۔ کلکٹر نے لکھا :

"The ground floor with four rooms is exempted from requisition order."

J. S. Hardman

مجھے بڑی ڈھارس ہوگئی ۔ خدا کے فضل سے یہ بڑا کام ہوا اور مجھے ہارڈین سے اُنس ہوگیا ۔ جیسے وہ میرے ہمدرد ہیں' میرے غمگسار ہیں ۔ اور اسی جذبے سے متاثر ہوکر میں نے ایسی بات کلکٹر سے کہہ دی جو کسی آفیسر سے پہلی ملاقات میں نہیں کہی جاتی ۔ چہ جائیکہ ضلع کلکٹر سے اور وہ بھی انگریز کلکٹر سے ۔ جذبات سے مغلوبیت کے عالم میں میری زبان سے نکل گیا :

"کلکٹر صاحب مکاندار علاقے کا بہت بڑا آدمی ہے ۔ وہ کارپوریشن کا کنسٹر ہے' اکثریتی فرقے کا ہے' حکومت میں رسوخ رکھتا ہے' لڑکا فوجی آفیسر ہے' مجھے اس مکان میں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے ۔ میں اس علاقے میں تنہا رہتا ہوں ۔"

جے ۔ ایس ہارڈین' ضلع کلکٹر نے دانتوں سے قلم نکال لیا ۔ ہاتھ ٹیبل پر ٹیک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک مختصر جملہ کہا' جو اس مختصر آرڈر ہی کی طرح تاریخی ہے اور میں انگریز ضلع کلکٹر کا وہ جملہ کہتے ہوئے اس کے تیور اور اس کی آنکھوں کی نرمی اور اس نرمی میں شفقت اور محبت کا رچاؤ آج تک نہیں بھول سکتا ہوں ۔ یہ جملہ مجھے اکثر یاد آتا ہے' ضلع کلکٹر کا چہرہ اور اس کا سارا پیکر میری نگاہوں میں جاگ اُٹھتا ہے ۔ اس نے کہا ۔

www.taemeernews.com

"آپ کیوں ڈرتا ہے بچہ؟ اکیلا ہے تو کیا ہے، ہم بھی اکیلا ہے،
خدا بھی اکیلا ہے۔"

اور اس کے بعد بھی میں تقریباً پانچ سال مزید اس مکان میں رہا اور اس طرح رہا کہ بقیہ کمرے اوپر کی منزل والے بھی میرے ہی استعمال میں رہے۔ مکاندار کا مقصد پورا مکان خالی کرانا تھا۔ وہ نہ ہوا تو آدھا خالی مکان اس کے کام کا نہ تھا۔ اس مکان میں تنہا تمام انقلابات دیکھے، آزادی کے پہلے کی قیامتیں دیکھیں، آزادی کے بعد کے مصائب دیکھے، تنہا رہا۔ عزت کے ساتھ رہا۔ وقار اور احترام کے ساتھ رہا۔

J. S. Hardman پٹنہ ضلع کلکٹر کے دو احسان ہیں۔ ایک میرے سر پہ کہ اس پر سایہ باقی رکھا۔ وہ مجھے جانتے نہ تھے۔ میں کوئی جاننے کے قابل آدمی تھا بھی نہیں۔ وہ جنگ کا زمانہ تھا، تقریباً ایمرجنسی کا دور تھا۔ جب اندھیرا اُجالا نہیں دیکھا جاتا۔ معقول نامعقول نہیں دیکھا جاتا۔ بس ایک ہی معقول بات ہوتی ہے یعنی سرکاری ضرورت، سرکاری حکمت، سرکاری سیاست۔ اور پھر میرے پاس کوئی معقول عذر بھی نہیں تھا، قابل بحث دلیل بھی نہیں تھی ـــــ اور ہارڈمین نے کوئی حجت نہیں نکالی، کوئی دلیل نہیں مانگی، صرف ایک بات پوچھی، جو نہ کوئی وکیل پوچھتا ہے، نہ پوچھنے کی یہ بات تھی، نہ کوئی منصف، نہ کوئی حاکم یہ پوچھتا ہے۔ بس اس نے ایک ہی بات پوچھی ـــــ اور ڈیڑھ سطر کا فیصلہ لکھ دیا۔

دوسرا احسان میرے دل پر کیا۔ ویسے میرا دل پہلے سے بھی مطمئن تھا۔ لیکن اس کے ایک جملے نے اور مطمئن کر دیا۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ میرا دل یہی فیصلہ سننا چاہتا ہے۔ وہ جملہ ان کی زبان سے نہیں نکلتا تب بھی شاید میں وہی کرتا مگر میرے دل کی بات کہہ کر ہمیشہ کے لئے ہارڈمین نے میرے دل میں جگہ بنالی۔ کتنی لگتی ہوئی بات انہوں نے کہی۔ لگتی ہوئی بات شاعر کہتا ہے یا کوئی پہنچا ہوا فقیر۔ مجھے معلوم نہیں وہ کیا تھے ـــ شاعر تھے یا فقیر۔ ویسے کبھی کبھی پکے دنیا داروں کی بات بھی تیر بہدف ہو جاتی ہے۔

www.taemeernews.com

میٹرک کر لینے کے بعد کالج میں داخلہ تو نہیں لے سکا مگر پٹنہ کے دونوں کالجوں، پٹنہ کالج اور بہار نیشنل کالج کے دیکھنے والوں میں؛ جاننے والوں میں، حالات سے باخبر رہنے والوں میں شاید مجھے زیادہ دور رہ کر قریب بہت کم ہوں گے۔ ابھی ایک سال پہلے بہار نیشنل کالج کے قدیم طالب علموں کا جلسہ تھا۔ مسٹر اے۔ پی۔ شرما وزیر مملکت ہند دہلی سے صدارت کے لئے آئے تھے۔ بی۔ این۔ کالج کے قدیم اور پرانے طالب العلم تھے۔ جلسہ ہوا، صدر کی تقریر ہوئی۔ انہوں نے کالج سے اپنے قدیم تعلق، قربت اور محبت کی داستانیں سنائیں۔ کہنے لگے زمانہ نے مجھے ہمیشہ کالج سے دور رکھا۔ کبھی روزگار نے، کبھی سیاست نے۔ لیکن دل کالج میں اٹکا رہا۔ اب بھی برسوں سے دور ہوں لیکن دل اس کی محبت سے سرشار ہے وغیرہ وغیرہ ـــــ میں جلسہ میں موجود تھا۔ مسٹر بوس پرنسپل بی۔ این کالج جو میرے استاد بھی ہیں، بولے "تم بھی کچھ کہو گے؟" میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا۔

"شرما صاحب نے چار سال کالج میں پڑھا۔ وہ کالج سے برسوں دور رہتے رہے اور اب بھی برسوں سے دور ہیں، ان کو کالج سے بڑی محبت ہے اور یہی محبت اور قدیم تعلق انہیں آج جلسے کی صدارت کا حق عطا کر رہی ہے۔ میں نے صرف دو سال اس کالج میں پڑھا ہے۔ وہ اڑتیس سال سے بی۔ این کالج کو جان رہے ہیں۔ میں چالیس سال سے جان رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں اور اس طرح دیکھ رہا ہوں کہ صبح اٹھ کر بی۔ این۔ کالج کی دیواروں کا آئینہ دیکھتا ہوں اور رات کو یہی آئینہ دیکھتا ہوا سوتا ہوں اور قربت اتنی ہے جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی۔ بلکہ دن رات میں سیکڑوں بار گردن اٹھاتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔ میں تقریباً چالیس سال سے کالج کا پڑوسی ہوں۔ اب بتائیے صدارت کا حق کس کو ہے؟"

www.taemeernews.com

شرما صاحب اتنے خوش ہوئے کہ اپنی کرسی چھوڑنے لگے۔ اور ناشتے میں اپنی کرسی کی بغل میں اپنی کرسی خالی رکھی تاکہ جب میں آؤں تو ان کی بغل میں بیٹھوں۔ اور کہنے لگے دہلی آؤ تو میرے یہاں آؤ۔

اور پٹنہ کالج جہاں داخلہ لینا تھا' وہاں دوسری نسبتوں سے خدا جانے کتنا آنا جانا رہا اس کے در و دیوار سے کتنی وابستگی رہی اور اس کی تاریخ سے اور اس کی داستانی ارتقا سے کتنی باخبری رہی اور پٹنہ کالج اپنے پچھلے چالیس سالہ دور میں کتنا آگے بڑھا کتنا پیچھے گیا، کتنا اوپر اُٹھا، کتنا نیچے گرا' انسان کتنے فرشتے بنے اور فرشتے کتنے شیطان بنے' تعلیم کتنی زندگیوں کا جزو بنی اور کتنی زندگیاں تعلیم کا جزو بن گئیں' کتنے تاریک رو روشن جمال ہو گئے اور کتنے سفید پوش سیاہ کار بن گئے۔ تعلیم نے کتنے بگڑے ہوؤں کو بنا دیا اور کتنے سنورے ہوئے لوگوں کو بگاڑ دیا۔ پٹنہ کالج کا ماحول کیا تھا، نقل و حرکت کیا تھی' ادب کیا تھا' تہذیب کیا تھی جاننے والے لوگ ہوں گے لیکن یاد رکھنے والے نہیں' جو یاد رکھنے والے ہیں وہ دہرا نہیں سکتے ——— ابھی پٹنہ کالج کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی ہے' زندگی رہی تو یہ ڈائمنڈ جوبلی بھی دیکھ لوں گا۔ وائس چانسلر صاحب نے جوبلی کے مختلف شعبوں کے لئے مختلف انتظامیہ بنائی ہیں۔ مشاعرہ کمیٹی شعبۂ اردو کو تفویض ہوئی۔ لوگوں نے کہا اور صدر شعبہ نے کہا "تم صدر کمیٹی بن جاؤ۔" میں نے کہا " عمر ساری تو کٹی ..... " سفیدی اور سرخی کے ساتھ چہرہ اب تک جگمگا تا رہا' اب کالک اس میں کیا لگاؤں ؟ میں نے وہ جوبلی بھی دیکھی جو شاید چالیس سال پہلے منائی گئی تھی۔ اور تقریبات میں اپنے تقاضائے سن کے اعتبار سے بہت انہماک کے ساتھ شریک رہا۔ مشاعرہ بھی دیکھا۔ کیا نظم تھا، کیا آراستگی تھی اور کیا نشست تھی اور کیسے اہل نشست تھے اور کیا وضع تھی اور کیا آداب تھے' ڈائس پر وائس چانسلر تھے (شاید سچدانند سنہا صاحب) اُن کی بغل میں بائیں طرف پرنسپل جے۔ بی۔ کالج مظفر پور (جو اب لنگٹ سنگھ کالج ہے) سفید شیروانی، چندیا بالوں سے خالی اور دائیں طرف مسٹر روش صدیقی مرحوم' سفید شیروانی اور سیاہ ٹوپی' ڈائس پر کیا شائستگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عظیم آباد کی تہذیب کو تصویر بنا کر اسٹیج پر سجا دیا گیا ہے

www.taemeernews.com

اور جب پرنسپل جے۔ بی۔ بی کالج مظفرپور جو ہندو تھے اور اردو میں شعر کہتے تھے، نام یاد نہیں، شعر پڑھنے لگے تو ایسا معلوم ہوا جیسے مشہور کانگریسی لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی شستہ اردو میں تقریر کر رہے ہیں اور سیاسی مجمع دم بخود سن رہا ہے اور روش صدیقی مرحوم نے جب یہ نظم شروع کی ؎

جگا دو ابن آدم کو جگا دینے کا وقت آیا

تو وائس چانسلر صاحب، اسٹیج کے معززین اور اساتذہ، طلبا، اور سامعین اس طرح جھوم رہے تھے جیسے اس سال اکاڈمنٹ جنرل کے مشاعرہ میں کلا مندر کے کھلے جلسہ گاہ کے اسٹیج پر زبیر رضوی کے اس غزل پر لوگ جھوم رہے تھے ؎

کالج کی کتابوں پر لڑکی کا پتہ لکھنا

روش صدیقی مرحوم کے یہاں بھی زندگی کی ایک حقیقت تھی اور زبیر رضوی کے یہاں بھی ایک حقیقت ہے مگر زندگی کی حقیقت نے کہاں سے کہاں سفر کیا ہے یہ عبرت ناک ہے۔ اور اس جوبلی میں سہ روزہ موسیقی کانفرنس تھی اور اس کانفرنس میں فن موسیقی کے کون کون مایۂ روزگار ماہرین و فنکار شریک تھے میں وہ چند نام جو مجھے یاد رہ گئے ہیں سناتا ہوں۔ بتائیے کیا نام آپ نے سنے ہیں؟ سنے ہیں تو کیا یاد ہیں؟ یاد ہیں تو کیا ان کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟ میں شاید ۳۹۔۴۰ سال بعد یہ نام کہہ رہا ہوں اور اس کے بعد ان کے متعلق کچھ بتاؤں گا اور پھر چند مناظر دکھاؤں گا۔

(۱) استاد فیاض خاں گوالیار	(۲) پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر کلکتہ
(۳) پنڈت گوسوامی نند حیدرآباد سندھ	(۴) پنڈت پٹوردھن بمبئی
(۵) پنڈت نرائن راؤ ویاس بمبئی	(۶) استاد حافظ علی خاں گوالیار
(۷) استاد امیر علی خاں کلکتہ	(۸) ماسٹر مشتاق علی خاں کلکتہ
(۹) کمار گندھرو بمبئی	(۱۰) کمار پلسکر بمبئی

کانفرنس شروع ہوتی ہے، کچھ تقریریں، کچھ موسیقی کی خصوصیات، کچھ فن کے آداب۔ اور اسٹیج

www.taemeernews.com

خالی ہوا، سازندے آئے اور ایک حلقے میں سارنگی والے، تانپورہ والے، یکتارے والے اور طبلے والے بیٹھ گئے۔ ان کے لباس اور ان کی وضع اور ان کے چہرے ایسے گویا کسی عبادت کی ادائیگی کے لئے بیٹھے ہیں۔ وہاں پانی نہیں ہوتے تھے، سگریٹ اور چائے نہیں چلتی تھی۔ یہاں تک کہ پانی کے گلاس اور جگ بھی نہیں آتے تھے اور وہاں دور نہیں چلتے تھے کہ ایک غزل گائی گئی، پھر خیال گایا گیا، پھر دُھرپد الاپا گیا، یا دوسری غزل شروع ہوئی۔ نہ ٹھمری نہ دادرا۔ بس ایک فنکار آتا تھا، سازندوں کے حلقے میں بڑی نمایاں سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا۔ سازندے ہلکا سا آغاز کرتے، اس کے بعد فنکار اپنا کام شروع کر دیتا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ تو گنگنانے میں لگتے۔ پھر آہستہ آہستہ بول شروع ہوتے، کوئی ایک ٹکڑا آہستہ آہستہ تول تول کر ادا ہوتا، اس میں مزید بیس منٹ لگتے، پھر تان شروع ہوتی۔ اس کے بعد راگ یا راگنی کا شباب شروع ہوتا اور یہ شباب کبھی ۴۵ منٹ، کبھی ایک گھنٹہ لیتا۔ اس طرح ایک راگنی یا راگ میں آغاز سے خاتمے تک کم از کم دو گھنٹے لگتے۔ جتنی دیر ایک مکمل فلم سنیما ہال میں لیتی ہے اور اس کے بعد فلم بین تھکے تھکائے، ٹکتے اور ڈگمگاتے ہال سے باہر آتے ہیں۔ ایک فنکار دو گھنٹے میں اپنے کمال کا مختصر مظاہرہ کر سکتا تھا اور اس دو گھنٹے میں پانی یا چائے کا ایک گھونٹ بھی حلق کے اندر نہیں جاتا تھا۔ یہ موسیقی تھی جو ہندستانی مذہبیات میں عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔

جی ہاں تو کمار گندھرو تشریف لائے۔ تقریباً بیس سال کی عمر، سانولا رنگ، پاجامہ اور پرنس کوٹ، کچھ بیماروں جیسا چہرہ۔ مگر وہ بیمار چہرہ اور بیمار جیسے لب، بیمار جیسی آنکھیں۔ بول کے ساتھ صحت مند ہونے لگیں اور موسیقی کے اتار چڑھاؤ میں آنکھیں کبھی فضاؤں کو چھو لیتیں اور جھکتیں تو تحت السریٰ کو پہونچ جاتیں۔ کمار گندھرو دُھرپد کے ماہر تھے۔ پھر پلسکر جی آتے ہیں: نوجوان ۱۷-۱۸ برس کا سن، گندمی رنگ، چھریرا بدن کھلتا ہوا قد لانبا کتابی چہرہ۔ کشتی نما گاندھی کیپ سے ملتی جلتی ٹوپی مگر ٹوپی اور کرتا ایک رنگ۔ ہلکا زرد، چست پاجامہ ماتھے پر چندن کا قشقہ اور گلے میں کسی لکڑی کے موتیوں کی مالا۔ پلسکر نے خیال شروع کیا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے فضا میں کوئی چیز رقص کر رہی ہے۔ اور اسی رقص کے ساتھ پلسکر کے ہاتھ اُس کی

www.taemeernews.com

آنکھیں گردش کر رہی ہیں اور چہرہ بول کے ساتھ مختلف انداز کی حرکتوں، دائیں بائیں اوپر نیچے کی وجہ کر سُرخ ہو رہا تھا۔ قدیم موسیقی، راگ اور راگنیوں کی مشق جسمانی، روحانی، دماغی اور قلبی ورزش کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس کی منزلوں سے گذرنا ایک عظیم مجاہدہ ہے۔ پلسکر کا بہت کامیاب تاثر مجمع پر رہا اور تمام سامعین اور ماہرین کو بڑی توقعات پلسکر سے تھیں۔ وہ پٹوردھن کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔ چند ہی برسوں بعد سنا کہ کسی نے رشک اور رقابت میں پلسکر جی کو زہر دے کر مار ڈالا۔

پنڈت نارائن راؤ ویاس۔ بھاری بھرکم مگر آواز بچوں جیسی سریلی تان لیتے تو تین تین منٹ تک سانس نہیں ٹوٹتی۔ پنڈت گوسوامی نندؔ سندھی ماہر موسیقی۔ لانبے چوڑے آدمی۔ سرخ و سفید رنگ۔ پچاس کے لگ بھگ عمر۔ بڑی سی رنگین زعفرانی پگڑی، اور زعفرانی مرزئی گھٹنے تک سفید باریک دھوتی۔ ان کے ساتھ سازندے نہیں رہتے۔ صرف طبلہ اور خود ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا تان پورہ جس کا کام صرف آواز کے وقفہ میں آواز کے سلسلے کو قائم رکھنا تھا۔ ایک یا دو تار پر ان کی انگلیاں آہستہ آہستہ چلتیں، اور ایک ہی بول کو دو گھنٹے مختلف انداز سے دہراتے یہ بڑا کمال تھا۔ ایک سُر کی تبدیلی سے بول کو نیا راستہ مل جاتا۔ ان کے پورے دو گھنٹے ایک ہی بول کے سینکڑوں اُتار چڑھاؤ میں گذر جاتے۔ استاد امیر علی خان اور مشتاق علی خان ستار کے بادشاہوں میں تھے۔ یہ گاتے نہیں تھے۔ ان کا فن اُن کے ساز میں تھا۔ موسیقی ستار کے درجنوں تار پر ناگن کی طرح لہریں لیتی۔ انگلیاں جب جوش میں تیز چلنے لگتیں تو واقعی ایسا معلوم ہوتا کہ ناگن غصے میں تیز پھنکاریں مار رہی ہے اور ساری فضا سائیں سائیں کرنے لگتی اور پوری کائنات، ہزاروں سامعین کا مجمع اس آواز کے سحر میں ڈوب جاتا اور دو گھنٹے سامعین کی نگاہیں، ستار کے تار اور فن کار کی انگلیوں پر جمی رہتیں۔ کلائی ستار پر یوں رقص کرتی جیسے کوئی کبوتر پلٹیں کھا رہی ہے اور سامعین دم بخود، پھٹی آنکھوں، رُکی سانسوں اور ساکت جسموں کے ساتھ اس ناگن کے زہر میں مدہوش نظر آتے اور راگ اور ستار کے گفتگو نما ہٹ کا جادو اسی وقت ٹوٹتا جب موسیقار کی کلائی رُک جاتی اور تاروں کے ارتعاش میں ہلکے ہلکے قدموں سے موسیقی کی رانی گنگناتی ہوئی دور

www.taemeernews.com

کہیں طلسمات میں جاکر کھو جاتی۔ اور پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھتا۔

پنڈت اونکار ناتھ ٹھاکر مشرقی ہند کے صاحبِ طرز ماہر موسیقی تھے جو واقعی موسیقی کو عبادت کی طرح برتتے تھے۔ اسٹیج پر آئے تو تمام فنکاروں میں وضع اور تقدس کے اعتبار سے بہت ممتاز نظر آئے۔ تقریباً پچاس سال کی عمر ہلکا گداز مائل بہ فربہی بدن ننگے سر، سفید کرتا سفید دھوتی۔ اور گندمی بنارسی بیلدار چادر چپراس کی طرح تہہ کی ہوئی۔ ایک شانے سے دوسری بغل تک لپٹی ہوئی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ شاید پان بہت کھاتے تھے۔ پنڈت جی گانے کو ہاتھ جوڑ کر مودب بیٹھتے تھے۔ پہلے کوئی بھجن گاتے تھے اور بار بار ہاتھ کو سینے سے پیشانی تک لاتے تھے جس طرح کوئی بزرگوں کو پرنام کرتا ہو۔ یہ ان کا طریقۂ خراج عقیدت تھا موسیقی کی دیوی کو۔ پندرہ بیس منٹ اس اظہار عقیدت والے بھجن میں لگتے پھر وہ کوئی راگ یا راگنی شروع کرتے۔ پنڈت جی کی الاپ مشہور تھی۔ وہ بول کم نکالتے۔ الاپ ہی میں اپنے جوہر دکھاتے۔ گانے کے وقت ان کا عالم ایسا ہوتا جیسے انہیں دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہے۔ ایک دیوانہ ہے جو مست ہے سرشار ہے، جوش اور جذبے سے معمور ہے اور اپنے وجود کو اس مستی، سرشاری اور جوش اور جذبے کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتا ہے اور ڈھال کر ایک نیا وجود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ موسیقی سے میری گہری دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ میں غفور خاں ستار یے کا شاگرد کئی سال پہلے بن چکا تھا۔ پکّے گانوں اور راگوں اور راگنیوں کا رسیا ہو چکا تھا۔ اس کے موٹے موٹے نکات جاننے اور سمجھنے لگا تھا۔ تھوڑی مشق اور ریاض کر چکا تھا اس لئے اس کی کنہیات سے کچھ آشنائی ہو چکی تھی۔ جب وہ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد اسٹیج سے اُٹھ کر جانے لگے تو میں ان کے پاس گیا۔ سلام کیا وہ محبت سے ملے اور جب ان سے کہا کہ میں بھی استاد غفور خان کے وسیلے سے گنپت راؤ گھرانے کا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ گنپت راؤ جی کے یہاں موسیقی اور شاعری کا سنگم ہے۔ گنپت راؤ کوی بھی تھے ان کے یہ کہنے پر مجھے استاد غفور خان کی موت یاد آگئی۔ ایسی موت کسی شاعر ہی کی موت کی یاد دلاتی ہے۔ پھر پنڈت اونکار جی نے کہا کہ موسیقی

www.taemeernews.com

کا کمال روحانیت کے کمال کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا ۔ موسیقی سے ایسے ہی پیار کرنا چاہیے جیسا پیار کسی گرد کسی پیر سے ہوسکتا ہے ۔ گرو اور پیر چیلے کی جس طرح حفاظت کرتے ہیں اسی طرح موسیقی کی دیوی اپنے پجاریوں کی کرتی ہے ۔ وہ بولے کہ میں تین بجے رات کو اٹھ جاتا ہوں اور صبح تک بھجن گاتا ہوں جس میں گندھاری راگنی اور مالکونس راگ کے الاپ ہوتے ہیں اور سورج نکلتے نکلتے بھیرویں پر اپنا ریاض ختم کرتا ہوں ۔ اسی لئے پچاس پچپن سال کی عمر میں بھی ان کی آواز میں تیس سال کے جوان کی توانائی تھی ۔ پنڈت جی زیادہ وقت مشق اور ریاض کا کسی مخصوص مندر میں گذارتے تھے ۔

پنڈت اونکار ناتھ کو شاید میں پہلی بار کلکتہ میں دور سے دیکھ چکا تھا ۔ پٹنہ کالج جوبلی تقریبات میں دوسری بار صرف انہیں دیکھنے ہی کا نہیں سننے اور باتیں کرنے کا موقع بھی ملا لیکن استاد فیاض خاں کو پہلی بار اور شاید آخری بار پٹنہ کالج کے جوبلی ہی میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ استاد فیاض خاں تقریباً پچپن سال کی عمر، میانہ قد، کسرتی بدن چوڑا چکلا سینہ، سر پر گھونگھریالے بال جو اب تک بالکل سیاہ تھے ۔ چوڑی پیشانی، لمبی ناک، رنگ سیاہی مائل گندمی ۔ خیروانی، چست پاجامہ، پاؤں میں موزے ۔ شکل و شباہت، وضع قطع سے کوئی رئیس معلوم ہوتے تھے ۔ لبوں پر مسکراہٹ کھیلتی بہت بے تکلف انداز سے چار زانو بیٹھتے ۔ ایسا معلوم ہوتا مجمع سے ان کو محبت اور مجمع کو ان سے محبت ہے ۔ وہ اپنے سننے والوں سے بے نیاز نہیں ہوتے ۔ ان کا انداز بہت بے تکلف ۔ جیسے موسیقی ان کی ساتھی سنگھاتی ان کی بے تکلف دوست، ان کی ہر وقت کی مونس اور ہمراز، ہمنشیں اور ہمنوا ہے جیسے موسیقی ان کی محبوبہ ہو ۔ دونوں ایک دوسرے کے ناز بردار ۔ آپس میں بگڑتے بھی ہوں اور سنتے بھی ہوں ۔ جیسے داغ دہلوی کی معشوقہ کہ دونوں میں جلی کٹی بھی ہوتی تھی ۔ لیکن داغ اہلِ ہوس تھے، خودغرض تھے زمانہ ساز تھے ۔ استاد فیاض خاں کا انداز اپنی محبوبہ سے اہلِ ہوس اور خودغرضوں کا سا نہیں تھا ۔ دونوں ایک دوسرے کے وفادار ۔ استاد فیاض خاں جب گاتے تو ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی بجائے بشاشت اور شگفتگی نظر آتی ۔ اور ہر تان پر وہ زانو

www.taemeernews.com

پر ہاتھ مارتے اور مستی میں چہرہ اوپر اٹھا کر آنکھ بند کئے ہوئے مسکراتے۔ وہ یوں گاتے جیسے ان کا محبوب ان کے سامنے ہو اور ان کا دل فخر سے معمور اور ناز سے مخمور ہو۔ پنڈت اودے کار ناتھ جی سے بالکل مختلف انداز ان کا نظر آتا تھا۔ وہ موسیقی کو دیوی دیوتا نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے آگے ہاتھ نہیں جوڑتے تھے، سر نہیں جھکاتے تھے۔ مومن صرف ایک ہی کے آگے سر جھکاتا ہے۔ فیاض خاں کی مستی اور سرشاری دوسری نوعیت کی تھی۔ جیسی مستی غالب کے یہاں یا جیسی سرمستی اور سرشاری اقبال کے یہاں ہے۔ میں یہ اپنے ذہن اور اپنے مشاہدے کی ترجمانی اب کر رہا ہوں یہ اس لئے کہ فیاض خاں کے پورے انداز اور طرز ادا کی تصویر میرے ذہن میں صاف واضح اور محفوظ ہے۔ اس بے زبان مشاہدہ کو اب میں الفاظ دے رہا ہوں۔ اس وقت فیاض خاں کا انداز عجیب لگا پورے مجمع کے انداز سے بالکل الگ تمام فنکاروں سے بالکل جداگانہ اسی لئے حافظے نے مشاہدے کی تصویر بالکل محفوظ رکھ لی۔ اس وقت میں فیاض خاں کو اپنے پورے پوز میں تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور وہ پوز جو الفاظ چاہ رہا ہے مرے قلم سے نکلوا رہا ہے۔ استاد فیاض خاں کی "جبڑے کی تان" مشہور تھی۔ جب وہ تان اڑاتے تو ان کے چہرے سے لے کر بدن کے تمام حصے اس تان میں شامل نظر آتے ان کا سینہ ان کا حلق اور ان کے جبڑے یہ تین ان کی تان کے مرکز تھے اور ان کا پورا بدن گویا پرِ پرواز تھا۔ جب وہ جھوم کر سر کو تیزی سے ہلاتے ہوئے تان اڑاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر کی تہہ سے طاقت اور قوت کا مظہر ایک کھلی ہوا کی رفتار سے اچھلتی ہے اور سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی سطحِ آب سے اچھل کر قوس قزح بناتی ہوئی پھر سمندر کی تہہ میں سما جاتی ہے یا دور خلا سے کوئی ستارا ٹوٹتا ہے اور تیز رفتاری سے آسمان کے نیچے محراب بناتا ہوا دوسری طرف خلا میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور ہر تان کے بعد استاد فیاض خاں اسی مسرت اور شادمانی کی کیفیت سے سر اوپر اٹھا کر بند آنکھوں کے ساتھ مسکراتے۔ جیسی مسرت ایک فن کار کو کسی نادر تخلیق پر ہوتی ہے۔ استاد فیاض خاں اپنا فن اپنے ساتھ لے گئے۔ اور وہ اعتماد اور یقین بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ جو ایک عظیم فنکار کی صفت ہے اور وہ مسرت، فخر

www.taemeernews.com

ناز اور شادمانی سے بھری ہوئی مسکراہٹ بھی اپنے ساتھ لے گئے جو فن اور فنکار کے گہرے تعلق اور گہری ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔

یہ میوزک کانفرنس غالباً تین روز تک ہوتی رہی۔ سینٹ ہال کے اردگرد کہیں پنڈال بنا ہوا تھا۔ کوئی پولس نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی حفاظتی انتظام نہیں تھا۔ جوبلی تقریبات میں کوئی رکاوٹ شرکت کی نہیں تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ داخلہ ٹکٹ سے تھا یا مفت تھا۔ مگر بہرحال شانتی دلجمعی اطمینان اور سکون کا ماحول تھا۔ کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی شور نہیں کہیں کسی گوشے سے کوئی خلاف تہذیب آواز نہیں۔ خوش پوش بھی تھے۔ سادہ پوش بھی تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ جوان بھی، بوڑھے بھی، ادھیڑ بھی جہاں تک مجھے یاد ہے نوجوان یا طلبا کم ہی نظر آتے تھے۔ یا تھے تو آج کے طلبا کی طرح نہیں تھے۔ طلبا بھی اس دور میں وضع قطع لباس، پوشاک، عادات و اطوار کے لحاظ سے عمری مہذب طبقے ہی کا ایک جزو معلوم ہوتے تھے۔ ایسی بات نہیں کہ دل شرارتوں سے خالی تھے۔ لیکن شرارتوں کے اظہار کا اور موقع وہ جانتے تھے اور بے موقع کوئی بات ہو جائے اور کسی طرف سے کوئی نگاہ تیز اٹھ جائے تو نادم ہو کر سر جھکا لیتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ شاید سینٹ ہال میں کوئی مشاعرہ تھا۔ میں اپنے مسلم اسکول کے ایک استاد ماسٹر سلیمان صغیر صاحب کے ساتھ پیچھے کے حصے میں کہیں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کسی شاعر نے کوئی شعر پڑھا تو تقریباً میرے ہی بغل سے یا بغل کے قریب ہی سے ایک جوان طالب العلم نے کوئی جملہ چست کیا۔ اور جملہ چست کر کے سر جھکا کر دوسرے لوگوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ رہا۔ دوسرے شعر پر پھر کوئی جملہ چست کیا۔ میں نے کچھ ناگواری سے کہا کہ بھائی جان یہ مناسب نہیں ہے تو وہ مسکرائے اور مسکراہٹ میں کچھ حقارت اور طنز کی سی کیفیت تھی تو ماسٹر سلیمان صغیر صاحب نے کہا کہ میاں تمہارے جیسے میرے بہت شاگرد ہیں اور میں یہیں پر ہوں۔ وہ جوان ندامت سے خاموش ہو گیا۔ اور پھر پورے مشاعرے تک کوئی جرأت جملہ بازی کی انھوں نے نہیں کی۔ وہ جوان مجھے یاد ہے کون تھا۔ اپنا نام وہ اس مضمون میں پڑھیں تو ممکن ہے وہ واقعہ انہیں یاد آجائے یا وہ بھول گئے ہوں تو میرے زبانی بھی تصدیق کر لے سکتے ہیں۔ وہ ہمارے بزرگ دوست اور سینئر ہم عصر پروفیسر سید عبدالمنان تھے۔

www.taemeernews.com

جو اب کامرس کالج پٹنہ میں اردو کے استاد ہیں۔

تو عرض کیا کہ پٹنہ کالج یا پٹنہ یونیورسیٹی کی وہ جوبلی دیکھی۔ خدا جانے وہ سلور جوبلی تھی یا گولڈن جوبلی۔ قیاس ہے کہ وہ سلور جوبلی ہی ہوگی۔ اس لئے کہ تقریباً چالیس سال کا وقفہ درمیان میں حائل ہے۔ اس وقت چاندی شاید چھ آنے یا سات آنے تولہ ملا کرتی تھی اور لوگ چاندی کے زیور پہنا کرتے تھے۔ پاؤں میں پازیب اور چاندی کے کڑے چھڑے جہیز میں دلہن کو دئے جاتے تھے۔ کہیں چاندی کے کمر زیب کمر دھن بھی ہوتی تھی اور بازو پر جوشن، نونگے اور بازو بند بھی ہوتے تھے۔ اوسط گھرانوں میں گلے میں بھی چمپا کلی چندن ہار اور جگنو چاندی کے بھی ملتے تھے۔ ہاں کانوں میں بالی بجلی اور پتے سونے کے ضرور ہوتے اور ان دنوں سونے کا بھاؤ پچیس روپے تولہ تھا مجھے خوب یاد ہے کہ اماں نے والد کے انتقال کے بعد فسادات سے تین چار سال پہلے میری شادی میں پچاس پچاس تولے کے دو سونے کے ڈتے پچیس سو (۲۵۰۰) روپے میں فروخت کئے تھے۔ خریدنے والا ڈوماساؤ سونار مرادپور اور بیچنے کو آنے والوں میں ڈاکٹر اعظم نانا تھے اور ساتھ ساتھ میں بھی تھا۔ تو کانوں میں اور ہاتھوں میں سونے کے زیورات ہوتے تھے۔ ہاتھوں میں بالا، پٹری، بتانہ، کنگن یا پہنچی۔ ہیرے کا تو نام کہیں کہیں آتا تھا ناک میں کیل ہیرے کی ملی یا بہت ہوا تو کوئی چھوٹی موٹی انگوٹھی ہیرے کی ہوتی۔

اب تو پٹنہ یونیورسیٹی کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی ہے۔ اس وقت سونا ڈھائی ہزار روپے تولہ شاید بک رہا ہے۔ ہیرے کا بھاؤ کون بتائے۔ ایک ہفتہ قبل میں اپنی نن سسرال بارو میں شریک تقریب تھا۔ دُلہا کو پانچ ہزار سلامی کے ساتھ دس ہزار کی ایک انگوٹھی ہیرے کی ملی تو نوشہ کی ماں نے غصے سے وہ انگوٹھی سمدھی کی ناک پر پھینک ماری کہ کیا بچوں کا کھلونا دے رہے ہو۔ تو دس ہزار کی ہیرے کی انگوٹھی حقارت سے سمدھی کی ناک پر پھینک ماری جائے تو ایسے دور میں یونیورسیٹی کی ڈائمنڈ جوبلی ہوگی تو کیا ہوگی۔ وہی یونیورسیٹی جہاں پروفیسر مَل جیسے انگریزی کے پروفیسر پروفیسر گلیجانی جیسے اکنامکس کے استاد، پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ، حافظ شمس الدین، اختر اورینوی جیسے اردو فارسی پڑھانے والوں کے زمانے میں سلور جوبلی نہ ہوتی تو کیا ہوتی اور

www.taemeernews.com

اب جب کلیم عاجز جیسے پڑھانے والے ہوں تو ڈائمنڈ جوبلی نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔ سلور جوبلی کے زمانے میں پٹنہ کالج سے بی۔ این کالج تک شاید ایک ہی دوکان کتاب کی تھی۔ اور اب پٹنہ کالج سے چلئے تو بی۔ این کالج تک کتابوں کی دوکانوں کا شمار آپ کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ جب کتابوں کی دوکانیں بہت کم تھیں تو پڑھنے والے ہر لڑکے کے ہاتھوں اور کندھوں پر کلاس جاتے ہوئے ایک اچھا خاصہ بوجھ کتابوں کا ہوتا تھا۔ اب تو ایک نازک سی کاپی دو انگلیوں میں ہلاتے ہوئے یا اسے رول کر کے بجاتے ہوئے ایم۔ اے کے کلاسوں میں اسٹوڈنٹس آتے ہیں بعضوں کے ہاتھوں میں تو اب فیشن کے طور پر نازک سی ڈائری ہوتی ہے جس میں بقول زبیر رضوی " لڑکیوں کا پتہ بھی ہوتا ہے " ٹیلی فون نمبر بھی۔ غزل کے اشعار بھی، سینما کا پروگرام بھی اور کسی استاد کے ساتھ بڑا اخلاص ہوا تو اس کے لکچر کا ایک حصہ بھی۔ کتابوں کی دوکانوں پر فٹ پاتھ کے اسٹالوں پر رسالے، میگزین، ناول، افسانے، رنگین اور حسین تصاویر کے ساتھ۔ چمکدار جلدوں کی کتابیں اتنی کثرت سے ملتی ہیں کہ کبھی کبھی تصور اس ملک کو یا اس صوبے کو چاند ستاروں کا گھر سمجھنے لگتا ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ آج ایک صاحب کہنے لگے کوئی گریجویٹ صاحب پوچھ رہے تھے کیزوئل لیو (Casual Leave) کی درخواست کیسے لکھی جائے ؟۔ جب کتابیں کم تھیں تو مجھے یاد ہے کہ میٹرک کے امتحان گاہ میں لڑکے داخل ہوئے تو گھڑی کوئی نہیں دیکھتا تھا اور نہ امتحان ہال میں کہیں گھڑی تھی۔ اعلان ہوا کہ دس منٹ اور ہیں تو پانچ منٹ پہلے کاپیاں مکمل کر کے لڑکے بیٹھے رہتے تھے۔ ادھر گھنٹہ بجا اور ایک ساتھ ہال سے باہر نکل آئے۔ اب ہال کے سامنے گھڑی پر یا اپنے ہاتھ میں بندھی ہوئی رسٹ واچ پر بار بار نگاہیں جاتی ہیں اور کاپیاں امتحان ختم ہونے کے بعد بھی دینے میں دس پانچ منٹ مزید تاخیر ہوتی ہے اور خوشامد برآمد کر کے کاپیاں ہاتھ سے چھیننی پڑتی ہیں ۔۔ جب کتابیں کم تھیں تو ایک امتحان میں ایک لڑکا دوسرے لڑکے کے کندھے سے جھانک کر اس کی کاپی سے کچھ نقل کرنا چاہتا تھا تو قریب کے دوسرے لڑکے نے پکار کر کہا کہ " دیکھئے سر چوری کرنا چاہتا ہے " اور آج اس کے لئے یونیورسیٹی میں احتجاج کیا

www.taemeernews.com

جاتا ہے کہ امتحان گاہ میں کتابیں اور کاپیاں لے جانے کی اجازت دی جائے ۔ جب کتابیں کم تھیں تو میں نے ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ بی۔ این کالج کے لڑکے Quit India ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ لینے کے لئے کالج سے باہر نکل کر شور کرنے لگے۔ کالج سے پرنسپل معین صاحب مرحوم ننھے دُبلے پتلے نانے ایسے آدمی باہر نکلے، سڑک پر آکر دائیں طرف کے لڑکوں کو صرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس طرف کے لڑکے سر جھکا کر ہاسٹل کے اندر چلے گئے۔ بائیں طرف کے لڑکوں کو اشارہ کیا سب سر جھکا کر کالج کے پھاٹک میں واپس چلے گئے ۔ اب کتابیں بہت ہو گئیں تو کسی اُستاد کی نہ آبرو محفوظ ہے نہ جان۔ کپڑے پھاڑے جاتے ہیں طمانچے لگائے جاتے ہیں اور پٹائی ہوتی ہے۔ جب کتابیں کم تھی تو عموماً خوش مقدور اور خوش حال خاندانوں میں پڑھے لکھے ہوتے تھے وہ بھی اتنے کہ گننے کی ضرورت نہیں۔ میرے بچپن میں مجھے یاد ہے صرف شاہ عبدالحمید صاحب گاؤں میں مکمل گریجویٹ تھے اور گاؤں کے گماشتہ ڈھنمن لال کے منجھلے لڑکے بیجولال بی۔ اے میں پڑھ رہے تھے۔ مگر گاؤں کا حجام جب ہم لوگوں کے بال تراشتا تھا تو اس کی قینچی کے ساتھ اس کی زبان بھی چلتی اور اس دور میں ہم کہہ سکتے تھے کہ زبان سے پھول جھڑتے تھے۔ کلکتہ میں والد بال ترشوانے کو سیلون میں بھیج دیتے تھے۔ جب گھر آیا تو حجام سر دیکھ کر کہتا "ہیر کٹنگ کر کے آئے ہو کلیم بھوا؟" اور پھر اس کی بات چلتی شہر کی نقلی اور دکھاوے کی زندگی پر اور دیہات کی سادگی اور معصومیت پر ۔ اور تیلہاڑے میں جمعراتی سبزی فروش اور سکھو میاں سبزی فروش کبھی کبھی شعر و شاعری کی محفلوں میں شریک ہو جاتے اور گرچہ اردو شاعری میں یعنی غزل میں معشوق کی جنس کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی مگر کسی منچلے کی زبان پر غزل میں معشوق کی کالی آنکھوں اور نکیلی بھوؤں کا ذکر آجاتا تو جوان جمعراتی سبزی فروش اور ادھیڑ سکھو میاں نگاہیں جھکا لیتے اور گچھے سے منھ ناک تک ڈھانک لیتے۔ اور آج جب کتابیں بہت بڑھ گئیں تو مشاعروں میں "ایک لڑکی کا نام اور سہی" جیسے غزل کے مصرعوں پر ہزاروں صاحب قسم کے خوش پوش جوان تعلیم یافتہ اور مولانا قسم کے جوانوں کا ہاتھ واہ واہ کا شور کرتے ہوئے بلند ہو جاتا ہے اور "مکرر ارشاد مکرر ارشاد" سے مشاعرہ گونجنے لگتا ہے۔

www.taemeernews.com

جب کتابیں کم تھیں تو دماغ کے ورق اُلٹے جاتے تھے اور ہر ورق پر لکھے ہوئے باریک حرفوں کو فکر کی خوردبین سے دیکھا جاتا تھا پھر ان کو معنی پہنائے جاتے تھے پھر الفاظ کا پیراہن دیا جاتا تھا پھر ان کا خلاصہ اور جوہر نکالا جاتا تھا اور وہ جوہر بادشاہِ دل کے حضور میں پیش کیا جاتا تھا اور دل کا اس پر دستخط ہو جاتا تھا اور وہی فیصلہ عام ہو جاتا۔ اسی فیصلے پر نگاہ بھی چلتی کان بھی چلتے ہاتھ پاؤں بھی چلتے۔ اب کتابیں بہت زیادہ ہو گئیں تو نہ دماغ کی تہیں اُلٹی جاتی ہیں نہ فکر کی دوربین کام کرتی ہے، نہ الفاظ و معانی مہیّا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ان کا خلاصہ نکالا جاتا ہے۔ سب کچھ کیا ہوا۔ Guess paper میں موجود ہے وہی دل کے سامنے پیش ہو جاتا ہے اور سب کچھ اسی پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ سینما کے اوراق پر، اخباروں کے کالموں پر رسالوں اور میگزین کے اور ناولوں اور افسانوں کے صفحات پر سب کچھ لکھا ہوتا ہے اور وہ کام کے لئے کافی ہوتا ہے بلکہ کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ دماغ سوزی، دل خراشی اور جگر کاوی سے جتنا حاصل ہوتا ہے اس سے سینکڑوں گونہ یونہی حاصل ہو جاتا ہے۔ دو گز کپڑے کے لئے ایک ماہ پہلے سے پیسے جمع کئے جاتے تھے اب دوکان پر لوگ جاتے ہیں چیزیں اٹھا لیتے ہیں قیمت طلب کیجئے تو چھرا ملتا ہے چھرا سہہ جائیے تو پستول کی گولی ملتی ہے۔

بچپن میں پٹنہ شہر سے لوگ گاؤں جاتے تو پڑھے لکھوں کی نشستوں میں اکثر پٹنہ کے ایک اخبار کا نام آتا اور نام ہی سے دماغ اور ذہن پر نام کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی اور طلسم ہوش رُبا کے کسی جادو کی اصطلاح کی طرح طبیعت اس نام کو سوچنے اور اس کے معنی اور اثرات کی وسیع دنیا میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتی۔ "Search Light" شاید اس وقت بہار کا واحد اخبار تھا۔ کبھی کبھی "اتحاد" کا نام بھی سن لیتے اور بعد میں پٹنہ میں قیام آیا تو سلطان احمد صاحب ایڈیٹر "اتحاد" کو دیکھا بھی۔ خیر ان کے متعلق پھر عرض کروں گا "Search Light" شہنشاہ افراسیاب کے سحر کی طرح ذہن پر چھایا رہتا۔ پھر اس کے ایڈیٹر صاحب کا تذکرہ آتا۔ ان کے اداریٔ مضمون کی دھوم تھی۔ ان کی انگریزی تحریر کا معیار اس کی گہری معنویت اور اشاریت اس کی نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی تحریر کا جوش اور جذبۂ حریت اور آزادی کی بے باک ترجمانی کا ذکر

www.taemeernews.com

اکثر آتا۔ ان ایڈیٹر صاحب کا نام بہت سے پرانے پڑھے لکھوں کے ذہن ہی میں نہیں زبانوں پر ہوگا۔ تذکروں میں اب بھی آتا ہوگا اس لئے وہ نام نہیں لکھوں گا۔ بہرحال دیہاتوں میں بھی ان کا نام مسلمان تعلیم یافتہ جوانوں اور بوڑھوں میں عموماً زبان زد تھا۔ پھر ۱۹۴۶ء آیا۔ اور اس سے پہلے مسلم لیگ، تحریک کی مخالفت میں ان کا زورِ قلم جادو جگاتا رہا۔ ۱۹۴۶ء آیا اور نواکھالی کے زرعی فساد کو فرقہ وارانہ فساد کا رنگ، دے کر سنا کہ خوب مضمون آرائی کی گئی۔ اور سنا کہ تحریر کا رنگ، ہی بدل گیا اور اسی تحریر کے نتیجے میں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں ایک دن میں نے بھی دیکھا کہ پٹنہ کے شارع عام سے مرادپور اور بی۔ این کالج ہوتے ہوئے ایک، بڑا جلوس نواکھالی فساد کی مذمت میں نکلا۔ اس جلوس میں ایک، سادھو جی نعرہ لگاتے ہوئے جا رہے تھے "کھونوں سے آئی آواج انکلاب جندہ باد" یہ "کھونوں سے آئی آواج انکلاب، جندہ باد" واقعی ہر جگہ خونوں سے آواز نکلوائی گئی۔ دوسرے ہی دن چھپرہ میں فساد ہوا پھر سارا بہار کم و بیش آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ یہ بھی کتابوں ہی کی زیادتی اور فراوانی کے نتیجے میں ہوا۔

مسلم تحریک کا دو تین بار ذکر آگیا۔ جی میں آتا ہے کہ آج سے چالیس سال پہلے اس تحریک کے متعلق لوگوں کا سوچا ہوا بولا ہوا بتایا ہوا۔ سنا سنایا ہوا جو ذہن میں ہے اسے پھر دوبارہ ذہن میں لاکر زبان پر لاؤں سیاست سے بالکل غیر متعلق ہونے کے باوجود وہ دور جو آج سے بہت دن پہلے نہیں گذرا ہے۔ چالیس پینتالیس سال کوئی بہت لمبی مدت نہیں ہوتی۔ اس دور میں بھی۔ اس نزدیک ترین دور میں بھی سیاست کا تعلق زندگی سے کیا تھا اور سیاست کا مفہوم کیا تھا اسے ذہن میں دوبارہ زندہ کرتے ہی یہ شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

۱۹۴۷ء میں نظام مملکت کیا بدلا، نظامِ دل بدل گیا نظامِ دماغ بدل گیا، نظام طبیعت بدل گیا۔ نگاہیں، باتیں، خیالات، مقالات، افکار، شعار سب یوں بدلے کہ پہچانے نہیں جاتے جیسے رات کو کوئی فرشتہ سوئے اور صبح کو شیطان اٹھے۔ انسان پلنگ پر جائے اور حیوان

www.taemeernews.com

بن کر پلنگ، سے اُٹھے ۔ جیسے بہار میں آنکھ جھپکے اور" جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا" مجھے بھی اس کا فخر ہے کہ دنیا کو یوں بدلتے دیکھا ہے کہ ایسی تبدیلی پھر ممکن ہے آیندہ سو برسوں میں نہ ہو۔

تو میں پڑھنے لکھنے کا شوقین سیاست سے ہمیشہ دور رہا اور گھر میں بھی برسہا برس سے یہی دستور رہا۔ لیکن آتے جاتے سیاست کی باتیں سننے اور کبھی کبھی کچھ بول لینے کا ماحول بھی ضرور رہا ـــــ میں جو بول رہا ہوں یا لکھ رہا ہوں یہ بولنے اور لکھنے والا نہ سیاست کا ماہر نہ ملکی معاملات کا واقف نہ حکیم نہ دانا نہ مفکر نہ فلسفی نہ محقق نہ دانش مند لیکن ایک عامی بھی ایک انا ڈی بھی جسے کچھ سوچنے کی استعداد ہے۔ قلم پکڑنے کی کچھ صلاحیت ہے اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کے اظہار میں حق بہ جانب ہے ۔ میں ایسا تو کبھی نہیں سوچتا اور کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا کہ ـــ" آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" لیکن مجھے اپنی رائے قائم کرنے کی عادت ہے اور اس کا بے ٹوک اظہار کر دینے کی دحشت ہے ۔ لیکن اس کی حسرت نہیں کہ میری رائے قبول کرلی جائے گرچہ مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہے ـــــ بہر حال تو پاکستان کے سلسلے میں جو کچھ میری سمجھ میں آٹھ دس سال کی سمجھ میں آیا۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک کے مابین وہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظریہ کچھ اور تھا اور پاکستان کی حقیقت کچھ اور بن کے سامنے آئی۔ پاکستان دو قوموں کی عداوت اور رقابت کے نتیجے میں وجود میں آیا یہ شاید غلط ہے۔ پاکستان ایک قوم کے اعتماد، ایمان آرزو اور قوت اظہار کے نتیجے میں قائم ہوا یہ شاید صحیح ہو۔ پاکستانی سیاست کی پیداوار ہے یہ شاید غلط ہو۔ پاکستان ایک محبت کی تخلیق ہے، یہ شاید صحیح ہو۔ سیاست میں قوتِ تخلیق نہیں ہے ۔ محبت میں یہ قوت ہے ۔ ہندوستان کی آزادی سیاست نہیں تھی محبت تھی ایک ملک کے رہنے والے آزادی سے محبت رکھتے تھے، غلامی سے نفرت کرتے تھے۔ اپنی روایت اپنے طریقۂ زندگی اور اپنی مخصوص معاشرت تہذیب اور تمدن سے وارفتگی رکھتے تھے ۔ اسی محبت اور وارفتگی نے ہندوستان کو آزاد کرایا ۔ اس طرح اس ملک کی ایک مخصوص قوم اپنی مخصوص روایت، تہذیب ایک مخصوص ایمانی زندگی سے محبت رکھتی تھی ۔

www.taemeernews.com

اس ایمانی زندگی کا مظاہرہ پہلے ہو چکا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ مظاہرہ پھر ہو۔ جب بھی یہ زندگی، مخصوص ایمانی زندگی وجود میں آئی تھی دنیا میں ایک دلکشی پیدا ہوئی۔ ایسی دلکشی جو سنتے ہی طلسم ہوش رُبا کی ایک کہانی معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ کہانی نہیں تھی ایک حسین اور خوبصورت حقیقت تھی۔ اس خوبصورت حقیقت کا ظہور دنیا کی ہر زمین پر ہوا تھا اور اس کا چٹخارا زبانوں پر تھا۔ اُس کا حُسن نگاہوں میں تھا۔ وہ قوم چاہتی تھی کہ نگاہوں میں چھپا ہوا حُسن نگاہوں سے باہر آکر پھر ایک بار ٹھوس حقیقت بن جائے۔ سنا کہ مہاتما گاندھی اپنی تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ اے ہندوستان والو حضرت عمر فاروق جیسی حکومت قائم کر سکو تو کرو۔ چنانچہ لوگ چاہتے تھے کہ تقریر والی بات جیتی جاگتی زندگی بن جائے۔

اس تحریک سے اقتدار کی ہوس رکھنے والوں میں نفرت ہو تو ہو عام زندگی میں مجھے نفرت نہیں نظر آئی۔ ممکن ہے اس تحریک کے سربراہوں میں اقتدار اور حکومت کا باغ ہو۔ عام ذہنوں میں اور دیہات کے معصوم دماغوں میں کچھ اور ہی تصویریں تھیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ سوچتے ہوں کہ پاکستان بنے گا تو حکومت کریں گے عیش کریں گے۔ عام لوگ یہی سوچتے تھے کہ ہم کو پاکستان سے یہی واسطہ ہے کہ ہماری حسرتوں کی دنیا میں جو فضا آباد ہے وہ فضا پنجاب میں اور سندھ میں اور بنگال میں اور آسام میں اور صوبہ سرحد میں زندہ ہو جائے گی۔ اسلامی زندگی ہوگی، اسلامی معاشرہ ہوگا لوگ ایمان کے ساتھ رہیں گے ایمان کے ساتھ جئیں گے۔ ہر طرف نور ہوگا سرور ہوگا، روشنی ہوگی، تجلی ہوگی وہ تجلی ہمیں بھی پہونچے گی ہمیں بھی ایمانی زندگی کا نور ملے گا۔ ہم بھی اپنے ہم وطنوں کو دکھا سکیں گے کہ اسلام کیا ہے، اسلامی معاشرہ کیا ہے۔ پس ہمیں پاکستان سے صرف اسی قدر تعلق ہے۔ ہم تو اسی سرزمین سے اُٹھے ہیں اسی سرزمین کے اندر جائیں گے ؎

ہم اسی گلی کے ہیں خاک سے یہیں خاک اپنی ملائیں گے
نہ بلائے آپ کے آئے ہیں نہ نکالے آپ کے جائیں گے

اس میں کہیں دشمنی کا علیحدگی پسندی کا شائبہ نہیں تھا۔ شاید سمجھ دار لوگ یہ سمجھتے بھی نہ تھے۔

www.taemeernews.com

میں دو واقعہ عرض کرتا ہوں ـــــ کلکتہ میں میرے مکان کے راستے کے سلسلے میں ایک اگروال لکھ پتی سے تنازعہ چل رہا تھا۔ مقدمہ کلکتہ کارپوریشن میں تھا۔ شاید ۳۹ء میں کلکتہ کارپوریشن کا الیکشن ہوا جس میں مسلم لیگ نے شرکت سے انکار کیا اور متفقہ فیصلے کے ساتھ الیکشن کا بائیکاٹ کیا۔ الیکشن ہوا لیکن ایک ممبر بھی منتخب نہیں ہو سکا۔ گورنمنٹ نے چند مسلمانوں کی نامزدگی کردی۔ ان میں دو نام مجھے یاد ہیں۔ خان بہادر خدا بخش خاں فرید پور ضلع بنگال کے کوئی زمیندار تھے اور پرنس یوسف مرزا جو نواب واجد علی شاہ کے پوتے تھے۔ میرے والد مجھے لے کر ان دونوں کے پاس بھی گئے اور ایک یا دو مسلمان اور بھی ممبر تھے ان سے مل کر بھی مقدمہ کی صورت حال بیان کر کے ہمدردی اور حمایت کی درخواست کی۔ دونوں نے حمایت کا وعدہ تو کیا مگر احسن طریقے سے اس کی قیمت کا بھی مطالبہ کیا۔ میں نے یہ واقعہ اپنی پہلی کتاب "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں کچھ تفصیل سے لکھا ہے۔ والد صاحب استغفار پڑھتے ہوئے اُن کے یہاں سے نکل آئے اور مسٹر حسین شہید سہروردی کے یہاں گئے جو شاید بنگال مسلم لیگ کے صدر تھے۔ بہر حال وہ مسلم لیگ کے بنگال میں ذمہ دار تھے ـــ انہوں نے سب حال سنا اور یہ جان کر کہ ہم لوگ خان بہادر صاحب کے یہاں اور پرنس یوسف مرزا کے یہاں بھی گئے تھے بہت خفا ہوئے۔ مجھے ان کا جملہ یاد ہے ـــ "آپ لوگ غداروں کے یہاں چلے گئے؟" پھر غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو ٹیلی فون اُٹھا کر ایک جگہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر ہم لوگوں سے کہا کہ آپ جا کر راجہ ملک سے مل لیجئے۔ راجہ ملک ایک راجہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ جس طرح سہروردی صاحب، مسلم لیگی تھے۔ راجہ ملک بھی کٹر مہا سبھائی تھے۔ ہم لوگ شام بانار کے علاقے میں گئے۔ بہت بڑا محل نما مکان، بڑے بڑے ستونوں پر ایک بہت طویل اور عریض عمارت۔ دور تک چمن زار فوارے۔ پرندے اور جانوروں کے پنجڑے، نوکروں اور ملازمین کا جھنڈ۔ ہم لوگوں نے خبر کرائی تو راجہ ملک خود باہر چلے آئے۔ بہت بلند و بالا وجیہہ اور خوبصورت شخصیت۔ ہم لوگوں کو بہت محبت سے بٹھایا۔ مجھے اپنی بغل میں بٹھا کر مقدمے کی ساری تفصیل سنی اور اپنی بنگلہ اور کچھ ہندی ملی جلی زبان میں ایک ہی جملہ کہا "آپ لوگ نشچنت تھاکن ہم اس کا

www.taemeernews.com

دائک ہے"۔ یعنی۔ آپ لوگ بالکل مطمئن رہئے ہم اس کام کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے بعد اپنی شاندار" رائل رائس" گاڑی نکلوائی اور ایک، ایک، ہندو اور بنگالی ممبروں کے پاس جاکر اس طرح سفارش کی جیسے خود ان کا مقدمہ ہو۔ اور اسی موقع سے ایک دوسری کارپوریشن کمیٹی میں اسی مقدمے کی ایک دوسری پیشی تھی تو ہماری طرف سے ایک مشہور مسلم لیگی وکیل محمد یعقوب صاحب جو غریب تھے مگر بڑے صاحب کردار تھے اہرسٹ اسٹریٹ کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ پیروی کار بنے اور کمیٹی کے ہندو ممبروں کے یہاں گئے۔ اور ایک بہت بڑے پڑھے لکھے مارواڑی ممبر جو بڑے انڈسٹریلیسٹ اور تاجر تھے اور بہت بڑے مہا سبھائی تھے انہوں نے یعقوب صاحب کی بات سن کر کہا کہ" تو میرا دوست ہے جو تو کہے گا وہی ہوگا۔ یعقوب جو کہے گا مکڑ وہی کرے گا"۔ (موہن لال مکڑا ان کا نام تھا) اور وہی کیا اور دونوں کمیٹیوں میں ہم لوگ کامیاب ہو گئے۔

بہار میں فسادات ہوئے پاکستان کے نام پر بستیاں اُجڑیں جانیں پامال ہوئیں جائدادیں برباد ہوئیں۔ خان عبدالغفار خاں بہار آئے۔ کہیں کسی مقام پر شاید ڈاک بنگلے میں یا ریسٹ ہاؤس میں یا کسی اور مکان میں پریس کانفرنس تھی یا ان کا انٹرویو تھا۔ مجھے تین شکلیں یاد ہیں گرچہ لوگ تو بہت تھے۔ خاں عبدالغفار خاں۔ قاضی احمد حسین صاحب پھلواروی اور ایک جوان مع خوبصورت داڑھی اور شیروانی اس کے ساتھ ایک دوسرا کمسن نوجوان بھی تھا۔ خان عبدالغفار خاں پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے کہ یہ علاحدگی پسندی ہے اور اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے۔ وہ جوان کہہ رہا تھا کہ ہم پاکستان حکومت کے لئے نہیں چاہتے ہم گاندھی جی کی وہ آرزو پوری کرنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ اپنی تقریروں میں حضرت عمر فاروق خلیفہ دوم کی خلافت کی تعریف اور تائید میں جو کچھ کہتے ہیں ہم اس خواب کو حقیقت کا جامہ دینا چاہتے ہیں کہ

سلطنت اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں

جن صوبوں میں مسلم اکثریت ہے وہاں اسلامی قانون، اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ قائم ہو۔ ہم دور سے دیکھیں اور خوش ہوں اور اپنے ہم وطنوں سے کہیں کہ دیکھو مہاتما گاندھی جو

www.taemeernews.com

کہتے تھے وہ ہو رہا ہے۔ حضرت قاضی احمد حسین صاحب نے کہا یہ ممکن نہیں ہے اس پر دوسرا نسبتاً جو کمسن نوجوان اس جوان کی بغل میں تھا اس نے کہہ دیا کہ "آپ کیا جانیں" اور قاضی صاحب نے برجستہ کہا کہ "بیشک میرا مبلغ اتنا نہیں ہے جتنا آپ کا" اس جواب پر وہ کمسن نوجوان شرما گیا۔ اور اس کا وہ ساتھی جو خان عبدالغفار خاں سے گفتگو کر رہا تھا اس کمسن نوجوان پر اتنا خفا ہوا کہ پھر مجھے دم بخود ہو گیا۔ قاضی صاحب کے ساتھ اس نوجوان کی گستاخی اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس مختصر انٹرویو اور قاضی صاحب سے سوال جواب کے وقت میں اسی دہشت اور دیوانہ پن میں وہاں موجود تھا جو حادثوں کی وجہ کر مجھ پر طاری تھا۔ اور اس دیوانگی میں بھی کوئی کام کی بات کوئی اچھی بات کوئی کردار کی بلندی کی بات یا انسان کے صاف دل اور نیک خواہشات کی ترجمانی کرنے والی بات مرے طلسم خانۂ حافظے میں داخل ہو کر کہیں گوشے میں محفوظ ہو جاتی تھی .....

اور میں اسی وقت سے سمجھ رہا تھا کہ تصور پاکستان ایک بہت اعلیٰ بہت مقدس بہت پاکیزہ جذبے کی تخلیق ہے۔ اس کی تخلیق میں جو بھی شریک کار رہے ہوں گے وہ مخلصین ہوں گے۔ اس کا بھی ایک مشاہدہ مجھے ہوا یا یہ کہئے کہ اس خیال کی تائید میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔

۱۹۴۸ء میں ایک عزیز مجھے تبدیلیٔ حال اور تبدیلیٔ مزاج کے لئے کراچی لے گئے۔ اس سفر کا مختصر حال انشاء اللہ اور کسی وقت عرض کروں گا۔ ہم لوگ وہاں گئے اور ایک ماہ سے زیادہ قیام رہا۔ کراچی میں بھی بہت غیر مسلم سندھی اور غیر سندھی تاجر ملازمین، زمین دار افسران وکلا وغیرہ موجود تھے۔ ان سے رابطہ بھی ہوا بعضوں کے یہاں دعوتیں بھی ہوئیں۔ ایک دن ہم لوگ بندر روڈ جو وہاں کی مخصوص اور اہم شاہ راہ ہے گذر رہے تھے۔ سہ پہر کا وقت تھا شاید تین بجے ہوں کسی مقام پر اسی شاہ راہ میں کسی مسلم اور غیر مسلم سے لڑائی ہوئی اور فساد ہو گیا۔ ہم لوگوں کے سامنے ایک دوکان لوٹ گئی اور تیز بھگدڑ مچ گئی۔ ہم لوگ کسی قدر اجنبی تھے مگر بے رہبری کے ہم لوگ بھی کسی طرف بھاگے۔ اور دیر تک بھاگتے رہے کسی سے راستہ پوچھنے کا موقع تھا نہ کوئی بتانے کے ہوش میں تھا۔ غالباً نصف گھنٹے ہم لوگ بھاگتے بھاگتے ایک دوسری شاہ راہ پر آئے۔ جو اور زیادہ کشادہ تھی۔ راستہ میں کئی جگہ دیکھا کہ بدمعاش قسم کے لوگ دوکان لوٹنے کی مہم میں

www.taemeernews.com

لگے ہوئے ہیں ۔اس شاہ راہ پر تیز بھاگتے ہوئے ہم ایسی جگہ پہونچے جہاں دو تین بڑی کاریں کھڑی ہو رہی تھیں ۔آگے والی کار بالکل رک گئی ۔ دروازہ کھلا اور سیاہ شیروانی چست پاجامہ جناح کیپ میں مسٹر محمد علی جناح مرحوم تیزی سے اُترے اور ان کے ساتھ اس کار سے اور دوسری کاروں سے چند فوجی افسر بھی اُترے ۔مسٹر جناح کے بالکل بغل میں ایک افسر تھے جن کے متعلق معلوم ہوا کہ اس زمانے میں فوج کے کمانڈر جنرل اکبر خاں تھے ۔مسٹر جناح کے اترتے ہی ہزاروں کا مجمع وہاں پر اکٹھا ہو گا ۔اور" قائداعظم زندہ باد" ، " محمد علی جناح زندہ باد" کے نعروں سے زمین و آسمان گونج گئے ـــــ مجھے آگے جو بات کہنی ہے وہی اصل بات ہے میں اس مجمع سے بہت دور نہیں تھا ۔ہم لوگ بھی ٹھہر گئے ـــــ مسٹر جناح نے پہلے تو مجمع کی طرف سے منھ پھیر لیا پھر مجمع کی طرف مخاطب ہوئے میں اس زمانے میں چہرہ پڑھنے کی مہارت نہیں رکھتا تھا لیکن ایسا نافہم بھی نہ تھا ۔میں نے غصے کے چہرے بھی دیکھے تھے مگر اس دُبلے پتلے جسم کے نازک چہرے پر جو مجھے اس وقت نظر آیا ۔ایسی نفرت ایسی حقارت ایسا رنج اور ایسا غصہ میں نے کسی چہرے پر نہیں دیکھا تھا وہ کچھ دور تھے ـــ آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی ۔مگر اس نفرت سے کھولتے ہوئے چہرے پر لبوں سے جو ہلکی آواز نکل رہی تھی ۔وہ کچھ اس قسم کی تھی ـــ" تم کمینے ہو ـــ تم نالائق ہو ـــ تم پاکستان کو بدنام کرنے والے ہو ـــ مجھے تم سے نفرت " ـــــ یہ کہہ کر مسٹر محمد علی جناح نے تیزی سے منھ پھیر لیا اور جنرل اکبر خاں سے کہا ۔" shoot at sight " "کسی کو کہیں پر کوئی غیر قانونی کام کرتے دیکھو بلا تامل گولی مارو" قائداعظم کار پر سوار ہو گئے ۔تمام شہر میں ہلچل پھیل گئی ۔ اور آغاز واقعہ جو قریباً تین بجے سہ پہر کو ہوا تھا ۔اس سے ایک گھنٹے بعد جب ہم لوگ بہار کالونی چاکیوارہ اپنی جائے قیام پر پہونچ رہے تھے اس وقت سارے شہر میں امن و امان تھا ۔کتنوں کو گولیاں ماری گئیں ـــ اور پھر شام کے وقت ہم لوگ شہر میں نکلے تو تمام دوکانیں کھلی ہوئی تھیں ۔ ـــ نہ کرفیو تھا نہ دفعہ ایک سو چوالیس ـــ

www.taemeernews.com

عظیم آباد والے عظیم آباد کے مضافات والے وہ نہیں ہیں جو اب ہیں، وہ تو ختم ہو گئے، مٹ گئے، خاک ہو گئے اور اچھا ہوا خاک ہو کر پاک ہو گئے۔ اگر اب رہتے تو نہ پہچانے نہ پہچانے جاتے۔ دیوانے ہو جاتے۔ میری ہی طرح چاک دامن ہو کر خاک اُڑاتے۔ بولتے تو بے آبرو ہوتے، چُپ رہتے تو اپنی ہنسی اُڑواتے ــــ مِٹ کر اپنی آبرو بچا گئے۔ برباد ہو کر خوابوں، خیالوں، شاعری اور افسانوں کی دنیا آباد کر گئے۔

سنا ہے خاک بھی ہم ہو کے لاجواب ہوئے
اگر یہ سچ ہے تو اچھا ہوا خراب ہوئے

اور پُرانی حقیقت زندہ کر گئے۔ کہ خراب ہو کر ہی لاجواب ہوتا ہے۔ دانہ خاک میں ملتا ہے تب ہی شگوفہ نکلتا ہے۔ لیکن وہ دانہ جو خاک میں مل کر شگوفہ بنتا ہے بڑی مشکلوں سے بنتا ہے بڑے مرحلوں سے گذرتا ہے۔ وہ بہت دنوں میں بنے تھے۔ زمانہ نے کتنی کروٹیں لے کر انہیں بنایا تھا۔ تاریخ کو بہت اوراق سیاہ کرنے پڑے تھے تب ایسی سپیدی نمودار ہوئی تھی۔ بہت کھودا گیا کوڑا گیا جوتا گیا پٹایا گیا تھا۔ تب وہ فصل اُبھری تھی۔ عظیم شاہ نے تو صرف نام دیا تھا۔ کام تو صدیوں سے ہو رہا تھا۔ جوتنی اور پٹونی بہت دنوں تک ہوئی تھی۔ بھوا کے سنسان جنگلوں میں برسوں رونے والے روئے تھے۔ راجگیر کی ویران پہاڑیوں میں مدتوں دعائیں کی گئی تھیں۔ جیٹھلی کی پرانی بستی کی گنگا ترائی میں برسوں مٹی کو آنسوؤں سے سیراب کیا گیا تھا۔ تب کیوال شکوہ، لودی کٹرہ، مغل پورہ، خان مرزا اور مضافات میں اسلام پور، زلفی پور، محی الدین پور، بی بی پور، اشرف پور، خرم پور، کشمیری چک، کرائے پر سرائے، عطا سرائے وغیرہ کی فصلیں اُبھری تھیں۔ ان کشت زاروں کی سرسبزیوں اور شادابیوں پر کہکشاں کو رشک آیا ہوگا۔ ستاروں کی چلمن سے قوس قزح طنز سے مسکرایا ہوگا۔ ان کشت زاروں سے کیسے کیسے پھل نکلے۔ کیسے

www.taemeernews.com

کیسے پھول کھلے' ان کی مٹھاس' چاشنی اور خوشبو کو پھیلنے کے لئے ادب و شاعری کے رہوار کی ضرورت نہیں تھی ۔ ان کے رنگ و بو کو دلالی کی احتیاج نہیں تھی ۔ ہر زبان ان کی شیرینی سے آشنا' ہر مشام ان کی خوشبو سے معطر اور ہر آنکھ ان کے نور سے منور تھی ۔ عظیم آباد اور مضافات کی ان فضاؤں نے بادِ نسیم کے نازک شانوں پر دور و نزدیک کا سفر کیا ۔ جہاں جہاں ہوائیں گئیں وہ رنگ و نور کی فضاؤں کا پیغام لے کر گئیں ۔ عبدالقادر بیدلؔ' ملا علیم تحقیق بڈھ وغیرہ ان فضاؤں کے سفیر تھے ۔ رنگ و بو کی ان آبادیوں نے کبھی کبھی اپنے جلوۂ گریزاں کی پرچھائیاں ادب و شاعری پر ڈالیں ۔ ادب و شاعری کے لئے پرچھائیاں ہی کافی تھیں ۔ آرٹ اور فن ان حقیقتوں کی نمائندگی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ۔ ان کا بھرپور جلوہ نہیں دکھا سکتا تھا ۔

ان صدیوں کی پھولی پھلی پھلواریوں پر تین تلواریں چلیں ۔ یہ تین وار آناً فاناً ہوئے اور صدیوں کی آبادی دو چار برسوں میں ہی برباد ہو گئی ۔ پہلا وار تقسیم کا تھا ۔ دوسرا وار خاتمۂ زمینداری کا تھا ۔ تیسرا وار زبان پر چلا ـــــ پہلے وار نے سر کو کاٹا' دوسرے حملے نے گھروں کو اُجاڑا ۔ تیسری تلوار نے تہذیب کو قتل کر دیا ـــــ میں سیاست کا آدمی نہیں' سیاست کا طالب علم نہیں' سیاست سے آشنا نہیں واقف نہیں ـــــ میں تو یہی جانتا ہوں ۔ میں نے یہی دیکھا یہی سمجھا ـــــ کہ کچے یا پکے مکانوں میں رہنے والے' کرتہ پاجامہ پہننے والے ۔ دال روٹی یا دودھ بھات کھانے والے ۔ پڑھے لکھے یا اَن پڑھ سیدھے سادے لوگ' پان کھاتے یا حقہ پیتے ہوئے' نمازیں پڑھتے ہوئے' محرم کا اکھاڑہ نکالتے ہوئے' عرس کرتے ہوئے' خانقاہوں میں قوالی سنتے ہوئے' کیفیت' وجد اور حال میں جھومتے ہوئے' دیہاتوں میں' کھیتوں میں کام کرتے ہوئے اور وقت ہو جائے تو وہیں وضو کر کے گمچھا بچھا کر دو چار رکعت ادا کرتے ہوئے ... ... چھوٹی موٹی مجلسیں گرماتے ہوئے' قصے کہانیاں کہتے ہوئے' شام کو پاکڑ یا برگد کے سائے میں دن بھر کی تکان مٹانے کے لئے آپس میں بول چال کرتے ہوئے ۔ دیوالی اور دسہرہ میں چراغاں دیکھنے کو نکلتے ہوئے ۔ گروجی سلام' پنڈت جی سلام کرتے ہوئے ۔ بازاروں میں آتے جاتے ہوئے ۔ مہابیر حلوائی سے بتاشے سورجی تمبولن سے پان اور درگی ساؤ سے کپڑے خریدتے

www.taemeernews.com

ہوئے۔ کبھی یہ نہ سوچتے ہوں گے کہ پاکستان ہوگا تو ہم حکومت کریں گے سلطنت کریں گے ریاست کریں گے ایسری کریں گے سرداری کریں گے، دشمنی کریں گے، انتقام لیں گے۔ وہ کبھی نہیں سمجھتے تھے کہ پاکستان سے مراد انسانوں کی تقسیم ہے، جانوں کی تقسیم ہے، زبان کی تقسیم ہے، دلوں کی تقسیم ہے، محبت کی تقسیم ہے، دوستی کی تقسیم ہے، تعلق اور مروت کی تقسیم ہے رشتے اور بھائی بندی کی تقسیم ہے۔ پاکستان کے معنی ہیں سروں کا کٹنا، گھروں کا اجاڑنا، بستیوں کا تباہ کرنا۔ دوستوں کا دشمن بن جانا، اپنوں کا پرایا بن جانا، آنکھوں سے پانی کا اتر جانا، رواداری کا ختم ہو جانا ——— وہ تو سمجھتے تھے کہ ایک جگہ کچھ لوگ ایسی بستی بنائیں گے جس کا نام پاکستان ہوگا۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ جہاں اب بھی مسلمانوں کی حکومت ہے۔ آسام میں بنگال میں، پنجاب میں، سندھ میں سرحد میں۔ صرف نام بدل جائے گا۔ سب مسلمان یہی سمجھتے تھے کچھ لوگ ممکن ہے کچھ اور سمجھتے ہوں۔ یہ کوئی نہیں سمجھتا تھا کہ وہی کام جو اب قانون ہے نام بدل جانے سے وہی جرم ہوگا۔ اس کے لئے گردنیں کاٹی جائیں گی، گھر اُجاڑے جائیں گے۔ بستیوں سے نکالا جائے گا۔ ایک ایک اینٹ زمین سے ان کو محبت تھی، زمین پر رہنے والوں سے محبت تھی۔ سبزے سے، پھولوں سے، کانٹوں سے، گھاس سے، پودوں سے، دیواروں سے، گلیوں سے، پگڈنڈیوں سے، اڑانوں سے، ٹیلوں سے، گڈھوں سے، کھیتوں سے کھلیانوں سے، درختوں سے شاخوں سے ایک ایک چیز سے ان کو محبت تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسی مٹی سے نکلے ہیں اسی مٹی پر چلے ہیں پھرے ہیں کھیلے ہیں دوڑے ہیں اسی مٹی پر گریں گے اور اسی مٹی میں گڑیں گے۔ انہیں لاہور سے، پشاور سے، ملتان سے ڈھاکہ سے چٹاگانگ سے محبت نہ تھی۔ بہت تو نام بھی نہیں جانتے تھے۔ اپنے گاؤں کو جانتے تھے اپنی بستی کو جانتے تھے، اپنے شہروں کو جانتے تھے۔ یہی گاؤں یہی بستی یہی شہر ان کا سب کچھ تھا۔ تعلق محبت رشتہ ناتہ بھائی بندی برادری سب کچھ انہیں سے تھا۔ اسی کی کہانیاں اسی کے قصے اسی کے فسانے سن سن کر جاگتے تھے۔ انہیں کو خوابوں میں دیکھتے تھے اور انھیں میں تعبیریں ڈھونڈھتے تھے۔ ان کی ننھیال دادھیال سسرال، سمدھیانہ سڑھوانا سب کچھ یہیں تھا۔ بیٹیاں انہیں میں جاتی تھیں بہوئیں انھیں سے

www.taemeernews.com

آتی تھیں براتیں یہیں اترتی تھیں۔ان کا میل جول ان کا لڑائی جھگڑا ان کی جدائی، ان کا ملاپ سب کچھ انہیں سے تھا۔ترک محبت اور تجدید محبت سب کچھ یہیں ہوتا تھا۔ چٹاگانگ، ڈھاکہ، پشاور، کراچی سے نہ کبھی برات آتی تھی نہ جاتی تھی۔نہ ان کا لین دین تھا نہ ان کا آنا جانا تھا۔نہ جان پہچان تھی۔نہ ان کا دھیان کبھی ادھر جاتا تھا۔نہ ان کے تصور میں، خواب میں خیال میں کوئی آتا تھا نہ یہاں کی آب و ہوا سے کوئی مناسبت تھی نہ مزاج طبیعت سے ہم آہنگی تھی۔نہ بول چال کی مناسبت تھی۔کوئی پہلو ایسا نہیں جس سے کوئی جرم ثابت ہو جس کے لیے اتنی بڑی سزا دی جائے۔ ہاں ایک رشتہ تھا وہ ایمان کا تھا۔مرنے کے بعد والا رشتہ تھا۔ اس میں تو بہت دیر تھی۔ وہ تو ہر حال میں ہو کر رہتا اور ہو کر رہے گا۔ جہاں رہیں، زمین پر رہیں، آسمان پر رہیں، زہرہ مریخ، مشتری، عطارد کہیں رہیں وہ رشتہ تو ایک دن بہر حال زندہ ہونا تھا، زندہ ہونا ہے زندہ ہوگا۔لیکن جیتے جی تو سارے رشتے ناطے یہیں سے رہے، رہن سہن یہیں کی رہی، یہیں کی ہے اور یہیں کی رہے گی۔ تو پھر۔

یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

بغیر کسی گناہ، بغیر کسی جرم، چھوٹے یا بڑے دھندلے یا صاف، مبہم یا واضح نئے یا پرانے۔ایسی سزائیں دی گئیں جن کی مثال نہیں۔ دوستوں کے ساتھ رات دن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ ہم جولیوں کے ساتھ بھائی بھتیجہ بن کر رہنے والوں یا بنا کر رکھنے والوں کے ساتھ وہ کیا گیا جو دشمنوں کے ساتھ خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ اور نہیں کیا گیا ہوگا۔ گاؤں کے گاؤں سنسان ہو گئے، بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔ جہاں چراغاں ہوتے تھے وہاں ایک چراغ جلانے والا کوئی نہ رہا۔لوگ بستیوں کو مٹا کر ایسے خوش ہوئے جیسے گھر بنا کر خوش ہوتے ہیں۔انسانوں نے وہ کیا جو درندے بھیڑیے نہیں کرتے۔

اس طرح یہ تلوار گردنوں پر پڑی سینوں پر پڑی۔ان کے سروں پر ان کے سینوں پر جنہوں نے باغ لگائے گلزار کھلائے روشیں بنائیں، کیاریاں جمائیں، گیسوؤں کو سنوارا چہروں کو نکھرنا سکھایا ابروؤں کو بل کھانا سکھایا جن کی صحبتوں میں بلبلوں کو چہکنا آیا، سبزوں کو لہکنا آیا۔

www.taemeernews.com

کلیوں کو مسکرانا، شاخوں کو سر سرانا آیا۔ جنہوں نے وضع داریاں بنائیں۔ کجکلاہیاں سکھائیں، مرزائیوں، انگرکھوں اور چپکنوں سے گذار کر شیروانیوں تک پہونچایا۔ لالہ جی کو اور پنڈت جی کو شاستری جی کو سہنا جی کو درما جی کو شیروانی چست پاجامہ اور ناگرہ پہنا کر چلایا پھرایا۔ دسترخوان بچھانا سکھایا ــــ رکابیوں کی پیالوں گلاسوں کی تشتریوں کی قسمیں ایجاد کیں۔ ترکاریوں، مٹھائیوں روٹیوں، چٹنیوں کے ذائقے شکلیں اور صورتوں سے دسترخوان کو سجایا۔ انشی انشی قسم کی ترکاریاں اور سیکڑوں قسموں کے حلوے اور مٹھائیاں ایجاد کیں۔ وضع میں لباس کی تراش خراش میں پہننے اوڑھنے بچھانے رہنے سہنے کے لوازمات کو مٹی سے سونے کی شکل دی۔ زمین سے آسمان پر پہونچایا۔ سڑکیں بنائیں، شاہراہیں کھولیں، چوکیاں بٹھائیں، رسل و رسائل کے وسائل کہاں سے کہاں پہونچائے۔ جنہوں نے شالیمار دیا، لال قلعہ دیا، فتح پور سیکری دیا، قطب کی لاٹ دیا۔ جنہوں نے کتنے رحیمن دیئے، کتنے ملک محمد جائسی دیئے، کتنے دیا شنکر نسیم دیئے، کتنے چکبست دیئے، سرور جہان آبادی دیئے، فراق دیئے، آنند نرائن ملا دیئے، تیر دیئے، غالب دیئے، انہیں بے زبان کر کے، بے سہارا کر کے، بے آسرا کر کے، بے سایہ، بے چادر، بے ڈوپٹہ، ننگا بھوکا نکال دیا۔ شیر شاہ روڈ ڈھاکہ نہیں گیا، لال قلعہ، چٹاگانگ نہیں گیا، فتح پور سیکری، لاہور نہیں گیا، تاج محل کراچی نہیں گیا، قطب کی لاٹ پیشاور نہیں گیا ــــ مجرموں کو نکال دیا لیکن جرموں کی یادگاریں یہیں رہیں۔

چند ہی برسوں بعد دوسری تلوار چلی ــ خاتمۂ زمینداری ہوا ــــ میں سیاسیات کا ماہر نہیں، اقتصادیات کا ماہر نہیں، عمرانیات کا ماہر نہیں۔ میں تو ادب کا طالب العلم ہوں۔ یہ بھی ایک نظر ہے، یہ بھی ایک نگاہ، یہ بھی ایک روشنی ہے، چیزوں کو اس روشنی میں اس نظر سے اس نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس کی بھی ایک رائے ہے، اس کا بھی ایک فیصلہ ہے ــ اور اس کی رائے بھی بہت رایوں پر بھاری رہی ہے اس کا فیصلہ بھی بہت سے فیصلوں پر وزنی رہا ہے اور اکثر اسی کا فیصلہ قائم رہا ہے۔ زمانے نے بہت سے دوسرے فیصلوں کو غلط کہہ کر رد کر دیا وقت نے دوسرے فیصلوں کی کمزوری خامی کو ثابت کر دیا لیکن ادب والا فیصلہ اکثر جاوداں ہو گیا۔

www.taemeernews.com

غیر فانی ہوگیا، مستقل ہوگیا، مستحکم ہوگیا ـــــ میں نہیں کہہ سکتا خاتمۂ زمینداری سے ملک کو کتنا فائدہ ہوا کتنا نقصان ہوا۔ نام بدل گئے، زمینداری ختم ہوگئی، زمیندار ختم ہوگئے۔ لیکن کتنے نئے مال دار پیدا ہوگئے؟ سرمایہ دار پیدا ہوگئے؟ ـــــ مال دار، سرمایہ دار جو اب کر رہے ہیں کس زمانے میں وہ زمین دار اور تعلق داروں نے کیا؟ ـــــ یہ دیکھ رہے ہیں۔ دنیا یہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن دنیا چُپ ہے۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ـــــ زندگی سے ایک شائستگی نکل گئی۔ ایک حُسن نکل گیا۔ بیٹھنے اُٹھنے ملنے جلنے بولنے چالنے رہنے سہنے، خدمت محبت، مروت، رواداری، پرورش، پرداخت، نشست و برخواست کی ایک چمکتی دمکتی، دھڑکتی، لہکتی دنیا ختم ہوگئی۔ زمین داری کے ساتھ ریاست تھی، امارت تھی۔ گرچہ نام بڑا اور درشن تھوڑے تھے۔ مگر کسی زمیندار کسی رئیس کے یہاں وہ نہیں ہوتا جو سرمایہ داروں اور مالداروں کے یہاں اب ہوتا ہے ـــــ وہاں آداب عرض تھا، تسلیمات عرض تھا، بندگی عرض تھا، جاہل اور عالم پڑھے لکھے اور اَن پڑھ۔ مالک اور مصاحب میں فرق کرنا مشکل تھا۔ پیٹ میں کھانا نہیں تھا لیکن بالوں میں تیل تھا، ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ باتوں میں وزن رہتا تھا، لباس میں صفائی رہتی تھی۔ گھر میں فاقہ بھی ہوتا ہو تو مہمان کے لئے پیالی میں چائے آجاتی تھی۔ پان کا ڈبہ بڑھا دیا جاتا تھا یہ نفاق نہیں تھا۔ وضع داری تھی۔ زمینداری کے ساتھ طوائفیت بھی تھی۔ کوٹھے بھی آباد تھے۔ پائل کی جھنکار اور ساز و نغمہ کی چہکار بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن طوائفیت وہ تھی جہاں شرفا کے کمسن اور نوجوان لڑکے آداب و نشست و برخواست، اصول و گفتار، تہذیب و شائستگی سیکھنے کو بھیجے جاتے تھے۔ اب کوٹھے آباد نہیں۔ لیکن وہ کوٹھے کہاں کہاں منتقل ہوئے ہیں سب جانتے ہیں۔ اور کس حال میں ہیں کس سطح پر ہیں سب جانتے ہیں دیکھتے ہیں سنتے ہیں۔ نام زمیندار تھا لیکن زمینداروں کے پاس کیا تھا؟ چادر گاؤ تکیہ تھا اور کیا تھا۔ لیکن چادر کے نیچے، گاؤ تکیہ کے اندر کتنے محتاجوں کی پرورش کا نظم تھا۔ لوگ اب کار رکھتے ہیں۔ اس وقت کس کس کے یہاں گھوڑا رہتا ہوگا۔ لیکن ہر دروازے پر دو چار غریب طالب العلم کی تعلیم و تربیت پرورش و پرداخت کا نظم تھا اور وہ طالب العلم ان کے گھر کے فرد اور خاندان کا جزو ہوتا تھا۔ یتیم خانے، مسکین خانے،

www.taemeernews.com

نہیں تھے۔ یتیم، مسکین نہیں جانتا تھا کہ یتیم مسکین کسے کہتے ہیں۔ وہ سماج کا سوسائٹی کا ایک باعزت فرد ہوا کرتا تھا۔ گماشتہ جی، پٹواری جی، بساہل جی۔ تہذیب و شائستگی، ادب و وضع مرنج اور طبیعت کے ایسے ہوا کرتے تھے کہ آج پروفیسر صاحب اور ڈاکٹر صاحب اس سطح کو نہیں پہونچتے۔ پھر ان کے متعلقین اور متوسلین ایک وسیع عملہ ہوا کرتا تھا۔ جس کی جسمانی پرورش و پرداخت کے ساتھ اخلاقی اور روحانی تربیت بھی ہوتی تھی۔ زمیندار صاحب کی آمدنی سو روپے ڈیڑھ سو روپے ماہوار تھی لیکن گھر کی فضا، گھر کی تہذیب، گھر کی رہائش، گھر کے لوگوں کی وضع، گفت گو دیکھو تو آج ہزاروں اور لاکھوں والوں کے یہاں بھی نہیں ملے گی۔ لاکھوں کے کاشتکار ہیں۔ گھر میں جا کر دیکھو تو اِدھر کوڑا، اُدھر کرکٹ، اِدھر کٹوا اُدھر بھونسہ، اِدھر گوبر اُدھر گوٹھا، اِدھر سوَر، اُدھر کتا، اِدھر بھینس اُدھر بیل، اِدھر تھوک اُدھر کھنکھار، اِدھر دتون اُدھر جبھی۔ ٹوٹی کرسی، جانگھ تک میلی دھوتی۔ بدن ننگا۔ آواز تلخ بات خشک "ارے چلنوا۔ ارے سار ادھر کا کرے ہے رے۔ سارا ادھر نہ آ" دیہات دیہات چلے جائیے گاؤں گاؤں پھر جائیے یہی منظر ملے گا۔ اسی منظر کے پس منظر میں گردن کاٹی جا رہی ہے۔ گھر لوٹے جا رہے ہیں کھیتیاں برباد کی جا رہی ہیں خون ہو رہے ہیں، لہو بہایا جا رہا ہے ـــــ پہلے لہو بنایا جاتا تھا۔ پہلے بہت کم پیسے میں بہت زیادہ لہو بنا دیا جاتا تھا۔ اب بہت کم پیسے میں بہت زیادہ لہو بہا دیا جاتا ہے۔ پہلے ایک ایک قطرے خون کی قیمت تھی۔ اب ایک گھڑا خون بھی بے قیمت ہے.... بہت دنوں پہلے میں مکتب میں پڑھتا تھا۔ نانا کافی ضعیف تھے۔ گھر کے لوگ سب ہلسہ کسی تقریب میں گئے تھے۔ نانا اور گھر میں ماما تھی۔ کسی دن نانا نے گھر کے کھنڈہر دیوار کی معمولی مرمت کے لئے ایک ادھیڑ مزدور مقرر کیا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد شام کو مزدوری کے سلسلہ میں اسی مزدور سے جو نشہ میں تھا کچھ حجت ہو گئی۔ اس نے بھی کچھ شوخی اور گستاخانہ انداز میں بات کی اور نانا بھی کچھ ڈانٹ ڈپٹ کر گئے۔ رات ہوئی صبح ہوئی وہ مزدور گھر نہیں پہونچا تلاش ہوئی اور وہ مزدور نانا کے کھنڈ کی دیوار سے متصل کنویں میں مردہ پایا گیا۔ اس کے گھر والوں نے شور کر دیا کہ مولوی صاحب نے ہمپو بلدار کو مار کر کنویں میں ڈال دیا۔ تمام بستی میں آگ کی طرح بات

www.taemeernews.com

پھیل گئی۔ قتل ایک نہایت غیر معمولی بات تھی۔ اس زمانے میں برس چھ مہینے پر بھی کہیں یہ بات ہو جاتی تو تمام سنسنی پھیل جاتی۔ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ قریب کے یکنگر سرائے تھانہ سے پولیس، جمعدار، سب انسپکٹر بھی آ گئے۔ نانا ضعیف آدمی، مولوی صاحب۔ نیکی اور شرافت میں سارے جوار میں مشہور، مگر واقعہ نظر کے سامنے تھا۔ اس کی سنگینی سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور حالات بالکل قرین قیاس تھے۔ حجت تکرار شام کو ہو چکی تھی۔ لاش کھنڈ کے اندر کنویں میں پائی گئی۔ گرچہ بدن پر کہیں زخم کا کوئی نشان نہ تھا۔ کنویں میں گرتے ہوئے بدن پر خراشوں کی موجودگی تھی، لیکن دوسری طرف مولوی صاحب کی عمر اور ضعیفی اور نیکی، خوشنامی اور شرافت بھی تھی۔ پولیس نے گرفتار تو نہیں کیا مگر مقدمہ درج کر لیا۔ افسران بالا کو خبر کی گئی۔ ہلسہ سے انسپکٹر پولیس آئے۔ بہار شریف سے ڈی۔ ایس۔ پی آئے۔ تحقیقات بڑی تیزی سے شروع ہوئیں۔ پورے جوار میں بات مشہور ہو گئی۔ موافق اور مخالف دونوں طرح کے بیانات سوالات جوابات آنے لگے۔ ہم لوگ بھی ہلسہ سے آئے۔ والد بھی کلکتہ سے آ گئے اور رشتہ مند بھی جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب پر سخت سوالات اور جرح ہوتی رہی۔ مولوی صاحب بالکل ناواقفیت اور لاعلمی کا اظہار کرنے لگے۔ ہلسہ کے انسپکٹر پولیس جمنا پرشاد سنگھ، سیاہ فام آدمی، بڑے بڑے دانت کرخت لہجہ۔ طنز آمیز انداز۔

"کہیے مولوی صاحب۔ یہ کیا ہوا؟

"بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ کیا ہوا کیسے ہوا"

"جی۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ تو جانتے ہیں چھوٹ نہیں جانتے"

وہ دانت پیس پیس کر غصے کے انداز میں بات کرتے۔ نانا معصومیت سے جواب دیتے۔ پھر وہ مجمع کی طرف مخاطب ہوتے۔

"تم لوگ جو کہو،... جو سمجھو.... میں تو سمجھتا ہوں کہ مولوی صاحب نے مار کر کنویں میں ڈال دیا ہے"

مجمع میں کچھ لوگ خاموش رہتے۔ کچھ تائید کرتے۔ تردید کرنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

www.taemeernews.com

کسی گاؤں میں اتنے پولیس افسران اور پولیس کا جمع ہو جانا ہوش گم کر دینے کو اس زمانے میں بہت کافی تھا۔ بات مسلمان ہندو کی تھی۔ ظاہری حالات، مولوی صاحب کے خلاف تھے .... پولیس سچائی کی تلاش میں تھی... اس کی غیر موجودگی میں مولوی صاحب تو فیصد ماخوذ ہونے کے قابل تھے .... بہرحال مولوی صاحب کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ یاد نہیں ضمانت ہوئی یا نہیں ہوئی۔ مگر جمنا پرشاد سنگھ بار بار غصے سے دانت پیستے ہوئے مولوی صاحب سے مخاطب ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ انہیں پورا یقین ہے کہ مولوی صاحب نے ہی یہ جرم کیا ہے۔

پولیس موجود رہی آفیسران آتے رہے جاتے رہے، انکوائری ہوتی رہی، تحقیقات ہوتی رہی جائے وقوع کا معائنہ ہوتا رہا، پیمائش ہوتی رہی۔ گواہاں اور شہادتیں بھی گذرتی رہیں .... انسپکٹر کا انداز دیکھ کر گواہوں اور شہادتوں کا رُخ مولوی صاحب کے خلاف ہی چلتا رہا .... انسپکٹر صاحب اسی تیور سے تحقیقات کرتے رہے اور شہادتیں لیتے رہے۔ اسی میں ہفتہ عشرہ گذرا۔ شاید دو ہفتہ کے بعد ایکنگر سرائے کے جمعدار آئے۔ ہم لوگوں کی طرف سے پیروی کار، اطہر نامہ اور ڈاکٹر سید محمد اعظم صاحب تھے۔ جمعدار صاحب، ان دونوں سے مسکراتے ہوئے مخاطب ہوئے اور انسپکٹر کی رپورٹ کی نقل حوالے کی۔ پڑھا گیا۔ رپورٹ کا خلاصہ یہی تھا کہ ہیمو بلدار نے تمام دن کھنڈ میں کام کیا۔ تاڑی بھی پیتا رہا۔ کام بھی کرتا رہا۔ اسی کھنڈ میں اول کے درخت تھے جن کی جڑوں سے ترکاری اور اچار بنائے جاتے ہیں۔ شام کو اسی نشہ میں مولوی ضمیر الدین صاحب مالک مکان سے حجت ہوئی مقررہ رقم سے وہ زیادہ مزدوری کا طالب تھا .... مزدوری سے اس نے اور بھی نشہ پیا۔ رات گئے تک پیتا رہا۔ اور رات گئے، مولوی صاحب کے کھنڈ سے اول چرانے کے لئے گیا۔ دیوار سے متصل کنواں تھا جو اندھیرے میں نظر نہ آیا۔ دیوار جو نیچی تھی۔ اس پر چڑھ کر کھنڈ میں کودا تو وہیں پر کنواں تھا سیدھے کنویں میں گیا۔ نشہ بھی تھا چوٹ بھی کھائی۔ چیخنے اور شور کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی کنویں میں ہی مر کر رہ گیا۔ مولوی ضمیر الدین بالکل بے قصور ہیں۔"

یہ رپورٹ اسی انسپکٹر پولیس کی تھی جو غصے میں دانت پیس پیس کر مولوی صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ معلوم ہوا اس کا انداز ہی یہی تھا اور جس کی بے قصوری کا اسے احساس ہو جاتا اس سے

www.taemeernews.com

اور زیادہ سختی، درشتی اور غصے کے انداز میں مخاطب ہوتا تھا۔۔۔۔ جمعدار صاحب کو اعظم نانا نے دس روپے کا نوٹ جو اس دور کے پانچ سو روپئے کے برابر تھا۔ پان کھانے کے لئے پیش کیا۔ جمعدار نے اُٹھ کر سلام کیا۔ اور کہا میرے لئے آپ لوگوں کا آشیرواد اس سے بہت زیادہ ہے اور روپے نہیں لئے۔

حقیقتاً واقعہ بھی یہی تھا۔ اسے کسی نے قتل نہیں کیا۔ قتل اس دور میں آسان نہ تھا۔ اس کے لئے انسان کو اپنے اندر کی حیوانیت ابھارنے میں بہت دیر لگتی تھی۔ اور اس کام کے لئے اسے اتنا وقت نہیں ملتا تھا اور باہر کے حالات بھی ایسے نہ تھے کہ انسان کے اندر کا شیطان غفلت سے اتنی جلد بیدار ہو جائے۔ یہ اس تہذیب کی دین تھی جو زمیندارانہ، رئیسانہ، جاگیردارانہ نظام کی آغوش میں پرورش پاتی تھی۔ آج کے جمہوری نظام زندگی میں جو تہذیب نشوونما پا رہی ہے۔ وہ پیش نظر ہے۔

میرے بہت بچپن کی بات ہے۔ شاید میں مکتب میں بھی داخل نہ ہوا تھا۔ پاس ہوا ہی تھا۔ میرے جوار میں بڑی شدت سے کالرا پھیلا ہوا تھا۔ ہر طرف موت کی خبریں روزانہ تیزی سے آرہی تھیں اور وبا بتدریج تیلہاڑہ کے قریب آرہی تھی۔ بستی میں ذہن بہت منتشر تھے جو معلمن تھے۔ وہ دعاؤں میں، عبادتوں میں مشغول تھے۔ مگر وبا کی شدت اطراف میں بڑھتی جارہی تھی۔

ایک دن شام میرے مکان کے سامنے صحن کے بعد امام باڑے کے چبوترے پر ایک شخص آکر بیٹھا۔ گندمی رنگ، بدن کچھ فربہ، سیاہ کرتہ، سیاہ لنگی، کندھے پر سیاہ کمبل۔ ہاتھ میں بہت پرانی چکنی لاٹھی۔ بغل میں کونڈل جو فقیروں کے پاس ہوتا ہے، بھرکلہ سیاہ داڑھی، تقریباً پچاس پینتالیس کی عمر سردی کافی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے وہیں چبوترے پر شبنم میں اپنا کمبل بچھایا۔ نماز پڑھی اور بیٹھا رہا۔ شب کو کھانے کا نظم کیا گیا۔ مگر اس نے نہ کوئی سوال کیا، نہ گفتگو کی۔ رات گذر گئی۔ صبح اس نے چند سمجھدار لوگوں کو ہمارے محلے سے بلایا۔ مختصر لفظوں میں کچھ باتیں کیں ایک سیاہ بکرا منگوایا گیا۔ یاد نہیں چندے سے آیا، یا میرے گھر سے خریدا گیا۔ بہرحال بکرا آیا۔ قریب ہی چوراہا تھا۔ راستہ ایک ہمارے محلے کی طرف آتا۔ شمال میں ہمارا محلہ۔ جنوب میں قاضی ظہور الحق صاحب

www.taemeernews.com

اور سبزی فروشوں کا مشرق میں بازار، مغرب میں باغ اور ندی کی طرف کا راستہ۔ وہ بکرا وہیں چوراہے پر ذبح کیا گیا۔ اور وہیں آگ سلگا کر بڑے ہنڈے میں پکایا گیا۔ دن بھر پکتا رہا۔ کئی سو چھوٹی چھوٹی کلہڑی جیسی آج کل پلیٹ فارم پر چائے کے لئے استعمال ہوتی ہے کمہار کے یہاں سے منگوائی گئی۔ اور شام کو انھیں کلہڑیوں میں بوٹیاں اور قلیہ ڈال کر پوری بستی میں فقیر غریب، امیر جوان، بوڑھے عورتوں، مرد ملے، مسلمان اور شاید غیر مسلموں کو بھی تقسیم کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بھی کھایا... صبح کو وہ شخص غائب تھا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کدھر سے آیا تھا۔ کدھر گیا۔ اور دوسرے ہی روز سے ہیضہ کی وبا میں کمی آگئی۔ جہاں تک یہ وبا پہونچی تھی، اس سے آگے نہیں بڑھی اور رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔

یہ اسی تہذیب کی برکت تھی، اسی نظامِ زندگی کی برکت تھی۔ اب پڑھ لکھ کر سمجھا اور سنا کہ صدقہ بلاؤں کو ٹالتا ہے.... وہ صدقہ ہی کی تقریب تھی جسے ایک مردِ غیب نے آکر یاد دلایا۔ اور مکمل کر کے غائب ہو گیا۔ اور اپنے ساتھ سیکڑوں ہزاروں جانوں کی مصیبتیں لیتا گیا۔

اس کے بعد بھی میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر اعظم نانا جو معمولی ہومیو پیتھک دوائیں رکھتے تھے۔ ایک پرانی سی میز، اس پر ایک چھوٹی سی صندوقچی۔ اس میں پچاس ساٹھ چھوٹی چھوٹی ننھی ننھی شیشیاں۔ دو تین بوتلوں میں پانی۔ کچھ خالی شیشیاں۔ کچھ کاغذ کے ٹکڑے قلم دوات اور ایک کرسی۔ یہی ان کا مطب، یہی کلینک اور یہی دواخانہ تھا۔ تیلہاڑہ سے آدھ میل شمال گوالوں اور کوئریوں کے دو تین گاؤں میں کالرا کی تیز وبا آئی اور اعظم نانا کو دیکھتے کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھ کر ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر ہاتھ میں چھڑی لیتے اور ان گاؤں میں چلے جاتے۔ گھر کے لوگ منع کرتے۔ ملنے والے بھی منع کرتے مگر ان کا روزانہ کا یہ معمول رہتا۔ ظہر کے قبل تمام مریضوں کو دوا دیتے ہوئے واپس آتے۔ اور کبھی بیمار نہ پڑے۔ اور ان کے اکثر و بیشتر مریض چنگے ہو گئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اور تصویریں پیش کروں گا۔

www.taemeernews.com

ستم ہیں آب و گُل پر آب و گِل کے
چمن لوٹا چمن والوں نے مِل کے
کلیجہ رہ گیا پھولوں کا ہِل کے
نہ جانے کیا کہا غنچے نے کھِل کے
ہم اسے عاجزؔ غزل کہتے نہیں ہیں
پھپھولے پھوڑتے رہتے ہیں دل کے

کسی نے زہر دیا، کسی نے زہر گوارا کرلیا۔ مجرم دونوں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ زہر دینے والا خدا اور خدا کی تمام مخلوق کی نگاہ میں مجرم ہے اور زہر گوارا کر لینے والا صرف خدا کا مجرم ہے۔ دوسرا مجرم معاف کردیا جاسکتا ہے اور معاف کردیا جائے گا۔ لیکن پہلا مجرم کسی حال میں اور کہیں معاف نہ کیا جائے گا اور تاریخ بھی اسے معاف نہ کرے گی۔ بشرطیکہ کوئی سچا تاریخ لکھنے والا پیدا ہوگیا جس کی امید کم ہے ع

رہی یہ بات کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ شاید تیرہویں یا چودھویں قسط میں لکھ رہا ہوں۔ ایک چھوٹی سی کتاب تقریباً مکمل ہوگئی۔ لیکن ابھی تو دل کا پورا تہہ بھی نہیں کھلا ہے۔ کچھ باتیں رہ کر ٹپک آئی ہیں۔ کیا کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کیا کہوں گا ابھی تو ابتدا ہوئی ہے۔ بہت دن ہوئے ایک غزل لکھی تھی جو مطبوعہ مجموعے میں ہے اس کا ایک شعر ہے ؎

تم میرے فکر و فن کا اگر حوصلہ بڑھاؤ
دنیا میں کھینچ لاؤں فضائے بہشت کو

www.taemeernews.com

"وہ جو شاعری کا سبب ہوا" ـــــ "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" ـــــ "اک دیس اِک بدیسی" اور "یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ" ان چاروں کتابوں میں یہی "فضائے بہشت" کو دنیا میں کھینچ لانے کی ابتدائی کوششیں ہیں۔ یہ کسی منافع کے لئے، کسی اُجرت کے لئے، کسی معاوضے کے لئے نہیں ہے۔ اُجرت پر "دنیا میں فضائے بہشت" کا پیدا ہونا کہاں ممکن ہے۔ اس فردوس گم شدہ کو کوئی دیوانہ ہی ڈھونڈ کر لا سکتا ہے۔ تقریباً چالیس سال قبل الفنسٹن تھیٹر میں 'لیلیٰ مجنوں' ڈرامہ دیکھا کرتا تھا۔ ماسٹر غلام حسین مجنوں بنتے تھے۔ خوب اچھی آواز سے گاتے تھے۔ پورا ڈرامہ شاید منظوم ہی تھا ـــ تو ایک منظر یہ تھا کہ مجنوں دامن دریدہ گریباں چاک ـــ چہرے پر گرد، سر پہ خاک، 'لیلیٰ' پکارتا ہوا دیوانہ پھر رہا ہے اور لڑکے اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے چل رہے ہیں۔ لڑکوں کا پہلا منظوم مکالمہ یہ تھا:-

چُپ رے چپ رے او دیوانے تیری شامت آئی ہے
لیلیٰ لیلیٰ بکتا ہے کیا کھائی تو نے بھنگ
سُن لے گا جو اس کا والد جی کر دے گا تنگ

تالیاں بجاتے ہیں چڑھاتے ہیں۔ مجنوں بھی کچھ اشعار پڑھتا ہے اور پھر کچھ پتھر ہاتھ میں لے کر لڑکوں کی طرف دوڑتا ہے اور یہ شعر پڑھتا ہے ؎

لیلیٰ کا جو نام لیا ہے رحم ہوں تم پہ کرتا
ورنہ اس پتھر سے دیکھو ٹکڑے سر کے کرتا

لڑکے کچھ اور شعر پڑھتے ہیں۔ آخر کا مصرع یہ ہے کہ ع

پھوڑ لے اپنا سر پتھر سے عاشق ہے گر سچا

مجنوں، اس ترغیب پر مست ہو جاتا ہے، رقص کرتا ہے اور کہتا ہے ؎

کیا مزے کی بات ہے ہو جاؤں میں قربان
پھوڑ لوں اپنا سر پتھر سے دیدوں بلکہ جان

اور قریب ہی کہیں دیوار پہ زور سے سر مارتا ہے سر پھوٹ جاتا ہے اور زور سے خون جاری ہو جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

مجنوں کے رقص و مستی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے ـــــ سر پھوڑنے کے لئے مجنوں کو بھی ترغیب کی ضرورت تھی ـــــ تو دل کا لہو کرنے کے لئے بھی ترغیب کی حاجت ہے۔ فضائے بہشت دنیا میں برپا کرنے کے لئے کوئی حوصلہ بھی تو نہیں دیتا۔ اس مردہ پرست انسانوں کی بستی میں گہر لاؤ گے تو کوڑیوں کے مول مانگیں گے اور جب مر جاؤ گے تو کوڑیوں کے بھاؤ خریدے ہوئے موتیوں کو لعل و جواہر کے بھاؤ میں پھر بیچیں گے۔

شاید چند سال پہلے جاں نثار اختر کا مجموعہ کلام شائع ہوا تھا۔ قیمت دس روپے تھی۔ جاں نثار اختر کے انتقال سے کچھ پہلے علی سردار جعفری کا خط جاں نثار اختر کے نام آیا کہ ادب و شاعری کا المیہ ہے کہ تین سال سے تمہارا مجموعہ پڑا ہوا ہے۔ دس روپے میں کوئی لینے کو تیار نہیں۔ اور جاں نثار اختر مر گیا تو سنا کہ ابھی اس کا مجموعہ دوبارہ شائع ہوا ہے جس کی قیمت شاید پچاس روپیہ ہے :

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

تنقید کی گنتی کی کتابیں لکھی گئی ہیں، شاد کا نام بھی کسی کتاب میں نہیں آیا۔ ایم۔ اے میں، بی۔ اے آنرس میں لڑکے مجاز کو جان گئے، اختر شیرانی کو جان گئے۔ لیکن شاد کو، آزاد کو کوئی نہیں جانتا۔ اب کہا گیا کہ

"اردو شاعری کے ارباب ثلاثہ میر، غالب اور شاد ہیں۔ کبھی کبھی شاد غالب سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔" جب شاد کے نام ہزاروں روپے کھا لئے گئے تب زبان سے یہ بات پھوٹی۔ ابھی جمیل اور پرویز ہزاروں ٹن مٹی تلے پڑے ہیں جب کفن بیچ کر کھا لیا جائے گا، تب مُردوں کو نیا کفن پہنانے کے لئے پھر قبر سے نکالا جائے گا۔

میں تو نیکی کر رہا ہوں اور دریا میں ڈال رہا ہوں۔ نیکی کرتا رہوں گا اور دریا میں ڈالتا رہوں گا۔ ..... دن گذر جائیں گے۔ جب سناٹا ہو جائے گا تو دریا میں غوطے لگائے جائیں گے۔ ان تہہ نشینوں کو نکالا جائے گا اور پھر :

یہ دنیا جو بہت اترائے پھرتی ہے۔
مجھے ٹھکرائے پھرتی ہے۔

www.taemeernews.com

میری غزلوں کو سینے سے لگائے گی
میری جب یاد آئے گی

ان کی گرہوں کو کھولا جائے گا۔ تہوں کو الگ کیا جائے گا۔ جو سمجھا جا چکا ہے اس کا اظہار کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ ہاں ٹھیک کہا گیا کہ

ہم کو دعائیں دو کہ تمہاری اداؤں پر
ہم نے جو کہہ دیا وہ بھلایا نہ جائے گا
ہر دور میں ہماری غزل گائی جائے گی
جیسی بھی دھوپ آئے یہ سایا نہ جائے گا

میں نے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ مسلم اسکول کے نویں کلاس میں ماسٹر عبدالقدوس صاحب جو شاید اردو اور فارسی میں ایم۔اے کر کے آئے تھے، سجیلی کسی ہوئی شیروانی، گیا کی ترشی ہوئی سفید کامدار پلّے کی ٹوپی، سنہری کمانی کا چشمہ، سفید خالتہ پاجامہ، سیاہ شو، سانولا رنگ، جوان و بلند و بالا، ایک روز کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ اردو پڑھاتے پڑھاتے فارسی کا ایک قطعہ بلیک بورڈ پر چاک سے لکھا۔ چالیس سال سے زیادہ ہو گئے۔ اسی کلاس میں یہ قطعہ بلیک بورڈ پر لکھا ہوا دیکھا تھا اور اب تک یاد ہے۔ خوشنما صاف نستعلیق حروف میں۔

جانِ پدر تو صُفرہ بے ناں نہ دیدہ ای
جنگِ عیال و گریۂ طفلاں نہ دیدہ ای
نہ تشتئ بگوشہ از بیم قرض خواہ
ناگہ ز در در آمد مہماں نہ دیدہ ای

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ماسٹر صاحب "صفرہ" کی ہجے غلط ہے۔ اور زبان سے یہ نکلنا تھا کہ میری زبان شرم اور خوف سے باہر نکل آئی اور میں نے سر ٹیبل پر ٹیک دیا کہ یہ میں نے کیا کہہ دیا۔ ادھر ماسٹر صاحب کے ہاتھ سے چاک گر گیا۔ ایک اسکول کا طالب العلم کلاس میں ایسی بات کہہ دے۔ انہوں نے تیور سے کہا:

www.taemeernews.com

"کیا غلطی ہے، تمہیں کیسے معلوم ؟"
میں خاموش ۔ انھوں نے پھر ڈانٹا ۔
"بتاؤ کیا غلطی ہے ۔ اور تمہیں کیسے معلوم ؟"
میں نے ڈرتے ڈرتے رکتے رکتے کہا :
"حضور ! بوستان میں پڑھا تھا ۔ دسترخوان پر لکھا ہوا دیکھا تھا ۔"

ادیم زمیں سُفرۂ عام اوست
چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

ماسٹر عبدالقدوس صاحب کے تیور کھنچے ہوئے تھے ۔ چند لمحہ وہ سکتے کے سے عالم میں رہے ۔ پھر ان کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے اور چند ہی لمحے بعد ان کے لبوں پر، آنکھوں میں، پورے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی ۔

www.taemeernews.com

میرے لئے یہ حادثہ کہ گھر نہ رہا گھر والے نہ رہے' گاؤں نہ رہا گاؤں کے مانوس اور محبوب لوگ نہ رہے' رشتے ناتے ختم ہو گئے۔ دیہاتی گھروں کی پاک وصاف معصوم فضائیں نہ رہیں۔ معصوم بولیاں' معصوم لہجے' معصوم الفاظ نہ رہے۔ ایک گاؤں کے اندر ہی جو حسن، دلکشی اور دل کو موہ لینے والی زندگی کے نمونے تھے وہ زندگیاں اچانک دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئیں۔ امرود' جامن' سنگر ہارے کے درخت جن سے نسلوں کی یادیں وابستہ تھیں وہ مزیدار شیریں یادوں والے درخت ختم ہو گئے۔ سریلی آوازیں جن سے گھر آباد تھے فضاؤں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گئیں۔ گویا یتیم' غریب الدیار' غریب الوطن' بیکس اجنبی بن کر رہ گیا۔ بیشک اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اس کے بعد ہر پچھلا حادثہ اور بعد میں آنے والا ہر حادثہ دل کے گلدستے میں غموں کے چھوٹے چھوٹے پھول بن کر رہ گیا ہے۔ وہ حادثہ درمیان میں ایک بڑے گلاب کی طرح اب تک دل کی آنکھوں میں اپنی رنگینیاں بکھیرتا ہے اور دل کے سینے میں ایک لازوال غم کی خوشبو آباد رکھتا ہے یہ بیشک بڑا حادثہ ہے گذر گیا لیکن مجھ سے نہیں گذرا قریب اور ہم بغل رہتا ہے اور اسی قربت اور ہم بغلی اور ہم نشینی نے میری شاعری کی تخلیق کی ہے۔ اس کا ساتھ چھوٹے گا نہیں اور شاعری کا سلسلہ ٹوٹے گا نہیں۔ چنانچہ اب بھی جب کہ میں مشاعروں میں نہیں جاتا رسالوں میں کلام نہیں بھیجتا تنہائی ہوتی ہے گذری ہوئی کہانیاں اپنی وفائیں دوسروں کی جفائیں یاد آنے لگتی ہیں اور دل چل پڑتا ہے تو قلم کو بھی چلنا پڑتا ہے۔

جو حادثے مجھے شاعر بنا گئے عاجز
وہ یاد آئیں گے جتنا بھلائے جائیں گے

یہ حادثہ گذرا اور دل کے اندر ایک مستقل نگارخانہ تعمیر کر گیا جس کی تصویریں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ایک دو حادثے اور ہوئے۔ جس کی چوٹ دل نے محسوس تو نہ

www.taemeernews.com

کی لیکن اُس کے المناک نتائج ہر وقت نگاہوں کے سامنے آتے رہتے ہیں اور دل کو کڑھاتے رہتے ہیں اور کسی نہ کسی مقدار میں ہر وقت دل پر بوجھ کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ دو حادثے ہیں ایک تو بہار سے ایک پوری تہذیب کی ہجرت۔ ہجرت ۱۹۴۶ء کے فسادات کے بعد تہذیب کے علم برداروں کی ہجرت ہے۔ اور دوسرا حادثہ خاتمۂ زمینداری جس نے تہذیب کی بچی کھچی خاکستر ہوا میں اُڑا دی۔ پٹنہ، نیورا، فتوحہ، خسرو پور، ہرداس بیگہ، نگر نہسہ، پھلواری شریف، منیر شریف، مہدانواں، بہپورہ، سنگر یانواں، ڈیانواں، کرائے پرسرائے، ہلسہ، بانس بیگہ، مفتی گنج، جمواںواں، صالح پور، جمالی چک، ہرگانواں، اسھانواں، بلچھی، ماتی، دیسنا، گیلانی، اسلام پور، پتھر، تیلہاڑہ، نیانواں، بڑا دیہہ، باڑھ، زلفی پور، کاکو، اسھوا، شاہو بیگہ، شہباز پور، نتول، برنی، فیروزی، برانواں، سائیں، ہرلا وغیرہ وغیرہ چند نام۔ مرکزی مقام پٹنہ عظیم آباد سے مشرق، مغرب، اور جنوب تقریباً ساٹھ ستر میل کے دائرے میں پچاس ساٹھ قصبات ہوں گے جن میں مسلم غیر مسلم کی مخلوط آبادیاں تھیں۔ یہ وہ آبادیاں تھیں جن سے صرف بہار کی نہیں۔ بنگال میں مرشد آباد سے لے کر دہلی تک کے تمام علمی ادبی تہذیبی مراکز کو تازہ اور صحت مند خون پہنچتا تھا۔ صدیوں سے اِن کے فکر و فن، تہذیب و تمدن، مذہب، اور تعلیم شعر و ادب کے ذریعہ مشرق و مغرب میں گلزار کھلا ہوا تھا جن کی خوشبوئیں مشام جان کو ایسا معطر رکھتی تھیں کہ کم از کم میں تو گذشتہ پچاس سال سے ان خوشبوؤں میں مست ہوں۔ آنکھوں سے رنگینیاں دیکھ رہا ہوں، کانوں سے ان کی آوازیں سُن رہا ہوں، انگلیوں سے انہیں مَس کر رہا ہوں اور دل میں تمام مجموعی لذتیں سمائی جا رہی ہیں۔ ملکوں ملکوں پھر آیا ساتوں سمندر چھان ڈالے۔ تہذیب کی بڑی بڑی عمارتیں دیکھیں، تمدن کے ایک سے ایک گلزار اور پھلواریاں دیکھیں، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی روشنیاں دیکھیں ایسے ایسے سجے سجائے چہرے دیکھے ایسے ایسے سنوارے بنائے لوگ دیکھے، ایسے ایسے لباسوں کی تراش خراش دیکھی، رفتار دیکھی گفتار سنی گھروں کی رونقیں دیکھیں، آرائشیں دیکھیں جن کی تعریف میں ملکوں کی زبانیں، تحریریں، کتابیں، رسالے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ صرف تعریف اور تحسین میں لاکھوں کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں تو ان سنوار بناؤ

www.taemeernews.com

سجاوٹ، تراش خراش، تعمیر و تزئین، آرائش و زیبائش میں کتنا خرچ ہوتا ہوگا۔ ایسے ایسے لباس بھی عروسی کے تیار ہوتے ہیں کہ صرف ایک لباس عروسی کی تیاری میں ایک سال لگتے ہیں اور ایک ایک کروڑ کی رقم لگتی ہے۔ اس میں ہیرے جواہرات نہیں ٹانکے جاتے۔ بس اُس کی تراش اور ترتیب کی باریکیاں ہی سب کچھ ہیں اور جب وہ لباس پہن کر دلہن مجلس میں آتی ہے اور بے باکی سے دونوں طرف دیکھتی ہوئی مسکراتی ہوئی سر کے اشارے سے سلام لیتی ہوئی چار انگلیوں کے حسین پنکھے سے جو لباس ہی کا ایک جزو ہوتا ہے، ہلکے ہلکے نزاکت سے چہرے کو ہوا دیتی ہوئی اپنے منگیتر یا شوہر یا دُلہا کی بغل میں ہاتھ ڈالے ناز سے گذر جاتی ہے تو مجھے وہ دیہاتی دلہن یاد آتی ہے جس کے پاک و مقدس جسم سے شوہر کا لباس مَس ہوا تو اُس لباس کی خوشبو جدائی کے بعد بھی مہینوں نہ گئی۔ میلے ہونے کے بعد بھی نہ گئی اور کئی بار دُھلنے کے بعد بھی نہیں۔ اور میں بھی اپنے اُس دیہاتی دوست کے لباس کی خوشبو مہینوں محسوس کرتا رہا اور اس شخص کی معصوم گفتگو اور وارفتگی آج تک نہیں بھولا۔ گرچہ پینتالیس سال ہو گئے۔ پرائی دیہاتی بدن کی تو یہ خوشبو اور زندگی کی خوشبو یہ کہ جب دشمن تلواریں لے لے کر شوہر کو قتل کرنے کے لئے بڑھے اور تلواریں چل چکی تھیں کہ دیہاتی خوشبو والی دُلہن شوہر کو دبوچ کر بیٹھ گئی خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور شوہر اب تک صحیح و سالم۔ کیا خیال ہے؟ تہذیب کے علمبرداروں کا؟ وہ ایک کروڑ والا لباس پہننے والی دلہن اپنے ہاتھ سے خود کو مور چھل جھلنے والی، اغل بغل والوں کو ریجھانے والی دلہن دو چار سال دس سال بعد دوسرے شوہر کے بغل میں چلی جانے والی دلہن یا وہ جو شرماتی لجاتی گھونگھٹ کاڑھے شوہر کے پاس آئی اور ایسی ہی شرماتی لجاتی گھونگھٹ کاڑھے شوہر پہ قربان ہو گئی۔

دل بتا تیرا کدھر جانے کو دل چاہے ہے

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملکوں ملکوں پھرا کیسی کیسی تہذیبی مجلسیں دیکھیں، ادارے دیکھے، لوگ دیکھے، زرق برق پاؤں کے ناخن سے سر کے بال تک سجے سجائے لاکھوں میں رہ کر بیقرار رہنے والے لوٹنے کے لئے رہنے والے مخملی گدوں پر بیٹھے ہوئے چائے پیتے ہوئے۔ بادشاہوں کے ایوانوں کی طرح سجے سجائے کمروں میں رہنے والے۔ آئینہ جیسی سڑکوں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی مور

www.taemeernews.com

جیسی گاڑیوں میں سفر کرنے والے مصافحہ کر کے گذر جانے والے' ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے دوسرے ہاتھ سے کالر یا ٹائی درست کرنے والے' شاندار عمارتوں والے، بادشاہوں کے محلوں سے زیادہ حسین اور رنگا رنگ چراغاں میں سیر و تفریح کرنے والے دیکھے لیکن ایسا لگا کہ یہ مورتیاں ہیں جو کل گھاٹ میں دفن ہو جائے گی۔ تھیٹر کے ایکٹر اور مناظر ہیں جو چند گھنٹے بعد اپنے اصلی روپ میں نظر آجائیں گے۔ مناظر کے نقلی رنگا رنگ پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور وہی کریہہ چہرے اور کریہہ زندگی سامنے آجائے گی جو بہروپیوں کے بہروپ اتر جانے کے بعد آنے لگتی ہے۔ میں جس طرح خالی جھولی لے کر گھر سے نکلتا ہوں ویسی ہی خالی جھولی گھر واپس آجاتا ہوں۔ نہ لباس میں سچائی ملتی ہے نہ چہروں پر سچائی جھلکتی ہے نہ باتوں میں سچائی نظر آتی ہے نہ ملاقاتوں میں نہ کام میں نہ جھام میں۔ رکشہ والوں سے لے کر ایوان حکومت تک جتنے شعبے ہیں تعلیمی تدریسی علمی ادبی معاشرتی اقتصادی سیاسی مذہبی سب بہروپیے نظر آتے ہیں۔ بول رہے ہیں کچھ سوچ رہے ہیں کچھ زبان پر کچھ ہے دل میں کچھ ہے' ارادے کچھ اور ہیں موضوع کچھ اور ہے' گفتگو کچھ اور ہے مقصد کچھ اور ہے اظہار کچھ اور ہے بیان کچھ ہے نہ باتیں کرنے کا ڈھنگ نہ آواز میں لوچ نہ لہجے میں گرم جوشی نہ دل میں پیار نہ آنکھوں میں مروّت۔

یہ سب فرق پیدا ہونے میں زیادہ دن نہ لگے۔ بس تیس چالیس سال کے درمیان دیکھتے دیکھتے زندگیاں کیا سے کیا ہو گئیں۔ مزاج کیا سے کیا، صورتیں کیا سے کیا، سیرتیں کیا سے کیا۔ اور چالیس سال کے اندر یہ تبدیلی اس لئے ہوئی کہ قدروں پر کنٹرول اور قابو رکھنے والے یک بیک رخصت ہو گئے یا ہجرت کر گئے۔ ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہوئی۔ ایک روپے میں تیرہ سیر چاول ۱۹۳۹ء میں چار سیر ہو گیا اور ۱۹۴۴ء میں روپئے کا سوا سیر چاول ملنے لگا۔ مگر اس بجلی کی رَو سے گرانی کے بڑھ جانے کا اثر زندگی پر کم تھا۔ جنگ دروازے پر آگئی تھی۔ کلکتہ کے مرکزی شاندار بازار دھرمتلہ پر جاپانی بم گرنے لگے تھے۔ کچھ لوگ ذرا نروس تھے مگر پوری آبادی مطمئن تھی۔ گھروں میں دیکھ بھال جاری تھی' اسکولوں کالجوں میں استاد ہشیار اور چوکنا تھے۔ لڑکوں پر کڑی نگاہ تھی۔ ویسے ادارے آباد تھے مجلسیں گرم تھیں' جلسوں کی ہماہمی بھی تھی۔ قومی مشاعرے بالاخانوں پر بھی ہو رہے تھے

www.taemeernews.com

کہ سڑک پر چلنے والے بھی سن لیں۔ شیروانی اور ٹوپی، کوٹ پر صافہ، شلوار اور قمیض، دھوتی پر پرنس کوٹ اور پتلے کی ٹوپی۔ گفتگو میں رکھ رکھاؤ ملاقاتوں میں بے ساختگی، محبت میں بے ریائی سب کچھ باقی تھا۔ پٹنہ میں سائیکل رکشہ آ گیا تھا۔ رکشہ چلانے والا صاف دھوتی، صاف کرتہ یا قمیض، بالوں میں تیل اور باٹری کنگھی سے جمی ہوئی ہونٹوں پر پان کی سرخی۔ ہنس کی طرح دھیمی چال سے سڑک پر رکشہ چلا رہا ہے۔ میں باقر گنج گلی سے نکلا۔ دیکھتے ہی رکشہ روکا۔ "چلئے گا کلیم بابو؟" "ہاں جی!" "تو آئیے۔" نہ دام نہ درنہ بھاؤ نہ حجت نہ بے مروتی نہ بد تہذیبی نہ خشکی نہ جہالت۔ حالانکہ تھا جاہل ہی۔ مگر رکشہ لے کر بڑھا تو بات شروع ہوئی تو یوں لگتا جیسے وہ بھی زمانے کی شکایت کر رہا ہے۔

"جمانہ بدلے گا کلیم بابو۔ سوراج ملے گا تو کیا جمانہ ایسہی رہے گا؟"

مجھے سن کر حیرت ہو جاتی۔ میں نے جو چھ سال بعد کہا سنہ ۱۹۵۱ء میں کہا۔

نہ سنبھل سکے گی تجھ سے تری زلف تا بہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

وہ رکشہ والا سنہ ۱۹۴۴ء میں کہہ رہا تھا۔ میں باتیں کرتا پٹنہ سیٹی مچھر ہٹہ گلی تک چلا گیا۔ پہنچ کر رکا اترا۔ پیسہ دینے کے لئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا "کتنا دیں جی؟" "بارہ آنہ دے دا"۔ پیسے لئے جیب میں رکھا سینہ تان کر مسکرا کر سلام کیا اور پھر اسی ہنس کی چال سے رکشہ پھیر کر بانکی پور کی طرف روانہ ہوا۔ مطمئن، آسودہ، بے فکر۔ بشاش اس کسان کی طرح جو کھیت میں کام کر کے آسودگی سے گھر واپس آ رہا ہو۔ جوش ملیح آبادی کے بقول اس شان سے :

"سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل"

اب کسی رکشہ کے قریب جائیے تو وہ خود رکشے کے گدے پر پاؤں چڑھائے ہوئے بیٹھا ہوگا۔

"بھئی چلو گے؟"

"کہاں؟"

"یہیں بس بی۔ ان کالج کے قریب"

"بی۔ ان کالج کے قریب کہاں پر؟"

www.taemeernews.com

"ارے بھئی ہمدرد دواخانے کے پاس۔"

"سڑک ہی پر یا گلی میں؟"

اُسی طرح گدے پر پاؤں چڑھائے ہوئے آپ سے یوں مخاطب ہوگا جیسے جج صاحب کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"نہیں بھائی بالکل سڑک پر۔"

"کتنا دیجئے گا؟"

"بھائی تم ہی بولو۔"

"کرایہ چار روپیہ ہوگا۔"

"ارے بھائی چار روپیہ؟ کرایہ تو دو روپیہ ہے؟"

"جائیے جائیے۔ دو روپیہ تو سبزی باغ تک کا ہے۔"

کہہ کر بیڑی سُلگانے لگے گا۔

تقسیم سے پہلے آپ سڑک پر نکلے۔ سواری چاہتے ہیں اسٹیشن جانا ہے۔ ایک یکہ گذرا۔ زرد سرخ سبز رنگے ہوئے حسین پہیے۔ پیچھے اسی طرح کی حسین جالی۔ ڈنڈے گہرے سُرخ رنگ کے۔ یکہ پر گدّا اور گدے پر سفید بُراق چاندنی دونوں طرف پیتل کے حلقوں میں پیتل ہی کی بنی ہوئی پوش کی ہوئی جالی دار قندیل۔ اور گھوڑا؟ گہرے سیاہ رنگ کا کمان کی طرح گردن اور زلفیں فاختے سے ایک طرف بکھری ہوئی۔ منہ میں پڑی ہوئی سفید آہنی زنجیر کو مستی میں دانتوں سے چباتا ہوا۔ اور زنجیر سے لگی ہوئی خواہ چاکلیٹ رنگ کے تسمے کی یا رنگ رنگ کی رنگی ہوئی جوٹ کی چمکتی ہوئی لگام تھامے ہوئے دھوتی، سفید قمیض اور سفید مریٹھا باندھے ہوئے پان کھائے پائدان پر لگی ہوئی گھنٹی کو پاؤں سے بجاتا ہوا یکہ بان۔

نہ کبھی مرنا ہو تو مر جانے کو جی چاہے ہے

آپ رکشہ کی تلاش میں تھے مگر یہ اختیار آ جانے کر یکہ پر سوار ہو چلتے ہیں پورے وسیع ٹمٹم پر صرف چار سواریاں۔ اس سے زیادہ بٹھانا وہ تہذیب کے خلاف سمجھتا تھا۔ چار سواریاں ہوئیں اور اُس نے

www.taemeernews.com

نہ انجم مان پوری صاحب مرحوم کی ٹمٹم کی طرح گھوڑے کو چابک لگائی نہ لگام کھینچا نہ دُم اینٹھی۔
"ہاں بیٹا چلو تو قدم چال سے"
اور گھوڑا گویا رقص کرنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ آپ گھر میں پلنگ پر غیر متحرک بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ٹمٹم کو کھینچتا ہوا گھوڑا مستی کی چال سے اسٹیشن روانہ ہوا۔ اور یکہ بان یوں بیٹھا ہے جیسے وہ سڑک پر چل نہیں رہا ہے اُڑ رہا ہے اور ایک سلسلہ ہے خوش آوازی کا۔
"ہاں بابو جی، بھیا جی، ذرا کنارے۔ بھیا بھیا ذرا کنارے جوڑ مجھوڑ بس ذرا کنارے ہاں بیٹا شاباش۔ ہاں میرے شیر، ہاں میرے شیر ذرا دھیرے دھیرے بس کیا کہنا ہے بیٹے شاباش شاباش شاباش۔
معلوم ہوتا، یکہ بان اور گھوڑا نہیں ہے دونوں ایک مائی کے لال ہیں، ایک کہہ رہا ہے دوسرا سُن رہا ہے۔ نہ چابک ہے نہ چھڑی ہے بس اشارے اشارے میں تمام مرحلے طے ہو رہے ہیں۔ خوش گفتاری، خوش رفتاری، خوش رنگی، خوش پوشی، خوش مزاجی، خوش لہجگی خوبصورت شعر کی طرح ایک توازن ایک موسیقیت ــــ

یہ رکشہ والے، یکہ والے، ٹمٹم والے، پھل والے، سبزی والے، ہوٹل والے، معمار، مزدور، منشی، پٹواری، براہل، گماشتہ، دکان دار، خریدار، وکیل، موکل، ڈاکٹر، مریض، کلرک، چپراسی، افسر، ماتحت، چوکیدار، کانسٹبل، تھانیدار، انسپکٹر، کسان، روپئے، کاشتکار، قلی، چیکر، اسٹیشن ماسٹر، پسنجر، گارڈ پچاس سال پہلے کچھ اور تھے، چالیس سال پہلے سے ان سب کا بدلنا نمایاں ہونے لگا۔ اور اس وقت تو پہچانے نہیں جاتے جیسے صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور۔ ایسی دنیا بدل گئی، جیسے اچانک اسد غاری کو لوح طلسم مل جائے اور وہ پڑھ کر لوح کو ہوا میں اچھال دے، اور طلسم ہوش ربا بکھر کر رہ جائے، شہنشاہ افراسیاب، لاچین، شہنشاہ نوشافشاں، کوکب روشن ضمیر، شہزادی براق، حجرہ ہائے بلا۔ ہفت خواں، برق، قران، صرغام، جانسوز اور عمرو عیار اس کی زنبیل اور گلیم سب کچھ ہوا میں اُڑ جائے اور ہرا بھرا گلزار بنجر ویرانہ بن جائے۔ وجہ یہ ہے کہ درد والے محبت والے مروت والے، اخلاق والے، تہذیب والے، رواداری والے، اصول و

www.taemeernews.com

وضع داری والے، فرض و ذمہ داری والے، جن کے فیض صحبت سے، گرمیٔ محبت سے، قرب و تعلق سے، جن کے بول سے آواز سے رنگ سے خوشبو سے گاؤں گاؤں، بستی بستی، محلہ محلہ شہر شہر بسا رہتا تھا، ہرا رہتا تھا بھرا رہتا تھا، یک بیک دنوں دن، راتوں رات قتل کر دیئے گئے، اُجاڑ دیئے گئے، مٹا دیئے گئے، جلا دیئے گئے، جو بچے بھگا دیئے گئے۔

ایک سویرا ایسا آیا اپنے ہوئے پرائے
اِس کے آگے کیا پوچھو ہو آگے کہا نہ جائے

میرا سرمایۂ شعر خوانی سنو ایک مصرع میں پوری کہانی سنو
صبح ہوتے ہی وہ دشمنی کر گئے جن سے دن رات کا دوستانہ رہا

اِس حادثے کے بعد جل کُھٹ کر مٹ کر برباد ہو کر بھاگ بھگیڑ سے بھی بے پروا ہو کر جو سخت جان رہ گئے اگر وہ بھی اپنی وضع داری میں چھوڑ دیئے جاتے۔ گلزار جل چکا ہوتا، چمن زار اُجڑ چکا ہوتا کہیں کہیں کوئی کوئی شاخ بریدہ شکستہ سوختہ خاکستر آلودہ رہ گئی تھی۔ اُنہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا جاتا تو وہ کروٹ بدلتے کراہتے جاتے جاتے بھی بہت کچھ بنا جاتے ٹیک پشتہ ڈال کر ہی سہی کچھ دنوں کے لئے تہذیب و شائستگی رواداری، وضع داری اخلاق و مروت کی گرتی ہوئی دیوار کو کھڑی کر ہی جاتے، مگر

سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور حرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

دس سال کے اندر ہی اندر ۵۷-۵۶ء میں خاتمۂ زمینداری کے بہانے سینکڑوں سال میں اہل درد، اہل محبت، بے غرض، بے لوث انسانوں کی انسانی ہمدردی میں صدیوں کی قربانی خونِ جگر کی ارزانی اور اشک فشانی سے سینچی ہوئی تہذیب و شائستگی کی پھلواری کے ایک ایک پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا گیا۔ دوسرے کے سر پر چلاتے ہوئے اپنے پاؤں پر بھی کلہاڑی مار دی گئی۔ جو گئے آبرو سے چلے گئے۔ لیکن ساری نعمتیں اور بشارتیں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے چلے گئے۔

www.taemeernews.com

وہ اہل درد جو ناقابل خیال گئے
وہی چھپائے ہوئے گدڑیوں میں لال گئے
جو تم پہ مر گئے اپنی بلا تو ٹال گئے
بچے ہوؤں کو بڑی کشمکش میں ڈال گئے

کس کشمکش میں ڈال گئے؟ دیکھ لو۔ گلیوں میں گذر جاؤ سڑکوں پہ پھر جاؤ شہروں شہروں نکل جاؤ

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

جو آواز آتی ہے وہ سننے کے قابل نہیں، جو صورت نظر آتی ہے وہ دیکھنے کے قابل نہیں جو رنگ ہے وہ ناگوار ہے جو خوشبو ہے وہ ناخوشگوار ہے۔

کٹنے پٹنے کے بعد شاہ راہ پر دکان کرلی تھی۔ دکان تو بہت بڑی تھی۔ پچاس روپے میں اتنی بڑی دکان ایک ہمدرد نے کرایے پر دے دی۔ مال کم ہی تھا کاروبار کیا چلتا۔ بس گذر اوقات ہو رہی تھی۔ سائن بورڈ بڑا سا لگا ہوا تھا۔ دکان بڑی سائن بورڈ بڑا۔ پونجی چھوٹی آمدنی کم، لیکن شہرت زیادہ۔ دو تین سال بعد حساب لے کر انکم ٹیکس جانا پڑا۔ انکم ٹیکس آفیسر نے چٹھا دیکھا۔

"بکری آمدنی آپ بہت کم دکھا رہے ہیں۔ رپورٹ میں ہے دکان بہت بڑی ہے۔ کیا اس نوعمری میں آپ غلط کتاب رکھتے ہیں؟"

بولنے والے انکم ٹیکس آفیسر کا لہجہ نرم، زبان فصیح اور الفاظ شیریں تھے۔ میں عموماً نیچی نگاہیں رکھتا ہوں۔ اب تک میں نے انکم ٹیکس آفیسر کو بھرپور دیکھا نہیں تھا۔ اُن کے سوال پر میں نے جم کر نگاہیں اٹھائیں دیکھا۔ تقریباً پچاس کی عمر گندمی رنگ، بہت چھوٹے چھوٹے سیاہ و سفید بال۔ جیسے سر منڈانے کے کچھ روز بعد سر پر اُبھر آتے ہیں۔ سفید کھدر کا لمبا کرتہ اور سفید دھوتی۔ ننگے سر۔ انگلیوں میں قلم لئے مجھے نہایت مبہم سی ہلکی مسکراہٹ والی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

"حساب غلط نہیں صحیح ہے۔ مجھے ابھی تجارت کا سلیقہ نہیں آیا ہے۔"

www.taemeernews.com

"آپ نے تعلیم حاصل کی ہے ؟ کہاں تک پڑھا ہے ؟"

"میں نے صرف انٹرنس امتحان پاس کیا ہے۔ وہ بھی دس سال پہلے۔"

"پڑھنا چھوڑ کیوں دیا ؟"

"کہنا ذرا مشکل ہے۔"

وہ بہت مُصر ہوئے۔ اور مجھے اپنا حال بہت مختصر کہنا ہی پڑا۔ دو تین منٹ ہی میرے مختصر افسانے کو لگا ہوگا۔ اس اثنا میں ان کی انگلیوں نے قلم رکھ دیا۔ اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر وہ مجھے دیکھتے رہے سنتے رہے۔ اِدھر میں خاموش ہوا، اُدھر انہوں نے فائل بند کیا۔ اور کہا آپ جائیے انکم ٹیکس معاف ہے۔ میرا نام شرن سنگھ ہے۔ کوئی کام ہو کوئی ضرورت ہو آپ مجھ سے ملئے گا۔ جب تک میں ہوں آپ کو اس آفس میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلا آیا۔

دوسرے سال نہیں تیسرے سال پھر مجھے حساب دکھانے کی نوٹس ملی۔ میں کاغذات اور حساب لے کر پھر انکم ٹیکس آفس پہونچا۔ حاضری دے کر باہر بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ نگاہیں نیچی تھیں۔ کچھ سوچ رہا تھا کہ ایک نرم آواز آئی۔

"آپ پھر یہاں چلے آئے ؟"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ اسی لمبے کھدر کے کرتے اور سفید دھوتی میں شرن صاحب سامنے کھڑے مجھے اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔

"جی ہاں، مجھے حساب دکھانے کی نوٹس ملی ہے۔"

"پھر نوٹس ملی ہے۔" ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "نوٹس لائیے۔"

میں نے نوٹس ان کو دی۔ وہ تیز رفتاری سے آفس کی طرف گئے اور پانچ منٹ بعد واپس آئے۔

"آپ تشریف لے جائیے۔ آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں آپ نے پڑھنا شروع کیا ؟"

www.taemeernews.com

"ابھی تک تو شروع نہیں کر سکا ہوں۔"

"ضرور شروع کر دیجئے۔ آپ کے فرم کا نام تو جانتا ہوں، آپ کا نام؟"

میں نے نام بتا دیا۔

"اچھا کلیم صاحب آپ تعلیم آگے شروع کر دیجئے۔ خدا آپ کی مدد کرے گا۔"

اتفاق کہئے کہ اسی سال واقعی میں نے ایک خاص موقع سے اور خاص ترغیب سے جس کی تفصیل آگے لکھوں گا۔ آئی اے کی تیاری شروع کر دی۔ شرن صاحب تیسرے سال تبدیل ہو گئے۔ چوتھے سال جب میں نے بی۔ اے میں داخلہ لیا تو پھر انکم ٹیکس آفس سے مجھے حساب دکھانے کی نوٹس ملی۔ رجسٹر وغیرہ لے کر گیا۔ حاضری دی۔ فوراً ہی انکم ٹیکس افسر کے کمرے میں طلبی ہوئی۔ کمرے میں داخل ہوا تو افسر کی کرسی خالی تھی اور دوسری طرف ایک صوفے پر ایک ادھیڑ عمر کے آدمی بیٹھے تھے۔ سفید بش شرٹ اور سفید پینٹ رنگ سیاہی مائل گندمی۔ مگر بے حد ہنس مکھ میرے داخل ہوتے ہی انہوں نے پوچھا۔

"آپ کا نام کلیم احمد عاجز ہے؟"

"جی ہاں۔"

"آئیے اس طرف کرسی پر بیٹھئے۔"

میں بیٹھ گیا اور رجسٹر والا پیکٹ ان کے قریب ٹیبل پر رکھا۔ انہوں نے کہا۔ "اس پیکٹ کو آپ نیچے رکھئے اس کی ضرورت نہیں۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا؟"

میں نے سمجھا یہ کوئی مسلمان ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں اتنی اچھی صاف اردو زبان دفتروں میں اور کون بول سکتا ہے۔ مگر مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں میری تعلیم سے کیا غرض اور میرے نام سے انھیں کیسے واقفیت ہوئی۔ پھر سوچا ممکن ہے فائل میں میرا نام ہوگا۔ دستخط تو میں مخفف کرتا ہوں۔ میں نے سر اٹھا کر انہیں حیرت سے دیکھا۔ وہ مسکرائے اور بول پڑے۔

"میں کے۔ ان۔ شرما ہوں۔ مجھ سے پہلے شرن صاحب تھے۔ انہوں نے مجھے چارج

www.taemeernews.com

دیتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ آپ کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ کلیم عاجز کو بلائیے گا۔ میں نے حساب دیکھنے کو نہیں بلایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ آپ سے پوچھوں آپ نے اپنی تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا یا نہیں؟

"جی ہاں میں نے ایک ہی سال میں پرائیوٹ امتحان دے کر آئی۔ اے کر لیا ہے اور بی۔ اے آنرس میں داخلہ لے چکا ہوں پٹنہ کالج میں پڑھ رہا ہوں۔"

وہ خوشی کے جذبے سے بے اختیار کھڑے ہو گئے اور قریب آکر میرے پیٹھ دو تین بار ٹھونکی۔ جیب سے کچھ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بزرگ کی طرف سے ایک عزیز کی کامیابی پر مٹھائی کھانے کے لئے انعام ہے میری جیب میں اس وقت پچیس ہی روپے ہیں۔ آپ جائیے اور جی لگا کر پڑھئے اور بی۔ اے کر لیجئے تب میرے پاس آئیے گا انعام لینے کو۔"

چالیس سال سے غزل گا رہا ہوں، ساز چھیڑ رہا ہوں، عمر رفتہ کو آواز دے رہا ہوں اور آواز دیتا رہوں گا۔ اقبال کہتے ہیں ؎

میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اقبال کی جستجو بہت دور کی ہے۔ میں تو اس قافلے کو آواز دے رہا ہوں جو ابھی ابھی گذر رہا تھا۔ بہت دور نہیں گیا ہے۔ ابھی گرد کارواں بیٹھی بھی نہیں ہے فضا میں اڑ رہی ہے۔ اس گرد کا ایک ذرہ میں بھی ہوں اور بھی بہت ہیں مگر وہ سب دیکھ رہے ہیں کہ جھونپڑا مکان بن رہا ہے مکان محل بن رہا ہے اور محل قلعہ بننے والا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ محل والے مکان کے قابل بھی نہیں اور مکان والے جھونپڑے کے لائق بھی نہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ کیا آرہا ہے۔ وہ دیکھ رہے کہ ٹمٹم گئی ٹمپو آرہا ہے۔ اسکوٹر آرہا ہے، ماروتی آرہی ہے، ٹویٹا آرہا ہے سوزوکی آنے والا ہے اور پھر کاڈلک کی آمد آمد ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں اسکوٹر پر چھرا چل رہا ہے پستول چل رہا ہے۔ اور ٹمٹم پر کیا حسین بول چلتا تھا۔ ایک ٹمٹم سے میں گذر رہا تھا۔ گھوڑے کی ہر ٹاپ کے ساتھ زندگی اوپر کو اٹھتی نظر آتی تھی۔ گھوڑے کی شاندار روانی دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ کاش یہ سفر ختم ہی

www.taemeernews.com

نہ ہو۔ آدھ گھنٹے میں چھ میل کا سفر کر کے چوک کے قریب پہونچے تو آگے ذرا بھیڑ تھی گھوڑے کی چال مدھم ہوئی اور ٹھہر گئی۔ بغل میں ایک درزی کی دکان تھی ایک نوجوان گنگناتا ہوا تیزی سے مشین چلا رہا تھا۔ گھوڑا رکا تو سر میں سفید انگوچھا لپیٹے ہوئے، پان کھائے ہوئے طرحدار یکہ بان نے تیزی سے مشین چلاتے ہوئے جوان درزی سے کہا شاید وہ اس کا دوست تھا۔

"السلام علیکم!"

درزی نے منہ پھیر کر دیکھا اور چال ذرا دھیمی کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا "وعلیکم السلام"

یکہ بان نے کہا "کیا حال چال ہے دوست، ؟"

درزی نے کہا "شکر ہے۔ چلا جا رہا ہے"

یکہ بان نے کہا۔ "کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

درزی ہنس پڑا۔ آگے بھیڑ ہٹ گئی۔ یکہ بان نے بھی گھوڑے کو ذرا اشارہ کیا اور ذرا تیز مسکراہٹ سے آگے بڑھ گیا اور میرے منہ سے بے ساختہ واہ نکل گئی۔ درزی بھی اور یکہ بان بھی کیا معنی خیز گفتگو کرتے ہیں کہ بڑے بڑے زبان داں کو وجد آجائے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

وہ دیکھ رہے ہیں کہ بڑی بڑی عمارتیں لائبریریوں کی بن گئیں۔ گوشے گوشے میں قیمتی شلف لگ گئے اور شلف کتابوں سے بھر گئے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ کتابوں سے گھر خالی ہو گئے۔ زبان خالی ہو گئی۔ گفتگو کا انداز بگڑ گیا، باتوں کا سلیقہ ختم ہو گیا، تحریر سے رنگت چلی گئی، تقریر سے لذت ختم ہو گئی۔ آمد و رفت کی گرد اڑتی ہوئی اور برسات میں تین تین انچ والی کیچڑ والی سڑک سے بھی بہت دور میرے جیسے گاؤں تیلہاڑہ کے تقریباً ہر شریف کے گھر میں الف لیلیٰ، طلسم ہوش ربا کی جلدیں، امیر حمزہ کی داستانیں، آرائش محفل، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب، ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کی تصنیفات وغیرہ وغیرہ الماریوں میں اور طاقوں پر سجی رہتی تھیں انہیں پڑھ لیتے تھے تب لڑکے اسکول اور کالج جاتے تھے۔ اور اب؟ کالج اور یونیورسٹیوں سے فارغ ہونے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان کتابوں کے نام بھی نہیں جانتے۔

www.taemeernews.com

وہ دیکھ رہے ہیں کہ فریزر روڈ، اکزیبشن روڈ اور اسٹیشن روڈ پر کیسے کیسے فرم کیسے کیسے تجارتی ادارے، کیسی کیسی شاندار دکانیں کھل گئیں۔ دکانوں میں، فرموں میں، تجارتی اداروں میں لوگ بھر گئے، سامان بھر گئے۔ روپئے بھر گئے۔ آوازوں سے اور بولیوں سے اور چیخوں سے اور اسکوٹر کی ہوٹ (Hoot) اور کاروں کے ہارن سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ بس مال آرہا ہے۔ نوٹوں کی گڈیاں کھل رہی ہیں، سامان لدرہے ہیں، کسی کو کسی سے بات کرنے کی فرصت نہیں Air pollution اور Sound pollution اور Oil pollution اور Dust pollution۔ کوئی کانوں میں انگلیاں ڈالے ہے، کوئی ناک منہ پر رومال رکھے ہوئے ہے۔ کوئی آنکھیں مل رہا ہے، کوئی عینک صاف کر رہا ہے، کوئی پسینہ پونچھ رہا ہے، کوئی بدن جھاڑ رہا ہے کوئی سر سہلا رہا ہے۔ نہ کسی کا حال پوچھنے والا، نہ کوئی مزاج کا پرساں، نہ درد آشنا نہ رمز آشنا بس سب شکم آشنا۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ پٹنہ کالج سے نکلئے تو بنارسی داس پبلیکیشنز گذرے۔ آداب عرض کلیم صاحب، آداب عرض بنارسی جی۔ ایک پیالی چائے تو ہو جائے، بس ہم تو آپ کی چاہ کے پیاسے ہیں۔ چائے بھی پی لیں گے۔ آگے بڑھئے تو ڈوما ساؤ کی سجی ہوئی زیور کی دکان، زرد سلک کا کرتہ، بے داغ سفید بُراق دھوتی۔ گلے میں سونے کی باریک زنجیر۔ ہونٹوں پر پان کی سرخی۔ ناک پر سنہری عینک۔

نہ بھی مرنا ہو تو مر جانے کو جی چاہے ہے

سلام، کلام، آداب بندگی۔ آگے بڑھئے تو میوالال کی سونے چاندی کی دکان اور ان کا بیٹا لکشمن دور ہی سے دیکھ کر پکار اُٹھتا۔ "کلیم صاحب!"

کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ارے نہیں لکشمن۔ ذرا جلدی میں ہوں۔ اُس نے بنارسی پان سے بھرا ہوا چاندی کا ڈبہ بڑھایا۔ اور نہ بھی کھانا ہو تو کھا جانے کو جی چاہے ہے، بے اختیار ہاتھ بڑھ ہی جاتے۔ اور مرنجا مرنج خوشبوؤں سے بسا ہوا پان منہ میں ڈالتے ہی زندگی محبت، فرحت اور مسرت سے سنسنا اُٹھی۔ آگے بڑھئے تو

www.taemeernews.com

"بہادر شو ہاؤس"۔ ایک چھوٹی سی مگر نفیس قسم کی جوتے کی دکان ۔ داس برادرس کی بغل میں گذرا تو ٹھٹھک کے کھڑا ہوگیا ۔ دکان میں اُنہیں دیکھا جنہیں مشاعرہ میں غزل پڑھتے یا غزلوں پر بہترین قسم کی پرمعنی دلچسپ داد دینے والوں میں دیکھا تھا۔ راجہ رام نارائن موزوں، مہاراجہ کلیان سنگھ، راجہ شتاب رائے کے متوسلین، حکمراں، متعلقین، منصب دار اور تہذیبی علم برداروں کا محلہ دیوان محلہ شاید ایک دو بار دیکھنے کا موقع ملا تھا جب آتش جواں تھا۔ پینتس سال پہلے ۔کسی مکان کا بڑا خوبصورت ہال۔ ہال میں نفیس فرش، فرش پر حسین تکیے اور گاؤ تکیے ۔ اور بلوری فانوسوں میں مومی شمعیں، چھت پر بجلی کے بلب اور قندیلیں ۔ گلاب پاش اور عطردانوں کے سیٹ اور شاید فتح پیچ اور پیچوان بھی ۔ اور اس فرش پر فانوسی شمعوں کے درمیان برقی قمقموں کے سائے میں محلہ کے وضع دار غیر مسلم تعلیم یافتہ اردو ادب اور شعر کے نئے اور پرانے عاشقین اور شائقین عام طور سے شیروانیوں یا سفید براق کرتہ پاجامہ اور ٹوپیوں میں ملبوس پان کے ڈبوں کے ساتھ یا بغیر پان کے سولف اور الائچیوں کے شغل کے ساتھ سلیقے سے بیٹھے ہوئے غزل پڑھتے یا غزلوں پر دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے ۔

یہ تقسیم کے چار پانچ چھ سال بعد کا منظر تھا اردو زندہ تھی کاغذ پر نہو فائل میں نہو، اسٹیج پر نہو۔ لیکن دلوں میں زندہ تھی۔ گھروں میں زندہ تھی، زبانوں پر زندہ تھی مجلسوں میں محفلوں میں، صحبتوں میں نشستوں میں زندہ تھی ۔ بازاروں میں بھی تھی۔ لباسوں میں، وضع میں، نین دین میں ملنے جلنے میں زندہ تھی۔ ایک مستقل تہذیب تھی اور مستقل تہذیبی زندگی تھی ۔ دیوان محلے کی اُس نشست میں جس میں مسلمان سامعین مسلمان شعرا کم تھے ۔غیر مسلم شعرا اور غیر مسلم سامعین زیادہ تھے ۔ اُن کی نشست اور نشست میں گفتگو کی فضا، شعر و غزل کی حسین، رنگ و نور و نغمہ سے گونجتی ہوئی فضا میں اگر کوئی جادوگر نقلی جنت بنا کر بھی سامنے لے آتا تو یہ وضع ۔ اہل مجلس اُس سامنے والی جنت کو نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور کہہ دیتے کہ

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

www.taemeernews.com

اُسی مجلس کے ایک فرد کو دیکھا کہ جوتے کی دکان میں بیٹھے ہیں بازار میں بیٹھے تھے مگر ٹھاٹ باٹ وضع اور لباس، انداز اور اطوار تیور اور تپاک وہی تھے جو آٹھ دس سال پہلے دیوان محلّے کی مجلس میں دیکھے تھے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور صاف کہا۔ زمینداری ختم کر دی گئی۔ معاش بھی قتل کر دی گئی اور معاشرت بھی اُجاڑ دی گئی۔ اِسی نے تہذیب کا جنازہ نکلوایا گھر سے اٹھا کر بازار میں بٹھایا۔

وہ "بہادر شعر ہاؤس" بھی شاید نہیں چل سکا۔

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ ؟ تو استعفا مرا باحسرت و یاس

کئی سال بعد تک بھی میں دیوان محلے اور چودھری ٹولہ کے پرانے وضع داروں کو کہیں کہیں دیکھتا رہا۔ کہیں بیٹھے ہوئے، کہیں گذرتے ہوئے، کہیں ٹہلتے ہوئے۔ زندگی سے بھرپور پیچ و خم کھاتے ہوئے دریا کے بہاؤ پر نزاکت اور لطافت کے ساتھ۔ ایک یادگار اور کبھی نہ فراموش ہونے والی تہذیب کی لوچ کھاتی ہوئی کشتیاں اور بجرے چلانے والے' ایک انوکھی زباں، دردمندی، محبت، میل ملاپ، یگانگت، اخوت، رواداری، ایثار اور قربانی کے جذبوں سے سرشار انسانوں کی پیدا کردہ ساختہ پرداختہ زبان اردو کا نغمہ الاپتے ہوئے، بد تہذیبی، بد زیادتی، بد خواری کے ذریعہ آنے والی گندگیوں سے دامن بچاتے ہوئے، آخر آخر تک وضع داری نباہتے ہوئے، حسن کردار حسن گفتار، حسن کردار کے بے مثال نمونے دکھاتے ہوئے لوگ چل دیئے ہم

ہاتھ مَل کے رہ گئے پچھتا کے رہ گئے

یہ نمونے شاید اب ہمیشہ کے لئے بازار سے اٹھائے گئے۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

اب نہ وہ چراغ رہا نہ وہ رُخِ زیبا اور نہ اب ڈھونڈنے والے رہے تو وعدۂ فردا لے کر جانے والوں کا پتہ کون بتائے؟ کیا ہم؟ سو ہم بھی کب تک

www.taemeernews.com

کون اے عشق تیرا پجاری بنے بزم میں کوئی اہلِ وفا نہ رہا
ایک گوشے میں ہم رہ گئے یہاں وہ ہمارا بھی اب کیا ٹھکانہ رہا

دیوان محلہ اور چودھری ٹولہ سے اب کوئی سریلی آواز نہیں آتی کوئی سجیلی شکل دکھائی نہیں دیتی، کوئی البیلی وضع سامنے سے نہیں گذرتی وہ فرش، وہ فانوس، قالین اور قندیل، عطردان اور گلاب پاش، وہ انقاب و آداب، وہ خوش خیال و خوش نوا، وہ غزل اور غزل سرا، بس دیکھتے دیکھتے پندرہ بیس پچیس سال کے اندر محل سرائے ماضی میں نقش و نگار طاق نسیاں بن کر رہ گئے۔

اس کے گئے پہ ایسی گئی دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بس ایک نہایت ہی جی دار اور حوصلہ مند کو پانچ سات سال پہلے تک دیکھا تھا شیروانی تو اتر گئی تھی مگر سفید بے داغ کرتا سفید ململ کی ٹوپی سنہری عینک کے ساتھ کبھی کبھی میری دکان کے سامنے سے گذرتے تھے میں انہیں سلام کرتا تھا اور وہ مسکرا کر صرف ہاتھ کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے گذر جاتے تھے۔ اور ان کی زبانِ حال یہ شعر پڑھتی تھی۔

زمانہ قدر کر ہم کجکلاہانِ محبت کی
کہ پیدا اس نمونے کے جواں ہر دم نہیں ہوتے

یا یہ شعر

ہمیں اس ہوس کے زمانے میں ہیں
محبت کی دنیا سنبھالے ہوئے

ممکن ہے اور بالکل قرینِ قیاس ہے کہ اُن کی اولاد اعلیٰ اقتصادی اور معاشی تعلیم حاصل کر کے اونچے درجے کے منصب و ملازمت پر فائز ہو یا عراق اور کویت چلی گئی ہو۔ دیوان محلے کے مکانات اور بنگلے تین منزلہ اور چار منزلہ عمارتیں بن گئی ہوں۔ درجنوں کمروں میں صوفہ سٹ، ٹی وی، وی سی آر، فریج اور کھلونوں کی الماریاں بھر گئی ہوں۔ امبا سڈر، فیاٹ اور ماروتی دروازوں پر کھڑی ہو۔ کونے کونے میں موٹر سائیکلوں اور اسکوٹروں کی قطار ہو۔ لیکن سناٹا ہوگا یا کان پڑی آواز سنائی

www.taemeernews.com

دیتی ہوگی اور گذرے ہوئے کسی میرے ہی جیسے دیوانے کا جی چاہتا ہوگا کہ یہ شعر پڑھ دے ؎

ہوئی آباد دنیا اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

کوئی گھٹیا قسم کا بھی کلیم ہوگا تو یہ شعر تو ضرور ہی پڑھ دے گا۔

بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

۱۹۴۷ء کے پہلے یا ۱۹۵۶ء کے پہلے تک کی ایک تصویر آپ کو اور دکھاؤں اور اس کے بعد یہ چاپٹر یا قصہ کا یہ باب ختم کر کے آگے بڑھ جاؤں کہ۔ دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار۔ کا معاملہ درپیش ہے۔ دل تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن دل کا چاہا ہوا کب اور کتنا کس کے ہاتھ آیا ہے ہم میں کون سا سرخاب کا پر ہے۔ خواجہ حسن نظامی بھی تھک گئے تھے گرچہ میں تھک تو نہیں سکتا۔ کہ یہی میری توانائی ہے مگر شاید آپ تھک جائیں مگر بہرحال ایسے لوگ اب بھی بہت ہیں کہ شام سے لے کر بیٹھیں گے تو صبح ہوتے ہوتے بھی مشکل سے چھوڑنے پر آمادہ ہوں گے۔ داغ دہلوی جب رام پور آئے تو نواب کے پٹھان فوجی دستے کے افراد گروہ در گروہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور جب داغ اپنی چٹ پٹی مسالہ دار غزلیں پڑھتے تھے تو نو جی پٹھان اپنی زبان میں تعریف کرتے تھے کہ ہائے حرامزادہ کیا کہتا ہے۔

مجھے سن کر یا پڑھ کر لوگ بول اُٹھتے ہیں اور بول اُٹھتے رہیں گے کہ
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے

تو جناب ۱۹۴۸ء میں جب میں نے بی۔ این کالج کے سامنے دکان کھولی۔ تو وہاں کے بہت سے مناظر ہیں اُن میں ایک آپ بھی دیکھ لیجئے۔ کبھی کبھی صبح دس بجے میں دکان میں رہتا تو ایک صاحب کو دیکھتا بہت چُست تندرست اور توانا بدن بلکہ کسرتی بدن کہئے۔ سینہ بہت چوڑا اس کے اعتبار سے کمر پتلی، عمر تقریباً پینتالیس یا پچاس سال سانولا رنگ اور میانہ قد سر پر سیاہ زلف اور زلف پر سیاہ رنگ کی رام پوری ٹوپی ترچھلاہی کے انداز سے پیشانی اور سر کے

www.taemeernews.com

عقبی حصہ کو بھر پور اپنی آغوش میں لئے ہوئے۔ بھرپور اور بھرکلہ سیاہ داڑھی، کنگھی سے آراستہ کی ہوئی، سجائی ہوئی، بہت وضع داری سے ترشی ہوئی اور سلی ہوئی۔ چست شیروانی ایک ہی نہیں کئی شیروانیاں ہوں گی۔ جاڑے میں سیاہ سرج یا ووسٹڈ کی۔ گرمیوں میں سلک یا سوتی۔ کبھی بادامی کبھی آسمانی رنگ کی۔ لمبے خوب تندرست۔ شیروانی تقریباً ٹخنے تک پہونچی ہوئی سفید چست پاجامہ جو تندرست اور گٹھی ہوئی پھلیوں میں بالکل چست اور کسی ہوئی۔ بادامی یا اور کسی رنگ کا پمپ یا شو۔ اور اسی رنگ کا موزہ۔ ہاتھ میں نہایت خوبصورت لکڑی کی سیاہ یا بادامی چھڑی۔ بہت جھومتی ہوئی باوقار چال سے بی۔ ان کالج کے فٹ پاتھ سے لگے ہوئے مشرق سے آتے۔ اور کالج اور ہوسٹل کے درمیان راستے سے مڑ جاتے۔ کہیں جاتے خدا جانے بہار بینک یا اور کہیں۔ یہ صبح دس بجے کے قریب کا وقت ہوتا۔ اور پھر وہ چار پانچ بجے سہ پہر کو اسی گلی یعنی بی۔ ان کالج اور ہوسٹل والی گلی سے نمایاں ہوتے اور پورب کی طرف مڑ کر کہیں چلے جاتے سبزی باغ، دریاپور سلطان گنج، عالم گنج، پٹنہ سیٹی خدا جانے کہاں جاتے۔ میں انہیں کئی ماہ بلکہ شاید کئی برس دیکھتا رہا۔ وہ میری ایک محبوب شخصیت بن گئے۔ ماحول سے الگ رواج رسم اور وضع سے الگ۔ ایک مخصوص وضع میں مخصوص انداز سے، مخصوص تیور سے جھومتے مسکراتے جیسے سارے زمانے کو چیلنج کرتے ہوئے ساری فضا کو مسخر کرتے ہوئے حلم، بردباری، وقار اور وضع داری کا ایک بے مثال نمونہ بن کر آنکھوں کے سامنے نقش بناتے ہوئے گذر جاتے۔ میں ایسی شخصیتوں کا عاشق ایسی وضع داریوں کا رسیا، ایسے تیور ایسی چال ایسے انداز اور وقار کا دارفتہ اور شیدائی۔ میں انہیں دیکھتا رہا، مزے لیتا رہا خوش ہوتا رہا کہ قیس جنگل میں اکیلا تھا۔ یہ دوسرا دیوانہ بھی آگیا۔ میں نے تحقیقات نہیں کی۔ بس دیکھنا لطف لینا مسرور ہونا اور اپنے خزانۂ شعور میں محفوظ رکھنا یہ میرا کام ہے وہ میں کرتا رہا۔

ایک صبح یا شام میری دکان میں یا تو میرے چچیا سسر مسٹر احسن الظفر بیٹھے تھے یا محمود بھائی مرحوم۔ ان دونوں کا قیام پٹنہ سیٹی میں رہتا تھا۔ ان سے باتیں کر رہا تھا کہ وہ صاحب اسی مستی سرشاری اور وقار کے ساتھ گذرے۔ میں نے پوچھا۔

www.taemeernews.com

"آپ انہیں پہچان سکتے ہیں؟"
احسن چچا یا محمود بھائی نے گھوم کر دیکھا۔
"ارے ہاں۔ یہ تو نظام صاحب ہیں۔"
"کہاں رہتے ہیں؟"
"باغ کالوخاں پٹنہ سیٹی۔"
"کیا کرتے ہیں اور روزانہ یہ کہاں جاتے ہیں؟"
"یہ پٹنہ کلکٹریٹ میں کلرک ہیں۔"

اگر میرے ہاتھ میں پیمانہ یا گلاس ہوتا تو چھوٹ جاتا۔ اور چکنا چور ہو جاتا۔ میں بے اختیار چونک گیا۔ اور دو ایک لمحہ حیرت سے خبر دینے والے کا منہ تکتا رہا۔
"کلرک ہیں؟؟"
"ہاں بھئی کلرک ہیں اور خدا کے اچھے بندے ہیں پرانی وضع داری کی ناک ہیں غیور اور خوددار ہیں ہماری تہذیب کی آبرو ہیں۔"

تفصیل سن لیجئے۔ نظام صاحب پٹنہ سیٹی باغ کالوخاں کے رہنے والے پرانے شرفا کی یادگار تھے۔ اوسط درجے کا گھرانہ۔ انگریز دور کے اوسط پڑھے لکھے انسان۔ ضرورت کے تحت ملازمت کرلی پٹنہ کلکٹریٹ کے کسی شعبے میں کلرک سے ترقی کر کے ہیڈ کلرک یا آفس سپرنٹنڈنٹ وغیرہ ہو گئے تھے۔ جس دن آفس جوائن کیا اور جس دن ریٹائر کیا۔ اسی وضع اسی شان سے۔ پٹنہ سیٹی سے چل کر ٹمٹم یا یکہ پر عدالت کے قریب اتر کر رئیسانہ انداز سے چھڑی ہاتھ میں لئے جس طرح فوجی سپاہی ہاتھ میں رائفل لے کر چلتا ہے۔ نظام صاحب عدالت گیٹ سے خراماں خراماں کلکٹریٹ آتے اسی طرح شیروانی کے ساتھ اپنے ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتے۔ چھڑی اور جیب سے پان کا ڈبہ نکال کر ٹیبل پر رکھ لیتے۔ اپنے کام میں لگ جاتے پان کھاتے اور فائل سے گذرتے رہتے۔ نہ کسی ہوٹل میں جاتے نہ چائے خانہ میں قدم رکھتے۔ شاید چائے ٹیبل پر منگوا لیتے ہوں یا نہیں پیتے ہوں۔ خوش مزاجی اور خندہ پیشانی سے کام کرتے۔ زندگی میں ایک پیسہ رشوت نہیں لی۔ اس عظمت سے زندگی گذاری۔

www.taemeernews.com

اس دیانت سے کام کیا اور ایسی وضع داری سے نباہ دی کہ گذری ہوئی تہذیب کا ایک ہیرو بن گئے ریٹائر ہوئے تو دفتر کو سناٹا کر گئے۔ مرے تو ایک تہذیب کے در و دیوار کو بے چراغ کر گئے۔

مرنے پہ جان دیتے ہیں اس خاندان کے لوگ
یہ وضع دار لوگ تھے یارب کہاں کے لوگ

---

www.taemeernews.com

دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ جرمن کا حلیف جاپان میدان میں آچکا تھا۔ میں کلکتہ میں تھا۔ جاپان کی شرکت کی وجہ سے جنگ ہندوستانی سرحد کے قریب آچکی تھی۔ کلکتہ کا تجارتی طبقہ زیادہ متوحش پریشان اور خوف زدہ تھا مگر کاروبار عشق جاری تھا۔ کلکتہ کے منومنٹ میدان میں وہ عالم نہیں تھا جو اب ہے اب تو میدان پہچانا نہیں جاتا۔

تو برما اور سنگاپور کے قریب جاپان سے جنگ بھی جاری تھی لیکن کاروبارِ زندگی اور کاروبارِ شوق کی وہی چہل پہل تھی۔ اخبار رسالے ویسے ہی نکل رہے تھے۔ سینما ہال اور الفنسٹن تھیٹر میں ویسے ہی ہجوم تھا۔ گاڑیاں اسی تیز رفتاری سے سڑکوں پر چیختی پھرتی تھیں۔ جنگ بھی ہوتی رہی اور کلکتہ میں یہ سب ہوتا رہا۔ برطانیہ اور جاپان کی جھڑپیں مشرق بعید میں بہت تیز ہوگئیں۔ اور آخر پرل ہاربر میں برطانیہ کے دو شہرۂ آفاق جنگی جہازوں، "پرنس آف ویلس" اور "ریپلس" کی چمنیوں میں بمباروں کے دو جاں باز ہوابازوں کو گود میں لے کر ہوائی جہاز سے کود گئے۔ دو بہادروں نے اپنی جان دے کر دو عظیم جنگی جہازوں کی تباہ کاریوں سے جاپان کو ہمیشہ کے لئے بچالیا۔ 'پرنس آف ویلس' اور 'ریپلس' دونوں پرل ہاربر میں غرق ہوگئے۔

اور ایک دن دھرمتلہ اسٹریٹ سے شمال بنٹنک اسٹریٹ (Bentink St.) میں جاپانی ہوابازوں نے دو بم گرائے ان میں ایک بم بوہرا خاندان کے بہت بڑے تاجر جے۔ سی محمد علی (J. C. Mohammad Ali) کے پانچ منزلہ دکان کے قریب ہی گرا۔ اور اسی شام سے دھرمتلہ اسٹریٹ کی رونق میں اور سارے شہر کی گرما گرمی میں فرق آگیا۔ ہوڑہ اور سیالدہ اسٹیشنوں میں کلکتہ چھوڑنے والوں کا ہجوم ہوگیا اور اس ہجوم میں ایک میں بھی تھا۔

میرا وہ مکان جو نرغے میں کافروں کے اکیلا امام تھا۔ ایک طرف رائے بہادر ہزاری مل

www.taemeernews.com

دودھ والا کے مکانات کا سلسلہ۔ دوسری طرف راج کشور عطر والے کے مکانات جس سے کئی برس مکان کے راستے کے سلسلہ میں والد سے جنگ رہی اور ہر طرف کے ہندو مکانداروں نے والد صاحب کی حمایت کی، مدد کی، ساتھ جس کا مختصر قصہ اپنی کتاب "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں ملے گا۔ اور جس میں میرے بڑے بھائی اور بڑے نانا ۱۹۲۷ء کے فساد میں پوشیدہ پناہ گزیں رہے۔ جن کی حفاظت میں پچیسوں ہندو دربانوں نے اور درجنوں ہندو رنڈیوں نے جان کی بازی لگادی تھی، جو ہندوستانی معاشرتی زندگی اور ہندو مسلم اتحاد کا عجیب و غریب واقعہ ہے۔ اسی مکان میں ہریسن روڈ کے سڑکی اخبار فروش عبدالغفار بھائی کبھی کبھی آکر نیم دراز ہوتے تھے۔ اور آنکھیں بند کئے مجھ سے کم در و دیوار سے زیادہ مخاطب ہو کر دنیا اور دنیا والوں کے متعلق سیدھے سادے فلسفیانہ انداز میں ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جو اکثر میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن نہ سمجھ کر بھی محویت کے عالم میں سنتا رہتا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا کہ میری طرح در و دیوار، ہوائیں، کھڑکیوں سے آنے والی دھوپ بھی محو اور مسحور ہو کر سن رہی ہے۔ اُسی مکان میں میری والدہ کا ایک ہی بار، پہلی اور آخری مرتبہ قدم آیا۔ اور اسی مکان میں ان کی موجودگی میں ایک بار میں سخت بخار میں مبتلا ہوا اور رات بھر تیز بخار میں نیم بیہوش رہا۔ اور اسی نیم بیہوشی یا گہرے خواب میں کسی فرشتے کی مترنم آواز کی طرح کانوں میں یہ جملے گونجے۔ "اٹھو بیٹا، صبح کی نماز کا وقت جا رہا ہے" ــــ اور ایسا لگا کہ اسی فرشتے نے مجھے اٹھا کر چاق و چوبند بٹھا دیا۔ اور میری والدہ سفید زری کی کوردار ساری پہنے مسکرا رہی تھیں۔ بخار غائب ہو چکا تھا اور میں نے وضو کر کے نماز پڑھی ــــ اسی مکان میں منشی عزیز امحسن دل لکھنوی اور آغا مستحسن آیا کرتے تھے۔ منشی دل لکھنوی الفنسٹن تھیٹر پر برسوں اسٹیج کئے جانے والے ڈرامے "نادر شاہ درانی" کے مکالمے دُہرایا کرتے تھے جو ان کی شاہکار تصنیف تھی اور آغا مستحسن جو اُس ڈرامے میں ایک اہم کردار انجام دیتے تھے۔ منشی دل کے ڈرامے کے مکالموں پر تنقید کیا کرتے۔ کبھی وہ ہار جاتے کبھی منشی دل کو ان کی تنقید ماننی پڑتی اور مکالمے میں ترمیم کرنی پڑتی۔ وہ مکان جس میں بڑا بازار پوسٹ آفس کے مسلمان بڑے پوسٹ ماسٹر نے والدہ کا حال آکر دیکھا۔ اور واپس جا کر ہفتوں کا کام ایک گھنٹے میں مکمل کر کے والد کی چالیس پچاس ہزار

www.taemeernews.com

کی رقم سکیشن سرٹیفکٹ کی بنیاد پر والدہ کو اپنے ہاتھ سے حوالہ کردی اور یہ کہہ کر واپس گئے کہ میرے لئے دعا کیجیے گا۔ لاکھوں ہندوؤں کے درمیان اسی تنہا مکان میں ایک دن کلکتہ کارپوریشن بلڈنگ کمیٹی کے چیرمین مسٹر بدوبھوشن سرکار اور مسٹر سلومن یہودی ممبر اور کارپوریشن کے چیف اکزیکٹو افیسر مسٹر ٹی سی بوس جمع ہوئے۔ مکان دیکھا راستہ دیکھا اور سب کے سامنے یہ اعلان ہوا کہ راج کشور بہادر عطر والے کا مطالبہ ناجائز ہے۔ اور کہا "کفایت حسین صاحب آپ کے مکان کا راستہ رہے گا اور اتنا ہی چوڑا رہے گا" اور رائے بہادر بی مل دودھ والے نے والد کی طرف سے اسی مکان میں سب کی دعوت کی۔ اُس مکان میں قفل ڈال دیا گیا اور میں نے بھی اپنے دو ایک ملازموں کے ساتھ گویا کلکتہ کی رہائش کو الوداع کہا اور ہوڑہ اسٹیشن آگیا۔

میں تیلہاڑہ ہوتا ہوا پٹنہ آگیا۔ یہاں ایک رہائشی مکان کی ضرورت تھی تاکہ میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ یہ شاید ۱۹۴۲ء کے فروری مارچ کی بات ہے میرا سترھواں سال تھا۔ میٹرک پاس کئے شاید ڈیڑھ سال ہو چکے تھے والد کا انتقال ایک سال قبل ہو چکا تھا۔ لودی کٹرہ پٹنہ سیٹی میں عارضی رہائش رکھ کر بانکی پور میں مکان کی تلاش میں آیا کرتا۔ اس وقت میری صحت، قد و قامت، لباس و پوشاک، وضع قطع نگاہوں کو کھینچ لیتی اور توجہ کو مرکوز کر لیتی۔ نفاست، صفائی اور وضع داری فطرت کا جزو بن کر طبیعت اور مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ کا شباب تھا چیزیں گراں ہو چکی تھیں اس کے باوجود پانچ پی PPPPP کا انگریزی لٹھا بارہ آنے گز مل جاتا تھا۔ بہترین انگلش ادھی ململ ایک روپیہ گز شیروانی کا سلک اور گرم سرج یا دوشٹڈ چھ سات روپے گز۔ بنگال ٹیسری کے معیار اور درجے کا فل شو پندرہ سولہ روپے کو اور ہاف شو بارہ روپے کو۔ ترکی ٹوپی تین روپے کو یا بہترین سیاہ مخمل کی رام پوری ٹوپی ڈیڑھ دو روپے کو۔ رسٹ واچ کا رواج اتنا نہ تھا۔ ویسٹ اینڈ، سائیما اور اومیگا کی جیب گھڑی مع زنجیر تیس چالیس روپے کو مل جاتی تھی — چنانچہ سفیدی مائل ہلکے سرمئی رنگ کی شیروانی، سفید خالتہ پاجامہ، سیاہ مخمل کی ٹوپی اور بنگال ٹیسری کا براؤن فل شو پہن کر جیب میں کاج کے ساتھ روپہلی زنجیر میں لگی ہوئی گھڑی ڈال کر لودی کٹرہ سے سبزی باغ تک آتا تو گرچہ میں ابتدائے زندگی سے نظریں نیچی

www.taemeernews.com

کئے سر جھکا کر چلنے کا عادی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا کہ آنکھیں اُٹھ رہی ہیں اور نگاہیں تعاقب کر رہی ہیں۔
مکان کی تلاش کے دوران باقر گنج میں ایک صاحب مسٹر ڈی۔ کے۔ لعل سے ملاقات ہوئی۔ یونہی راستہ چلتے۔ وہ میری طرف دو چار لمحوں تک دیکھتے رہے۔ پینتس، چالیس سال کی عمر سانولا رنگ، چندیا پر مختصر بال، شفاف کھادی کا لمبا کرتہ اور کھادی کی دھوتی، پاؤں میں چپل۔ اُس دور کے گاندھی مارکہ نیتا قسم کے انسان۔ وہ میری طرف دیکھنے لگے تو میں بھی مخاطب ہو گیا۔ مجھے مکان کی تلاش تھی۔ میں نے تعارف پیدا کیا۔ وہ فوراً بہت اشتیاق اور دھیان سے متوجہ ہو گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات میں مہربان جیسے نظر آئے ــــ کہیں جا رہے تھے۔ اپنا ارادہ ملتوی کیا۔ مجھے ہمراہ لے کر اپنے مکان میں آئے۔ بی۔ این کالج کے سامنے گلی میں دو چار مکان کے بعد۔ ایک چھوٹا سا تین منزلہ پختہ مکان۔ گھر لائے۔ اپنے دو لڑکوں کو بلایا ملایا۔ باتیں ہوئیں۔ مکان کی ضرورت کا حال معلوم کیا۔ بولے تمہیں مکان دلا دوں گا۔ اچھے آدمی کا اچھا مکان دلاؤں گا۔ دوسرے دن مجھے بلایا۔ ساتھ لے کر باقر گنج گولا روڈ گئے۔ ایک پرانے قاعدے کی وسیع اور کشادہ مکان کے اندر پہونچے۔ آنگن، سائبان چاروں طرف بڑے بڑے کمرے۔ سائبان میں موٹی موٹی لکڑیوں کی چھجیوں کی جالیاں بنی ہوئیں۔ ایک کشادہ کمرے میں چوکیوں کے فرش اور کرسیوں اور صوفوں کے درمیان ایک گندمی رنگ فربہ آدمی توند نکلی ہوئی۔ ننگے بدن موٹی جنیو ڈالے کمر تک دھوتی باندھے پرانی سلور کمانی کی عینک آنکھوں پر ڈالے بیٹھے تھے۔ دیوکی بابو نے میرا تعارف کیا۔ اور ان کا تعارف مجھ سے کہا۔ ڈاکٹر شیام بہادر میونسپل کمشنر۔ ڈاکٹر شیام بہادر سے کہا اب اپنا نیا مکان انہیں کرائے پر دیجئے۔ ان کی طرف سے میں ہر طرح کی ضمانت لیتا ہوں۔ ہم لوگ بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد فوراً ہی بات مکمل ہو گئی۔ دیوکی بابو کی بے ساختہ ضمانت اور ڈاکٹر شیام بہادر صاحب کی بلا تکلف آمادگی دونوں اس دور میں عجیب لگیں گی۔ اگر عجیب نہ ہوتیں تو میں اس وقت انہیں تحریر میں نہیں لاتا ــــ مکان کی تکمیل کے بعد نوّے روپیہ ماہانہ کرایہ طے پایا۔ تا تکمیل نصف کرایہ پینتالیس روپئے۔ نہ پگڑی نہ پیشگی۔ میں نے پینتالیس روپئے فوراً پیش کئے۔ انہوں نے فوراً رسید لکھ دی۔ چابی لے کر ملازم ساتھ دیا کہ اسی وقت جا کر مکان پر قبضہ دیدو۔ مکان میں آئے۔ دو منزلہ عمارت دو ہال چار کمرے۔ ٹھیک بی۔ ان کالج

www.taemeernews.com

کے سامنے۔ وہی مکان جس میں آج آپ Binny Cloths کا شوروم دیکھتے ہیں۔ وہ مکان ۱۹۴۸ء تک میرے قبضے میں رہا۔ اور ۱۹۴۶ء کے فساد سے پہلے مجھے وہ مکان بیس ہزار میں فروخت کرنے کو بالکل آمادہ تھا۔ مگر والد کی برآمد شدہ تمام رقم والدہ کی نجی تحویل میں تھی۔ ان سے مانگنا مناسب نہ سمجھا۔ اور وہ تمام رقم اور تمام لوازمات اور زیورات اُن کی شہادت میں انہیں پر صدقہ ہوئی۔

ڈاکٹر شیام بہادر کی نیت میں دو سال بعد ہی فتور آیا۔ مکان خالی واپس لینے کی کوشش کرنے لگے۔ مقدمات کئے، پیروی کی کوششیں کیں۔ رشوتیں دیں۔ آخر انگریز کلکٹر مسٹر جے۔ اِس ہارڈمین جن کا ذکر قبل آچکا کا فیصلہ بیشتر حد تک میرے حسب خواہ ہوا۔ ڈاکٹر شیام بہادر کا ایک لڑکا فوجی کپتان ہوا۔ اور لڑکے دوسرے جنگی عہدوں پر فائز ہوئے۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں وہ مکان چھوڑ دیا۔ مگر میرا چھوڑنا سازگار نہیں ہوا۔ ڈاکٹر شیام بہادر اسی وقت مر گئے۔ بڑا لڑکا راجندر پرشاد جنگ کے بعد مبتلائے فالج ہوا۔ مکان اونے پونے ختم ہو گیا۔ اب پتہ نہیں چلتا کہ چند برسوں کے اندر وہ خاندان کہاں گیا کیسے منتشر ہو گیا۔ کیا ہوا۔ کسی پر نظر نہیں پڑتی۔ میں نے تحقیق نہیں کی مسٹر دیو کی بوس آج بھی ہیں۔ بہت بوڑھے ہو گئے۔ ایک پاؤں کمزور ہو گیا۔ چھڑی کے سہارے اسی طرح کھدر کے کرتے اور دھوتی چپل میں سہ پہر کو نکلتے ہیں اور پرانے لوگوں سے ملتے جلتے چھڑی ٹیکتے کچھوے کی رفتار سے نو دس بجے شب میں گھر واپس آتے ہیں۔ جب میں دکان پر ہوتا ہوں اور وہ گذرنے لگتے ہیں تو میں کسی چیز کی آڑ میں ہو جاتا ہوں تاکہ وہ مجھے نہیں دیکھیں یا راستے میں نظر آجاتے ہیں تو میں فٹ پاتھ بدل دیتا ہوں۔ وہ دائیں ہوتے تو میں بائیں چلا جاتا ہوں تاکہ وہ مجھے نہیں دیکھیں یا راستے میں نظر آجاتے ہیں تو میں فٹ پاتھ بدل دیتا ہوں۔ وہ دائیں ہوتے تو بائیں چلا جاتا ہوں کہ ان سے مڈبھیڑ نہ ہو۔ کبھی کبھی راستے میں مل ہی جاتے ہیں تو وہیں کھڑے کھڑے اپنا پورا دل خالی کر دینا چاہتے ہیں۔ میں عذر کرنا چاہوں تو وہ میرا ہاتھ اپنے بوڑھاپے کی پوری قوت سے پکڑ لیتے ہیں اور پھر جب آتش جواں تھا اُس وقت کا قصہ چھیڑ دیتے ہیں۔ اپنا غم جان کا غم جہان کا غم کچھ نہیں چھوڑتے اور میں رونے لگتا ہوں اور وہ بھی آبدیدہ ہو جاتے ہیں آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں ہونٹ

www.taemeernews.com

کانپنے لگتے ہیں آواز بھرا جاتی ہے۔ اُن کا موضوع بھی وہی ہوتا ہے جو اپنا رہا کیا ہے یعنی

وہ وقت وہ قصے وہ فسانے
وہ باغ و بہار کے زمانے
جب یاروں کو کوئی غم نہیں تھا
ساقی کی نظر میں خم نہیں تھا
اندیشۂ بیش و کم نہیں تھا

ایک ہاتھ سے چھڑی ٹیکے۔ دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑے۔ اردو ہندی ملی ہوئی زبان میں شاعری کا سارا موضوع، ادب کا تمام مواد روایات کا تمام سرمایہ۔ پچھلی زندگیوں کی تمام رنگینیاں اور تازگیاں۔ محبت اور گداز اور دل دُکھنے اور جگر پگھلنے کے واقعات وہ لوگ وہ صحبتیں۔ میری وضع داری۔ اپنی سادگی اور پرکاری سب کچھ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے اور نکلنے لگتا ہے۔ ان باتوں کو سُننے والا۔ اُن تصویروں کو دیکھنے والا، سمجھنے والا لطف لینے والا اُنہیں کوئی نہیں ملتا۔ شام چار بجے سے رات دس بجے تک شاعر کی طرح تازہ غزل لے کر وہ سنانے کو چیونٹی کی رفتار سے اس بڑھاپے میں چھڑی ٹیکتے ہوئے باقر گنج گولا روڈ سے مراد پور اور چوہٹہ تک جاتے ہیں۔ کوئی ایک بات سننے والا مل گیا، کسی نے ڈیڑھ دو باتیں سن لیں۔ کسی نے نہیں سنیں لیکن وہ اپنا سامان لئے آواز لگاتے ہوئے روزانہ نکل جاتے ہیں۔ اور پھیری لگا کر جو کچھ بکا تھکے ہارے پھیری والے کی طرح وہ رات کو گھر واپس آتے ہیں۔ یہی ان کی کمائی ہے یہی روزگار ہے۔ جو حلوائی کی نئی دکان کی طرح پھیکے پکوان اور بے نمک کی کھچڑی کی طرح ہے۔ کون چکھے؟ کون کھائے؟ کبھی میں راستے میں مل گیا تو اُن کا پورا سودا بک جاتا ہے اور ہلکے پھلکے آسودہ اور مطمئن واپس گھر آتے ہیں۔ یہ مسٹر ڈی کے لعل یعنی مسٹر دیو کی لعل وہی ہیں جن کے لڑکے شراب کی دکان چودھری مارکیٹ کے سامنے بی۔ این کالج کی پورب طرف کلہڑیا کوٹھی کے مغربی کونے پر ہے۔ دیو کی لعل کا اس دکان سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن دکان انہیں کے نام پر ہے۔ اُن کا نشہ ٹوٹ چکا ہے وہ اب خمار میں ہیں۔

جو آج پی ہو تو ساقی حرام شے پی ہو ∴ ابھی تو کل ہی کے مے کا خمار باقی ہے

www.taemeernews.com

اسی لئے میں ان کے سامنے آنے سے بہت گھبراتا ہوں۔ انہوں نے شاید آنکھ بنوئی ہے موٹا شیشہ استعمال کرتے ہیں اسی لئے راستہ بدلتے وہ مجھے نہیں دیکھتے۔ مگر راستہ بدلتے ہوئے اور ان سے کترا کر نکلتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں خود سے کترا رہا ہوں۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں۔ آئینے سے آنکھیں بچا رہا ہوں' اپنے درد دل سے بہانہ کر رہا ہوں' اپنی غزل کو بھلانا چاہ رہا ہوں۔ اپنی داستان اپنی کہانی سے خود ہی کانوں میں انگلی ڈال کر ان سنی کرنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے اپنا مطلع یاد آجاتا ہے۔

مت کہئے کہ اب مجنوں نہ رہا لیلیٰ نہ رہی محمل نہ رہا
کہئے کہ لہو کا کھیل ہے یہ اور اتنا لہو فاضل نہ رہا

دیو کی لعل وہی زندگی گذار رہے ہیں جو میں گذار رہا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ وہاں چلتو ہے یہاں سمندر ہے انہیں باقر گنج یا بانکی پور کی گذری ہوئی روایتیں بے قرار رکھی ہیں مجھے ایک پورے عہد کی مٹی ہوئی زندگی اور بھولی ہوئی حکایتیں بے قرار رکھتی ہیں۔ وہ چند واقعات دہراتے ہیں اور چند لوگوں کے حالات سناتے ہیں اور آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ میں ایک نئی داستان طلسم ہوشربا دہراتا ہوں جو میرے سینے میں بند ہے اور جس کی کنجی تنہا میرا قلم ہے۔ اس طلسم کا دروازہ اور کوئی نہیں کھول سکتا۔ یہ طلسم کشائی میرا مقدر ہے اور میں تنہا طلسم کشا ہوں۔ افراسیاب کے طلسم ہوشربا کے لئے امیر حمزہ کے نواسے اسد غازی کو مصنف نے منتخب کیا تھا تقسیم کے پہلے اور بعد کی نصف صدی کے تاریخی طلسم کے لئے وقت نے میرے ضمیر سے کلیم عاجز کو چنا ہے۔ افراسیاب کا طلسم ہوش ربا لکھنو کے ایک مکان میں چھپر کھٹ پر بیٹھ کر پان کی گلوریوں اور حقے کی کش کے درمیان تخلیق کیا گیا۔ بیسویں صدی کا یہ طلسم ہوش ربا وقت کے اسٹیج پر چلتی پھرتی حقیقی زندگیوں کی ٹھنڈی آہوں گرم سانسوں' گلابی آنسو اور شہابی لہو کو گوندھ کر تیار کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد نقلی ہے اس کا خمیر اصلی ہے۔ اس کا رنگ عارضی ہے' اس کا رنگ' اس کا ڈھنگ' اس کا آہنگ دائمی ہے۔ وہ بادشاہوں کی' شہنشاہوں کی' شہزادوں کی' شہزادیوں کی' محلوں کی' محل سراؤں کی خیالی تصویریں ہیں۔ یہ غریبوں کی' فقیروں کی' محنت کشوں کی' عشق پیشوں کی' آشفتہ سروں کی' دیوانوں کی' دردمندوں

www.taemeernews.com

کی حقیقی زندگیاں ہیں ــــ وہ میر حسن کی مثنوی ہے، یہ میر کی غزل ہے۔ میر حسن پھولوں پر گذر کر گئے میر کانٹوں پر بسر کر گئے۔ وہ سب کے بس کا ہے یہ لاکھوں کروڑوں میں کسی ایک کے بس کا ہے۔ اس لئے دنیا کے غریب، فقیر، دردمند عشق پیشہ آشفتہ سر دیوانے میری شاعری کو میری نثر کو پسند کرتے ہیں جھومتے ہیں لوٹتے ہیں۔ لیکن وقت کے بادشاہ، ادب کے جاگیر دار، قلم کے ٹھیکے دار کرسی نشیں چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ اوپر اوپر ہنستے ہیں اندر اندر جلتے ہیں۔ منہ پر تعریف کرتے ہیں دل میں بددعا دیتے ہیں۔ قلم اٹھائیں گے تو گھوڑے کے دانے پر کتے کی راتب پر، بیل کی سانی پر بلی کے چھیچھڑے پر قصیدہ لکھ دیں گے، کتاب لکھ دیں گے، مضمون لکھ دیں گے لیکن کلیم عاجز کے قریب سے یوں گذر جائیں گے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں سنا ہی نہیں۔ یہ دیکھنے سننے، بولنے لکھنے کی چیز ہی نہیں۔ آج دو تین دوستوں کے درمیان ایک دوست نے کسی استاد کا یہ شعر پڑھا اور خوب جھوم کر پڑھا۔

ہر کس و ناکس سے جو اپنا ہی افسانہ کہے
ایسے دیوانے کو دنیا کیوں نہ دیوانہ کہے

میرے منہ سے بے ساختہ اپنی ایک پرانی غزل کے چند اشعار نکل گئے جو تقریباً پچیس[۲۵] چھبیس[۲۶] سال پہلے کہی تھی۔

اپنے دل کی بات شاعر بے حجابانہ کہے ❊ چاہے پتھر کوئی مارے کوئی دیوانہ کہے
میرے جیسا تشنہ لب کیا حالِ میخانہ کہے ❊ جو لئے بیٹھا ہو اپنے جام و پیمانہ کہے
کس نے یہ زلفیں سنواریں کیا یہ دیوانہ کہے ❊ خود ترا آئینہ بولے خود ترا شانہ کہے
نکلے ہم بے آبرو ہی آبروئے میکدہ ❊ ویسے کہنے کو جو چاہے پیر میخانہ کہے

بے ساختہ سب لوگ کاغذ قلم لے کر اشعار لکھنے لگے۔ نہ جانے کیا سمجھے شاید انہیں خبر نہیں کہ یہ پرانی غزل ہے اور میرے مطبوعہ مجموعے میں موجود ہے۔ مگر مجموعہ دیکھنے اور غزل پڑھنے کی کون تکلیف گوارہ کرے کیا یہ توہین کی بات نہیں۔

خیر جناب آئیے۔ میں نے بی۔ این کالج کے سامنے مکان لے کر اپنی اور اپنے بھائی

www.taemeernews.com

کی رہائش اُس میں مستقلاً منتقل کرلی۔ سب سے پہلا واقعہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ میرے یہاں ایک ملازم تھے۔ جوان مگر اوسط صحت۔ سیاہ داڑھی بھرکلاّ، نماز پڑھتے تھے اور فارغ اوقات میں اپنا رکشہ چلاتے تھے۔ وہ رکشہ اُن کا اپنا تھا۔ مکان کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھا رہتا۔ صبح شام وہ سواریاں ڈھویا کرتے۔ ایک دن شام کو وہ رکشہ ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ ایک شخص آیا۔ دراز قد تنومند۔ قمیض پاجامہ چپل۔ رکشہ پر کہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے یاد نہیں کیا بات ہوئی۔ اُس شخص نے ایک زور کا ایسا طمانچہ انہیں مارا کہ وہ گر پڑے۔ اور وہ شخص کھڑا گالیاں دیتا رہا۔ وہ دیر پر اُٹھے۔ اور ایک ہاتھ سے داڑھی سے بھرا گال سہلاتے ہوئے اُس شخص کی طرف دیکھا اور آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو ٹپک کر زمین پر گر گیا۔ اُس شخص نے اور گالیاں دیں اور کہا مجھے یاد رکھنا میرا نام فلاں ہے اور میں پولس میں حوالدار ہوں۔ وہ شخص مسلمان ہی تھا اور گیا ضلع کے کسی گاؤں کا پٹھان تھا۔

وہ خاموش گال سہلاتے ہوئے رکشہ لے کر چلے گئے ـــــ بہت دن گذر گئے۔ شاید کئی ماہ۔ ایک دن دیکھا وہی شخص اسی قسم کے لباس میں میرے مکان پر آیا۔ دیکھا کہ صحت اس کی گری ہوئی ہے۔ مضمحل، اداس اور کچھ خوف زدہ سا ہے۔ پوچھا وہ رکشہ والے کہاں ہیں۔ میں نے کہا اب وہ یہاں نہیں رہتے۔ کہاں چلے گئے مجھے معلوم نہیں۔ وہ شخص وہیں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ رونے لگا ـــ "میں ان سے معافی مانگتا۔ ہاتھ جوڑتا۔ مجھ سے بہت غلطی ہوئی مجھ سے بڑا جرم ہوا۔ مجھے بڑی سزا ملی۔ اور اسی بے خطا کو ستانے کے جرم میں ہوئی۔ میں Suspend ہوں اور بہت بیمار ہوں۔"

جن دنوں میں بی۔ ان کالج کے سامنے مکان میں آکر رہا۔ انہیں دنوں یعنی ۹ اگست ۴۲ء کانگریس کمیٹی نے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستان چھوڑو تجویز پوری اکثریت منظور کی وہی تجویز ٹھیک بیس سال پہلے ۱۹۲۲ء میں مولانا حسرت موہانی نے کانگریس سیشن میں پیش کی تھی جس پر مہاتما گاندھی چونک گئے تھے۔ اور ڈر کر حسرت موہانی سے کہنے لگے کہ "نہیں نہیں مولانا یہ تجویز بہت سخت ہے" اور مولانا حسرت موہانی کو بڑی حسرت ہوئی بڑا افسوس ہوا اور اپنی بے لاگ مجاہدانہ تجویز کے منظور نہ ہونے کے غم کو اپنی بے مثال غزل گوئی کے پردے میں یوں کہا۔

www.taemeernews.com

اپنا سا جوش اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم

لوگ کہتے ہیں کانگریس مصلحت اندیش تھی مولانا مصلحت نا اندیش۔ کیا مومن کی فراست تک کوئی پہونچ سکتا ہے۔ یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی ترقی کو بیس سال پیچھے پھینک گیا۔ جو کچھ ۱۹۲۲ء میں کرنا چاہتا تھا وہ ۱۹۴۲ء میں کر سکا۔ یہ مولانا یا مولانا قسم کے ہندوستانی مسلمان۔ جن کی وفاداری مشتبہ سمجھی جاتی ہے گرچہ زبان سے نہیں کہی جاتی۔ اور جن کی زبان ترقی دینے کے بہانے گدی سے کھینچی جاتی ہے۔ جنہوں نے آزادی کے لئے اولین قربانی دی۔ جب ہندوستان کے وفادار سپوت چلمنوں کی آڑ سے صرف تماشہ دیکھتے تھے وفاداری میں مشتبہ مسلمانوں کے اسلاف آزادی کا جھنڈا لے کر میدان میں کودے اور پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے تو لوگ چلمنوں سے نکلے آواز میں آواز ملا کر نعرہ لگانے لگے آزادی مل گئی تو نعرہ لگا کر جان بچا کر لے جانے والوں نے تمغے لگائے، انعام پائے اور جان کی بازی لگا دینے والے پاکستانی کہلائے۔ بہار شریف کے ایک بوڑھے طنز نگار شاعر گرد بہاری نے کہا۔

زندگی اپنی بسر ہوتی رہی جھنڈے تلے　　سانس ہم لیتے تھے استبداد کے ڈنڈے تلے
اور جب آزادی ملی انعام کے دن آ گئے　　کھائیں سب انڈے تلے اور ہم ہیں تلہنڈے تلے

جی ہاں تو ۱۹۴۲ء میں بی۔ اِن کالج کے مکان سے اور کبھی سڑک پر اتر کر میں دیکھا کرتا کہ بی۔ ان کالج میں پڑھنے والے ہندو مسلمان لڑکے کالج سے نکل کر فٹ پاتھ پر اور سڑک پر ہاتھ سے ہاتھ ملائے آواز میں آواز ملاتے "انقلاب زندہ باد" اور "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ لگاتے۔ پیر بہوڑ تھانے میں ایک داروغہ جی تھے۔ اس وقت کے داروغہ جی۔ آج کے اس پی صاحب سے زیادہ داب اور آداب والے ہوتے تھے۔ عمومی طور پر ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا لئے۔ وردی پر چمڑے کی پیٹی اور پیٹی میں پستول، سر پر خاکی ہیٹ، ہاف پینٹ خاکی موزہ اور براؤن چمکتا ہوا شو پہنے سڑک پر گذرتے تو ہوا تھم جاتی اور آواز دھیمی ہو جاتی۔ شور اور ہنگامے سرد پڑ جاتے۔ لیکن وہ بی۔ ان کالج کے سامنے اپنی پولس فورس لئے لڑکوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو ڈنڈا دکھا دکھا کر تیور بدل بدل کر

www.taemeernews.com

پیشانی پر شکن ڈال ڈال کر زور زور سے سانس لے کر ڈانٹ رہے تھے اور ایک مسلمان لڑکا جس کا نام شاید عبدالقدوس تھا اُن کے کھنچے ہوئے ڈنڈے کے عین مقابل اُن کے منہ سے بالکل اپنا منہ سٹائے اسی طرح زور زور سے سانس لے کر کہہ رہا تھا۔ "ڈنڈا پھینک دو"، "وردی اُتار دو" "نوکری چھوڑ دو"۔ "ہندوستان ہمارا ہے"۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

داروغہ جی کا ڈنڈا جھک گیا۔ پیشانی کی شکن سٹ گئی۔ تیور کا بل نکل گیا، سانس دھیمی ہوگئی۔ وہاں سے وہ ہٹ گئے۔ اُس دن سے آج تک مجھے یاد نہیں کہ میں نے ان کو پھر کبھی دیکھا۔ میں انھیں جانتا تھا۔ اُن کا نام محمد انوار تھا۔ شاید انہوں نے واقعی ڈنڈا پھینک دیا۔ وردی اُتار دی اور انگریزوں کی نوکری چھوڑ کر خدا کی نوکری کر لی اور اس نعرے پر عمل کیا کہ 'مسلم ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا'۔

اسی نوعیت کا دوسرا واقعہ بھی سنئے۔ اُنہیں دنوں جب پٹنہ اور پورے ہندستان میں Quit India تحریک چل رہی تھی یا چلی تھی۔ لوگ گرفتار کر لئے گئے تھے۔ احمد نگر قلعہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ جیل کا کھانا کھا رہے تھے۔ ہندستان کے مستقبل کے متعلق سوچ رہے منصوبے بنا رہے تھے۔ مولانا آزاد "غبار خاطر" میں اپنے دل کا شاعرانہ غبار منتقل کر رہے تھے۔ اور ہندستان میں مختلف مقامات پر ریل کے لائن توڑے جا رہے تھے۔ سگنل اُکھاڑے جا رہے تھے۔ انگریزوں کو پکڑا پیٹا جا رہا تھا اور ہندستانیوں پر فائرنگ ہو رہی تھی لاٹھیاں برسائی جا رہی تھیں میرے مکان کے ٹھیک سامنے بی۔ اِن کالج ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں کناڈین فوج کی ایک رجمنٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ اور بی۔ اِن کالج کی چہار دیواری سے متصل میرے سامنے جنوبی فٹ پاتھ پر ایک بوڑھا مجذوب مسلمان فقیر بیٹھا رہتا۔ تمام بدن ننگا کبھی کبھی کندھے پر کوئی میلا گمچھا اور کمر میں ایک لشٹی یا لنگوٹی کہئے۔ نہ کرتہ نہ گنجی نہ چادر۔ نہ جانے کتنے برسوں بی۔ اِن کالج کا فٹ پاتھ اس کا فرش مخملیں: چہار دیواری اس کی مسند آسمان اُس کا شامیانہ ہوائیں اُس کی رفیق، دھوپ اُس کی ہم نشین سردی گرمی برسات اس کی اٹل مہالی ساتھی اور سنگھاتی رہی۔ ایک مٹی کا آبخورہ اس کا جام جمشید

www.taemeernews.com

اُسی میں کبھی دال بھات کبھی ہوتا روٹی بھی گلاب جامن بھی اور رس گُلے بھی۔ کبھی اُس کو ٹھلانے والا نظر آتا کبھی نظر نہیں آتا۔ میرے اندازہ کے مطابق شاید وہ آٹھ دس سال وہاں پر رہا۔ ۱۹۵۰ء یا اس کے بعد کہیں غائب ہوگیا۔ لوگ آتے اُس کے سامنے بیٹھتے اُس کے مٹی کے چُلّے میں کھانے کی چیزیں دیتے۔ جب وہ کھالیتا تو کوئی اس میں پانی ڈال دیتا وہ پی لیتا۔ اُس کی بولی نہیں تھی۔ باتیں نہیں تھیں کسی سے مخاطبت نہیں ہوتا۔ لوگ بھی اس کے پاس چُپ بیٹھتے رہتے وہ بھی چُپ بیٹھا رہتا۔ نہ کسی کی طرف دیکھتا نہ کسی کو کچھ کہتا۔ کھانے کے سلسلے ہی میں کبھی کبھی اُس کی آواز سنائی دیتی۔ جب ضرورت سے زیادہ چیزیں اس کے آب خورے میں ڈالی جاتیں تو وہ صرف "اُوں اُوں" "ہوں ہوں" یا اسی قسم کی ملتی جلتی آواز نکالتا۔ ہاتھ سے ٹال دیتا یا چُمکا اٹھا کر پھینک دیتا۔ اپنے پہچانے ہوئے لوگوں میں اختر حسین صاحب باڑھ کو میں نے دو ایک بار دیکھا۔ وہ باڑھ کے رئیس تھے۔ بہت وضع دار، میانہ قد، شیروانی علی گڈھ پاجامہ سیاہ شو سیاہ ٹوپی، گداز بدن بڑی سنجیدہ چال سے راستہ چلتے۔ اُنھیں دو ایک بار دیکھا احترام سے اس بڈھے گونگے فقیر کے پاس جاتے وہیں زمین پر اکڑوں مع شیروانی اس کے سامنے بیٹھ جاتے کبھی شاید کچھ کھانے کی چیزیں بھی اس کے برتن میں ڈالیں۔ کچھ دیر بغیر کچھ کہے بولے مخاطب ہوتے۔ بیٹھتے پھر اُٹھ کر چلے جاتے۔ اِسی طرح کئی لوگوں کے متعلق اُسی دور میں بات سننے میں آئی۔ مثلاً کسی کا بیٹا ہائی کورٹ سے پھانسی کی سزا پا چکا تھا یا پا لینے والا تھا۔ اُس کی ادھیڑ ماں کئی بار اس کے سامنے آئی بیٹھی کھلایا پلایا کچھ کہے سنے بغیر چلی جاتی، پھر سُنا کہ اس کا بیٹا رہائی پا گیا۔

تو ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران امن وامان قائم کرنے اور ہندستانیوں کو ڈرانے خوف زدہ کرنے، سزا دینے گرفتار کرنے کو جو فوجیں آئیں اس میں کناڈین رجمنٹ بی۔ اِن کالج ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں قیام پذیر ہوگئی۔ میں کبھی ہوسٹل کی طرف تو نہیں گیا اس لئے کہ ممنوع علاقہ تھا اور کوئی غیر فوجی اس راستے سے نہیں گذر سکتا تھا۔ ہوسٹل کالج خالی تھے۔ بڑی بڑی بھاری بھاری ملیٹری ٹرکیں ہوسٹل سے فوجیوں کو لے کر نکلتیں، اِدھر اُدھر ڈیوٹی پر جاتیں، واپس آتیں۔ جیپیں، موٹر سائیکلیں، ملیٹری کاریں راؤنڈ لگاتی رہتیں۔ کبھی کبھی کوئی کناڈین افیسر پیدل گذرتا فوجی اٹینشن

www.taemeernews.com

میں آکر اسے سیلوٹ کرتے اور بڑے سے بڑے کرنل کو بھی دیکھا کہ گذرتے یا چلتے ہوئے بہت قاعدے سے اسی اٹینشن کے ساتھ معمولی فوجیوں کے سیلوٹ کا جواب سیلوٹ سے دیتے۔ بی اِن کالج اور ہوسٹل کے درمیان جو راستہ اشوک راج پتھ اور انٹا گھاٹ کو ملاتا ہے اُس کے دونوں شمالی اور جنوبی سروں پر دو دو تین تین کناڈین فوجی اِسٹن گن' برین گن اور مشین گن سے آراستہ کھڑے رہتے وہ گویا ملیٹری کیمپ کا دروازہ تھا۔ جس کے قریب سے کوئی گذر نہیں سکتا۔ گذرنے والے میری طرف کے فٹ پاتھ سے گذرتے۔ آگے لان کی مسجد کے قریب بھی بانس اور لکڑیوں سے سڑک گھیر دی گئی تھی رات کو جس کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ اُس گھیراؤ سے بغیر پاس یا کسی قسم کی شناخت کے کوئی گذر نہیں سکتا تھا۔ گاندھی ٹوپی سروں سے غائب ہو گئی تھی۔ کھدر کا لباس غائب ہو چکا تھا۔ بہت دنوں تک کہیں راستے میں کھدر کا کرتہ اور گاندھی ٹوپی نظر نہیں آتی۔ لوگ انڈر گراؤنڈ جا چکے تھے۔ یا یونیفارم بدل کر عام شہریوں کا لباس اختیار کر چکے تھے۔ عام طور سے کناڈین فوجی ملنسار اور ہنس مکھ تھے۔ کچھ فوجی ٹہلتے ہوئے میری طرف فٹ پاتھ پر بھی چلے آتے۔ میں باہر کھڑا رہتا۔ اپنے ادھی مل کے کرتے، خالتہ پاجامہ اور سیاہ مخملی ٹوپی میں ہوتا تو وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے۔ دو ایک میرے بہت قریب آئے تو تجسس میں، میں نے کبھی کبھی ان کے مشین گن پر کچھ محسوس کرنے کے لئے اپنی ایک انگلی رکھی تو وہ میرے ہاتھ میں مشین گن دیتے۔ Like it? سوال کرتے۔ میں مسکرا کر کہتا۔ yes تو وہ کہتے Look for yourself اور میں ہاتھ میں انہیں لیتا تو چھوٹی سی گن بھی کافی وزنی نظر آتی۔ مجھے ان کناڈین سپاہیوں میں انفرادی طور پر کسی وقت کوئی بات ایسی نظر نہیں آئی۔ جو میرے دل میں نفرت یا حقارت کا جذبہ پیدا کر دیتی۔ وہ ہندستانی پولس یا پولس افیسر کی طرح نہ ڈینگ کرتے تھے نہ رعب جماتے تھے نہ کسی کو دق کرتے تھے نہ اعتدال کے اندر کوئی مزاحمت کرتے تھے۔ بلکہ میرے دل میں ان کی کچھ عزت ہی آئی احترام ہی آیا جب میں نے اس دور میں یہ سنا کہ فتوحہ اسٹیشن پر گاڑی روک کر دو تین کناڈین افسروں کو فرسٹ کلاس سے ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر انہیں یوں قتل کیا کہ اُن کے پیٹ میں بھالے مارے جاتے تھے وہ ہاتھ سے بھالا پکڑ کر خود ہی پیٹ سے نکالتے کھڑے رہتے سگریٹ پیتے رہتے اور پھر بھالا مارا جاتا۔ اسی طرح

www.taemeernews.com

وہ گرے اور پلیٹ فارم ہی پر مر گئے۔ لیکن کبھی کبھی کسی ایک فرد کا عمل بڑے بڑے نتائج پیدا کر دیتا ہے خواہ اچھا عمل ہو یا بُرا۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص کے نماز نہ پڑھنے کی نحوست چاروں طرف چالیس چالیس گھروں تک جاتی ہے۔ تو ہم اس بڈھے مجذوب مسلمان فقیر کا واقعہ اس پس منظر میں کہنا چاہ رہے ہیں۔ ہندستان اور ہمارا پٹنہ شہر ایک انقلاب سے دوچار ہوا۔ ہوسٹل میں کناڈین فوج مقیم ہو گئی۔ ہوسٹل کا راستہ اور ہوسٹل کا کمپاؤنڈ بھاری گاڑیوں کی آمد و رفت سے ناہموار ہو گیا' گڈھے پڑ گئے۔ برسات آتی رہی اور دلدل ہو گئے۔ لوگوں کی آمد و رفت تکلف اور اہتمام میں تبدیل ہو گئی۔ راستہ چلنے والے کم ہو گئے۔ بی۔ این کالج کا حلقہ مع سڑک فٹ پاتھ پر میدان جنگ کا نقشہ نظر آنے لگا۔ ہر طرف بندوق' رائفل' مشین گن' وردیاں' سیٹیاں پریڈ سیلوٹ بھاگ بھگیڑ۔ لیکن اس پس منظر میں وہ بڈھا مجذوب مسلمان فقیر اپنی میلی لنگوٹی اور آب خورے کے ساتھ کبھی بی۔ این کالج کی چہار دیواری پر ٹیک لگائے بیٹھا ہے کبھی فٹ پاتھ پر نیم برہنہ پڑا ہے کبھی کھڑا ہے۔ دھوپ آ رہی ہے بارش آ رہی ہے لوگ چھُپ رہے ہیں' پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں فوجیں برساتی پہنے آ رہی ہیں جا رہی ہیں لیکن اس مجذوب کی دنیا میں کوئی ہلچل نہیں کوئی جوار بھاٹا نہیں۔ نہ فوجیوں کو اس سے تعرض نہ فوجیوں سے اس کو اعتنا۔ اس کا گھر وہی' خلوت وہی' محفل وہی نہ اُسے کہیں جانا نہ سائے کی تلاش نہ جائے پناہ کی جستجو نہ دھوپ اُسے ستاتی نہ بارش گھبراتی۔ وہ کس وقت اور کہاں اپنی ضرورتوں سے فارغ ہوتے جاتا ہے۔ اس کا استنجا خانہ کہاں ہے بیت الخلا کہاں۔ نہ میں نے دیکھا نہ میں نے کسی سے سُنا۔

کناڈین پہرے داروں میں سب ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ ڈیوٹی فرماں بردار حکم کے پابند ـــــ ایک دن ایک نیا کناڈین پہرے پر آیا۔ بہت کوتاہ قد مگر بڑا چُست اور گٹھیلا بدن۔ چہرہ معلوم ہو جیسے پتھر کا بنا ہوا۔ نہ غم نہ خوشی نہ اُمید نہ مایوسی' چہرہ درد سے خالی آنکھیں مروت سے ناآشنا' لبوں سے درشتی اور تیور سے سختی ٹپکتی۔ وہ بڑی سختی سے آنے جانے والوں کی روک تھام کرتا۔ وہ بڈھا بیٹھا بیٹھا اٹھا۔ اُٹھ کر دو چار قدم چلا۔

www.taemeernews.com

پھر بیٹھا، پھر اُٹھا اور اُٹھ کر گلی کے نکڑ پر آیا۔ جہاں دو اور کناڈین فوجیوں کے ساتھ وہی کوتاہ قد اور درشت چہرہ کناڈین فوجی پہرے پر تھا۔ بڈھے فقیر نے نکڑ پر آکر گلی کے اندر کی طرف بڑھنے کی نیت سے اپنا منہ مغرب سے جنوب کی طرف موڑا اور بی ان کالج اور ہوسٹل کے درمیان والے راستے جس پر تینوں کناڈین فوجی پہرے پر تھے، چلا۔ دو فوجیوں نے اُسے دیکھا مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ تیسرے کوتاہ قامت، سنگین چہرے، بے مروت آنکھوں والے فوجی نے نفرت اور حقارت سے ایسا طمانچہ اس بوڑھے فقیر کو مارا کہ وہ بے تحاشہ بائیں کروٹ گر گیا۔ کوئی پانچ منٹ وہ بے حس و حرکت پڑا رہا کوئی آواز نہیں کوئی آہ نہیں کراہ نہیں چہرے پر شکن نہیں کوئی اضطراب کسی اندرونی تکلیف کی شدت کے آثار نہیں ایسا معلوم ہوا جیسے بائیں کروٹ سو رہا ہے۔ چند منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ اُٹھا تو اس کا بایاں بازو ٹوٹ کر بغل میں لٹک رہا تھا۔

اور کچھ ہی دیر بعد ہوسٹل کے اندر سے بگل کی آوازیں گونجنے لگیں اور پھر گاڑیاں سڑکیں جیپیں، موٹر سائیکلیں، کاریں ہوسٹل کمپاؤنڈ سے نکلنے لگیں، روانہ ہونے لگیں۔ شام ہوتے ہوتے کیمپ لوٹ گیا۔ رجمنٹ روانہ ہوگئی ہوسٹل خالی ہوگیا سڑک پر گھیرے ہوئے بانس ہٹا دیے گئے۔ ٹرافک آزادی سے جاری ہوگئی۔ لوگ بے تکلف راستے پر فٹ پاتھ پر آنے جانے لگے۔ اور کہیں کہیں گاندھی ٹوپی اور کھدر کا کرتہ بھی نظر آنے لگا۔ اس فقیر کا ایک بازو گیا۔ اور پورے شہر کے دونوں بازو کھل گئے۔

پھونک کر ہم نے آشیانے کو روشنی بخش دی زمانے کو

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک جوان سپہ سالار کو ایک دوسرا جوان گھور رہا تھا۔ اس کے دل میں کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کیا کہ مجھے اس شخص سے ڈر معلوم ہو رہا ہے مجھے کسی بہت دور مقام پر پہنچوا دیجئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک جن کو اشارا کیا جس نے چشم زدن میں اُسے شاید ہندوستان پہونچا دیا۔ گھورنے والا شخص حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں ملک الموت ہوں مجھے اس سپہ سالار کی روح ہندوستان میں قبض کرنے کا حکم ہوا ہے وہ کہاں گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام

www.taemeernews.com

نے فرمایا "وہ ہندستان پہونچ گیا"۔ ملک الموت پہونچے روح قبض کرلی۔

اللہ نے فیصلہ کیا تھا کہ پٹنہ کے ایک مجذوب فقیر کا بازو ایک کوتاہ قامت کناڈین توڑے گا۔ اس کے لئے اہتمام دیکھئے۔ ایک بازو توڑنے کے لئے اللہ نے کتنا بڑا کارخانہ چلایا۔ بازو ٹوٹا اور کارخانہ بند۔ رجمنٹ روانہ اور ہوسٹل خالی۔ پھر کلاسز جاری ہوگئے پڑھائیاں چلنے لگیں۔ وقت گذرنے لگا۔ ۱۹۴۵ء کے تمام قیدی رہا کردیئے گئے۔ پٹنہ گاندھی میدان میں بڑا جلسہ ہوا۔ پنڈت نہرو آئے۔ بار بار رومال سے ناک صاف کرتے تھے۔ اور ٹھہر ٹھہر کر رُک رُک کر رئیسانہ انداز سے بولتے تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ نواب نصیر حسین خاں خیال اپنی شیروانی اور چست پاجامے میں داستان اردو بیان کررہے ہیں۔ جنگ ختم ہونے پر آئی۔ برما میں سبھاش چندر بوس کی نیشنل آرمی کو شکست ہوئی۔ سبھاش بوس بابو نے خودکشی کرلی۔ ان کے ساتھی گرفتار ہوئے۔ قیدیوں پر لال قلعہ میں مقدمہ چلنے لگا۔ ہندوستان کی طرف سے قیدیوں کی حمایت اور اُن کی مدافعت کرنے والے وکیلوں کے گروہ کی صدارت پنڈت جواہر لعل نہرو کررہے تھے اور ہونے والے پاکستان کی طرف سے قیدیوں کی طرفداری اور قانونی پیروی کرنے والے بیرسٹروں کے حلقے کی امامت قاضی عیسیٰ۔ پھر جنگ ختم ہوئی۔ ہندستان کو آزادی مل گئی۔ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا اور وہ بڈھا مجذوب مسلمان فقیر اپنے لٹکے ہوئے ٹوٹے بائیں بازو کے ساتھ بی۔ ان کالج کی چہار دیواری سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اٹھتا رہا، ٹہلتا رہا، سوتا رہا۔ لوگ آتے رہے۔ اس کے سامنے ادب سے اکڑوں یا دوزانو اسی اکھڑے ناہموار فٹ پاتھ پر بیٹھتے رہے۔ کوئی رس گلا کھلاتا رہا۔ کوئی کچوری کوئی دال بھات۔ اور وہ اوں اوں ہوں ہوں کے سوا نہ کبھی کچھ بولا نہ کسی کی طرف دیکھا، نہ کوئی تقریر نہ کوئی بیان نہ جلسہ نہ جلوس نہ تالیاں نہ نعرے نہ ہلٹنگ نہ مباحثہ نہ فیصلہ نہ فائل نہ اعلان۔ جب سب کچھ ہوگیا، تاریخ بدل گئی۔ سیلاب رُک گیا طوفان تھم گیا، آنسو خشک ہونے لگے، آہیں کراہیں بیقراری اور اضطراب والے صبر کرچکے اپنی اپنی قسمت پر شاکر ہوکر بیٹھ رہے تو خدا جانے کدھر ہوگیا کہاں چلا گیا۔ کوئی کریملن میں بیٹھا ہے کوئی وھائٹ ہاؤس میں کوئی ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں اور کوئی بی۔ ان کالج کے فٹ پاتھ پر سب اپنا اپنا کام انجام

www.taemeernews.com

دے رہے ہیں۔ کریملن والے وہائٹ ہاؤس والے ڈاؤننگ اسٹریٹ والے کو سب جانتے ہیں
سب مانتے ہیں بی۔ اِن کالج کے فٹ پاتھ والے کو کوئی جانتا ہے؟

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

---

www.taemeernews.com

میں یہ اکثر سوچتا ہوں کہ میری دنیا کتنی محدود رہی اور میرا دائرۂ عمل کتنا تنگ رہا۔ آرزوؤں کا بحران، تمناؤں کی طغیانی، خواہشوں، ارمانوں کا سیلاب میری زندگی میں شاید کبھی نہیں آیا۔ میں نے اپنی منزل کبھی نہیں بنائی، اپنا راستہ کبھی طے نہ کیا، مستقبل کی اسکیم کبھی نہیں بنائی۔ حیات کو کس ترکیب سے کس منصوبے سے کہاں پہونچانا ہے میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ مجھے کیا ہونا ہے۔ مجھے آئندہ کیا کرنا ہے۔ میری تعلیم کیا ہوگی۔ میرا مکان کیسا ہوگا۔ میں شادی کہاں کروں گا یعنی کس لڑکی سے کروں گا۔ تجارت کروں گا، ریاست کروں گا، ملازمت کروں گا، وکالت کروں گا۔ کیسی زندگی بسر کروں گا۔ آرام سے رہنے کی خواہش تو فطری بات ہے۔ مگر آرام کیسے ملے گا، کیسے مل سکتا ہے کن کن ذرائع سے مل سکتا ہے۔ اس کے لئے کیا کیا کرنا ہے، کیا کیا کرنا چاہئے۔ مجھے خیال ہی نہیں آتا کہ شب و روز کے کسی دور میں اس طرح کے خیال کی کوئی رَو میرے ذہن میں ہلکی یا وزنی کبھی گذری ہو۔ مجھے حیرت ہوتی ہے آج نوجوانوں سے باتیں کر کے۔ لڑکوں سے طالب علموں سے گفتگو کر کے۔ کوئی ایسا نوجوان نہیں ہے جس نے اپنی زندگی کے مراحل اور منازل کے متعلق کوئی نقشہ اپنے ذہن میں طے نہ کر رکھا ہو اور اس طے شدہ نقشے کے اعتبار سے اپنی محنت اور عمل پر شدت سے گام زن نہ ہو گیا ہو۔ آج مستقبل کے متعلق چند ہی چوکھٹے ہیں جس میں سے کوئی نہ کوئی خانہ ہر شخص نے طے کر رکھا ہے۔ کوئی طے کر چکا ہے مجھے ڈاکٹر بننا ہے، کسی نے انجینئر بننا، کسی نے سرکاری افسر بننا، پروفیسر بننا اور یہ سب کچھ نہ بننے کی صورت میں لیڈر بننا۔ بس ان چند خانوں کے علاوے اس شطرنج زندگی کی بساط پہ

www.taemeernews.com

کوئی خانہ نظر نہیں آتا۔ اس وسیع عریض طویل اور دور دراز دنیا میں کتنا محدود تصور زندگی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ بس چند تصویریتاں چند حسینوں کے خطوط۔ بس انہیں چند کلیوں پر قناعت کر کے انسان زندگی کی وسیع الدامانی کو کتنا رسوا اور ذلیل کر رہا ہے۔ چند لذتیں اور چند آسائشیں بس اس کی زندگی محور اور مرکز ہیں۔ اور یہ محور اور یہ مرکز حاصل کر کے انسان کن تکلیفوں اور کس کرب میں۔ کس بے اطمینانی کس الجھاؤ اور کس ناآسودگی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ چارلی چپلن کی مشہور فلم دی گریٹ ڈکٹیٹر (آمر اعظم) میں ہٹلر کی زندگی کا کس قدر دردناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ نہ اُسے چین سے کھانا، چین سے سونا، چین سے بیٹھنا چین سے باتیں کرنا۔ حتیٰ یہ کہ چین سے خیو کرنا بھی میسر نہیں آتا۔ آج بھی بشر اپنی اونچی کمائیوں، شاندار رہائشوں، وسیع مکانوں بیشمار وسائل و ذرائع پر قابو اور دسترس حاصل ہونے کے بعد زندگی کی بنیادی لذتوں، بشاشتوں، آسودگیوں اور فراخی اور کشادہ دلی سے کتنا محروم ہے اس کے لئے زیادہ غور و فکر نہیں بس نگاہ بینا کے ساتھ سرسری جائزہ لے لینا ہی کافی ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا میں نے زندگی کے کسی موڑ پر کسی، نوجوانی، جوانی اور اب بڑھاپے کے دور میں نہ کبھی زندگی کا منصوبہ بنایا نہ میں نے ایسا منصوبہ بناتے ہوئے اپنی کسی کے دور میں کسی کو دیکھا۔ بڑا گھر، بھرا پُرا گھر۔ بچے بچیاں، لڑکے جوان بوڑھے، ایک ایک گھر میں ایک ایک قافلہ نظر آتا تھا۔ لیکن یہ نظر نہ آتا تھا کہ یہ قافلہ اپنے اپنے متعلق سوچ رہا ہے؟ اُن بھرے پُرے گھروں میں نہ رہائش اور آسائش کا کوئی مسئلہ تھا نہ روزی روٹی کا نہ شادی بیاہ کا نہ بیماری دکھی کا نہ کوٹ کا نہ پیشی کا نہ مقدمہ نہ رشک رقابت کا نہ دوستی دشمنی کا نہ مقابلہ اور مجادلہ کا۔ حالانکہ ہوتا تھا سب کچھ، شادی بیاہ بھی اور بیماری دکھی بھی، کورٹ بھی مقدمہ بھی، رشک و رقابت بھی دوستی دشمنی، لڑائی اور فوجداری بھی۔ مولوی عابد حسین صاحب کے گھر سے اور اطہر نانا وغیرہ کے گھر سے کسی بات پر لڑائی ہوئی۔ فوجداری ہوئی، گنڈاسا اور بھالا بھی چلا۔ مجھے یاد ہے اطہر نانا یکنگر سرائے اسپتال سے واپس آئے۔ سر پر، ناک پر ٹھوڑی پر بنڈج لگا ہوا تھا۔ کئی دن اسپتال میں رہے تھے۔ لیکن پھر پتہ بھی نہ چلا کہ دونوں

www.taemeernews.com

گھروں میں دشمنی، جنگ مار پیٹ اور سر پھٹول بھی ہوئی تھی۔ پتہ بھی کسی کو نہیں چلتا تھا کہ لڑکی کا رشتہ کب طے ہوا کس سے طے ہوا۔ بارات آئی، ہاتھی گھوڑا بھی آیا۔ ڈھول باجا بھی آیا۔ کبھی کبھی ناچ رنگ بھی آیا۔ شام کو برات آئی۔ شربت چلا پھر ناشتہ چلا۔ پھر رات گئے کھانا ہوا۔ دوسرے دن برات مرجات رہی پھر صبح دودھ مالیدہ۔ دوپہر پلاؤ گوشت اور تیسری صبح چوکھا اور دودھ مالیدہ کھانے کے بعد رخصتی ہوئی۔ اور رخصتی سے پہلے میانہ اور پالکی کے ایک طرف بارات والے دوسری طرف بارات والے۔ پہلے شائستہ مذاق بذلہ سنجی حاضر جوابی۔ پھر کھلا مذاق پھر پھکڑ اور کبھی کبھی ماں کی دھکی کے بعد ہنسی اور آنسوؤں اور ہچکیوں کے ساتھ دلہن کی رخصتی۔ وہ ہوتا تھا جواب کبھی اور کہیں نہیں ہوتا۔ میں گھر میں بیمار ہوا شاید آٹھ سال کی عمر تھی۔ حکیم انیس صاحب تشریف لائے۔ موضع بیتن بہار شریف کے قریب ایک بستی کے رہنے والے۔ تیلہاڑہ آتے دو دو چار چار چھ چھ ماہ رہ جاتے۔ خدا جانے کیا سلسلہ تھا۔ دوستی، محبت، تعلق، دلبستگی، ہم آہنگی، کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ ایسا تو نہ تھا کہ اتنی چھوٹی بستی میں وہ پیشۂ طبابت کے لئے مقیم ہوں۔ مقصود پیشہ ہوتا تو ایسی وضع داری وہاں کی مختصر کمائی سے کیا نبھ سکتی تھی۔ اچھی خاصی وضع دار شیروانی۔ پاجامہ کبھی چست کبھی خالتہ۔ انگریزی بوٹ، ترکی ٹوپی، ہاتھ میں پان کا ڈبہ، چاندی کے خلالوں کا گچھا سیاہ دھاگے سے بندھا ہوا شیروانی کی جیب میں، دوسری جیب میں گھڑی۔ بستی کے حکیم بھی۔ اور بستی کے لوگوں کے مشیر بھی، میر مجلس بھی اور امام مسجد بھی، پنچایت کے مکھیا بھی۔ تقریبات کے مہتمم اور منتظم بھی، باورچی خانہ کے انچارج بھی۔ اور مہتمم اور منتظم اور انچارج ایسے کہ مجال نہیں کوئی خواہ صاحبِ خانہ ہی کیوں نہ ہو، صاحب تقریب ہی کیوں نہ ہو۔ اُن کے نظم و نسق ترتیب میں دخل دے سکے۔ جب قلمدانِ نظم اُن کے سپرد کر دیا گیا تو سیاہ و سفید سب کچھ حکیم صاحب کے ہاتھ میں۔ یہاں تک کہ تقریب میں کھانا کیا کیا پکے گا۔ کس وقت کھلایا جائے گا۔ دسترخوان پر سامان کیسے کیسے رکھا جائے۔ یہ سب محکمے اور تدبیریں اور نقشے اور تفصیلات حکیم صاحب کے اختیار میں۔ میلاد کی مجلس میں مولودِ شہیدی اس انداز سے پڑھتے کہ چھا جاتے۔ بے ساختہ اور

www.taemeernews.com

بے جھینپ گفتگو کرتے۔ حاضر جواب، بذلہ سنج سنجیدہ اور پر وقار۔ تو ہاں مجھے بخار آیا۔ دو تین روز یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔ کھانا بند۔ دودھ اور صاگودانہ۔ تیسرے روز بخار نہ اترا تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ صرف نبض دیکھی۔ ہاں جی میعادی بخار ہے۔ پندرہ دن میں اُترے گا یا ممکن ہے بائیس دن لے لے۔ دوا پلاؤ اور دودھ کھلاؤ اور سب کچھ بند۔ نسخہ لکھا۔ نسخہ کیسا۔ جیب سے میلے کچیلے پرانے قسم کے زردی مائل کاغذ کے کچھ ٹکڑے نکالے سَری کا قلم اور دوات منگوا کر نسخہ لکھا۔

(۱) گلِ بنفشہ، گل گاؤزبان۔ بادیانِ خشک، مکوہ خشک۔ خبّی، عناب، ملھٹی، خشخاش، سائیدہ جوشاندہ شکر آمیختہ سہ بار صبح شام شب بنوشند۔

دیگر: پوست املتاس برگ سنا (اور اجزا یاد نہیں ہیں۔)
درآب انداختہ، خشک کردہ، سفوف ساختہ شہد آمیختہ حبِ بمقدار نخود ساختہ شب بعد طعام یک عدد ہمراہ آب تازہ بخورند۔

بنئے کے یہاں سے دوائیں آئیں۔ شام تک تیار ہو گئیں اور بھر بھر پیالہ یہ کاڑھا پلایا جانے لگا۔ میں ناک بند کر لیتا اور جلدی جلدی چند گھونٹ میں پی کر پان کی گلوری کھا لیتا۔ اور بھر بھر ڈبو گائے کا خالص دودھ اور اگر بخار تیز ہے تو اس میں نصف پانی ملا کر یا اور زیادہ بخار ہے تو دودھ کو لیمن کے چند قطروں سے پھاڑ کر اس کا چھینا الگ کر کے شکر ملا کر دودھ کا پانی پیا جاتا۔ گھر میں سب لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہیں کوئی خاص انتشار نہیں، بے چینی نہیں جانتے ہیں دو ہفتہ نہیں تین ہفتہ میں بخار اُتر ہی جائے گا اور پھر صحت یابی کے پہلے دن پرانے باسمتی چاول کا گیلا بھات، اور لیمن کا اچار یہ پہلی غذا تین چار ہفتہ پر کس گرسنگی کس طلب کس لذت سے کھائی جاتی شاید کم لوگوں کو معلوم ہو۔ اور روزانہ شام ہوتے ہوتے محلے کی چچیوں، خالاؤں، پھوپھیوں اور بہنوں کی آمد شروع ہو جاتی۔ جانو بوبو، حاجو بوبو، ہانو خالہ، بالو خالہ کوئی پلنگ پر کوئی مونڈھے پر کوئی کرسی پر کوئی اغل کوئی بغل اور میعادی بخار میں مبتلا کلیم سے کلو، تلو سے کالو سے

www.taemeernews.com

چھیڑ چھاڑ بات چیت، ہنسی مذاق شروع ہو جاتا۔ عشار کا وقت ہو جاتا ایک ایک کر کے رخصت ہوتیں۔ کوئی کان اینٹھتی کوئی گال میں چٹکی لیتی۔ میں بچپن میں تندرست اور اچھا خاصا قبول صورت تھا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا حسین تھا۔ مگر بات کچھ اس کے قریب قریب ہی تھی۔ میں ہمیشہ ہر جگہ منظور نگاہ اور مطلوب نظر آتا۔ گھر بھی باہر بھی دیہات میں بھی اور شہر میں بھی۔ کلکتہ میں بھی اور پٹنہ میں بھی۔ خیر اس موضوع کو آگے نہیں بڑھاؤں گا اب اس کا دور نہیں، زمانہ نہیں اور یہ موضوع مجھے اب پسند بھی نہیں۔ ابھی چار سال پہلے میں پٹنہ کالج میں پڑھا رہا تھا۔ میری شاگرد اور میری شریک کار ڈاکٹر ثریا جبیں ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے آگئیں جو میں نے اپنے کسی شاگردہ کو اس کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کے سلسلہ میں مطالعہ کے لئے دی تھی۔ یہ ایک گلدستہ تھا۔ پٹنہ کی مجلس ادب کی روداد جس میں شاعروں اور ممبروں کی تصویریں ان کی مختصر سوانح اور انتخاب کلام اور بحیثیت سکریٹری میری تصویر بھی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں لکھی گئی تھی اور میری پہلی باضابطہ تصنیف تھی۔ تو ڈاکٹر ثریا جبیں کتاب ہاتھ میں لئے آئیں۔

"سر! یہ آپ کی تصویر ہے؟ اوہ سر! کتنی اچھی تصویر ہے اوہ آپ اتنے اچھے تھے سر!"

میں نے کہا "ہاں بھئی۔ اب بی جمورن کھاک ہو گئی ہیں۔ پہلے ایسی تھیں"۔

تو بیماری کے دوران میری خالائیں، پھوپھیاں، بہنیں پیار بھی کرتیں اور باتیں کرنے میں لطف بھی لیتیں اور میں میعادی بخار میں مبتلا ایک ایک ماہ ذی فراش رہ کر فاقہ کر کے صرف بھر بھر پیالہ دودھ کھا کر اور قے کر کر کے بھی اچھا خاصہ گپی اور باتونی تھا۔ نہ میں سمجھتا کہ میں بیمار ہوں اور نہ اور کوئی بیمار سمجھنے پر تیار تھا۔ ۲۲ دن کے بخار کے بعد بھی مجھے اٹھانے بٹھانے میں کوئی سہارا دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میرے کمرے سے بیت الخلا کئی کمروں کے بعد سائبان سے گذر کر ایک کونے میں تھا۔ ضرورت کے وقت میں رات کو خود ہی اٹھتا۔ گرچہ امی جان قریب ہی پلنگ پر سوئی رہتیں۔ میں انہیں بیدار نہ کرتا۔ دیوار سے لگے لگے جاتا اور اطمینان سے فارغ ہو کر آتا۔

www.taemeernews.com

میری شادی سے پہلے گھر میں صرف دو بہنوں کی شادی ہوئی ۔ابا تو گھر کے معاملات اور مسائل سے گویا بے نیاز ہی رہتے تھے ۔گھر میں اللہ کے بعد سب کچھ اماں ہی تھیں ۔بڑی بہن محمودہ باجی کی منسوب کب لگی کیسے لگی شاید نانا جان کو بھی پتہ نہ تھا ۔اور یقیناً پتہ نہ تھا۔ شادی ہوئی برات آئی شاہو بیگہ' حافظ فضل حق آزاد کے قبیلے اور گاؤں کے بڑے بڑے جغادری' رئیس اور زمیندار وضع دار صاحبان علم طرار اور فرار ۔حکیم انیس ہی صاحب تمام امور کے منتظم اور باورچی خانے کے انچارج بھی ۔ والد تو بہت لئے دئے الگ خلوت میں پڑے رہتے تھے ۔ایسی آؤ بھگت ہوئی ایسی ضیافت ہوئی ایسا نظم ہوا کہ شاہو بیگہ والے بھی دنگ رہ گئے ۔اور سب کچھ اسی گاؤں میں اُسی پانکڑ کی چھاؤں میں اُنہیں فضاؤں میں اُنہیں ہواؤں میں شامیانہ کے نیچے چوکیوں کے فرش پر اور جب محمودہ بوبو کی رخصتی ہونے لگی پالکی دروازے پر لگی تو شاہو بیگہ کے چھٹے ہوئے طرار فرار پٹنہ اور گیا کے پڑھے لکھے ایک سے ایک بذلہ سنج ایک سے ایک جملہ باز اور لطیفہ سنج ۔جنہوں نے حافظ فضل حق آزاد کے صاحب زادے عزیز الحق عزیز مرحوم کو دیکھا ہوگا ان کی دلچسپ دلفروز بامزاح گفتگو سُنی ہوگی یا پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید صاحب مرحوم صدر شعبۂ جغرافیہ پٹنہ یونیورسیٹی سے ہمکلام ہوئے ہوں گے لطفِ صحبت سے لذت اندوز ہوئے ہوں گے جانتے ہوں گے کہ شاہو بیگہ کے لوگ کیا آفت کے پرکالے ہوا کرتے تھے ۔تو شاہو بیگہ کے براتی ۔ پالکی کے قریب کھڑے ہوئے کہ میرے بہنوئی بھائی اکرام الحق مرحوم کو گھر کے اندر رخصتی کے آخری رسوم کے لئے اس وقت جانے دیں گے جب ہم سے دو دو چار چار باتیں ہو جائیں ۔بھلا تیلہاڑہ میں تو سنجیدہ لوگ زیادہ تھے ۔اُسی سنجیدگی سے جئے اور اسی سنجیدگی میں خاموشی سے شہید ہو گئے ۔اعظم نانا عینو ماموں نے تھوڑی دیر تک ہلکا پھلکا دار سنبھالا پھر خاموش ہو گئے ۔میں کیا بتاؤں پھر کیا ہوا ۔میرے ایک رشتے کے چچا تھے ۔چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں لکڑیاں کٹوا کر سپلائی کیا کرتے تھے ۔صرف اتنا پڑھے لکھے تھے کہ دستخط کر سکیں اور کچھ ضروری باتیں ٹیڑھے کبڑے حروف میں لکھ سکیں ۔عمر جنگلوں میں گذاری تیر اندازی خوب جانتے تھے ۔جانوروں سے مقابلہ

www.taemeernews.com

خوب کرتے تھے۔ اسی قسم کی کسی جنگ میں اپنا بایاں ہاتھ توڑ چکے تھے۔ وہ بالکل سیدھا ہو کر رہ گیا تھا۔ مڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ موسیٰ بنی جنگل سے آئے ہوئے تھے۔ کوئی نہ رہا تو عبدالعزیز چچا۔ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کی تلہتی یعنی ہتھیلی میں کھینی لئے اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے کھینی کو ملتے ہوئے پالکی کی دوسری طرف دروازے پر کھڑے ہو گئے اور زور سے ہنستے ہوئے کہا" کیا ہے بوُا، کیا ہے بوُا؟ ہاں بولو بوُا۔ اور اس کے بعد جو دونوں طرف سے زبانوں کی چوٹ اور الفاظ کی شپاشپ چلی ہے تو ایک طرف شہر پٹنہ اور گیا کے پڑھے لکھے جغادریوں کی برات اور دوسری طرف موسیٰ بنی جنگل کا تنہا ایک ہاتھ کا شکاری۔ دائیں بائیں سامنے پیچھے اروٹ کروٹ زبان کی ایسی قمچیاں چلا رہا تھا۔ دیہات کی بغیر چھلی ہوئی اور چکنی کی ہوئی کھجور اور تار کی قمچیاں کہ چند منٹ بعد ہی طرّاریوں کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور یکے بادیگرے وہ جو محاورہ ہے کہ دُم دبائے سب الگ ہونے لگے۔ اکرام بھائی دروازہ کے اندر گئے اور عبدالعزیز چچا نے ہتھیلی کی کھینی پر دو تین تھپکیاں دیں اور چٹکی سے کھینی کا سفوف نیچے کے دانت اور ہونٹ کے درمیان رکھتے ہوئے دروازے کی سیڑھیوں سے اتر کر ہنستے ہوئے ایک طرف چلے گئے اور تمام سراتی اور باراتی حیرت سے عبدالعزیز چچا کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے لوگ محمد علی کلے کو رِنگ سے باہر آتے ہوئے دیکھتے ہوں گے۔

تو جناب یہ سب کچھ ہوتا تھا لیکن آج کی طرح زندگی بھر اس کی پلاننگ اور منصوبہ بندی نہیں ہوتی تھی۔ اعلانات اور اشتہارات اور پیرویاں اور درخواستیں اور دعاؤں کی التجائیں معاونت کی گذارشیں اور فکریں اور پریشانیاں اور الجھنیں اور مجلس مجلس تذکرے کچھ نہ ہوتے تھے اور کام سب ہو جاتا تھا۔ بہن سعیدہ کی شادی ہوئی تو یہ شادی برادری اور قبیلے ہی میں ہوئی اس لئے اور بھی زیادہ خاموشی اور بے پروائی اور بے نیازی تھی۔ اماں نے اعظم نانا کو بلا کر پچاس پچاس تولے کے دو سونے کے ڈلے دئے اور پوری فہرست لکھوا دی اور کہا پٹنہ جاؤ سونا بیچ دو اور یہ تمام سامان خرید کر لے آؤ۔ اعظم نانا رشتے میں اماں کے چچا تھے مگر سن میں چھوٹے تھے اس لئے وہ ایسی ہی بات کرتی تھیں۔ چنانچہ اعظم نانا کے ساتھ دو ایک آدمی اور

www.taemeernews.com

گئے اور چند روز میں شادی کے تمام سامان خرید کر لیتے آئے ۔ اور اُن سامانوں میں ہم گھر کے لڑکوں کے لئے کپڑے جوتے بھی تھے۔ حالانکہ میں اسکول میں پڑھتا تھا گویا جوان تھا لمبا قد آور تندرست کہ جدھر سے گذر جاؤں لوگ دیکھتے تھے مگر گھر میں ہماری تمام ضرورتوں کو پوری کرنے کی ذمہ داری اماں کے سپرد تھی جو پہنادیں جو اُڑھادیں جو کھلادیں لیکن کیسا کھلاتی تھیں کیسا پہنا اوڑھاتی تھیں یہ لکھنے کی تاب نہیں ۔ تو جناب سب ہوا سب کے کپڑے سِل گئے ۔ شادی کے سامان تیار ہو گئے ۔ برات آئی ہاتھی گھوڑا بھی آیا ہنود بھی آئے ۔ ان کا باورچی خانہ الگ ۔ سب ہوا کہاں ہرّے لگی کہاں پھٹکری لگی کم لوگوں کو کچھ معلوم نہ ہوا ۔

بڑی باجی محمودہ مرحومہ کو پہلی ولادت ہوئی ۔ شام تک مزے میں گھوم رہی ہیں پھر رہی ہیں باتیں کر رہی ہیں کھا پی رہی ہیں ۔ میں بھی سو گیا سب لوگ سو گئے ۔ صبح اُٹھا تو باجی کے کمرے کی طرف گذر ہوا ۔ دیکھا گاؤں کی دائی دروازے پر بیٹھی ہے ۔ اور اندر سے اذان کی آواز آرہی ہے ۔ میں بھی کمرے میں حیرت اور گھبراہٹ میں داخل ہو گیا ۔ دیکھا باجی پلنگ پر کمبل اوڑھے بیٹھی ہیں اماں بچے کو گود میں لئے ہیں اور اعظم نانا بانگ صلاۃ دے رہے ہیں ۔

جب زندگیاں صاف ستھری تھیں تو مسائل صاف ستھرے ہو کر آتے تھے اور صاف ستھرے ہو کر جاتے تھے جیسے ہواؤں کا آنا اور گذرنا ۔ اِن کی آمد فطری اور ان کی روانگی بھی فطری ۔ موسموں کی تیاری اتنی ہی ہوتی تھی جتنی فطرتاً ضروری تھی ۔ جاڑے میں جاڑا آنے سے قبل سردی کے سامان لحاف، توشک، کمبل، شیروانیاں، کوٹ، مفلر چادریں، شال صندوق سے نکال کر دو چار روز دھوپ میں ڈال دیئے جاتے تھے ۔ کچھ ضرورت ہوئی مرمت کر دی گئی ۔ کچھ اضافہ کرنا ہوا کر دیا ۔ موسم آیا جیسے اپنے معمولات میں ہم اپنے پہلے والے موسم میں تھے انھیں معمولات میں دوسرا موسم آنے کے وقت بھی رہے ۔ بچے پیدا ہوئے ۔ دو سال بعد بسم اللہ ہوئی ۔ مکتب میں داخل کر دیئے گئے ۔ مولوی صاحب نے عربی اردو فارسی کی تعلیم مکمل کر دی ۔ اسکول جانا ہوا اسکول گیا ۔ اُسے جو ہونا تھا ہو گیا ۔ ہر قدم پر راستہ آگے کھلتا گیا ۔ منزل سامنے آتی گئی ۔ کوئی زمیندار ہوا، کوئی کاشتکار ہوا، کوئی ملازمت میں گیا کوئی تجارت میں گیا ۔ کوئی گاؤں میں رہا ۔ کوئی

www.taemeernews.com

شہر گیا۔ کوئی نزدیک بسا کوئی دور گیا۔ کوئی چٹائی پر رہا کوئی پلنگ پر کوئی مسہری پر، کوئی پیدل ہے کوئی سائیکل پر کوئی یکہ پر کوئی کہار پر کھٹولی پر۔ چٹائی پر بھی کوئی اتنا ہی بشاش ہے جتنا کوئی دوسرا مسہری اور قالین پر۔ اب قرآن کی تصویری زبانوں پر ہے تقریروں میں ہے تفسیروں میں ہے۔ کتابوں میں ہے۔ پہلے قرآن کی تصویریاں انسان کی عملی زندگیوں میں تھیں۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا اور دیکھتا رہا۔ وہاں بھی جہاں قرآن کا یہ ٹکڑا شاید لوگوں کو یاد بھی نہ ہو مگر سامنے چلتے پھرتے یہی منظر اور یہی حقیقت تھی کہ تم میں صاحبِ عزت وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اس میں نہ چٹائی کی تخصیص تھی نہ مسہری کی نہ شیروانی کی نہ لنگی کی نہ جھونپڑے کی نہ محل کی۔

"جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں ایک تہد و میاں کا ذکر ہے جو عید کی صبح نماز سے فارغ ہو کر عیدگاہ کے دروازے کے قریب شہنائی بجایا کرتے تھے۔ اپنے پورے لباس میں ہوتے بہت اونچی دیوار کی کشتی نما ٹوپی۔ بادامی رنگ کی گھٹنوں تک شیروانی اور چارخانے کی لنگی اور معمولی جوتا۔ یہ تہد و میاں مہتر تھے یعنی اُس قبیلے سے تھے جو بیت الخلاء کی کھٹیاں صاف کرتا ہے۔ اور پاخانہ پھینکتا ہے۔ میرے نانا مرحوم کہا کرتے تھے کہ تہد و میاں تم حلال خور ہو تمہیں حلال خور کہا جاتا ہے اِس کے معنی لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔ تمہاری کمائی بہت پاکیزہ ہے اور بہت قیمتی ہے۔ ہم لوگ گندگیاں ڈالتے ہیں تم گندگیاں پاک کرتے ہو۔ تم ہم سے زیادہ پاکیزہ ہو۔ دونوں چوکی پر بیٹھ کر حقہ پیتے اور مسجد جا کر نماز ادا کرتے۔

عنایت میاں راج مزدور تھے۔ میانہ قد، پاجامہ کرتا واسکٹ، کندھے پر رومال اور بڑی اونچی دیوار کی ٹوپی۔ تمام دن اپنے پیشہ کا کام کرتے۔ اور شام کو میرے نانا کے یہاں اکثر آتے۔ اور دیر تک دونوں چوکی کے فرش پر باتوں میں سرگوشیوں میں اور حقہ نوشی میں مصروف رہتے۔ میرے مکان کا تمام کام اور تمام نقاشیاں وہی کرتے تھے۔ مسجد کے قریب ہی ایک محلّے میں ان کا چھوٹا سا مکان تھا اور میں اکثر عنایت میاں کے مکان جایا کرتا۔ ان کے یہاں کھٹولے پر بیٹھتا۔ ان کے گھر کی عورتیں مجھے یاد نہیں مگر ان کا کھٹولہ اور اس پر میری نشست بخوبی یاد ہے۔

www.taemeernews.com

اور خوب اچھی طرح یاد ہے اُن کا لباس، اُن کا چہرہ، اُن کی زُلف اور اس پر اونچی ٹوپی اور مُنڈیا کا رومال اور دلّی وال جوتہ بھی یاد ہے۔ دلّی وال جوتہ یا جوتی کسے یاد ہوگی؟ کس نے پہنی ہوگی؟ یا کسے پہنے دیکھی ہوگی دیکھی ہوگی تو کسے یاد ہوگی؟ مجھے یاد ہے کہ یادیں ہی تو میری دولت ہیں میری پونجی ہیں میرا سرمایہ ہیں۔ یادوں ہی کے سہارے تو وقار کے ساتھ اور آسودگی کے ساتھ زندہ ہوں کہ میرے پاس وہ ہے جو کسی کے پاس نہیں ہے۔ سب نے کھو دیا میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا کہ سنبھال کر رکھی ہوئی دولت مجھے اتنا کام دے رہی ہے کہ اگر میں کوئی والئے ریاست ہوتا تو بھی اتنا غنی اتنا مسرور اور اتنا مطمئن نہ ہوتا۔ تو دلی وال جوتہ اور جوتی وہ ہے جو بلکل سرخ یا بلکل سیاہ چمڑے کی ناگرہ قسم کی تراش سے بنتی تھی۔ مگر ناگرہ کی طرح نوک نہیں ہوتی تھی۔ مرد اُسے یوں ہی پہنتے تھے اور بوڑھی عورتیں اس کی ایڑی کو کئی دنوں تک پلنگ کے پائے کے نیچے دبائے رکھتی تھیں کہ ایڑی چپٹی ہو جائے پھر اسے جوتی کی طرح پہنتی تھیں اور یہی دلّی وال جوتا زری کے کام کا بھی بنتا تھا۔ بغیر کام والے جوتے کو دلی وال کہتے تھے۔ اور زری کے کام والے جوتے کو کامدار کہتے تھے۔ میرے گھر میں میری ماں اور میری بہنیں یہی جوتی پہنا کرتی تھیں۔ یہ کام دار جوتہ دلّی سے آتا اور تین چار دن تک پائے سے دبا کر ایڑی چپٹی کی جاتی اور جوتہ سے یہ جوتی بن جاتی۔ اس میں انگلیوں کا تین حصہ چھپتا تھا ایک چوتھائی انگلیاں باہر رہتی تھیں۔ انہیں پہننے میں بڑی مشاقی کی ضرورت ہوتی تھی ورنہ جوتی پاؤں سے نکل کر پھنکا جاتی۔ مگر پہننے والوں کو اتنی مہارت تھی کہ تیز سے تیز چال میں بھی یہ پوری گرفت میں رہتی اور سفر حضر ہر جگہ استعمال ہوتی۔ میری اماں کلکتہ گئیں تو یہی جوتی اُن کے پاؤں میں تھی۔ پٹنہ آئیں تو یہی جوتی تھی۔ پٹنہ سے گاؤں گئیں تو پاؤں میں یہی جوتی تھی۔ اسی میں زندہ رہیں اور اسی جوتی میں شہید ہو گئیں۔ انشاء اللہ اُن جوتیوں کی جنت میں زیارت کروں گا۔

سُلجھی اور صاف زندگی عالم عالم کو سلجھائے رکھتی ہے۔ اُلجھنوں کو آنے نہیں دیتی۔ آگے بڑھ کر روک لیتی ہے۔

www.taemeernews.com

تند و سبک سیل ہے گرچہ زمانے کی رَو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

جس طرح آج جلوسوں کو دیکھ کر لوگ راستہ خالی کر دیتے ہیں۔ شفاف و پاک زندگیو لئے خود اُلجھنیں راستہ صاف کر دیتی ہیں۔ یہ گذر جاتی ہیں تو پھر وہ جدھر جانا ہوتا ہے جا ۔ ہم نے بچپن میں نوعمری میں، دیہاتوں میں اور پٹنہ میں اسکول کی تعلیم کے دوران بھی لوگوں کو اُلجھنیں بیان کرتے نہ سنا۔ اب تو ان کے سوا کوئی بات ہی نہیں تجارت بڑھتی جارہی ہے۔ مگر زبان سے یہی نکل رہا ہے کہ دعا کیجئے بڑی اُلجھنیں ہیں۔ وہاں سے مال اٹھانا ہے وہاں Payment کرنا ہے وہاں حساب دکھانا ہے۔ اتنا Due ہو گیا ہے۔ بجلی والا یوں پریشان کرتا ہے۔ ملازمین یوں دق کر رہے ہیں، بچہ کا ایڈمیشن نہیں ہو رہا ہے بچی کی منسوب نہیں لگ رہی ہے۔ یہ یہ اتنا اتنا مطالبہ ہے۔ اہلیہ کی طبیعت خراب ہے۔ بس دعا کیجئے کلیم صاحب۔ اللہ اللہ بس برات کی برات چلی آرہی ہے اُلجھنوں کی پریشانیوں کی اور انسانوں کی زبان انھیں بیان کرتے کرتے سوکھ رہی ہے۔

میری زندگی کے متعلق نہ والدین نے کوئی منصوبہ بنایا نہ میں نے کچھ سوچا تھا نانا جان سے عربی اردو فارسی اچھی خاصی پڑھ لی پھر کلکتہ چلا گیا۔ ایک ماسٹر جی رکھ دیے گئے۔ انگریزی حساب پڑھاتے تھے۔ ابا جان کی ایک خواہش اپنی تمام اولاد کے لئے یہ تھی کہ میرے لڑکے پہلوان بنیں اور حافظ بنیں۔ نادانستہ طور پر یا دانستہ اُن کی پلاننگ تھی کہ جسم اور روح دونوں کے متوازن اشتراک سے اچھی زندگی بنتی ہے اس لئے جسم کے لئے پہلوانی اور روح کے لئے حفظ قرآن شاید یہی ان کا نظریہ ہوگا۔ بڑے بھائی صاحب تو میرے بالکل بچپن میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا عجیب و غریب حال اور عجیب و غریب زندگی "جہاں خوشبوہی خوشبو تھی" میں تفصیل سے آئی ہے۔ ہم تین بھائی اور تھے دو مجھ سے چھوٹے علیم مرحوم نسیم سلمہٗ۔ ہم تینوں اسی منصوبے کے ماتحت پہلوانوں کے حوالے کئے گئے تھے۔ علیم مرحوم پہلوان بھی بنے اور حافظ قرآن بھی۔ ان کا حال بھی "جہاں خوشبوہی خوشبو تھی" میں مختصر مرقوم ہے۔ وہ حافظ ہوئے۔ تیلہاڑہ کی جامع مسجد میں تراویح سنائی۔ سید شاہ

www.taemeernews.com

بشیر اکبری ابوالعلائی کی نواسی خیرالنساء عرف نفیسہ خاتون سے شادی ہوئی ۔ شادی کے تیسرے سال وہ بیمار ہوئے اور چار سال دق میں مبتلا ہو کر اگست ۴۶ء میں انتقال کر گئے۔ نسیم سلمہٗ بہت چھوٹے تھے پہلوانی کی مشق میں بچپن میں ہی اچھا خاصہ جسم نکل آیا تھا ۔ وہ صرف اکھاڑے میں جاتے تھے اور نماز پڑھتے تھے ۔ میں ایک مرض میں بچپن سے مبتلا تھا ۔ وہ مرض عشق تھا ۔ مجھے اپنی ماں سے، بہنوں سے بھائیوں سے گھر سے محلّے سے بستی سے عشق تھا ۔ ایسا عشق جو مثالی کہئے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں اس کی پوری تفصیل ہے ۔ یہ عشق بہت بیقرار کرتی اور اس بیقراری کو نرم اور گوارہ کرنے کے لئے دوستوں نے مجھے تھیٹر کی راہ دکھادی ۔ جس نے میرے اوقات کا خاصہ حصہ اپنی گرفت میں لے لیا ۔ والد کو میرے پڑھنے لکھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ۔ پہلوان ضرور بن رہا تھا اور نماز کا پابند تھا اس کے آگے وہ کوئی خاص منصوبہ نہیں رکھتے تھے ۔ تھیٹر کی چاٹ نے والد سے ایک دن خوب پٹائی بھی کرائی اور گویا کلکتہ کے گھر سے نکلوایا بھی ۔ یہ سب باتیں اگلی کتاب میں آچکی ہیں ۔ تو میں جب گھر سے نکل کر تین ماہ ایک مقام پر گوشہ نشینی میں گذار کر تیلہاڑہ آیا اور والد کی ناراضگی کی وجہ سے کلکتہ میرا جانا بند ہو گیا تو اماں نے کہا اچھا ہے کچھ پڑھ لو ۔ بیکار رہنے سے اچھا ہے اسکول کی تعلیم مکمل کر لو ۔ تو وہ ہوا ۔ آٹھویں کلاس سے شروع کیا ۔ ڈبل پروموشن ہوتا گیا ۔ چار سال کی پڑھائی دو سال میں پوری کر لی اور میٹرک میں پورے صوبے میں پانچویں پوزیشن حاصل کر کے پٹنہ کالج کے اسکالرشپ پر داخلہ لینے والا تھا کہ والد دو تین ماہ کی علالت کے بعد انتقال فرما گئے پھر علیم مرحوم کی چار پانچ سال صاحب فراشی اور انتقال اور ان کے انتقال کے دو ماہ بعد آسمان کا ٹوٹنا زمین کا پھٹنا باغ کا لٹنا پھولوں اور کلیوں کا پامال ہونا گھر کا جلنا برباد ہونا تمام گھر والوں کا لہولہان ہو کر کوئیں میں آباد ہونا سب کچھ ہو گیا ۔ پھر کیسا منصوبہ کیسی پلاننگ اور کیسی اسکیم ؎

تم جانو تمہیں کیا کہے ہے کیا نہ کہے ہے
ہم کو تو جو دیکھے ہے سو دیوانہ کہے ہے

تین سال تک بیخودی اور ہشیاری دیوانگی اور فرزانگی عقل اور جنوں سمجھوں کی

www.taemeernews.com

مٹی پلید کرنے کے بعد تضیع اوقات یا تزئین اوقات کرنے کے بعد دوکان میں بیٹھا۔ تکیے والا مشہور ہوا۔ کون کلیم عاجز صاحب؟ وہ جنرل بیڈنگ اسٹور جو ہے نا باقر گنج میں وہ انہیں کی دوکان ہے۔ کیا وہ تکیے والے؟ وہی کلیم عاجز صاحب ہیں۔ وہی یہ سب شعر کہتے ہیں؟

آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی　　فصلِ گل آتی رہی جاتی رہی
شمع و پروانہ بلا سے جل بجھے　　آپ کی محفل تو گرماتی رہی

نہ وہ محفل رہی ساقی نہ پھر وہ دورِ جام آیا
تیرے ہاتھوں میں جب سے میکدے کا انتظام آیا
الگ بیٹھے ہیں جو آداب میخوشی سے واقف تھے
جسے پینا نہیں آتا اسی کے ہاتھ جام آیا

ارے یہ کلیم عاجز صاحب ہی کی تکیے کی دوکان ہے؟ تو جناب ایک طرف شاعر بنا محفلیں بھی گرمانے لگا۔

کلیم آئے بھی اپنا ہنر دکھا بھی گئے　　الاپ بھی گئے رو بھی گئے رُلا بھی گئے
غزل بھی پڑھ گئے محفل کو سنا بھی گئے　　اک آگ لائے بھی لے بھی گئے لگا بھی گئے

اور دوسری طرف تکیے والا بھی بنا۔ اس تکیے والے کی دوکان پر مسٹر بی۔ بی پرشاد چیف جسٹس آسام ہائی کورٹ بھی آرہے ہیں۔ جسٹس سر جوپرشاد پٹنہ ہائی کورٹ بھی مسٹر نول کشور ایڈوکیٹ بھی مسٹر وکیل خاں اڈیشنل کلکٹر بھی اور اس کے کرائے کے مکان کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے صدر شعبۂ اُردو بی۔ ان کالج پروفیسر نواب کریم پکارتے ہیں کہ ارے کہاں ہو بھائی کلیم عاجز ارے بی۔ ان کالج میں مشاعرہ ہوگا اور کلیم عاجز نہ ہوں گے تو اس مشاعرہ کو مشاعرہ کون کہے گا؟

تو میں صبح دکان کھولتا۔ جھاڑو ہاتھ میں لے کر دوکان میں جھاڑو لگاتا۔ پھر دکان کی سیڑھیاں صاف کرتا۔ پھر مشین پر بیٹھتا۔ چھوٹی موٹی چیزیں چادر غلاف وغیرہ سینے کے بعد کل کا کھاتا بہی لکھتا پھر کاغذ لے کر ادب و شعر کے موضوع میں منہمک ہو جاتا۔ خریدار آتے چیزیں دکھا کر قیمت کہہ دیتا جسے لینا ہوتا لیتا ورنہ چپ چاپ روانہ ہو جاتا۔

www.taemeernews.com

ایک منشی جی میرے یہاں آ گئے تھے۔ اِن منشی جی کا ذرا تفصیلی تعارف مجھے کرانا ہے۔ کلکتہ میں میرے والد کے بہت دوست تھے۔ ان دوستوں میں بڑے بڑے ہندو بنگالی زمیندار مارواڑی اہل کاروبار، میونسپل کارپوریشن کے اہل کار، مچھوا بازار اور ذکریا اسٹریٹ کے عوامی ذمہ دار، پہلوان، بدمعاش اور شہسوار ہر قسم کے لوگ تھے۔ اس کی تفصیل "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں آئی ہے۔ اُن کے گاؤں کندھیا گنج کے مراری گاؤں "کوبل" اور "نوگھڑ" کے راجپوت زمیندار اور کاشتکار بھی جو کلکتہ بھی آتے جاتے اور رہتے تھے۔ اِن سب ملنے والوں میں ایک بتن (Baldan) سنگھ راجپوت سیوان کے رہنے والے پٹنہ ٹرامو ے کارپوریشن میں ملازم تھے، سانولے آدمی، راجپوتی جثہ اور بدن، کھدر پوش۔ وہ اکثر آتے ایک روز انہوں نے ایک کمسن نوجوان کو ساتھ لایا تقریباً ۱۵ سال کی عمر گندمی رنگ سیاہی مائل گندمی کہئے۔ کھدر کا لمبا کُرتا دھوتی لمبی ٹیک مسیں بھیگی ہوئی ... والد سے ملایا کہا یہ میرا چھوٹا بھائی شیوپوجن سنگھ ہے اس کا جی دیہات میں نہیں لگتا۔ میں اس سے کہیں نوکری نہیں کروانا چاہتا۔ اسے آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔ میرے سامنے وہ دو تین سال رہے پھر والد کا انتقال ہو گیا اور جاپان نے کلکتہ پر بمباری کی۔ میں بھی تمام ساز و سامان کے ساتھ پٹنہ اور پھر پٹنہ سے گھر چلا گیا۔ شیوپوجن سنگھ بھی اپنی بستی سیوان ضلع واپس چلے گئے۔

میں نے دوکان کی تھی۔ موتی ہاری ضلع کے دو ایک ملازم تھے، محمد میاں اور عید میاں اور جہان آباد کے علاقے سے ایک آدمی آ کر رہے عبدالشکور جو سلائی کا کام کرتے تھے۔ میں دوکان میں بیٹھا تھا کہ ایک آدمی داخل ہوئے۔

"سلام کلیم بابو"۔

میں نے نگاہ اٹھائی اور حیرت سے دیکھتا رہا۔

"شیوپوجن جی؟"

"جی ہاں"۔

"آئیے شیوپوجن جی۔ آئیے منشی جی"۔

www.taemeernews.com

پھر پوچھ گچھ حال چال کہنا سُننا سب کچھ ہوا۔ اور کوئی معاملہ نہیں ہوا۔ بس وہ آئے، انہوں نے سامان رکھا اور میں نے اپنے گدام والے مکان میں جہاں رسوئی اور نلیل کی چھال وغیرہ رکھی جاتی تھی اور کچھ دنوں تک میں خود بھی اس میں رہتا تھا۔ ان کے لئے ایک چھوٹی کوٹھری خالی کروادی۔ انہوں نے اسٹو لگایا۔ کچھ دیگچیاں تھالیاں اور کڑاہیاں کرچل وغیرہ منگوائے۔ وہ دوکان ہی میں سوتے۔ صبح اُٹھ کر گنگا اشنان کرنے جاتے۔ وہیں مندر میں پوجا پاٹ کرتے۔ گھنٹہ بھر دھوپ نکلتے نکلتے۔ دھوتی باندھے۔ بھیگا گمچھا سر پر ڈالے ہاتھ میں لوٹا لئے آہستہ آہستہ منتر یا بھجن پڑھتے ہوئے وہ سیدھے گدام والے مکان میں جاتے۔ بھیگی دھوتی اور گمچھا دھوپ میں پھیلانے کے بعد انگوٹھے اور سیدھی انگلی سے دو تین بار جینو کو جسم پر پھرا پھرا کر اس کا پانی نچوڑتے پھر گنجی یا نیم آستین پہن کر لکڑی کے پیڑھے پر بیٹھ جاتے۔ آٹے کی ٹوکری اور سبزیوں کی ٹوکری سامنے کر کے تھالی میں سبزیاں کاٹتے۔ آلو، پھول کوبی، ٹماٹر، بیگن وغیرہ۔ پھر اسٹو سلگاتے اور کڑھائی چڑھا کر اس میں تیل ڈالتے۔ تیل کڑکڑانے لگتا تو اس میں کٹی ہوئی سبزیاں ڈال دیتے خشک پسا ہوا مسالہ چھڑک دیتے۔ دو چار بار کفگیر سے سبزیوں کو اُلٹ پھیر کر کے کڑھائی تھالی سے ڈھک دیتے اور دوسری تھالی میں آٹا نکال کر گوندھنا شروع کرتے اور اتنا گوندھتے کہ تقریباً خمیر جیسا آٹا ہو جاتا۔ اس دوران بار بار کفگیر سے سبزیاں کڑھائی میں چلایا کرتے الٹ پھیر کرتے رہتے۔ آٹا پوری طرح گوندھنے میں اتنا ہی دیر لگتی جتنی سبزی کے بلکل پک کر تیار ہونے میں لگتی۔ سبزی تیار ہوئی کڑھائی اُتاری۔ توا رکھا اور چوکی بیلن لے کر آٹے کے پیڑے بنا کر چپاتی بیلنے لگے ایک چپاتی توے پر رکھی اور دوسری بیلنی شروع کی۔ اشنان اور پوجا پاٹ سے واپس آنے کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ سوا گھنٹے میں وہ چپاتیاں اور سبزی تیار کر لیتے۔ دونوں تیار ہو جاتیں تو وہیں چولھے کے پاس ہی کپڑا بچھا کر ایک تھالی میں سبزی دوسری تھالی میں چپاتیاں اور لوٹے میں پانی لے کر وہ بیٹھتے۔ کچھ اچار وغیرہ بوتل سے نکال کر سبزی کے ساتھ رکھتے۔ اور اطمینان سے چار زانو بیٹھ کر کھانا شروع کرتے۔ دس بارہ چپاتیاں اور تقریباً پاؤ بھر سبزی آدھ گھنٹے میں کھانے سے فارغ ہو کر پورا لوٹا پانی پی کر زور سے ڈکار لیتے اور جے بھگوان کا نعرہ لگا کر کرتہ پہنتے اور سیدھے

www.taemeernews.com

دوکان میں آکر بیٹھ جاتے ۔ تقریباً نو بجے صبح کا عمل ہوتا ۔ اس وقت سے رات کو دوکان بند ہونے تک وہ کچھ نہیں کھاتے ۔ ایک دوبار ہوٹل سے چائے منگوا کر پی لیتے اور پھر وہی تقریباً ۹ بجے شب میں دوکان بند کر کے اپنی کوٹھری میں جاتے اور صبح والا پورا عمل دُہراتے ۔ تقریباً ساڑھے دس بجے اسی طرح روٹی اور سبزی تیار کر کے بھر پیٹ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دوکان واپس آتے اور یہیں چوکی پر اپنا پورا بستر بچھا کر مچھر دانی لگا کر سو رہتے ۔ میں جب نماز پڑھنے مسجد کی طرف جاتا تو خود بھی اُٹھ جاتے اور صبح والے معمولات پورے کرنے کو نکل جاتے ۔ دن کو دوکان ہی میں ایک گھنٹہ قیلولہ کرتے ۔ یہ دو تین معمولات صبح کا اشنان پوجا پاٹ کھانا بنانا کھانا اور پھر رات نو بجے بعد یہ عمل دہرانا اور دن کو ایک گھنٹہ دکان ہی میں سو رہنا ایسا عمل تھا کہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۴ء تک تقریباً اکتیس سال تک اس میں کوئی فرق نہ آیا ۔ نہ کبھی ہوٹل گئے نہ دو مرتبہ کے علاوہ تیسری بار کچھ کھایا ۔

میں نے جب دوکان کی تو پہلے پہل گویا تنہا ہی تھا ۔ "خود کردہ را خود کردہ گرد خود گِل کردہ" جھاڑو کش بھی، درزی بھی، سیلس مین بھی، منشی بھی ۔ پھر پہلے جھاڑو کش آیا ۔ پھر درزی آیا پھر سیلس مین منشی شیو پوجن سنگھ آئے ۔ ۔ ۔ ۔ منشی جی اُنہیں لوگ کہنے لگے تھے یا میرے گھر والے ۔ یعنی وہ بنیا وغیرہ نہیں تھے ۔ راجپوتوں کی ایک نہایت اعلیٰ نسل چوہان اور سورج بنسی نسل کے راجپوت تھے ۔ وہ ملازمت کے ضرورت مند نہ تھے ۔ ان کی جائداد تھی، کھیت کھلیان تھے ۔ گائے بیل بھینس، دودھ دہی، بچے بیوی ۔ مگر ان کا جی دیہات میں نہیں لگتا ۔ ان کے بھائی بتن سنگھ انہیں کلکتہ میرے والد کے یہاں پہنچا آئے ۔ پھر دس بارہ سال یہ گھر پر رہے ۔ خدا جانے انہیں کیسے خبر ملی کہ میں پٹنہ میں ہوں اور دکان کر لی ہے ۔ گھر بار چھوڑ کر وہ میرے یہاں آ گئے ۔ میں انہیں ۱۹۵۳ء میں پچھتر روپئے ماہوار خشک دیا کرتا تھا اور وہ بلکل میری جگہ تھے اور ضرورت کا ہر کام کرنا ان کا مزاج بن گیا تھا ۔ ضرورت ہوتی تو جھاڑو بہارو کا سارا کام کر لیتے ۔ دکان لگانا، سجانا، اٹھانا بند کرنا تقاضہ آیا تو سلائی مشین پر بیٹھ گئے اور سلائی کا ہر کام کر لیا ۔ بازار سے مال لانا، تیار کرنا، بیچنا لکھنا، حساب کرنا اور کبھی گھر کے اندر سے تقاضہ آیا کہ منشی جی ذرا بازار سے یہ سامان لا دیجئے

www.taemeernews.com

تو منشی جی جھولا لے کر بازار نکل گئے ۔ وہ میری ہی طرح ہر کے خادم، معاون اور مددگار، نرم دل اور نرم گفتار، صاف دل اور صاف کردار۔ میں دوکاندار ہو کر بھی دوکاندار نہیں تھا یعنی دکان داروں جیسی خریداروں کو ہموار کر لینے والی طرز گفتار ان میں نہیں تھی ۔ صاف صاف بات کرتے لینے والا لے جاتا ورنہ واپس ہو جاتا۔ ان کے رہنے سے میری آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن میری ذمہ داری میں بہت کمی ہوئی اور آزادی میں زیادتی ہو گئی ۔ ان کو میرے معمولات اور مشاغل کی پوری پوری خبر ہوتی ، میں کہاں ہوں، کب آؤں گا، کس وقت آؤں گا کب ملوں گا۔ میرے مزاج رجحان اور میلان سے بھی وہ خوب آگاہ ہو گئے تھے ۔ میرے اجنبی ملنے والوں کو پوری پوری آگاہی میرے متعلق ہو جاتی اور اسی اعتبار سے وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ورنہ منشی جی ہی کی صلاح سے وہ بغیر ملے واپس ہو جاتے ۔ وہ مجھ سے عمر میں سات آٹھ سال یا دس سال بڑے تھے ۔ مگر میرا بہت احترام کرتے ۔ اس لئے نہیں کہ میں انہیں تنخواہ دیتا ہوں بلکہ اس لئے کہ وہ مجھے ایک اچھا، نیک اور دیندار آدمی سمجھتے تھے ۔ احترام ہی نہیں وہ بلکل میرے گھر کے آدمی میرے خاندان کے فرد، میرے خیر خواہ، میرے اوقات کے محافظ، میرے گھر اور میری بیوی بچوں کے اتالیق یا نگراں ہو گئے تھے ۔ وہ حسب ضرورت میرے بچوں کو ڈانٹ دیتے اور میری بیوی کی بھی تنبیہہ کرتے ۔ میری بیوی کسی ضرورت سے کہیں جانا چاہتیں تو وہ اپنی سمجھ کے اعتبار سے غور کر کے فیصلہ کرتے کہ "نہیں دلہن جی اس وقت وہاں یا اُدھر نہ جائیے" اور رکشہ والے کو واپس کر دیتے ۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں جمشید پور میں سخت قسم کا فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ میری بیوی کی بھانجی اور اس کے شوہر جمشید پور میں تھے ۔ جس علاقے میں وہ تھے وہ بہت متاثر ہوا۔ اور خبر آئی کہ وہ لوگ اپنا کوارٹر چھوڑ کر کہیں کیمپ میں ہیں ۔ میری بیوی بہت پریشان بہت غمگین ۔

منشی جی میری عدم موجودگی میں ایک دن اندر گئے ۔

"دلہن جی ۔ دلہن جی ۔!"

"کیا ہے منشی جی ؟"

"کاہے پریشان ہو دلہن جی ۔"

www.taemeernews.com

"منشی جی۔ اسمو اور کجو (میری بھانجی اور بھانجی داماد) کی کوئی خبر نہیں ہے بہت تردد ہے۔"

"کھبر کیسے آئے گی دلہن جی ؟"

"کوئی وہاں سے آئے یا کوئی جائے۔"

"کون جائے گا دلہن جی ؟"

"کیسے کوئی جائے گا۔ جانے میں خطرہ ہے منشی جی۔"

"ہم جائیں دلہن جی ؟"

"آپ جائیے گا ؟ نہیں آپ کا ہے کو جائیے گا منشی جی۔"

"ہم جائیں گے۔ ہم ہندو ہیں۔ ہم کو خطرہ کم ہے۔ ہم وہاں کسی ہندو کے ذریعہ مسلمانوں سے پتہ لگالیں گے۔"

چنانچہ منشی جی جانے پر تیار ہو گئے۔ میری بیوی نے کچھ ساڑیاں، کچھ چادریں، کچھ مردانی کپڑے کی ایک گٹھری بنائی۔ نام دیا پتہ دیا۔ اور شیو پوجن سنگھ جمشید پور روانہ ہو گئے وہ جمشید پور میں ست گوڑا علاقہ میں گئے، جہاں وہ دونوں پہلے رہتے تھے۔ وہاں کے ہندوؤں سے ملے۔ ان لوگوں نے انہیں ساکچی کیمپ بھیج دیا۔ وہاں کیمپ پہنچکر پولیس کے ذریعہ کیمپ والوں سے ملے۔ نام بتایا۔ ان کے جاننے والے وہاں تھے۔ انہوں نے کہا کہ اسمو اور کجو بھالوباسا کیمپ میں ہیں۔ شیو پوجن سنگھ بھالوباسا کیمپ گئے، اسمو اور کجو سے ملاقات ہوئی۔ اُن کو سامان دیا، ان سے خیریت کے خطوط لئے اور چوتھے پانچویں دن منشی جی خیریت اور خوشخبریوں کے ساتھ پٹنہ واپس پہونچ گئے۔

جیسے جیسے ان کا سن آنے لگا انہیں نیند زیادہ آنے لگی اور مجھے بے وقت کسی کے سونے سے ہمیشہ الجھن اور نفرت۔ میں کبھی کبھی منشی جی سے کہتا کہ آپ اب بہت سونے لگے ہیں۔ وہ چپ رہ جاتے یا جلدی جلدی منہ دھوکر جم کر بیٹھ جاتے۔ کم از کم دو بار ایسا ہوا کہ میں ان سے ناراض ہو گیا اور کہہ دیا آپ گھر چلے جائیے۔

"گھر چلے جائیں کلیم بابو ؟"

www.taemeernews.com

"ہاں شیوپوجن جی آپ گھر چلے جائیے۔"

"اچھا تو کب جائیں؟"

"جب آپ چاہئے۔"

"اچھا تو کل چلے جاتے ہیں۔"

اور شیوپوجن سنگھ چلے گئے۔ اور میری بیوی سن کر لڑنے مرنے پر تیار۔ میں نے کہا نہیں اب منشی جی بہت سست ہوتے جارہے ہیں۔ لیکن منشی جی گئے تو ایسا لگا کہ دکان بھی اور گھر بھی سناٹا ہے۔ اب منشی جی کی آواز نہیں آتی۔ پہلے ہر طرف سے منشی جی پنڈت جی منشی جی پنڈت جی کی رٹ ہوتی تھی۔ وہ پکار رہا ہے وہ بول رہا ہے اب ہر طرف سناٹا۔ میرا دل بھی سناٹا سناٹا لگتا مگر میں خاموش رہا۔ بیوی نے کاغذ اٹھا کر ایک خط لکھ دیا۔ اور دو تین روز بعد دیکھتے ہیں کہ شیوپوجن جی اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں لئے دکان میں داخل ہو رہے۔ میں تو باغ باغ ہوگیا۔ مگر خشکی سے کہا۔

"آپ آگئے شیوپوجن جی؟"

"ہاں کلیم بابو۔ دلہن جی بلائن ہیں۔"

چنانچہ پھر گھر باہر منشی جی، پنڈت جی کی آواز گونجنے لگی۔ اعل نعل کے رہنے والے بھی۔ آگئے پنڈت جی؟ ہاں جی کیوں نہیں آئیں گے یہ بھی تو گھر ہے۔ منشی جی منشی جی پنڈت جی پنڈت جی شیوپوجن جی شیوپوجن جی۔ باہر اور اندر دکان اور مکان پھر منشی جی گرم بازار بن گئے۔

کبھی کبھی گھر سے بہت تقاضہ آتا کہ پتا جی آپ آجائیے بہت کام ہے۔ یہ بات ہے وہ بات ہے تو منشی جی لکھ بھیجتے کہ یہ کام یوں کرلو اور وہ کام یوں کرلو یہ اس طرح ہو جائے گا وہ اس طرح ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ مگر خود نہیں گئے۔ کبھی بہت تقاضہ گھر سے آیا تو منشی جی سست ہو کر آئے۔

"کلیم بابو ہم جاتے ہیں۔"

"کیا بات ہے منشی جی؟"

www.taemeernews.com

"لڑکن سب بہت دق کرے ہے کہ بہت ہرجا (نقصان) ہو رہا ہے۔"

"اچھا جائیے شیو پوجن جی۔"

اور شیو پوجن روانہ ہو گئے۔ اور پھر وہی سناٹا۔

اے۔ بس دس بارہ دن ہوتا ہے کہ منشی جی اپنے سوٹ کیس کے ساتھ پھر موجود۔ کسی اڑوس پڑوس والے نے پوچھا کہ آپ پھر چلے آئے پنڈت جی کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا۔ یہ جواب پوچھنے والوں نے ان کے مرنے کے بعد مجھے بتایا اور کئی شخص نے بتایا کئی بار کئی شخصوں نے اُن سے یہ سوال کیا اور ان کو یہی جواب ملتا گیا جو میرے علم میں ان کی زندگی میں نہیں آیا۔

وہ بولے۔ "کیا کریں ہمرا گھر میں جی نہیں لگے ہے۔ ہمرا کلیم بابو سے اور دلہن جی سے بڑا پریم ہو گیا ہے۔"

کم از کم دو بار یہ واقعہ بھی ہوا یعنی دو بار میں نے خود انہیں گھر روانہ کیا۔ اور وہ میری بیوی کے اشارے پر پھر آ گئے۔

ایک دو بار ان کا لڑکا ان کی بیوی کو لے کر پٹنہ بھی آیا۔ اُن کی بیوی یہ دیکھنے آئی کہ کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ شیو پوجن سنگھ۔ گھر بار بیوی بال بچے جائداد کھیت باڑی سب چھوڑ کر پٹنہ میں پڑے رہتے ہیں۔ اُن کی بیوی دو بار آئیں۔ آٹھ آٹھ دس دس دن رہیں۔ کچھ سمجھ کر اور خوش ہو کر ہی گئیں۔ اُن کے بیٹے تو اکثر آتے۔ بڑا بیٹا گھر سنبھالتا تھا۔ چھوٹا بیٹا اوورسیر تھا اور شاید بنگلور میں رہتا تھا۔ ایک اور بیٹا کلکتہ ٹیکسی چلوانے کا کاروبار کرتا تھا اور ان سب کا باپ جائداد والے کا باپ اور اوورسیر (Overseer) کا باپ اور ٹیکسیوں کا کاروبار کرنے والے کا باپ، گھر والا جائداد والا کھیت کھلیان والا۔ گائے بھینس بیل والا۔ پٹنہ میں کلیم کے یہاں پہلے پہل دو بے پھر سو روپے پر پھر سوا سو روپے پر اور آخر میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر پڑا رہتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے کھانا بنانا، کھانا، جو کچھ تنہا سونا کبھی کبھی میری ڈانٹ سن لینا اور مسکرا کر رہ جانا۔

۱۹۷۰ء کے بعد میں نے گدام والا مکان چھوڑ دیا۔ اور وہ دکان ہی کی اندر والی کوٹھری

www.taemeernews.com

میں اپنا کھانا بنانے لگے۔ میری بیوی بچے اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ اُن سے کوئی پردا نہ تھا۔ میرے علاوہ سب لوگ ان کے ماتحت تھے۔ کبھی کبھی چھپی زبان سے وہ مجھے بھی نصیحت کر دیا کرتے اور میں وزن اور تول کے بعد ان کی بات مان بھی لیتا تھا۔ شیو پوجن سنگھ میرے گھر کے ایک ناگزیر فرد بن گئے۔ اُن سے کوئی رشتہ نہ تھا مگر ان سے سب رشتہ ہو گیا۔ ایک ستر سالہ انسان کا جس نے تیس بتیس سال ایک گھر میں گذارے وہیں رہا وہیں کھایا پیا وہیں سویا پڑا۔ جوانی سے بوڑھا ہوا بوڑھاپے سے موت تک پہونچا اس سے کیا رشتہ نہیں ہو سکتا؟ سب رشتہ ہو گیا۔ ان کا رشتہ مجھ سے بھی میری بیوی سے بھی میرے بچوں سے بھی میرے گھر سے بھی۔ میرے دین سے بھی میرے مذہب سے بھی۔ وہ اللہ رسول بھی زبان سے بولنے لگے تھے اور کبھی کبھی میرے گھر کا میٹھا پکا ہوا بھی کھا لیتے تھے مگر بہر حال وہ اپنا کھانا خود پکاتے تھے۔ آخر میں وہ روزانہ اشنان کو نہیں جاتے ہفتہ میں دو تین بار جاتے ورنہ بیشتر وہ میرے ہی یہاں غسل خانے میں غسل کر لیتے۔ استنجا خانے میں استنجا کر لیتے یہ دونوں ضروریات کی جگہیں مکان میں نیچے بھی ہیں اور اوپر بھی۔

۱۹۸۴ء کے کسی ماہ کی تاریخ ہیں۔ شب کو دکان میں سوئے صبح علی الصباح اٹھے۔ پاخانہ گئے۔ باہر آتے ہوئے گرے۔ میرے بچے ڈاکٹر وسیم نے ایمبولنس منگوا کر امیر جنسی میں پہونچایا۔ پھر میں گیا پھر میری بیوی بچے گئے۔ وہ دن بھر بیہوش رہے۔ شام کو مر گئے۔ ان کی لاش میں نے اپنی دکان میں منگوائی۔ اور میرا ارادہ غالب کے اس شعر پر عمل کرنے کا تھا کہ ؎

وفاداری شرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب کا شعر اس موقع پر ترمیم طلب ہے کہ برہمن بتخانے میں نہیں رہا۔ کعبے ہی میں رہا اور کعبہ ہی میں مرا۔ لیکن گاڑا گیا بت خانے میں۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ شیو پوجن سنگھ کا کریا کرم پٹنہ میں ہی ہو اور ہم سب شامل رہیں۔ اور میرے پڑوس کے دوسرے ہندوؤں نے میری تائید کی آپ نے ان کے ساتھ کیا انہوں نے آپ کے ساتھ کیا۔ بال بچوں اور گھر سے ان کا کبار رشتہ رہا۔ پٹنہ میں ان کا کریا کرم ہونا چاہئے۔ مگر میں نے پھر سوچا۔ میں نے ان کو ان کے بال بچوں سے گھر سے

www.taemeernews.com

تیس تیس برس جدا رکھا۔ بال بچوں کو بیماری میں آنے کا بھی موقع نہ ملا۔ اب اِن کا مُرا منہ بھی اِن کے بال بچوں کو دیکھنے نہ دوں۔ ہو سکتا ہے ان کا دل دکھے۔ گرچہ میں نے آدمی سیوان روانہ کر دیا تھا۔ مگر سیوان سے بھی بہت دُور ان کا گاؤں تھا۔ دوسرے دن شام تک کوئی آنے والا آ سکتا تھا۔ سب تو پھر بھی نہیں آ سکتے تھے۔

میری بیوی میری بڑی بچی میری بڑی بہو اور دوسرے بچے شیو پوجن سنگھ کے سرہانے بیٹھے رہے۔ میری بیوی میری بیٹی روتی رہی۔ بیوی کہتی رہی "منشی جی آپ میرے یہاں آئے میرے یہاں رہے۔ اور میرے ہی یہاں مر گئے۔ آپ کے دھرم کے مطابق ہو سکتا ہے آپ کا رشتہ ہم لوگوں سے پچھلے جنم میں ہو۔"

میں نے ٹیکسی منگوائی۔ میرے گھر کے لوگوں نے، بیوی نے بیٹی نے بہو نے آنسو پونچھتے ہوئے منشی جی کی لاش کو رخصت کیا۔ ٹیکسی میں پیچھے کی سیٹ پر اُن کی لاش رکھی گئی۔ میری بغل کے ایک پنڈت جی اور ایک دوسرے پڑوسی لاش کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھے۔ مظہر میاں اور میں آگے بیٹھا۔ تقریباً آٹھ بجے شب میں روانہ ہو کر پوری رفتار سے ٹیکسی دو تین بجے بھور میں منشی جی کے گاؤں موضع اُدینی (Oeni) ضلع سارن پہونچی سارے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ رونا دھونا تو ہونا ہی ہے لیکن سارے لوگ ہم لوگوں سے لپٹ گئے۔ کچھ لوگ ان کے کریا کرم کے سامان میں لگ گئے۔ کچھ لوگ ہم لوگوں کے ارد گرد رہے۔ جب ان کی ارتھی مشان روانہ ہوئی تو ٹیکسی واپس ہوئی۔ اور یہ شعر زبان پر آیا۔

یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

چھ سال ہو گئے اور بات ابھی تک تازہ ہے اور کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی سے ان کا ذکر آ جاتا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کبھی کبھی پوچھ بیٹھتے ہیں۔ "منشی جی کہاں گئے؟" اور جب مختصر کہانی سنتے ہیں تو پرانی تاریخی باتیں افسانے کہانیاں یاد آ جاتی ہیں کہ اس دور میں ایسا بھی ہوتا ہے تیس تیس برس میں میرے تقریباً تمام اعزہ اور اقارب رشتہ دار اور قرابت مند، دوست اور احباب

www.taemeernews.com

شاگرد اور استاد خریدار اور دوکان دار اُنہیں خوب جان ہی نہیں گئے تھے، اُن سے مانوس ہو گئے تھے دیس پردیس رہنے والے بھی۔ امریکہ کناڈا اور عرب اور پاکستان رہنے والے بھی جو اس طرف دس بیس برس میں جا کر رہے ہیں پوچھ بیٹھتے ہیں منشی جی کیسے ہیں؟ میری شاعری بین الاقوامی ہو گئی۔ میں بھی اور منشی جی بھی بین الاقوامی ہو گئے۔ ان کے جاننے والے، یاد کرنے والے ملکوں ملکوں ہیں اور ملکوں ملکوں ان کے تذکرے آتے رہتے ہیں۔ میری محمودہ باجی مرحومہ کا چھوٹا لڑکا انعام الحق جس کی پیدائش کے وقت میری باجی کا انتقال ہوا۔ تقریباً بائیس تیئیس سال کا ہو کر ۱۹۵۸ء میں پاکستان چلا گیا۔ میرے ہی ساتھ تھا اور شیو پوجن سنگھ سے بھی قریب تھا۔ میں تقریباً بیس سال بعد ۱۹۷۸ء میں راولپنڈی گیا۔ انعام سے ملاقات ہوئی۔ سب کو پوچھتے پوچھتے بول اٹھا منشی جی کیسے ہیں؟ میں نے کہا بہت اچھے ہیں گھر بھر پر رعب گانٹھتے ہیں۔ روز سویرے اشنان کر کے کنگھی سے بال سنوارتے ہیں کھا کر لمبی ڈکار لیتے ہیں اور جے بھگوان کہتے ہیں۔ بہت خوش ہوا۔ اور میری واپسی کے وقت ٹیپ آیا اور اپنی ممانی اور ماموں زاد بہنوں کو سلام پیغام اور کلام کے ساتھ منشی جی کے لئے لمبا سلام اور پیغام تھا۔ اور درخواست تھی کہ اب کوئی آئے تو منشی جی کی آواز بھی آئے چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۹۷۹ء میں پھر دوبارہ روانہ ہوا۔ ٹیپ میں سبھوں کی باتوں کے ساتھ منشی جی کی آواز بھی ٹیپ کرائی گئی۔ منشی جی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے تھوڑی بہت ہندی ناگری جانتے تھے۔ لمبی باتیں نہیں کر سکتے تھے مگر مختصر سہی دل کھول کر انعام سے بات کی۔ ٹیپ کرایا کہ "پلٹو (انعام الحق کا پکار نام پلٹو تھا۔ پیدائش کے تھوڑی دیر بعد گویا اس کی سانس بند ہو گئی تھی کچھ دیر بعد سانس لوٹی تو پلٹو نام پڑ گیا) تم چلے گئے پھر کبھی نہیں آئے اتنا دن ہو گیا تم کو نہیں دیکھا۔ تمہارا حال معلوم ہو جاتا ہے لیکن تم کو نہیں دیکھتے۔ ہم بھی تم کو یاد کرتے ہیں آ کر ملاقات کرو۔"

پلٹو تو نہیں آ سکا مگر پلٹو کے یہاں اُن کی آواز ٹیپ میں محفوظ ہے اور یہاں ہم سب کے کانوں میں اُن کی آواز ہے اور سب کی نگاہوں میں اُن کی صورت اور تیس تیئیس سال کی تقریباً پوری نقل و حرکت اور انداز و ادا محفوظ ہے۔ رات میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ منشی جی کے بارے میں کتاب لکھ رہا ہوں۔ بولیں کتنی باتیں لکھو گے۔ تم تو غائب رہتے تھے نہ تو ۲۴ گھنٹے ان کے

www.taemeernews.com

قریب رہتے تھے۔ بولیں ایک روز دکان میں جھانکا تو منشی جی اُبلے ہوئے دو تین شکر قند سامنے رکھے کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا شکر قند کھا رہے ہیں منشی جی؟ بولے ہاں آپ بھی کھائیے گا؟ میں نے کہا ہاں کھانے کا تو جی چاہ رہا ہے۔ بس شکر قند کھاتے ہوئے اور بقیہ چھوڑ کر اُٹھ گئے۔ بازار چلے گئے اور خرید کر لے آئے۔ لیجئے دلہن جی ہمرا جوٹھا کاہے کھائیے گا۔ یہ بازار سے لایا ہے۔ بولیں ایک دن تم جماعت میں چلے گئے تھے۔ شام کو دیکھا منشی جی کپڑے تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ رہے ہیں۔

بولیں "کیا ہے منشی جی کپڑا سریا رہے ہیں؟"

بولے "ہاں دلہن جی گھر جا رہے ہیں۔ کلیم بابو آج ہم پر بگڑ گئے۔"

"کلیم بابو بگڑ گئے؟ ارے وہ تو شاعر ہیں منشی جی۔ پاگل ہیں۔ آپ بھی پاگل بن رہے ہیں۔"

"تو کیا نہیں جائیں؟"

"آپ پاگل مت بنئے منشی جی۔"

بس منشی جی نے سوٹ کیس اوپر الماری میں رکھ دیا اور بیٹھ کر جیب سے کھینی نکالی۔ ہتھیلی پر انگوٹھے سے میل میل کر تھپکی دے دے کر چٹکی سے منہ میں ڈالی اور الماری سے ٹیک کر اونگھنے لگے۔

چھ سال سے میں سوچ رہا تھا منشی جی کا مجھ پر قرض ہے۔ مجھے ادا کرنا ہے۔ سوچا کوئی مضمون لکھ دوں اخبار میں چھپوا دوں "منشی جی" سرخی بنا دوں۔ بات ٹلتی رہی آج لکھوں گا، کل لکھوں گا۔ "ابھی سن لو مجھ سے" مکمل ہونے لگی تو یاد آیا کہ قرض ادا کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ منشی جی میرے ساتھ بتیس سال رہے۔ اب وہ میری کتاب میں میرے ساتھ صدیوں رہ جائیں گے۔

ہم کو دعائیں دو کہ تمہاری اداؤں پر
ہم نے جو لکھ دیا وہ بھلایا نہ جائے گا

---

www.taemeernews.com

میرا جو یہ شعر ہے ؎

وہ جو سب میں نا کارے ہیں ہم کو جی سے پیارے ہیں
محفل محفل ڈھونڈھ رہے ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانے ہم

ٹوٹے ہوئے پیمانوں کو ڈھونڈھنے والا کون ہے ؟ کیوں کوئی ڈھونڈھے ؟ ایک پیمانہ ٹوٹتا ہے تو اس سے اچھا پیمانہ سامنے آجاتا ہے۔ ارتقا نے اپنا حیرت انگیز وجود اپنی ہوش ربا حقیقت جس تیزی سے موجودہ صدی میں بلکہ پچھلے پچاس برسوں میں سنوائی ہے جس کا میں خود گواہ ہوں یہ تیزی پچھلی صدیوں میں یا اسی صدی کی ابتدا میں نہیں تھی۔ چیزوں میں کس برق رفتاری سے ترقی ہوتی ہے مکان، سڑکیں، روشنیاں، سواریاں، لباس، پوشاک، کھانے، مشروبات، سامانِ تفریحات کی تیزیٔ رفتار کا ہم پیچھا نہیں کر سکتے۔ اور یہ بتانا دشوار ہو جاتا ہے کہ ہم نے کل یہ چیز کیسی دیکھی تھی آج کیسی ہے اور کل کیسی ہو جائے گی۔

بدلتی جاتی ہے تیزی سے اس قدر دنیا
کہ آشنا کو بھی مشکل ہے آشنا کہنا

کیا کل ہم انھیں سے ملے تھے ؟ کیا ان کی آواز کل یہی تھی ؟ انداز یہی تھا ؟ تیور یہی تھا ؟ مزاج یہی تھا ؟ مشکل ہے فیصلہ کرنا اور فیصلہ کر دو تو مشکل ہے دل کا ماننا۔ دل مطمئن نہیں ہوتا۔ دماغ قائل ہو جاتا ہے۔ کرتہ پاجامہ ٹوپی ہر وقت پہنتا رہا۔ پچاس بلکہ پچپن برس سے پہننا یاد ہے۔ کپڑوں کے تھان، مشینوں کی صورتیں، کپڑوں کی مہک سرسراہٹ، چکناہٹ، دبازت، صباحت بلکہ فصاحت اور بلاغت بھی کہہ لو سب یاد ہے۔ ململ کا کرتہ لٹھے کا پاجامہ رام پوری ٹوپی بنگال ٹیزی کا بانس شولہ ہیلمٹ یا پیپ یا البرٹ کوئی نیا کرسامنے آگیا تو کرتے کی پاجامے کی ٹوپی کی

www.taemeernews.com

جوتے کی زبان تان شان آن بان، خاندان، نسل، برادری رشتہ مندی سب کچھ سمجھ میں آجاتی تھی اور ایسی سمجھ میں آجاتی تھی کہ بھلائی نہیں جاتی تھی۔ اب بھولنے کی کوشش کرتا ہوں تو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ غم ہوتا ہے اور جی چاہتا ہے کہیں تنہائی میں چپ چاپ بیٹھ کر ان کی یاد میں رولوں۔ پچاس سال پہلے جب دس آنے گز کا ۱۱۰۰ نمبر ململ کا کرتا اور ساڑھے نو آنے گز PPPPP پانچ پی کا پاجامہ اور دو روپئے کی سیاہ مخمل کی رام پوری ٹوپی۔ اور دس روپے کا بنگال ٹینری کا ہاف شو پہن لیتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کسی مخلص محبت بھرے دوست سے بغل گیر ہوں جو بدن کے لئے بھی آنکھوں کے لئے بھی اور روح کے لئے بھی سبب فرحت و راحت ہے۔ ان کی خوشبو ناک سے داخل ہو رہی ہے۔ رنگ آنکھوں میں سما رہا ہے، نرمی اور نزاکت بدن محسوس کر رہا ہے اور ان سب کی مجموعی آسودگی سے دل غنی مطمئن مست اور سرشار ہے۔ صبح ایک روپئے کے دس سیر گیہوں کی روٹی اور صرف چودہ آنے سیر گھی میں ذرا سی چپکائی ہوتی۔ ایک آنے سیر دودھ کی فیرنی کے ساتھ کھا کر اٹھا تو دوپہر تک خوشبو رسا اور فرحت بخش ڈھکاروں سے مشام جان معطر رہتا تھا۔ دو پیسے سیر آلو کا قتلہ چھ آنے سیر سرسوں کے تیل میں تلا ہوا زبان پر جاتا تو نرمی اور گھلاوٹ اور ذائقہ کی جوئے شیر زبان سے حلق اور حلق سے شکم تک رواں ہو جاتی۔ روٹیاں اور ترکاریاں اور فرنی جن مراد آبادی یا تام چینی کے برتنوں میں دسترخوان پر رکھی جاتیں وہ کھانوں کی لذت کو قوت کو اور توانائی کو بڑھا دیتی تھیں۔ کھانے لکڑیوں کی آگ پر پک کر برتنوں میں چن کر انگلیوں سے مس ہو کر زبان اور حلق سے گذر کر سیری آسودگی لذت اور صحت کا لامتناہی سلسلہ بن جاتے کیا ۱۱۰۰ نمبر ململ کا ٹکڑا۔ PPPPP پانچ پی کے لٹھے کی کوئی پرانی دھرانی دھجی کہیں مل جائے، چودہ آنے سیر والی گھی کا ذائقہ اور ایک آنے سیر والے دودھ کی لذت کہیں سے آپ کو مل جائے تو آپ حیرت زدہ نہ ہو جاؤ گے؟ آپ کسی اور دنیا میں نہ چلے جاؤ گے اور اس دنیا کو اپنی تمام گھڑ گھڑاہٹ اور تمام پھٹپھٹاہٹ اور تمام چیچاہٹ کے ساتھ بھول نہ جاؤ گے؟ بھول جاؤ گے اور ایسا بھول جاؤ گے کہ پھر واپس آنے میں روؤ گے، تڑپو گے پچھڑو گے۔

تو اُن ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے مقابلے میں اِن چمکتے ہوئے کھنکتے ہوئے اور نقلی بے سری

www.taemeernews.com

موسیقی سے ٹھنکتے ہوئے پیمانوں سے مجھے کیا تشفی ہو سکتی ہے اور تلاش اور جستجو اور آرزو اور تمنا اور خواہش سے، یہ مجھے کیا روک سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ٹوٹے ہوئے پیمانے بھی اب نہیں ملتے وہ بھی بہار سہار کر کوڑے کرکٹ کے خندقوں میں ڈال دیئے گئے۔ اِس اُدھم مچاتی ہوئی، شور کرتی ہوئی پُر ہجوم دنیا میں ٹوٹے پھوٹے ہوئے لوگ پرانے پیمانوں کی شکستہ یادگار بن کر کہاں پڑے ہیں کہاں چھپے ہیں، ڈھونڈھنا، تلاش کر کے انہیں نکالنا نہایت ہی صبر آزما کوششوں کا نام ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب

پرانے ٹوٹے پھوٹے پیمانے بھی اب بہت ہی مشکلوں بہت ہی دشواریوں اور بڑی بڑی مسافتوں پر کہیں کہیں مل جاتے ہیں مگر تلاش جستجو۔ آرزو اور تمنا خود ایک لذیذ چیز ہے مگر ارمانوں میں، آرزوؤں میں، تمناؤں میں، تلاشوں میں، جستجوؤں میں لذت نہیں ہوتی تو دنیا کب کی ختم ہو چکی ہوتی کتنے ایٹم بم چل چکے ہوتے اور عالم عالم ویران ہو چکا ہوتا یہ مضطرب تلاش و جستجو کسی نہ کسی حد تک کہیں نہ کہیں جاری ہے کوئی نہ کوئی کر رہا ہے اس لئے ایٹم بم چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ آگ لگتے لگتے تھم جاتی ہے اور کھنڈروں میں اور خاکستروں میں پھر تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ مجھی کو دیکھو۔ تلاش کرتے کرتے تقریباً پینتالیس سال گذر گئے۔ کیا کسی نے مجھے تھکتے دیکھا؟ مایوس ہوتے دیکھا؟ رکتے دیکھا؟ ارادہ بدلتے دیکھا؟ چال ڈھال رفتار گفتار تبدیل کرتے دیکھا؟ بول بدلتے دیکھا، لہجہ بدلتے دیکھا، آہنگ بدلتے دیکھا؟ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہاں دیکھا کیا یہ معمولی لذتوں کی بنیاد پر ہو سکتا ہے؟ پیارے

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

یہ تلاش خود ایک لازوال لذت ہے ایک دائمی ذائقہ ہے۔ ایک کبھی نہ اُترنے والا نشہ ہے کبھی نہ کم ہونے والی مستی ہے۔ یہ نشہ، یہ مستی خود ایک عظیم طاقت ہے۔ ایک اعلیٰ توانائی ہے۔ یہی ایسی بات کہلواتی ہے کہ

www.taemeernews.com

یہ مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

یہی مستی ہے جس نے حضرت شمس تبریز کی زبان سے اپنے ایک محبوب شاگرد کی میت پر قم باذن اللہ قم باذن اللہ، قم باذن اللہ کہتے کہتے جب شاگرد زندہ ہو کر نہ اُٹھا تو جوش میں ایک بار کہلوا دیا "قم باذنی" اور شاگرد کی میت زندہ ہو کر اُٹھ کھڑی ہو گئی۔ کام تو ہو گیا تخلیق تو ہو گئی۔ لیکن جس نے یہ مستی یہ سرشاری دی تھی اسی کی نازل کی ہوئی شریعت کی بنیاد پر حضرت شمس تبریز کی کھال کھنچوائی گئی۔ دونوں بات سچی تھی دونوں ہوئی۔ منصور کو دار پر بھی چڑھوایا گیا اور سرمد کو شہید کیا گیا لیکن کام تو دونوں کر گئے۔ اور دونوں اسی معشوق کے اشارے پر کر گئے جو پردہ رنگاری میں چھپا بیٹھا ہے۔

تو تلاش بھی جاری رہے گی اور تلاش میں دیواریں بھی کھڑی ہوتی رہیں گی دیواریں گرتی بھی رہیں گی اور جستجوؤں کا آرزوؤں کا قدم آگے بڑھتا رہے گا۔ ٹوٹے پیمانے کون ڈھونڈھنا چاہے؟ ٹوٹے پیمانوں سے کیا ملے گا؟ سب نفعی کاروبار چاہتے ہیں اور منافع کے ساتھ چاہتے ہیں لیکن کبھی کبھی ایسے کاروباری بھی پیدا ہوتے رہے ہیں جن کی تجارت جن کی دکانداری مخالف سمت چلتی ہے ؎

بازاریان عشق کی ہے طرفہ رسم و راہ
وابستۂ آہ سود ہے اِن کا زیان پر

عشق کے کاروباری کا منافع خسارا ہے۔ لوگ ایک کے ڈیڑھ چاہتے ہیں لیکن ایسے کاروباری بھی ہوتے رہے ہیں جو ایک کا ڈیڑھ کیا، اپنا ایک بھی نقصان کر کے شادیانے بجاتے ہیں۔ حضرت جنید بغدادی نے ایک دکان کپڑوں کی کھولی تجارت کرتے رہے ایک دن ایک خریدار آیا۔ اور بغل سے ایک تھان نکال کر دکھایا کہ اس میں یہ عیب ہے۔ میں لے گیا تھا۔ گھر جا کر دیکھا اندر کٹا ہوا ہے۔ حضرت جنید بغدادی بہت خوش ہوئے تھان واپس لے لیا اور وصول کی ہوئی پوری قیمت خریدار کو شکریے کے ساتھ واپس کر دی۔ اِدھر خریدار گیا اور حضرت جنید بغدادی نے ملازمین کو بلا کر کہا تم لوگ دکان کا سامان آپس میں بانٹ لو

www.taemeernews.com

اور دکان ختم کر دو۔ ملازمین حیران ہو گئے۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا میں نے منافع کمانے کے لئے دکان نہیں کھولی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو تاجر کوئی عیب دار مال خریدار سے واپس لے کر اس سے لی ہوئی قیمت اُسے پورا ادا کر دے تو اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ میں نے اسی حدیث شریف کا فرمایا ہوا ثواب لینے کے لئے یہ دکان کی تھی۔ مجھے وہ ثواب مل گیا۔ اب دکان داری کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔

حضرت آتش فرماتے ہیں :

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

اور حضرت راسخ عظیم آبادی فرماتے ہیں :

نازاں ہوں اپنے قلبِ شکستہ کی شان پر
ہے عرش کو حسد اسی ٹوٹے مکان پر

اور اقبال کہتے ہیں :

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا سے ایک دن پوچھا۔ اے اللہ میں تجھے دنیا میں کہاں ڈھونڈھوں ؟ خدا نے فرمایا مجھے ٹوٹے ہوئے دلوں میں ڈھونڈھا کرو میں وہیں رہتا ہوں۔ لیکن کون ڈھونڈھتا ہے ؟ مجھے ڈھونڈھنے میں مزا آتا ہے۔ میں ڈھونڈھتا ہوں بہ تلاش کبھی شاعری کے ذریعہ کبھی ادب کے ذریعہ کبھی عمل کے ذریعہ کبھی دعا کے ذریعہ کبھی آنسوؤں کراہوں اور آہوں کے ذریعہ اور ہر ذریعہ ایک خاص حسن رکھتا ہے کشش رکھتا ہے چاشنی رکھتا ہے۔ جن کو یہ حسن یہ لذت یہ چاشنی مل گئی وہ اسے بھلا چھوڑنے والے ہیں ؟

اب اور کسی کو کیا دیکھیں نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں
آنکھوں پہ تری صدقہ کر کے جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا

www.taemeernews.com

مجھے یہ لذت بہ چاشنی ملی ۔ اور میں حاتم طائی کی طرح کوہِ ندا سے آتی ہوئی آواز پر جا رہا ہوں میرے لئے بنگال کا سارا جادو، اودھ کی شام اور بنارس کی صبح ادھر ہی ہے ۔ دہلی کا سوہن حلوا، سوقرا کا پیڑہ منیر کا لڈو باغ بازار کا رس گلا اُدھر ہی ہے ۔ ڈھاکہ کی ململ، کشمیر کی شال، لکھنؤ کا جامہ دار میسور کا ریشم اُدھر ہی ہے ۔ عرب کے گھوڑے راجستھان کی پالکی، فورڈ کی موٹر اُدھر ہی ہے ۔ قندھار کے انار، چمن کے انگور، کشمیر کے سیب الہ آباد کے امرود سب کچھ تو اُدھر ہی ہے ۔

اِدھر کیا دیکھتے ہو؟ اس طرف کیا ہے؟ اُدھر دیکھو
عشق نے ہم کو خواب میں اپنا شیش محل دکھلایا ہے
رستے سے گرچہ نہیں واقف منزل ہیں پہچانے ہم

اب راستے سے بھی واقفیت ہو گئی ہے اور وہ رفتار بھی سمجھ میں آگئی ہے جو اس راستے پر چلنے اور اُس منزل تک پہونچنے کے لئے ضروری ہے لوگ بے تحاشہ آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں سیڑھیاں لگا رہے ہیں لیکن نہ آسمان کی پہچان ہے نہ سیڑھیوں کی شناخت ہے ۔ انجانی چیزوں کی شناخت میں انسان اپنی شناخت بھی فراموش کر رہا ہے جتنا اوپر جانا چاہتے ہیں ٹھوکریں کھا کر نیچے ہی گر رہے ہیں :

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

دنیا بس "ساتھ دو ساتھ دو" کے نعروں پر چل رہی ہے ۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ ساتھ کس کا دینا ہے کیوں دینا ہے بس بھیڑ ہے ایک نے ہُو کیا اور سب دوڑ پڑے اور ملتا کسی کو کچھ نہیں بس چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط ۔ کچھ القاب آداب لے کر واپس آجاتے ہیں ۔ میری سمت مخالف ہے :

ہم تو مٹی سے اگائیں گے محبت کے گلاب
تم اگر ڈھونڈھنے جاتے ہو ستارے جاؤ

www.taemeernews.com

لیکن یہ سب کے بس کا نہیں۔

یہ سمندر ہے کنارے ہی کنارے جاؤ
عشق ہر شخص کے بس کا نہیں پیارے جاؤ

بھلا یہ کس کی ہمت ہے :

دل کی بازی لگے پھر جان کی بازی لگ جائے
عشق میں ہار کے بیٹھو نہیں ہارے جاؤ

اسی لئے لوگ یہ کہہ کے الگ ہو جاتے ہیں :

موت سے کھیل کے کرتے ہو محبت عاجزؔ
ہم کو ڈر ہے کہیں بے موت نہ مارے جاؤ

کتنے ساتھی بچھڑ گئے، کوئی ترقی پسند بن گیا، کوئی جدیدیہ بن گیا، کوئی جوڑ توڑ کے سہارے چلنے لگا۔ کسی نے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" پر اکتفا کر لیا کسی نے شعبدہ بازی اختیار کر لی کوئی ٹٹی کی آڑ پکڑ کر شکار کھیلنے لگا۔ سب اپنا الّو سیدھا کرنے میں لگ گئے.... اور ہم ؟

درد کا اک سنسار پکارے کھینچے اور بلائے
لوگ کہیں ہیں ٹھہرو ٹھہرو ٹھہرا کیسے جائے

بقول حضرت مولانا آزاد سبحانی صاحب کہ تمام دن شہروں کی گلیوں کی خاک اُڑاتا ہوں۔ اُن سے ملتا ہوں اُن سے مخاطب ہوتا ہوں بس ٹھیکرے بٹورتا چلتا ہوں رات کو تھک کر اپنی تھیلی اونڈیل کر کنکر پتھر ڈھیلے کھپڑے جو چنے ہیں انہیں دیکھتا ہوں کچھ کام کی چیزیں مل جاتی ہیں تو انہیں الگ کرتا ہوں اُن کے لئے کچھ پیغام سناتا ہوں ان کے لئے دعائیں کرتا ہوں پھر صبح ہوتے ہی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔

تو میں بھی بہت برسوں سے یہی کرنے لگا ہوں۔ مجھے اس میں فائدہ ہی نظر آیا نقصان کا پہلو نہیں ملا۔ جو نقصان ہے وہ قابل خیال اور قابل اعتنا نہیں..... دیکھئے میں آپ کو

www.taemeernews.com

ایک ٹوٹا ہوا پیمانہ دکھاتا ہوں یہ پیمانہ پچاس سال پہلے مجھے صحیح سالم نظر آیا تھا۔ پھر نظروں سے خیالوں سے اوجھل ہوگیا۔ ٹوٹا اور مجھے خبر نہیں اس لئے کہ میں بھی اب تک ٹوٹتا چلا جارہا ہوں پتھر سے ٹکراتا جارہا ہوں۔ بہرحال مسلم اسکول میں تھا۔ میرے گارجین اور استاد اور بزرگ ابوالفضل محمد ادریس ہیڈ ماسٹر مسلم اسکول نے مجھے اپنے ہی ساتھ اپنے مکان میں چند طالبعلموں کے ساتھ رکھا تھا۔ ایک دن شام کو وہ ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ تقریباً پچاس سال پہلے سنہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ میں نویں کلاس میں تھا۔ یہ صاحب سفید مارکین کے کرتے، سفید مارکین کی لنگی، سفید مارکین کی ٹوپی سفید گمچھا اور بادامی پمپ جوتے میں تھے۔ رنگ سیاہی مائل گندمی۔ عمر تقریباً پچپن ساٹھ سال۔ ان کے سائبان میں داخل ہوتے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے احترام سے سلام کیا مصافحہ کیا۔ وہ صاحب چوکی کے کنارے ہی پاؤں زمین پر لٹکائے بیٹھ گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے بہت اصرار سے اوپر لانا چاہا مگر انہوں نے خوش اسلوبی سے ٹال دیا اور بہت مسکین کی طرح سکڑے ہوئے کنارے بیٹھے رہے۔ کیا کیا باتیں ہوتی رہیں یہ مجھے یاد نہیں۔ میں صرف اُنہیں دیکھنے میں منہمک تھا۔ اُن میں اتنی سادگی اور مسکینی نظر آئی کہ وہ اُن کی عظمت اور سادگی اور بلندی بن گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھے مصافحہ ہوا۔ اور ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں باہر تک پہونچانے گئے ہیڈ ماسٹر صاحب واپس آئے تو بغیر ضرورت بھی اور اپنے ماسٹر صاحب کے درمیان سن و سال درجہ مقام اور منصب کے فرق کے باوجود بے ساختہ اُن سے پوچھ بیٹھا۔

"ہیڈ ماسٹر صاحب .... یہ کون تھے؟"

انہوں نے بڑی عقیدت سے نرم لہجے میں

"مولوی محمد لاڈلے صاحب" کہا اور گھر کے اندر چلے گئے۔

نام، صورت، لباس اور مسکینی یہ چوہدی اسی وقت دل کے اندر اتر گئی۔ اور اترتی رہ گئی۔ میں نے نویں کلاس کا امتحان دیا۔ ڈبل پرموشن ہوا۔ انٹرنس پاس کیا۔ پورے

www.taemeernews.com

صوبے میں پانچویں پوزیشن لائی ۔ پھر کیسا پڑھنا اور کیسا سوچنا اور کیسا دیکھنا ۔ چند روز بیمار باپ کی خدمت کی اُنہیں سپردِ خاک کیا پھر تین سال بیمار بھائی کو لئے لئے پھرا وہ مرا اسے دفن کیا ۔ اور پھر ایک اندھیرا چھایا اس اندھیرے میں بجلی کی چمک بادل کی گرج ، آندھیوں کی سنک شعلوں کی لپک کے بعد جب صبح ہوئی تو آشیاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور میرے لئے زخموں کی کسک اور اشکوں کی لہک کے سوا کچھ باقی نہیں رہا تھا ۔ انہیں اب تک لئے پھر رہا ہوں ۔

یہ جو زخم دل کو پکائے ہم لئے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی ناشناسِ مزاجِ غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

تو اس حال میں بھی مولوی محمد لاڈلے صاحب کا نام اُن کا چہرہ لباس اور سکینی کبھی کبھی ذہن کے پردے پر اُبھر آتی ۔ اتنی فرصت نہیں ملتی تھی کہ اس چوہدری میں اضافہ کروں مگر پچاس سال بعد مولوی صاحب نے مجھے خود ڈھونڈھ نکالا ۔ ابھی دو سال پہلے میں کشمیری کوٹھی شاہ ریاض صاحب کے یہاں بیٹھا تھا ۔ یہ محلہ اور یہ مکان اور یہ شاہ صاحب میری سسرال کے پڑوس والے ہیں اس لئے برس دو برس کے بعد سلام کلام خیریت مزاج ہو جاتی ہے ۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی کی زبان سے مولوی محمد لاڈلے صاحب کا نام کسی نسبت سے نکل آیا ۔ مجھے جیسے کسی نے بغل میں ہاتھ ڈال کر اٹھا کر کھڑا کر دیا ۔

"آپ مولوی لاڈلے صاحب کو جانتے ہیں ؟"

"ارے وہ تو میرے پڑوسی ہی تھے ۔"

"آپ مجھے ان کا مکان دکھائیں گے ؟"

وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ یہ میرے کالج اور یونیورسٹی کے ہم سبق ہم مزاج ، ہم خیال سید سعید رضا اگر سیاح ثاقب صاحب کے صاحبزادے ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول تھے ۔ کالج یونیورسٹی کے زمانے تک اور اس کے بعد بھی بہت برسوں تک میرے پرسان حال رہے ۔ ہم دونوں ملتے رہے پھر گردشِ روزگار انہیں اِدھر اُدھر پھراتی رہی اور میری

www.taemeernews.com

آوارگیٔ دل درد کے صحراؤں کی بادیہ پیمائی میں مصروف رہتی ہے۔ کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس دن ملاقات ہوئی تو یہ کرشمہ ہوا اور وہ مجھے لئے ہوئے نون کے چوراہے کی گلی میں قادر بخش کی مسجد کے قریب ایک مکان میں لے گئے۔ گلی سے لگا ہوا ایک کمرہ۔ اس میں ایک طرف ایک پلنگ دوسری طرف ایک چوکی کچھ اور گھریلو سامان کمرے سے متصل اور دوسرے کمرے سائبان اور آنگن۔ یہ شاید مولوی محمد لاڈلے صاحب کی صاحبزادی کا مکان تھا اور ان کے دو ایک نواسے چوکی پر بیٹھے تھے۔ چوکی سے لگی ہوئی دیوار میں کھونٹی سے ایک تلوار لٹک رہی تھی اور تلوار کے اوپر دو کھونٹیوں کے سہارے ایک سند چوکھٹے میں آویزاں رکھی ہوئی تھی۔ یہ مولوی صاحب کی دوسری چوہدری مجھے ملی۔ مولوی صاحب کا مکان' ان کی صاحبزادی اور نواسے' ان کی تلوار اور ان کی ایک تعلیمی سند مولانا کی تیسری چوہدری قادر بخش کی مسجد سے متصل ایک دوسری چھوٹی سی مسجد کے اوپر ایک حجرے میں مولوی صاحب کی عمر بھر کی ہم بغل چھوٹی سی کھٹولی۔ اس پر ایک نہایت سخت ناریل کے چھال کا گول تکیہ، درس کی چٹائی اور ایک گلوب یعنی دنیا کا نقشہ۔ بس ان تین چوہدریوں میں مولوی صاحب کی زندگی کی مختصر روداد ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ عرض کرنے سے پہلے یا بعد پوچھوں گا چاند پر اور کہکشاں اور مریخ تک سفر کرنے والوں سے راج بھون اور راشٹر پتی بھون کے صاحبان اعزاز سے اور جدید تاریخ نویسوں سے اور پوچھوں گا بڑی بڑی کتابوں کے مصنفوں سے اور پوچھوں گا بڑی بڑی سندوں اور ڈگریوں کے حاملوں سے اور تعلیمی ماہروں سے اور بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں اونچی اونچی کرسیوں پر درس دینے والوں سے' قصر سلطانی کی گنبدوں کے اندر رہنے والوں سے' پارلیامنٹ میں حق و صداقت و انسانیت کے دعویداروں سے' اسٹیج کے ماہرین سے' مقرروں سے خطیبوں سے' قانون ساز اسمبلیوں سے' اسکیمیں اور منصوبے بنانے والوں سے' انجمنوں سے' اداروں سے مدرسوں سے خانقاہوں سے' دنیا کے بہترین سامان تیار کرنے والے کارخانوں سے' ملوں کے مالکوں سے صحافیوں سے' شاعروں سے' ادیبوں سے' افسانہ نگاروں' ناول نویسوں سے' سیاست دانوں سے' دانشوروں سے کہ تم سب کی متفقہ اداروں نے اور متحدہ کوششوں نے کروڑوں اور

www.taemeernews.com

اربوں کے صرف سے ادھر پچاس ساٹھ سال میں کوئی ملتا جلتا ہی سہی ایک پیمانہ بھی ایسا بنایا ہے؟

نام میاں محمد، معروف بہ مولوی محمد لاڈلے۔ نسل کے قریشی یعنی قصاب۔ اساتذہ صادقپور پٹنہ کے شاگرد۔ ملک کے مختلف صاحبان علم وفن کے تربیت یافتہ اور سند گرفتہ۔ شادی خاندان ہی میں ہوئی۔ دو لڑکیاں تولد ہوئیں دونوں کی شادی اپنے بھانجوں سے کردی۔ مکان وہی تھا۔ جہاں میں گیا تھا۔ لیکن رہائش ایک چھوٹی مسجد کے اوپر حجرے میں تھی۔ وہی اُن کی رہائش گاہ، وہی آرام گاہ، وہی حجرہ اُن کی درسگاہ، وہی عبادت گاہ ریاضت گاہ۔ مولوی صاحب جس پر آرام کرتے تھے وہ چھوٹی سی چارپائی میں نے دیکھی بس زمین سے صرف ایک بالشت مشکل سے اونچی پوری لمبی اور چوڑی اتنی ہی جتنی قبر میں مُردے کے لئے جگہ بنائی جاتی ہے رسیاں ایسی موٹی اور سخت کہ شاید ہم آپ اُس پر کچھ دیر لیٹ جائیں تو کروٹیں لینے میں بدن کی کھال مجروح ہو جائے۔ اس پر ایک گول کشن نما تکیہ جسے میں نے ہاتھ میں لیا تو پتھر سے کچھ ہی کم بھاری اور سخت تھی۔ یہی کوشن مولوی صاحب کے سونے کے وقت سرتلے ہوتا تھا اور درس دینے کے وقت کہنی تلے۔ سامنے تار اور کھجور کی ملی جلی چٹائی۔ اِسی پر اُن کے طلبا بیٹھتے۔ جنہیں وہ بلا معاوضہ حدیث اور دوسرے علوم اور فنون کا درس دیا کرتے تھے۔ ان کے طلبا میں حضرت شاہ صبیح الحق صاحب سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ منگل تالاب قسم کے بھی شاگرد تھے۔ شاگردوں سے کبھی کوئی نہ معاوضہ قبول کیا نہ کبھی کوئی خدمت لی۔ ان کے ایک بہت چہیتے شاگرد نے ایک دن پاؤں دبانے کی بہت عاجزی سے اور عقیدتمندی سے درخواست کی تو بہت مشکلوں سے چند لمحوں کے لئے ٹلوے سے صرف گھٹنے تک دبانے کی اجازت دی۔

ان کا ذریعہ معاش اُن کا خاندانی روزگار نہ تھا بلکہ صبح وہ اپنے ہم پیشوں سے چمڑہ خریدتے تھے۔ ایک خاص تعداد میں چمڑے اکٹھے ہو جاتے تو اُنہیں کارخانے میں جاکر بیچ آتے۔ اور گیارہ بجے دن سے پہلے اپنے دھندے سے فارغ ہو جاتے اور اپنے درس کی ذمہ داری سنبھال لیتے۔ ظہر کے قبل درس سے فارغ ہوتے۔ ظہر کے بعد اپنی بیٹی کے گھر جاکر کھانا نوش کرتے۔ اپنی خانہ داری کا پورا خرچ بیٹی کے حوالہ کردیتے تھوڑی

www.taemeernews.com

دیر آرام کرکے پھر درس شروع کر دیتے ۔ عصر سے عشا تک کا وقت کچھ لکھنے پڑھنے میں گذارتے عشار سے فارغ ہوکر پھر بیٹی کے یہاں جاکر کھانا کھا لیتے ' پھر آرام کرتے اور عبادت و ریاضت میں مشغول ہوتے ۔ کسی کے گھر جاکر کبھی تعلیم نہیں دیتے ۔ ملنے جلنے کا معمول بہت کم تھا ۔ شاہ صبیح الحق صاحب کے والد حضرت شاہ حبیب الحق عمادی سے اکثر نشست رہتی ۔ اہل حدیث تھے ۔ مگر خانقاہ سے رغبت تھی ۔ مجلس سماع میں شرکت کرتے تھے ۔ مگر حال نہیں لاتے ۔ ایک کنارے کونے میں بیٹھے یا کھڑے رہتے اور پھر چپکے سے روانہ ہو جاتے ۔ پان تمباکو چائے حقہ سے بالکل شوق نہ تھا ۔ کوئی دوست بہت اصرار کرتا کہ ذرا سی چائے پی لیجئے تو کہدیتے کہ ذرا سا پی ہی لوں تو کیا ہوگا ۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب کے گہرے دوست تھے ۔ اور وہ پٹنہ آتے تو ان کے یہاں اسی حجرے میں قیام کرتے ۔ اسی حجرے میں ایک کتابوں کی الماری بھی تھی ۔ وہ بھی مطالعہ کرتے اور اُن کے احباب مولانا آزاد سبحانی قسم کے بزرگ بھی مطالعہ کرتے ۔

صبح کے چند گھنٹے کی مشغولی میں وہ اتنا حاصل کر لیتے کہ اُن کی ضرورتوں کی کفالت کے بعد ان کے غریب اور قابل خیال طلبار کی حاجت براری کے لئے بھی کام آتا اور مال کے ساتھ اپنی جان بھی لگاتے ۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کے لئے اپنی سائیکل پہ جاتے ٹمٹم سے جاتے اور اپنا خرچ کرتے ایک پیسہ کسی سے نہیں لیتے ۔ شہر کے اہل وسائل ان کی قدر کرتے ۔ ان کا حکم ماننے میں اپنی سعادت سمجھتے ۔ کسی کو نوکری دلوادی کسی کا کہیں داخلہ کرادیا ۔ مسٹر عبدالعزیز مرحوم بیرسٹر ان کے نہایت عقیدت مندوں میں تھے ۔ ان کی قربت کی وجہ سے مولانا بھی مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے ۔ مسٹر عزیز مرحوم ضروری امور میں ان سے مشورہ کرتے اپنی فٹن انہیں لانے کے لئے بھیجتے مگر مولانا ٹمٹم سے آتے اور اپنی جیب سے کرایہ دیتے یا سائیکل سے آجاتے ۔

سپہ گری اور کشتی سے بھی شوق تھا ۔ میں جب مولانا کے گھر کے کمرے اور چھوٹی سی مسجد کے اوپر حجرے میں مولوی صاحب کی قبر نما چھوٹی سی سخت کھردری چارپائی اور اس پر ناریل کی چھال بھرا ہوا کوشن نما بھاری اور سخت تکیہ دیکھ کر صدیوں پہلے کی ریاضت اور مجاہدے کی

www.taemeernews.com

یاد تازہ کرتا ہوا۔ اور دل ہی دل میں سوچتا ہوا کہ اس بیسویں صدی میں ابھی پچاس سال پہلے بھی ہماری بغل میں ہماری آنکھوں کے سامنے ایسی دھڑکتی ہوئی زندگیاں بھی تھیں جن کے ذریعہ ہزاروں کے دل دھڑکتے تھے۔ جو سب کے لئے بہت کچھ تھے لیکن اپنے لئے کچھ بھی نہیں تھے۔ جنہوں نے اپنی ساری کائنات، اپنا درد، اپنا علم اپنی صلاحیت اور اپنی ظاہری باطنی تمام کائنات اوروں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے جسم کی ضروری راحتیں بھی دوسروں کے لئے وقف تھیں وہ مشقت اور مجاہدوں میں بسر کرتے تھے تاکہ ان کے حصہ کا ضروری آرام بھی دوسروں کے کام آجائے۔ یہ سوچتا ہوا گذر رہا تھا۔ راستے میں ایک خوشحال شخص کا مکان تھا۔ سائبان میں دور تک کرسیاں پڑی تھیں اور چوکی اور بنچ کے درمیان ایک شخص بیٹھا تھا تقریباً ستر سال کی عمر۔ معمولی دھوتی اور نیم آستین مگر بدن کھلا ہوا اور کسرتی۔ سعید رضا گھر نے کہا یہ رامو پہلوان کا بیٹا گنگا پہلوان ہے۔ رامو پہلوان کشتی میں مولوی لاڈلے صاحب کا ساتھی تھا اور گنگا دونوں کا شاگرد۔ میں مکان میں داخل ہوگیا اور کہا مولوی لاڈلے صاحب کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ گنگا پہلوان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور پچاس سال پہلے اس دور کے بوڑھے اور سن رسیدہ لوگوں سے مل کر زندگی کی حرارت اور خوشبو جو میں محسوس کرتا تھا وہ حرارت کی ہلکی سی لہر مری رگوں میں دوڑ گئی اور اس خوشبو کی ایک نازک سی موج مری ناک میں داخل ہوگئی۔ گنگا پہلوان بولا اور اس کی آواز اس دور سے مختلف نظر آئی۔ اس میں نقلی چھنک نہیں تھی۔ اس میں ایک گونج تھی جو کسی قدیم گنبد کو یک بیک کھول دینے سے نکلتی ہے۔ جیسے کسی گذری ہوئی دنیا سے کوئی بول رہا ہو جس میں درد کی کسک محبت کی مٹھاس تعلق کی گرمی ہو۔ وہ زبان قدیم اردو بول رہی تھی جیسے نئی اردو کی چھاؤں اس پر نہیں پڑی ہو۔ گنگا بولا۔ مولوی صاحب میرے پتاجی کے ساتھی تھے دوست تھے پیارے تھے۔ میں دونوں کا عزیز تھا۔ میرے پتاجی اور مولوی صاحب ایک ہی درجے کے ہاتھ پاؤں اور قوت والے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پٹخنے۔ مقابلہ میں دونوں شیر تھے اور ملنے میں دونوں کبوتر۔ مولوی صاحب اسی بغل والی مسجد میں رہتے تھے۔ دنیا سے اُن کو کچھ نہیں لینا تھا اور دنیا کو سب کچھ دینا تھا۔ وہ اپنا کپڑا

www.taemeernews.com

خود سیتے۔ خود پیوند لگاتے۔ اپنی مسجد کی خود صفائی کرتے اور خود ہی مرمت بھی کرتے تھے۔ اور صبح کے سناٹے میں جب وہ مسجد میں اذان دیتے تو درد کی ایک جوالہ اُن کی آواز سے اُٹھتی ہواؤں میں گھل مل جاتی اور ہم سب کے سینوں میں اُتر جاتی۔ میں زیادہ دیر تک نہ سن سکا اور نہ بیٹھ سکا۔ میں نے کہا گنگا جی میں یہ بھوک اور یہ پیاس بھول جانا چاہتا ہوں آپ کے پاس دیر تک بیٹھوں گا تو میری پیاس بہت بڑھ جائے گی۔

مولوی لاڈلے صاحب، اپنے شاگردوں کو حدیث و تفسیر پڑھاتے اور آج کے ماہر فن کی طرح اپنی قبر نما چارپائی کے قریب رکھے ہوئے دنیا کے نقشہ سے حدیث و تفسیر کے تاریخی اور جغرافیائی پہلو پر روشنی ڈالتے۔ اُس موٹی رسّی کی کھردری چارپائی اور ناریل کی چھال کا سخت تکیہ زمین سے ان کا گہرا رشتہ قائم کرتا اور وہ زمین کے اندر ہی اندر اپنے دل کو حدیث اور قرآن کے محلِ نزول پر لے جاتے وہاں سے جو کچھ لاتے اپنے شاگردوں کو سپرد کر دیتے۔ ان کے شاگردوں میں ایک بار ایک ستر بہتر سالہ ریٹائرڈ کانسٹبل داخل ہوا۔ مولوی صاحب اس کو پڑھاتے اور کہتے میاں بڈھا طوطا بھی کہیں پڑھتا ہے مگر بایں ہمہ اسے بھی اتنا پڑھا ہی دیا کہ شرح ملا جامی، ترمذی شریف وغیرہ کے ذریعہ قرآن کچھ سمجھ ہی لے۔ ان کے ایک شاگرد محلہ بٹاؤ کنواں کے مولوی خدا بخش تھے۔ اچھے شاگرد تھے۔ ایک بار وہ آموختہ پڑھ رہے تھے۔ ایک لفظ کے معنی بھولے۔ دوسرے اور تیسرے چوتھے پانچویں دن تک وہ آموختہ میں اس لفظ کے معنی بھولتے ہی رہے لیکن مولوی صاحب نے خود بتایا نہیں۔ چھٹے دن مولوی خدا بخش حضرت مولانا شاہ حبیب الحق صاحب سے اُس لفظ کے معنی پوچھ کر لائے آموختہ سنایا اور لفظ کے معنی بتا دیئے مولوی صاحب بے اختیار بول اُٹھے۔ تو شاہ حبیب الحق سے پوچھ کر آرہا ہے۔ میں تیرے ہی حلق سے اس لفظ کے معنی نکلوانا چاہتا تھا۔ اب آگے تو میری شاگردی کے لائق نہیں ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے پھر انہیں نہیں پڑھایا۔

مولانا کی لڑکی کے مکان میں کھونٹی سے ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ بڑی حد تک زنگ خوردہ تھی۔ تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال کر مجھے بھی سنسنی سی ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب تلوار

www.taemeernews.com

بھی گرفت پہچانتی تھی۔ اور تلوار کے قبضے سے ایک برقی رَو جسم میں بھی دوڑ جاتی تھی۔
بہت دنوں تک تلوار کا اور میرا یہی ساتھ رہا۔ گھسو خلیفہ کی شاگردی میں اس لذت سے آشنائی ہوئی۔ اور سسرال میں پہلی شب دیوار سے ایک حسین تلوار لگی دیکھ کر خواہش ہوئی تھی کہ جہیز میں اور کچھ ملتا نہ ملتا مگر یہ تلوار ضرور مل جاتی۔ خواہش کا اظہار کیا تو انکار ہوا۔ مگر گھر آکر جب جہیز کا سامان کھلا تو بستر میں ریشمی غلاف میں لپٹی ہوئی وہ حسین اور نازک تلوار بھی تھی۔
بہرحال تو مولوی صاحب کے گھر۔ چوکی کے اوپر ٹنگی تلوار ہاتھ میں لی تو ایسا لگا کسی بیوہ کی افسردہ پیشانی دیکھ رہا ہوں۔ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ یہ تلوار مولوی لاڈلے صاحب کی ہے۔ مسجد کے اوپر حجرے میں قبر نما چارپائی پر مولانا کے ساتھ یہ تلوار بھی ہم بغل رہتی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے فسادات میں مولانا کی ذات پورے علاقے کی قوت اور توانائی کا ذریعہ تھی۔ اُسی دوران ایک آخر شب مولانا اسی پلنگڑی پر آرام فرما رہے تھے کہ "جے" کے نعرے بلند ہوئے مولانا کی آنکھ کھلی اور وہ اللہ اکبر کے نعرے کے ساتھ تلوار لئے ہوئے مسجد کی چھت سے نیچے گلی میں کود گئے۔ مولانا کا سن وسال اِس کا متحمل نہ تھا۔ مگر جوش شہادت میں یہ تحمل قائم نہ رہ سکا اور اونچی چھت سے نیچی گلی میں کودتے ہوئے مولانا کا سر کسی سخت دیوار سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔

یہ تحقیق نہیں کر سکا کہ اِس شدید زخم خوردگی میں مولانا کتنے روز زندہ رہے۔ انہوں نے اسپتال یا کہیں جانے سے انکار کر دیا۔ مسجد ہی میں صف کے ساتھ انہیں لٹا دیا گیا۔ سر شمال اور پاؤں جنوب۔ مولانا کے پاؤں سے لگ کر ہی نماز کی صف شروع ہوتی اور مولانا اسی عالم میں نماز باجماعت ادا کرتے رہے اور اسی عالم میں انتقال فرما گئے۔

ڈوبنے والو نہ گھبراؤ ہم آتے ہیں

اسی روز میں نے مولانا کی قبر کی بھی زیارت کی جو ایک نہایت کشادہ مقام پر نہایت پُرفضا اور پرسکون مقام پر بہت نمایاں اور بہت مخصوص ہے۔ مولانا کی قبر سے اس مقام کا تقدس اور اس ماحول کا حسن بڑھ گیا ہے۔ جنازے کا عالم کیا تھا کیا بیان کیا جائے یہ تفصیل لکھنے

www.taemeernews.com

کی ضرورت نہیں یہ غیر ضروری ہے ۔ مولانا کی زندگی سے ہمیں تعلق ہے اور وہی ہمارے لئے سرور، انبساط، سرشاری اور وقار کا سبب ہے ۔ اُن کی موت کے بعد ان کا سارا معاملہ اُن کے مالک کے ساتھ ہے۔ اس میں ہم شامل نہیں ہو سکتے اور نہ اسے ہم بیان کر سکتے ہیں ۔ چند سال جی کر جو نمونہ وہ پیش کر گئے وہ پوری کی پوری ہمارے لئے ہے ۔ اس کے بعد پوری کی پوری ان کے لئے ہے اس سے ہمیں کچھ نہیں ملے گا ۔

www.taemeernews.com

میں نے مکتب کی درسی کتابوں کے بعد سب سے پہلی اردو کتاب قصص الانبیاء پڑھی جو بہت بڑی تقطیع پر بہت جلی حرفوں میں لکھی ہوئی تھی۔ اور سب سے پہلا اُردو ناول فسانۂ خورشیدی پڑھا جن میں صرف چھ کردار تھے۔ بڑی بیگم، چھوٹی بیگم، مشتری بیگم خورشیدی بیگم، نواب آسمان جاہ اور نواب تقی خاں۔ گرچہ ناول میں شروع تا آخر در اصل چار ہی کردار ہیں، مشتری بیگم، خورشیدی بیگم نواب آسمان جاہ اور نواب تقی خاں۔ ضمناً کچھ کرداروں کے صرف نام ہیں اور کچھ کرداروں کی ہلکی وقتی ہنگامی جھلکیاں ہیں۔ سب سے پہلا رسالہ نیرنگ خیال پڑھا جس کے سرورق انڈین شیکسپیر آغا حشر کاشمیری کی عمر آخر کی تصویر تھی۔ نیشنلسٹ لباس میں کھدر کا چست پاجامہ، کھدر کا کرتہ اور کھدر کی کشتی نما ٹوپی۔ وہ ٹوپی نہیں جو بہت بعد سے دور حال تک اپنی مخصوص تراش کی وجہ سے گاندھی ٹوپی کہی جاتی ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گولڈن فریم کا چشمہ، پاؤں میں کشمیری ناگرہ اور ہاتھ میں کتاب۔ ٹیبل کے سامنے صوفے پر کسی خیال میں غرق۔ اور اسی رسالے میں ان کے آخری اردو ڈرامہ کا ایک حصہ "عشق و فرض" کی سُرخی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ جسے اُس دور کے بعض اہل قلم نے "اردو ادب کا قرآن" کہا اور جو بعد میں "رستم و سہراب" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا اور اب داخلِ نصاب ہے۔ میں اُنہیں اس تصویر کے قبل کلکتہ میں جیتا جاگتا، سُرخ و سفید دیکھ چکا تھا۔ جب ان کا ہندی ڈرامہ "دل کی پیاس" الفنسٹن تھیٹر کے اسٹیج پر چل رہا تھا اور کئی برسوں تک ان کے انتقال کے بعد بھی مسلسل اسٹیج پر پیش کیا جاتا رہا۔ اور اسی دور میں کلکتہ کے ایک رسالے "فلم اسٹیج" میں ان کی شاید آخری غزل شائع ہوئی تھی۔ جسے رسالے کے ایڈیٹر صاحب نے آغا حشر صاحب سے رسالے کے لئے فی البدیہہ کہلوائی تھی۔

www.taemeernews.com

جس کا ایک مطلع ایک شعر اور مقطع مجھے یاد ہے سُن لیجئے ؎

ملی پھر مہرباں ہو کر نگاہِ دلستاں ہم سے
کرے گا صلح اب مجبور ہو کر آسماں ہم سے
کیا اے حیرت نظارہ آخر تو نے شرمندہ
شکایت کر رہے ہیں جلوہ ہائے رائیگاں ہم سے
غزل اے حشر لکھنا صرفِ بیجا ہے تخیل کا
مگر لکھوا ہی لیتے ہیں ہمارے مہرباں ہم سے

اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس زمانے میں ان کی آخر عمر کے معاشقے کی داستان خواص کے زبانوں پر تھی ۔ اور میں نے اس خاتون کو دیکھا بھی جو ایک تعلیم یافتہ شباب رفتہ کی یادگار پنجابن عورت تھیں ۔ مس نہیں تھیں مگر مس مختار بیگم کے نام سے مشہور تھیں ۔ خوب گاتی تھیں اور بہت اچھی آواز سے گاتی تھیں ۔ اور اسی زمانے میں سُنا کہ چند سال پیشتر کلکتہ کے مشہور زمانہ میوزیم میں فردوسی کی سالگرہ منائی جا رہی تھی اور صدارت کے لئے دہلی سے سفیر ایران آ رہے تھے ۔ مدعوین میں آغا حشر بھی تھے ۔ آغاز جلسہ سے کچھ قبل اطلاع آئی کہ سفیر ایران کسی علالت کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے ۔ تو آغا حشر کو صدارت کے لئے مجبور کیا گیا اور انہوں نے فردوسی کی حیات اور شاعری پر فارسی زبان میں دو گھنٹے برجستہ تقریر کی ۔ اور اسی زمانے میں یہ بھی سنا کہ آغا حشر مولانا ابوالکلام آزاد کے مُربّی بھی رہ چکے تھے ۔ جب وہ اپنی ابتدائی ڈرامہ نگاری کے دور میں بمبئی کے پارسی تھیٹر سے متعلق تھے ۔ اور مولانا بھی اپنی نوجوانی میں وہاں پہونچے اور دونوں ذہانت کے پُتلوں کا وہاں ساتھ رہا ۔ جب آغا حشر کا بھرپور شباب تھا اور مولانا عہدِ شباب میں قدم رکھ چکے تھے ۔ آغا حشر پر بھی مذہبی غلو تھا ۔ اور وہاں کے اکثر عیسائی علماء سے مناظرہ اور مکالمہ کرتے تھے ۔ مولانا کی خطابت اور طرزِ تحریر پر آغا حشر کی بے مثال ذہانت کی پرچھائیاں ضرور پڑی ہیں ۔ اردو نظم و نثر پر آغا حشر کی طبیعت رسا کس حد تک اور کس نوعیت سے قابو پا چکی تھی ۔ یہ ان کے ڈراموں سے اور ان کی دو طویل نظموں سے ظاہر ہوتا ہے ۔ نثر تو ڈرامہ کے

www.taemeernews.com

محدود تقاضے کی مجبوری سے اپنے جوہر کا خاطرخواہ مظاہرہ نہیں کرسکی۔ لیکن شاعری میں آغا حشر کی قوت گویائی اور تخیلی استعداد کا پتہ ان کی دو طویل نظموں "آبِ زم زم" اور "شکریہ یورپ" سے چلتا ہے۔ میں نے بچپن میں انہیں پڑھا۔ کم استعدادی کے باوجود نظم کے اکثر حصے زبان پر چڑھ گئے پھر بھول گیا۔ دو سال قبل جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانے میں ان دونوں نظموں کے قدیم نسخے نظر آئے۔ میں نے ایک طالب علم کو اُس کی نقل حاصل کر لینے کو کہا۔ موقع ہوا تو اس پر الگ کچھ لکھوں گا۔

سب سے پہلا روزنامہ اخبار جمہور اور ہفتہ وار پرچہ چوبک نگاہوں سے گذرا۔ جمہور کلکتہ سے مولانا عثمان نکالتے تھے اور چوبک عنایت دہلوی کی ادارت میں۔ اس وقت اخبارات صحافت کا نمونہ ہوتے تھے۔ ادب اور شاعری صحافت کے دائرے میں نہیں تھی۔ ملکی وطنی اور قومی سیاست اور مذہب اخباروں کا بنیادی موضوع ہے۔ خبروں کے علاوہ انہیں پر دروٹک منطقی گفتگو ہوتی تھی۔ ادب کی چاشنی "فکاہات" کے کالم میں رہتی تھی۔ جو اچھے اردو اخباروں کا بہت اہم کالم تھا۔ "جمہور" اور "عصر جدید" کلکتہ کے دو معتبر اور باوقار اردو روزنامے تھے۔ جن کے لکھنے والوں میں اسلامیہ ہائی اسکول کے ماسٹر عثمان صاحب بھی تھے جو کچھ دنوں کلکتہ کارپوریشن کے میئر یا ڈپٹی میئر بھی رہے تھے۔ اور مولانا عبدالرؤف صاحب داناپوری۔ ماسٹر عثمان صاحب بہار شریف ہی کے علاقے کے تھے۔ اسلامیہ اسکول کلکتہ کی تاریخ ماسٹر عثمان صاحب کے پر وقار علمی دور کی گواہ ہے اور کلکتہ کارپوریشن کی تاریخ یہ بتائے گی کہ بہار شریف کے ایک دیہاتی مسلمان ایڈمنسٹریٹر نے اس کے اوراق پر کہاں کہاں مہر لگائی ہے۔

مسٹر عنایت دہلوی اڈیٹر "چوبک" اسٹیج نقاد تھے۔ مجھے ان کے کردار سے پوری واقفیت نہیں۔ یہ زمانہ میرا ابتدائی تعلیمی دور تھا۔ مکتب سے فارغ ہو کر اسکول کی پڑھائی میں داخل ہوا تھا۔ پینتالیس سال سے زیادہ کی بات ہے۔ گھر کی جدائی وطن کی جدائی وطن کے لوگوں کی مفارقت سے دل ٹوٹا ہوا اور کلیجہ چھلنی رہتا تھا۔ اکثر آنکھیں آنسوؤں سے

www.taemeernews.com

تر رہتی تھیں ۔ نیند کم آتی تھی ۔ دوست احباب نہیں تھے ۔ اسکول کے ساتھیوں سے ساتھ نہیں تھا ۔ تعلیم ماسٹروں کے ذریعہ ہوتی تھی ۔ بس مطالعہ یا خاموش بیٹھنا ' سوچنا اس زندگی میں بہت کم سنی ہی میں نگاہوں میں باریکی دل میں نزاکت اور خیالوں میں تیزی بھر دی تھی ۔ اکثر وہ باتیں نظر آجاتیں جو شعور کی بالیدگی کی علامتیں ہیں ۔ مثلاً ہر چیز میں پہلو خوبی کا ڈھونڈھ لینا ۔ تنہائی اور افسردگی کی وجہ سے کچھ سن رسیدہ دوستوں نے اسٹیج اور فلموں کی طرف متوجہ کر دیا تھا جن کی طرف تیزی سے دوڑ گیا ۔ اس دور کا اسٹیج اور اس دور کی فلمی دنیا آج کے کالجوں اور اسکولوں کو تو چھوڑیئے مدرسوں سے زیادہ اچھی تربیت گاہیں تھیں ۔ طبیعت میں جلا خیالات میں جولانی اور محبوبی کردار میں نفاست شرافت اور سنجیدگی پیدا کرتی تھیں ۔ اس دور کے اسٹیج اور فلموں میں مذہبیات کا گہرا دخل تھا ۔ مذہبیات جن ڈراموں کا موضوع نہیں ہوتا تھا ' ان میں بھی بنیادی طور پر ایک صالح مذہبی زندگی کی گہری پرچھائیاں رہتی تھیں ۔ مزاحیہ کرداروں میں بھی گہرا اصلاحی اور تعمیری پہلو پوشیدہ رہتا تھا ۔ نسوانی کرداروں میں بھی ایسا اہتمام رہتا تھا ۔ ان کا لباس ' ان کے چہرے کا انداز ' اُن کی رفتار و گفتگو کا طور طریقہ ' لہجہ ' اسلوب اشارے کنائے ایسے رہتے تھے کہ مجھے اب یہ بات یاد آتی ہے کہ عظیم آباد کی طوائفوں کے یہاں شرفا کی اولاد تہذیب آداب نشست و برخاست ' طرز گفتگو ' متانت ' ذہانت سیکھنے کو بھیجی جاتی تھی ' وہ کہانی نہیں حقیقت ہوگی ۔

میں نے پہلا اسٹیج ڈرامہ " ویر بالک " دیکھا جو آغا حشر کے قومی اور وطنی جذبات کا آئینہ ' ہندوستانی تحریک آزادی کے موضوع پر چار بے مثال ڈراموں میں اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی ۔ اس سلسلے کے دوسرے تین ڈرامے (۲) پرتمی بالک (۳) دھرتی بالک (۴) بھارتی بالک ' یکے بادیگرے لکھے گئے اور میں نے دیکھے ۔ میں اسٹیج اور فلم کے تہذیبی کردار کے متعلق عرض کر رہا تھا ۔ سب سے پہلی ہیروئن جو اسٹیج ڈرامے میں مجھے یاد ہے وہ منشی شمس لکھنوی کے ڈرامے " تلوار کا دھنی " میں شوکت کی بیوی " نازیہ " تھی ۔ لکھنؤ کی ایک طوائف " مس منی بائی " یہ کردار انجام دیتی تھی ۔ میں دیہاتی ماحول معاشرے میں نشو و نما پانے والا ۔

www.taemeernews.com

شوکت کی بیوی نازیہ کو اسٹیج پر دیکھ کر بھول گیا کہ میں کلکتہ کے مشہور الفریڈ تھیٹر کے اسٹیج پر ایک ڈرامہ کی ہیروئن کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگا کہ میری بڑی بہن محمودہ باجی ہیں۔ اتفاق سے قد و قامت اور خد و خال میں بھی مشابہت تھی۔ اور لباس؟ پوری آستین کا ٹخنوں تک کرتہ۔ کلائی پر آستین بٹن کے ساتھ چست۔ پوری آستین اور پورا گھیر خوب ڈھیلا ڈھالا۔ چست پاجامہ اور شلوار کے درمیان کی قسم کا کوئی پاجامہ گھٹنوں پر ایڑی کے پاس بٹن سے کسا ہوا سفید ڈوپٹہ سر کو پیشانی سے ڈھانکتا ہوا۔ کندھوں سے ہوتا ہوا کمر سے لپیٹ کر گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ جس نے نیم برقعہ کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ یہی انداز پورے ڈرامے میں یہی لباس رنگ اور تراش خراش کی تھوڑی تبدیلی کے ساتھ قائم رہا۔ اور پورے ڈرامے میں یہی ایک کردار عورت کا اہم تھا۔ دوسرا کردار نارسوس کی ملکہ کا تھا جو اہم نہ تھا۔ منی بائی کئی سال تک، کم از کم ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۰ء تک تھیٹر کے اسٹیج پر اہم کردار انجام دے کر شہر میں مشہور رہی مگر کسی نے اسٹیج سے باہر کسی مقام پر اُسے نہیں دیکھا۔

تو یہ اسٹیج کی دنیا تھی۔ اور اسی اسٹیج کی دنیا کے نقاد مسٹر عنایت دبلوی ایڈیٹر چوبخ کلکتہ تھے۔ ان کے ہفتہ وار پرچے کا مرکزی موضوع اسٹیج کے ایکٹروں اور ایکٹریسوں کی کارکردگی کا طنزیہ جائزہ ہوتا تھا۔ تعریف اور تنقید دونوں کے لئے وہ انداز طنز و مزاح کا ہی اختیار کرتے۔ مرے اس دور کے کچے شعور اور نابالیدہ ذہن یہی فیصلہ کرتے۔ میں انہماک سے ان کے خیالات اور فیصلوں کا مطالعہ کرتا۔ اور تحریر کے پس پردہ بڑی حد تک سچائی اور صداقت نظر آتی۔ اِس نوعیت کے پرچوں میں دو ایک پرچے عنایت صاحب کی مخالفت میں بھی تحریریں شائع کرتے۔ ان کے کارٹون نکالتے اور مضحکہ خیز طرز انداز میں ان کے کردار اور تحریروں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے۔ چوبخ کے اکثر ہم عصر ہفتہ وار پرچے عموماً عنایت صاحب کے مخالف حلقے سے متعلق تھے۔ مگر وہ تنہا میدان کارزار میں چوگنی لڑتے تھے۔ میں نے چند ایک بار انہیں دیکھا۔ وہ پرانی وضعداری کے رسیا تھے۔ کبھی بازار میں شیروانی اور ٹوپی کے بغیر نہ دیکھے گئے۔ سانولے رنگ کے بلند و بالا موزوں قد و قامت کے ادھیڑ آدمی۔ گھونگھر دار بال سیاہ مخمل کی ٹوپی سیاہ

www.taemeernews.com

عینک، چوڑی مہری کا پاجامہ۔ کالر تک بٹن لگائے ہوئے شیروانی ہاتھ میں چھوٹا سا بستہ مسکرا کر باتیں کرتے۔ اپنی تحریروں کے برعکس۔ کم گفتار، سنجیدہ غیور اور مستغنی قسم کے انسان۔ ان کے مخالف گروپ میں مسعود صابری اور ظفر تبریزی صاحب بہت پیش پیش اور نمایاں تھے۔ جس زمانے میں چونچ اور اس کے مخالفین کی باہم آویزش سے صحافتی محفل گرم تھی اُس زمانے میں الفنسٹن تھیٹر میں ایک نئی ایکٹریس کی بڑی دھوم تھی۔ شاید آپ لوگوں میں کسی نے اس کا نام سنا ہو۔ کلکتہ کے اسٹیج اور صحافتی دنیا میں ہر زبان پر اس کا نام تھا۔ بازار، محفلیں، چائے خانے، ہوٹل اس کے ذکر سے گرم تھے۔ جس طرف جائیے جہاں آرا کجن بیگم موضوع گفتگو ہوا کرتی تھی۔ لمبی، پتلی دبلی نازک گوری چٹی نہیں ابرو والی جیسی حسین نہیں مگر پُرکشش، ادا بہت شیریں۔ گلے میں رس نہیں تھا۔ مگر آواز کی نزاکت وہ کمی پوری کر دیتی۔ اس کا اپنا سارنگیا تھا جس نے اس کی آواز کے ساتھ سارنگی کی آواز کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اور سارنگی کی رسیلی آواز کجن کی بے لچک آواز کو رسدار بنا دیتی۔ سارنگی اور اس کے گلے کی تان آپس میں یوں مل جاتیں کہ دونوں کی آواز میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا۔ اسی لئے جب وہ گاتی تو اسٹیج کا آرکسٹرا اپنی آواز دھیمی کر دیتا تاکہ سارنگی کی آواز بلند ہو کر کجن کے گلے کی آواز کو اپنی آغوش میں لے لے۔ وہ طوائف تھی۔ بہت زیادہ بے حجاب تو نہیں تھی مگر اس دور کے اسٹیج کی روایتی سنجیدگی اس کے انداز سے گھائل ضرور ہو جاتی اور یہ بات عنایت صاحب کو بہت گراں لگتی اور وہ اپنے پرچے میں جہاں آرا کجن کے کردار کو اپنی تنقیدی طنزیہ نگاری کا گہرا نشانہ بناتے۔ اور ان کا ایسا کرنا ان کے ہمعصروں کو جو جہاں آرا کجن کے مداح اور حاشیہ نشیں تھے چراغ پا کر دیتا اور ان کے مخالف پرچے اکثر عنایت صاحب پر کبھی کبھی غیر سنجیدہ انداز میں اعتراض کرتے۔ اسی دوران الفنسٹن تھیٹر میں 'اندر سبھا' اسٹیج کیا گیا۔ خصوصیت یہ تھی کہ ڈرامہ کے مردانہ کردار بھی ایکٹریسوں نے ادا کئے۔ راجہ اندر لال دیو کالا دیو وغیرہ کا کردار بھی عورتوں نے ہی مردانہ لباس پہن کر ادا کیا۔ جہاں آرا کجن گلفام بنی اور مہ جبیں ناز سبز پری۔ اس ڈرامے میں سبز پری اور گلفام کے ایک عاشقانہ منظر میں دونوں کا قدم اظہار محبت کے دوران کچھ غیر سنجیدہ اور

www.taemeernews.com

اسٹیج کے روایتی اعتدال سے باہر ہوگیا۔ دوسرے ہی دن عنایت صاحب نے بڑے تیکھے انداز میں دونوں کی خبر لی ـــــ اور سنجیدہ عوام میں کجن کی مقبولیت کا خطرے میں پڑجانے کا امکان بڑھ گیا پھر کیا تھا مسعود صابری صاحب اور ظفر تبریزی صاحب نے لکھنؤ سے کسی پھکڑ کالم نویس کو بلوایا جس نے شعلہ لکھنوی کے نام سے عنایت صاحب پر بڑے تلخ مضامین لکھے اور شاید کچھ غنڈوں نے ان کے ساتھ بدتمیزی بھی کی۔ لیکن بہرحال کجن کا دور زوال شروع ہی ہوگیا۔ چونچ بھی شاید بند ہوگیا اور جہاں آرا کجن کی ترقی کا دروازہ بھی۔

بہرحال اسٹیج اور فلمی دنیا بھی اس دور میں ایک تہذیبی ادارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے قوانین اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کے معیار کی حفاظت کی جاتی تھی۔ اور محافظ اس پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ڈرامے اور فلمیں ایسی ہوتی تھیں جن کے ذریعہ اخلاقیات کو سنوارا جاتا تھا اور سنوری ہوئی قدروں کی بھرپور حفاظت ہوتی تھی۔ میں نے اپنی کتاب "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" میں اسٹیج کی دنیا کی ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ منی بیگم، شریفہ بیگم وغیرہ ایسی ایکٹریسیں تھیں جو اسٹیج کے پیش پردہ جس انداز سے ظاہر ہوتی تھیں ویسی ہی رہنے اور پہننے کی کوشش کرتی تھیں۔ اور مرد اکٹروں میں کم از کم چار پانچ نام تو مجھے ایسے یاد ہیں جو اسٹیج کی نقلی زندگی سے زیادہ اپنی اصلی زندگی میں ثقہ، معتبر اور پاکیزہ تھے۔ مسٹر عبدالرحمٰن کشمیری، محمد نواب کشمیری، محمد آغا جان بیدل کشمیری، مسٹر محمد علی گاماں، سہراب جی کیروالا۔ مسٹر دادا بھائی سرکاری۔ مسٹر کاؤس جی پٹھکی۔ ان کشمیری اور پارسی ایکٹروں کی میک اپ شدہ صورتیں راتوں کو اسٹیج پر جیسی نظر آتیں دن کو کبھی کبھی باہر نکلتے تو ان کا پہچاننا مشکل ہوتا۔ ان کے چہرے گویا دعوتِ نگاہ دیتے کہ دیکھو ہم اصلی روشنی میں کیا ہیں اور راتوں کی نقلی روشنیوں اور فوکس کی رنگینیوں میں کیا نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے نظر آتے جیسے ان کے دل ٹوٹے ہوئے ہوں، زندگی سے بیزار ہوں۔ یوں سر جھکائے چلتے جیسے مجرم ہوں گنہگار ہوں۔ وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ اسٹیج سے باہر بہت خاموش سنجیدہ اور مشغول زندگی گذارتے تھے۔ عبدالرحمٰن کشمیری اور محمد نواب کشمیری کے چھوٹے بھائی آغا جانی کشمیری شاعر تھے۔ بیدل تخلص کرتے۔ ہاں الفنسٹن تھیٹر کے ایک بہت بڑے کیرکٹر ایکٹر

www.taemeernews.com

ماسٹر محمد اسحاق تھے جو اکثر ایکٹروں کے استاد تھے۔ اسٹیج پر کھڑے ہوتے تو جچا جاتے۔ جو کردار بھی ادا کرتے کمال کو پہونچا دیتے۔ عموماً سپہ سالار یا وزیر یا سماجی زندگی کے اہم کردار کا رول ادا کرتے۔ اپنی رعب دار آواز، چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور مکالمے کی ادائیگی کے لہجہ طرز اور اسلوب سے ایک فضا پیدا کر دیتے۔ وہ چاندنی چوک کی ایک بڑی ٹوپی کی دوکان کے مالک تھے۔ اسی طرح ماسٹر سورج رام بھی کسی فرم کے حصہ دار تھے۔ ہمیشہ ویلن کا کردار ادا کرتے۔ بڑے موٹے تازے قد آور سیاہ فام انسان۔ یہ ویلن کی ایکٹنگ میں اتنے کامیاب تھے کہ ایک بار ایک ڈرامے میں (جس کا نام مجھے یاد نہیں) لوگ ان کے ویلن کے کردار سے اتنے برافروختہ ہوئے کہ سامعین میں بہت سے لوگ کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ چیخنے لگے اور بعضوں نے انہیں جوتے پھینک کر مارا۔ حالانکہ سب جانتے تھے کہ یہ ماسٹر سورج رام ہیں۔ انہوں نے اسٹیج پر ہی جھک کر سامعین کو سلام کیا اور جوتے اُٹھاتے ہوئے کہا "اِن تمغوں کا شکریہ"، تب لوگوں کو احساس ہوا کہ یہ ڈرامہ ہو رہا تھا حقیقی واقعہ نہیں تھا۔

انٹرنس تو میں بہت پہلے کر چکا تھا۔ اپنے مسلم اسکول کے اساتذہ سے بھی۔ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی، کے صفحات میں آپ کو اجمالی طور پر ملا چکا ہوں۔ آپ کو کچھ ایسے ساتھیوں سے ملاؤں جو مجھے یاد ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مسلم اسکول کا قیام ٹی کے گھوش اسکول کے ایک واقعہ سے ہوا جس کی تفصیل مجھے اس لئے یاد نہیں کہ میں اس زمانے میں پٹنہ نہیں آیا تھا۔ ٹی کے گھوش اسکول کے کچھ حساس مسلم لڑکے بعض غیر مسلم استادوں کے ناگوار اور نازیبا تعصب سے برافروختہ ہو کر سڑکوں پر نکل آئے۔ اور اسی سڑک پر ارادے ہوئے اور ارادوں نے اسکیم بنائی۔ پٹنہ میں بہت لوگ ہوں گے بہت لوگ تھے لیکن ٹی کے گھوش اسکول سے قریب ہی ایک شخص ان لڑکوں کو ہاتھ لگ گیا۔ حالانکہ وہ شخص عوامی نہیں تھا۔ رئیس تھا کم آمیز تھا۔ دہلی کانسل کا ممبر جسے اب ام۔پی کہتے ہیں۔ سو فیصد جاگیر دارانہ ذہن۔ انگریزوں کی اونچی سوسائیٹی سے ہم آہنگی رکھنے والا، لندن اور پیرس کی ہواؤں میں سانس لینے والا۔ اونچی ناک والا، اونچے قد والا۔ اونچی شیروانی اونچی ٹوپی اونچے خیال اونچے مزاج والا،

www.taemeernews.com

حیدر امام بیرسٹر ان لڑکوں کو مل گیا۔ اور وہ شخص اپنی تمام اونچائیاں فراموش کر کے شیروانی اتار کر، بیرسٹری اور کانسل کی ممبری کا رکھ رکھاؤ ٹھکرا کر کرتہ پاجامہ چپل پہن کر ننگے سر، شرمیلے لیکن جوشیلے لڑکوں کے ساتھ مرادپور کی دکان داروں کی دکان دوکان پھرنے لگا اور دامن پھیلا کر کہنے لگا۔ ہم ان نوجوانوں کے لیے آپ کے نونہالوں کے لئے ایک اسکول قائم کرنے کو چندے کی بھیک مانگتے ہیں۔

اس وقت لان کی مسجد سے خدا بخش لائبریری تک ترکی ٹوپی اور شیروانی پوش پُروقار، وضع دار مسلم تاجروں کی دورویہ خوبصورت دوکانیں تھیں۔ ایسے مسلم دکان دار شرافت والے، عزت والے، آبرو والے، ایمان والے، حمیت اور غیرت والے کہ انگریزوں کے دور کے عہدہ داران افیسرس، وکلا، بیرسٹر، مجسٹریٹ، منصف جج اپنی فٹن یا موٹر کاروں پر آتے دوکان میں داخل ہوتے۔ چھوٹی سی گدی یا آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے شیروانی ٹوپی میں ملبوس دوکان دار کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ سلام خان صاحب، آداب سیٹھ صاحب، مصافحہ کرتے، سامنے کرسیوں پر بیٹھ جاتے۔ خیریت اور مزاج پرسی کے بعد فہرست نکالتے۔ سیٹھ صاحب کے حوالے کرتے۔ سیٹھ صاحب ملازمین کو بلا کر فہرست سپرد کر دیتے۔ سامان پیک ہو کر سامنے آجاتا۔ کچھ نوٹوں میں، کچھ چاندی کے سکوں میں قیمت ادا کی جاتی۔ ملازم گاڑیوں میں سامان رکھ دیتے۔ پھر سلام ہوتا مصافحہ ہوتا اور رخصت۔ دام کیا جاتا نہ بھاؤ بٹتہ ہوتا۔ نہ در ملائی ہوتی۔ بس کچھ حساب دوستاں بر کاغذ ہوتا۔ کچھ حساب دوستاں در دل۔ بس یونہی کاروبار چلتا رہتا۔ دوکاندار بیٹھے رہتے خریدار آتے رہتے۔ نہ بھیڑ نہ بھڑکا۔ نہ مول نہ تول۔ تجارت کی تجارت، شرافت کی شرافت، ریاست کی ریاست، دوستی کی دوستی اور محبت کی محبت۔ ایک کام میں سب کام ہو جاتے۔ اب تو ایک کام بھی پورا نہیں ہوتا۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور ادھورے پن کا احساس دونوں طرف باقی رہتا ہے۔ نہ دوکان دار کو سیری ہوتی ہے۔ نہ خریدار کو تسلی ہوتی ہے۔ کچھ نام سُن لیجئے۔ اے حق اینڈ سنس الحمدللہ اب بھی ہیں۔ ابراہیم اینڈ سنس اب بھی ہیں۔ مگر ترکی ٹوپی شیروانی ختم ہو چکی۔ احمد علی خاں اینڈ سنس،

www.taemeernews.com

قاسم سیٹھ، بشیر حسن اینڈ سنس، ڈوکو واچ، سیٹھ ابراہیم، موسیٰ سیٹھ، قطب الدین اینڈ سنس ان کی نسل اب بھی ہے لیکن باپ دادا کا نام ختم ہو چکا ہے۔ سات سمندر پار سے نئے نام نئی کنیت، نئے القاب درآمد کر لئے گئے اور انہیں ناموں سے جانے جاتے ہیں۔

تو مسٹر حیدر امام دوکان دوکان پھر رہے تھے۔ مسلم اسکول کے لئے چندے کی بھیک مانگ رہے تھے۔ حیدر صاحب کا مکان اب نظر نہیں آتا۔ اب وہاں پٹنہ مارکیٹ نظر آتا ہے ایک مکان کی آغوش میں سینکڑوں دوکان سائن بورڈوں کے ساتھ، شوکیسوں کے ساتھ الماریوں کے ساتھ کاؤنٹروں کے ساتھ زمین سے اُبل آئی ہیں۔ پہلے ایک مکان تھا۔ اور لمبا چوڑا صحن اور باغ اور پھلواری۔ ایک طرف حسین بنگلہ اور دوسرے کونے میں فردوسی میڈیکل ہال۔ اس مقام پر آسمان کے نیچے یہی دو چیزیں نظر آتی تھیں۔ فردوسی میڈیکل ہال میں دوا بنانے کا کمرہ۔ مریضوں کے بیٹھنے کا سائبان مع کرسی اور میز۔ پیچھے نشست گاہ اور ڈاکٹر سید عبدالحفیظ صاحب، مالک فردوسی میڈیکل ہال۔ بھاری بھرکم آدمی۔ بہت لمبا کرتہ اور بہت خالتہ پاجامہ اور بہت اونچی بیل کی کامدار پالش کی ہوئی پتلے کی ٹوپی۔ سیاہ پمپ جوتہ گلے میں اسٹیتھسکوپ۔ مریضوں کو دیکھتے بھی خوش آوازی سے مزاج بھی پوچھتے۔ شفقت سے ہدایات بھی دیتے۔ اور ملنے والوں پر جملے بھی چست کرتے۔ عزیزوں کو تنبیہہ بھی کرتے۔ بیک وقت سب کام جاری رہتا۔ مریضوں کو شفا بھی ہوتی۔ نوعمر عزیزوں کے لئے دعا بھی ہوتی۔ اور سب کام پورا ہوتا اور بیک وقت ہوتا۔ شفا کے لئے الگ وقت، دوا کے لئے الگ وقت، دعا کے لئے الگ وقت نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ صاحب حیدر امام صاحب کے دوست بھی، بزرگ بھی۔ اہل مشورہ بھی اور مربی بھی۔ حیدر امام صاحب کے سامنے کوئی زبان نہیں کھول سکتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب حیدر امام صاحب کو ڈانٹ بھی دیتے۔ یہ ڈانٹ ایک بزرگ کی ایک مخلص دوست کی ایک جہاندیدہ مشیر کی ڈانٹ تھی۔ اب لوگوں نے بزرگوں کی ڈانٹ کھانی چھوڑ دی تو رکشہ والوں تک کی ڈانٹ کھاتے ہیں۔

تو حیدر امام صاحب بڑے وضع دار، بڑے خوش لباس، بڑے جامہ زیب، بیرسٹری کا پیشہ دل کو نہ بھایا۔ ریاست اختیار کر لی۔ اور میری یاد میں وہی پٹنہ کے رئیس نظر آئے۔ ان کی

www.taemeernews.com

نشست گاہ مشرقی اور مغربی طرز رہائش اور آرائش کا بہترین امتزاج تھی۔ ان کے پردے، قالین، کرسیاں، آئینے سنگاردان، میز، صوفے، تکیے، کوشن ان سب میں بیک وقت ہندستانی اور انگریزی ذوق کو بڑی خوش اسلوبی، حسن کاری اور سلیقے سے سمویا گیا تھا۔ چودھری سر ظفراللہ خاں کے بڑے گہرے دوست تھے۔ میری ابتدائی تعلیمی دور میں ایک بار چودھری صاحب پٹنہ آئے تھے۔ اور کئی دن مہمان رہے تھے۔ حیدر امام صاحب کے روزانہ ملنے والوں میں دو شخص بہت نمایاں تھے۔ اور میرے خیال میں ان دونوں سے جس قدر قربت حیدر امام صاحب کو تھی اور کسی کو نہیں تھی۔ مسٹر سلطان احمد سابق اِڈیٹر اتحاد۔ اور پھر گورنمنٹ اردو لائبریری کے مہتمم۔ اور دوسرے سید معین اللہ ایڈوکیٹ۔ سلطان صاحب کا بیشتر اُٹھنا بیٹھنا حیدر امام صاحب ہی کے یہاں تھا۔ ان دو حضرات کے متعلق انشاء اللہ آگے کچھ لکھوں گا۔ حیدر امام صاحب گھر سے باہر بہت کم نظر آتے۔ خاص خاص قسم کے تین مواقع تھے جب وہ باہر آتے۔ عیدین کی نماز کے لئے۔ کسی نہایت قریبی دوست کے یہاں تقریب میں یا جنازے کی نماز میں۔ ان کے یہاں آنے والوں کا بھی سلسلہ زیادہ نہ تھا۔ جیسا میں نے کہا وہ کم آمیز تھے۔ زیادہ تر تنہا رہتے، مطالعہ کرتے۔ ہاں ایک معمول ان کا اور تھا۔ شام کو مغرب سے کچھ قبل وہ اپنی لمبی "ہڈسن" کار میں اپنے گھر سے نکلتے۔ مرادپور سے ہوتے ہوئے لان کے میدان کا ایک چکر دیتے۔ اور اسٹیٹ بینک آف انڈیا کے سامنے والے لان کے گیٹ سے اندر لان میں داخل ہوتے۔ اور وہیں قریب کسی بنچ پر تھوڑی دیر بیٹھتے۔ کچھ بہت قریب کے دوست بھی ٹھیک اسی وقت پہنچ جاتے۔ تھوڑی دیر وہاں ان کی نشست رہتی۔ اور پھر اُٹھتے گاڑی پر بیٹھتے اور سیدھے اپنے مکان واپس چلے آتے۔

تو جناب حیدر امام صاحب نے چندہ کیا۔ چندہ تحصیل کیا اور چندہ دیا۔ اور رمنہ روڈ کے ایک مکان میں مسلم اسکول ۱۹۳۸ء میں قائم ہوگیا اور اس کے سکریٹری حیدر امام صاحب رہے۔ اور تقریباً تاحیات رہے اور پینتس چالیس سال تک رہے۔ اس پینتیس چالیس سالہ دور نظامت میں مسلم اسکول اور حیدر امام ایک دوسرے کا عکس، ایک دوسرے کا پرتو ایک دوسرے

www.taemeernews.com

کا حاصل اور ماحصل رہے۔ مسلم اسکول ان کو چلاتا تھا اور مسلم اسکول کو وہ چلاتے تھے۔ ان کی اور کوئی ہابی نہیں تھی۔ وہ اسکول سے باخبر رہے اور اسکول کو اپنے مزاج سے باخبر رکھا۔ کوئی میٹنگ اسکول کی ان کی شرکت سے خالی نہیں رہی۔ ان کے مزاج میں رعونت تھی۔ وہ اپنی رائے نہیں بدلتے تھے۔ اور انہیں کا فیصلہ فیصلۂ آخر ہوتا تھا۔ ممبر اور بھی تھے اور صدر بھی تھے مگر بات انہیں کی چلتی تھی۔ لیکن انہیں اپنے خیال' اپنی رائے' اپنے فیصلے کے منوانے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔ مزاج میں رعونت تھی مگر لہجے میں نرمی' بات میں شیرینی اور باتوں اور رایوں کو پیش کرنے کا بڑا سلجھا ہوا منطقی انداز ہوتا تھا۔ کبھی گرم نہیں ہوتے تھے۔ انداز میں سختی اور درشتی کبھی نہیں آتی تھی لیکن ان کی شخصیت سے متاثر اور ان کے انداز سے مرعوب سب ہو جاتے تھے۔ وہ لوگوں کی مانتے نہیں تھے اپنی منوا لیتے تھے۔ لیکن یوں منواتے تھے کہ منواتے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اسکول کے ابتدائی ہی دور میں ایک بار لڑکوں نے اسٹرائک کیا۔ حیدر امام صاحب اسکول میں آئے۔ ہال میں ہڑتالی لڑکوں کو بلایا۔ گفتگو ہونے لگی۔ لڑکے گرم تھے۔ اور لڑکوں کا جو لیڈر تھا وہ غصے میں سُرخ' باتوں میں سخت اور درشت تھا۔ وہ یوں باتیں کر رہا تھا جیسے حیدر امام صاحب یا اسکول کے سکریٹری صاحب اس کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ مگر حیدر امام صاحب اُسی مدھم' نرم اور شیریں انداز میں میرے بچے میرے بچے کہتے ہوئے اس کے سخت و درشت انداز گفتگو پر تنقید بھی کر رہے تھے۔ اور اس کے اعتراضات کا جواب بھی دے رہے تھے۔ اور آخر میں وہی ہوا کہ بات حیدر امام ہی صاحب کی رہی فیصلہ انہیں کا رہا۔ لڑکے نرم ہوئے مطالبات سے باز آئے اور ہڑتال واپس لے لی گئی۔

اُن کی نظامت کے دورِ آخر میں چار پانچ سال میں بھی اسکول کی مجلسِ انتظامیہ کا ممبر رہا وہ مجھے مانتے تھے۔ شاید میرے حالات سے متاثر بھی تھے۔ مجھے اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اور وہ میری رائے کی قدر بھی کرتے تھے اور میں نے ایک بار ان سے اپنی ایک بات منوا بھی لی۔ جو شاید ان کے دورِ نظامت میں کوئی نہ کر سکا۔ اور وہ بات بھی اہم تھی۔ اتنے اہم مسئلے پر وہ شاید اپنی رائے پر کسی رائے کو ترجیح نہ دیتے۔

www.taemeernews.com

اور وہ اہم مسئلہ تھا ماسٹر فیروز صاحب کا ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے تقرری کا۔ ماسٹر یونس صاحب کے بحیثیت ہیڈ ماسٹر ریٹائر کر جانے کے بعد۔ وہ حسب معمول اسکول کے باہر سے کسی کی تقرری کرنا چاہتے تھے اور دو ایک معقول آدمی ان کی نگاہ میں تھا بھی۔ ماسٹر فیروز صاحب مسلم اسکول ہی میں ٹیچر تھے سان کی تقرری کا کوئی سوال ہی ان کے ذہن میں نہ تھا۔ میں مسلم اسکول اولڈ بوائز کا صدر تھا۔ فیروز صاحب سکریٹری تھے۔ فیروز صاحب نے اپنے منشاء کا اظہار کیا۔ میں نے وعدہ کیا اور حیدر امام صاحب کو ایک طویل تحریر اس سلسلے میں لکھ کر بھیجی۔ انہوں نے مجھے گھر پر بلایا۔ مجھے ڈانٹا۔ خط میری طرف پھینک کر کہا یہ کیا خرافات تم نے لکھا ہے۔ میں اُن سے کم شیریں زبان نہ تھا۔ جو حربہ ہتھیار ان کا تھا۔ اور وہ اسے اپنے مخالفین اور معاندین پر استعمال کرتے تھے میں نے وہی حربہ ہتھیار اُن پر استعمال کیا۔ دونوں سپاہی اپنی سپہ گری دکھانے لگے۔ ایک طرف ایک جہاندیدہ، مشّاق، ماہر اور تجربہ کار سپاہی دوسری طرف ایک نومشق نوآموز اور مبتدی تھا لیکن اناڑی نہیں تھا۔ معرکہ کچھ دیر رہا آخر مشّاق سپاہی نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ رستم نے سہراب سے ہار مان لی۔ بیٹے کی محبت باپ پر غالب آہی گئی۔ میں نے فیروز صاحب کی باضابطہ درخواست پیش کی۔ اور ایک گھنٹے بعد ان کی تقرری کا پروانہ لے کر واپس ہوا۔

آخر رابطہ حیدر امام صاحب کے ساتھ مسلم اسکول کی نسبت سے اسکول کے لئے زمین حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہوا۔ مسلم اسکول اولڈ بوائز نے اسکول کی عمارت کے لئے چندے کی مہم بھی چلائی۔ اس مہم میں چند لڑکے بہت پُرجوش طریقے سے پیش پیش رہے۔ ان پیش پیش رہنے والوں میں سرفہرست عبدالرقیب تھے۔ جو اس زمانے میں سائنس کے طالب العلم تھے اور آج کل سعودی عرب میں ایک ممتاز عہدے پر ہیں۔ چندہ ہونے لگا تو زمین کی تلاشی بھی ہوئی۔ اور ہم لوگوں کی نگاہ مسٹر شریف صاحب بارایٹ لا مرحوم کی تولیت میں ایک بڑی شاندار سرزمین پر پڑی جو مدرسہ شمس الہدیٰ کے سامنے موجودہ شریف کالونی کے مشرق میں تھی۔ میں چند بار شریف صاحب کے یہاں گیا باتیں ہوئیں۔ انہیں کچھ ہموار بایا۔ مسٹر سید محمد ایوب صاحب ایڈوکیٹ مرحوم سے رابطہ کیا اور ہم دونوں متعدد بار شریف صاحب سے ملتے رہے۔ قانونی حیثیت سے جانچ پڑتال ہوتی رہی۔ کاغذات

www.taemeernews.com

دیکھے گئے۔ اور شریف صاحب نے زمین بندوبست کرنے کی رضامندی دے دی۔ میں حیدر امام صاحب سے ملا۔ انہیں اس بات سے گرانی ہوئی کہ اسکول کا اتنا بڑا مسئلہ اُن کی اجازت کے بغیر کیسے آگے بڑھا جیسا کہ میں نے اوپر کہا اُن کا مزاج ہی یہی تھا۔ انہیں گویا اسکول سے بیٹے کی طرح محبت تھی۔ ان کے بیٹے سے کوئی دوسرا محنت میں آگے بڑھ جائے یہ بات فطرتاً ایسے انسانوں کی ناگواری کا سبب ہوتا ہے۔ بہرحال بار بار کی آمد و رفت گفتگو، افہام و تفہیم خوشامد برآمد نے ان کی گرانی دور کردی۔ وہ خوش ہوئے۔ وثیقہ تیار ہوا۔ اور ایک روز میں شریف صاحب کے ساتھ ایوب صاحب کو لے کر حیدر امام صاحب کے یہاں گیا اور ہم چاروں ان کی کار پر پٹنہ رجسٹری آفس آئے۔ شاید حیدر امام صاحب کا یہ پہلا ہی اتفاق رجسٹرار کے کورٹ میں جانے کا ہوگا۔ مگر وہ بشاشت سے آئے۔ زمین کی رجسٹری ہوگئی۔ اور انہوں نے کہا زمین کی چاروں طرف نیچی دیوار بنوا دو۔ رقم جو خرچ ہو لے لو۔ اُس زمین کے تھوڑے سے حصے پر کچھ گوالوں کا قبضہ تھا جسے دور کرنے کے لئے کچھ قانونی کاروائی کرنے کی ضرورت تھی۔ اُسے اس وقت قطع نظر کر کے بقیہ خالی زمین پر بھی دیوار دے دی جاتی تو وسیع و عریض قطعہ اراضی اسکول کی مکمل عمارت، کھیل کا میدان اور دوسری ضرورتوں کے لئے کافی تھا۔ مجلس انتظامیہ یا اس کے بعض ممبران کی لاپرواہی، سستی اور بعض مسائل سے چشم پوشی نے آہستہ آہستہ خالی زمین کے حصوں پر بھی دوسروں کو بتدریج قبضے کا موقع دے دیا اور آخر ایک شاندار عطیہ ایک دردمند صاحب دل اور مسلم پرست کا غارت ہوگیا۔

تو اسکول قائم ہوا۔ اور وقت کے جو دردمند، اہل دل، اہل قلم، اہل علم اس دور کے تھے، مسلم اسکول کی تدریسی زندگی سے ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ مسٹر ابوالفضل محمد ادریس مسٹر عباس علی۔ مولانا قاسم پانی پتی، مولانا محمد سجاد، مسٹر احمد جعفری، مسٹر گپتا، ماسٹر محمد ادریس، ماسٹر عبدالقدوس۔ ان کی مخلصانہ خدمات کا نتیجہ مسلم اسکول کے پہلے ہی نتیجہ میں نکلا جو آگے بیان کروں گا۔

نوٹی کے گھوش اکیڈمی کے باغی لڑکوں میں جو مسلم اسکول کے بانی کہے جا سکتے ہیں سرفہرست عبدالمنان ہیں۔ قد و قامت سن و سال، وضع قطع انداز گفتار و رفتار، طرز اور تیور کے اعتبار سے وہ طالب العلم کم نظر آتے تھے لیڈر زیادہ۔ میرے اندازے اور تجربے کے لحاظ سے پڑھنے لکھنے کی صلاحیت اُن کی اتنی نمایاں نہ تھی جتنی مہارت ان کو کسی تحریک کے چلانے اور اس کی تنظیم کرنے کی

www.taemeernews.com

تھی ۔ بے خوف اور بے باک، معاملہ فہم اور حاضر جواب تیز تند اور چالاک ۔ گویا باغی لڑکوں کے سربراہ وہی تھے۔ اسکیم وہی بناتے ۔ اور عمل درآمد کے لئے دوسروں کو تیار وہی کرتے۔ چھوٹی موٹی تقریر بھی کر لیتے۔ محنت اور جفاکشی سے نہیں گھبراتے ۔ مسلم اسکول کے بانیوں میں ایک اور لڑکا اعزاز تھا۔ وہ میرے دور کے رشتہ مندوں میں بھی تھا۔ بڑا پُرجوش، بڑا دلیر، بڑا جاں باز، بڑا سچا اور بڑا کھرا ۔ ان تمام صفتوں کو ایک عیب نے ڈھانک رکھا تھا۔ بڑا تیز مزاج اور بڑا تند طبیعت ۔ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہنسی کم دیکھی ۔ گالوں پر تھوڑے سے حصے میں ایک قدرتی تیز سرخی تھی جو مزاج اور لہجے کی تیزی کے وقت اور تیز ہو جاتی ۔ بولنے میں بھی بہت تیز اور لڑنے مرنے میں بھی سب سے آگے ۔ یہی وہ لڑکا تھا جس نے اسکول میں لڑکوں سے اسٹرائک کرایا اور حیدر امام صاحب کے سامنے بڑی سختی سے ہمکلام تھا ۔ میں نے ابھی لکھا اس میں کارکردگی کی عجیب و غریب صلاحیت تھی ۔ وہ آتش نمرود میں کود پڑنے کا عادی جان دے کر پھر زندہ ہو جانے کا شوقین تھا ۔ ذہین بھی تھا پڑھنے لکھنے میں تیز بھی ۔ مگر اسی تیزی اور تلون نے اُسے تعلیمی زندگی میں زیادہ اُبھرنے نہیں دیا ۔ اس کے بعد مجھے اور کچھ یاد نہیں ۔

اس کے بعد آنے والے لڑکوں میں دو ممتاز لڑکے آئے ۔ مولانا تمنا عمادی کے بڑے صاحبزادے انعام ۔ انعام بھی بہت ذہین اور محنتی ۔ چست اور مستعد ۔ انگریزی سے زیادہ شوق تھا ۔ اسکول کے بہت ذہین طالب العلموں میں تھے ۔ شاید کسی دوسرے اسکول میں چلے گئے ۔ تقسیم کے بعد مشرقی پاکستان ۔ وہاں چٹاگانگ میں بڑی فرم کے مالک تھے ۔ کروڑپتی کہے جاتے تھے ۔ مشرقی پاکستان کی افتاد کے بعد کراچی گئے ۔ ہر سفر میں مجھ سے ملاقاتیں رہیں ۔ آج کل جدہ میں مقیم ہیں ۔

دوسرا طالب العلم سید محمد سمیع ۔ راجپوت نما پٹھانی کاٹھی ۔ چوڑا چکلا سینہ دوہڑیا ۔ بدن اور ہاتھ پاؤں ۔ بڑا سر بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی پیشانی، گورا رنگ ۔ اوسط درجے کے خاموش انسان ذہین بھی محنتی بھی ۔ خوش مزاج بھی ہنس مکھ بھی ۔ کم سخنی اور نرم آوازی ۔ بدن ہاتھ قد و قامت کے بالکل برعکس ۔ شادی شاہ رضی صاحب ایڈووکیٹ مولانگری کی صاحبزادی سے ہوئی ۔ کراچی چلے گئے ۔ ان دنوں کراچی کے مشہور اخبار "ڈان" کی مجلس ادارت میں ہیں ۔ ۱۹۷۸ء میں جب میں کراچی گویا

www.taemeernews.com

پہلی بار عزیزوں سے دوستوں سے ملنے گیا تو خبر سن کر بہت دور سے ملاقات کے لئے آئے۔ پھر اپنے بنگلے میں لے گئے۔ پرتکلف دعوت کی۔ لیکن دعوت کی قیمت غزل کی فرمائش کر کے وصول نہیں کی۔ غالباً ۱۹۵۳ء میں میری شاعری کے ابتدائی دور میں جگر مرادآبادی مرحوم پٹنہ تشریف لائے۔ پٹنہ کالج میں مشاعرہ ہوا۔ انجمن اسلامیہ ہال میں مشاعرہ ہوا۔ اور اپنی مشہور غزل پڑھی تھی ؎

اوروں کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھکو محبت کے سوا یاد

دوسرے دن سید محمد ایوب صاحب مرحوم ایڈوکیٹ کے یہاں کھانے پر دعوت تھی۔ کھانے کے بعد جگر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر اجازت لے کر اُٹھے اور جاتے جاتے کہا ایوب صاحب آپ کا شکریہ کہ آپ نے کھانے کی قیمت وصول نہیں کی۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ یہ کھانے کی قیمت کیا؟ کیا یہ ہوٹل ہے؟ فوراً ہی بات کھلی اور پہلی بار معلوم ہوا کہ کھانے کے بعد غزل گوئی گویا کھانے کی قیمت ادا کرنا ہے۔

ہاں تو میٹرک کلاس میں جب میں نے داخلہ لیا۔ تو میرے چند اہم ساتھیوں کو پہچانئے۔ ممکن ہے وہ لوگ مجھے اپنا ساتھی سمجھتے ہوں۔ میں تو سب کو بزرگ سمجھتا تھا۔ سب کا احترام کرتا تھا۔ سب کی باتیں مانتا تھا سب کا محکوم تھا۔ اسی لئے بعض ساتھی مجھے بدھو سمجھتے تھے اور کوئی بدھو کہہ بھی دیتا تھا۔ میری کم سخنی، کم آمیزی پسماندگی اور پس پشت نشینی نے سب کو مجھ سے بے خوف اور مجھے سب سے خوف زدہ کر رکھا تھا۔ میں ساتھیوں سے یوں ملتا جیسے کوئی استاد سے ملتا ہے۔ اور ہمارے بعض ساتھی کلاس مونیٹر بھی ہوا کرتے تھے اور بعض ساتھی ایسے بھاری بھرکم تھے بھی۔ جیسے قیوم قائد۔ وہ واقعی شاگرد بہت کم اور استاد زیادہ نظر آتے تھے۔ اور پیچھے سے ہی چلے آرہے تھے۔ شروع سے ان کا انداز ایسا ہی رہا رہا تھا اور بعد میں بھی آگے تک ایسا ہی انداز رہا۔ اور اب تک ہے۔ وہ شاید ٹی کے گھوش کے تھے یا اینگلو سنسکرت اسکول کے طالب العلم تھے۔ جیسے میرے ایک بھائی شہاب الدین مرحوم جو میرے اسکول میں آنے سے پہلے ہی دو سال اینگلو سنسکرت اسکول میں میٹرک کا امتحان دے چکے تھے جب

www.taemeernews.com

میں اسکول میں آیا اس وقت بھی میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ میرے ساتھ بھی شریک ہوئے اور میرے بعد بھی دیتے رہے۔ لیکن وہ محبوبہ ایسی ناراض تھی کہ نہیں ہی ملی اور انہوں نے بھی ایسا اس کو چھوٹا پھر مڑ کے دیکھا بھی نہیں اور بی اے' ام اے کر کے لوگ جو نہیں کر سکتے وہ نن میٹرک ہو کر بھی کر گئے۔ راشننگ میں افیسر ہوئے پھر ریلوے میں افیسر ہوئے اور پھر شہید ہو گئے۔

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اُس عہد کو ہم وفا کر چلے

ابھی بات بات پہ کہتے ہو کہ ضیاؔ حیا ہو تو ڈوب مر
کبھی کھیل جائیں گے جان پر تو کہو گے ہائے یہ کیا کیا

تو قیوم قائد صاحب ہم لوگ کے بزرگ ساتھیوں میں تھے۔ اور شاید اسی زمانے سے اُن کی صفت قیادت کے اعتراف کے طور پر ان کے ساتھی انہیں قیوم قائد کہتے تھے۔ اور ان کا نام یا پورا نام جو بھی ہو یاد رہا ہو۔ انہیں دنیا قیوم قائد ہی کے نام سے جانتی ہے پہچانتی ہے یاد کرتی ہے۔ اب بھی دیکھ لیجئے۔ ڈاکٹر انیس الرحمٰن عرف منو صاحب کے مطب میں وہ کرسی پر یوں بیٹھے نظر آئیں گے جیسے پٹنہ کے لوگوں کے پاس سب کچھ انہیں کا دیا ہوا ہے اور تمام احسان فروشوں کو جہنم واصل کر کے اطمینان سے وہ کرسی پر بیٹھے ہیں یا اخبار پڑھ رہے ہیں یا ناپ ناپ کر تول تول کر بول رہے ہیں کہ ایک بال بھی اِدھر اُدھر سے اب کسی احسان فراموش کو نہ ملے۔

میرے میٹرک کے ساتھیوں میں دوسرے مسٹر انوار احمد ہیں۔ یہ مدرسہ شمس الہدیٰ کی بازی جیت کر اسکول میں داؤں دگلنے گئے۔ اسکول کے اچھے اور ذہین اور قابل طالب العلموں میں رہے ہیں۔ خود کوئی ایجی ٹیشن کوئی تحریک لے کر آگے نہیں بڑھتے۔ بہت بہت تو یہ کہ دیا سلائی لگا کر کنارے ہو جائیں گے۔ اب جس کی قسمت ہو جلے جس کی تقدیر ہو بچے۔ باتیں کریں گے تو یوں کہ جیسے سارے جہاں کا درد انہیں کے دل میں ہے اور پھر یوں چُپ ہوں گے جیسے ساری دنیا کو اپنا درد سپرد کر کے خود بے درد ہو گئے ہیں۔ مجھ سے ہر ملاقات میں کہتے ہیں۔ ہائے کلیم تم نے اب تک میرے یہاں کا آم نہیں کھایا۔ یہاں کھاؤ گے تو یاد کرو گے۔ تم کو اپنے ہاتھ سے آم دھو دھو کر اور چاقو سے تراش تراش کر

www.taemeernews.com

کھلائیں گے ۔ دیکھو ضرور آنا ۔ اور جب گھر گئے تو حضرت تو غائب تھے ۔ آم بھی ختم تھا صرف چاقو رکھا ہوا تھا کہ سینے میں اُتارو یا پیٹ میں ۔ بیسوں سال سے یہی حادثہ ہوتا آرہا ہے اور ہم بھی ایسے بے حیا ہیں کہ اب تک چاقو نہ سینے میں اُتارا ہے نہ پیٹ میں ۔

اُدھر وہ بھی ہیں شرمندہ اِدھر ہم بھی ہیں شرمندہ

مدرسہ کے فارغ شدہ اسکول کے ساتھیوں میں ہمارے برادرم صلاح الدین مرحوم بھی تھے ۔ ایک دوسرے صلاح الدین الحمدللہ ! زندہ شاعر ہیں ۔ شاعر ہی نہیں شاعروں کے استاد ہیں ۔ دانا پور میں رہتے ہیں ۔ ریٹائرڈ افیسر ہیں ۔ ساغر تخلص کرتے ہیں ۔ خود ہی پیتے ہیں خدا جانے اور کسے پلاتے ہیں ہم تو اب تک محروم ہی ہیں ۔ مرحوم مولانا صلاح الدین مسلم اسکول کے ذہین اور بہترین طالب العلموں میں تھے ۔ اتنے سادہ اتنے کمپل کہ شبہ ہوتا عالم فاضل اور انگریزی طالب العلم ہیں یا کسی اسکول یا دفتر کے نوعمر چپراسی ۔ کرتہ پاجامہ یا قمیض پاجامہ اور نہایت معمولی سی چپل ۔ سر پر کبھی ٹوپی کبھی ندارد ۔ تیز چلتے تیز بولتے ، صاف اور کھرے آدمی ۔ نہ کسی سے بہت زیادہ دوستی نہ دشمنی ۔ نہ کسی سے لاگ نہ لپیٹ ۔ پڑھنے لکھنے سے کام ۔ ہم تین ساتھی ایک صف اور قطار میں تھے ۔ نظیر حیدر ، صلاح الدین اور میں ۔ ہمیں تینوں میں کلاس کے اول دوم سوم بنتے کبھی ہم کبھی وہ کبھی وہ ۔ میٹرک کے آخری ٹرمینل میں نظیر حیدر اول رہے ، صلاح الدین دوم اور میرا نمبر تیسرا تھا ۔ اسکول کے ٹسٹ امتحان میں نظیر حیدر اول میں دوم ہوگیا ۔ اور صلاح الدین تیسرے نمبر پر تھے ۔ میٹرک کا فائنل نتیجہ نکلا تو میں اول آگیا ۔ میرے بعد نظیر حیدر اور پھر صلاح الدین ۔ صلاح الدین کی تفصیل آگے معلوم نہیں ۔ چند سال بعد سنا ان کا انتقال ہوگیا ۔

نظیر حیدر میری ہی طرح کم سخن کم آمیز اور بے حد سنجیدہ اور متین ، دبلے پتلے مگر بہت ذہین تھے ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے زیادہ تر پینٹ اور قمیض ہی پہنتے ۔ سر ننگا پاؤں میں چپل ۔ بڑی بڑی آنکھیں اونچی چوڑی پیشانی ، گندمی رنگ ۔ اچھے نمبروں سے پاس کیا ۔ پھر سائنس کالج چلے گئے پھر میڈیکل کالج ۔ ڈاکٹر بنے ، پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کے یہاں شادی ہوئی ۔ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تو آنکھوں پر بہت دبیز شیشہ یوں ڈالے ہوئے کہ خوبصورت کشادہ آنکھیں دُراؤنی

www.taemeernews.com

ہوگئیں ۔ ان کے چچازاد بھائی مہدی بھی ہم لوگوں کے ساتھی تھے ۔ گورے چٹے دبلے پتلے، سر پہ اُلجھے بال ۔ مولوی ظفر صاحب انچارج گرین میڈیکل ہال کے صاحب زادے تھے ۔ میں بھی اپنے گارجین لیاقت حسین صاحب سے معمولاً ہدایات لینے وہیں جاتا اور مہدی بھی پیسہ وصول کرنے وہیں جاتے ۔ اسکول کے علاوہ ایک جائے ملاقات ہم دونوں کی گرین میڈیکل ہال بھی تھا ۔ عبدالقیوم کلکٹری میں کسی معقول عہدے سے، عبدالرشید ہائی کورٹ کی ملازمت سے اور مختار سنٹرل اکسائز کی سروس سے ابھی ریٹائر ہوئے ہیں اور ہونے والے ہیں ۔

مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں
اُنہیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں

www.taemeernews.com

میں نے جب ہوش سنبھالا یعنی مکتب میں پڑھنا شروع کیا تو الگ ہی پلنگ پر سویا کرتا تھا۔ اماں کے ساتھ اور باجی محمودہ کے ساتھ پلنگ پر سونا بھی یاد ہے۔ بیمار بھی ہوتا تو بخار میں الگ ہی پلنگ پر پڑا رہتا۔ رات کو حاجت کے لئے اُٹھنا ہوتا تو اماں ساتھ ساتھ جاتیں۔ مجھے ہمیشہ صبح خیزی کی عادت رہی اور گھر میں کوئی بھی طلوع آفتاب کے وقت سویا ہوا نہ ملتا۔ عموماً نمازوں کی پابندی سب کو تھی۔ اور اُٹھنے کے بعد پھر کوئی نہیں سوتا۔ سویرے ہی باورچی خانے سے فرصت ہو جاتی اور ظہر کی نماز کے فوراً بعد سارا گھر کھانے سے فارغ ہو جاتا اور غروب آفتاب کے بعد یعنی بعد نماز مغرب شام کا باورچی خانہ شروع ہوتا اور نماز عشا کے بعد سب فارغ ہو کر اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو جاتے یا جنہیں مطالعہ کا شوق ہوتا سرہانے لالٹین روشن کر کے کتابیں دیکھی جاتیں اور اسی میں نیند آجاتی۔ صبح کی نماز تقریباً اول وقت پڑھی جاتی اور پہلا کام تمام گھر کی صفائی۔ اس زمانے میں دیہات کے گھروں میں کھجور کے پتوں کے جھاڑو ہوتے تھے جن سے مٹی کے آنگن اور سائبان کی خوب صفائی ہوتی۔ پختہ زمین پر ہلکے ہاتھ مار دیا جاتا اور فرش یوں شفاف ہو جاتا کہ دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مٹی کی زمین پر ہر دوسرے روز سنہری گوری مٹی سے لیپائی ہوتی اور زمین پیتل کی طرح چمکنے لگتی۔ گرمیوں میں نئی لیپی ہوئی زمین پر ہلکی چادر بچھا کر دن کو لوگ سو رہتے اور زمین ایسی خوشگوار خنک اور خوشبودار ہوتی کہ ان دنوں ایرکنڈیشن کمروں سے زیادہ لطف خواب ملتا۔ ایرکنڈیشن میں صرف خنکی ہوتی ہے۔ اور گوری مٹی سے تازہ لیپی ہوئی دیوار و زمین میں صرف خنکی ہی نہیں خوشبو اور لطافت بھی ہوتی ہے۔ گھر میں کھانا پکانے والی ماما کی موجودگی کے باوجود گھر کی تمام عورتیں اور بچیاں پکائی میں ہاتھ بٹاتیں۔ لکڑیوں یا اوپلوں کا چولھا سلگانا اور چولھے کے پاس بیٹھ کر کھانا پکانا یہ ملازمہ کا کام تھا۔ بقیہ تمام کام بٹا ہوا تھا۔

www.taemeernews.com

کوئی مسالہ پیس رہی ہیں، سبزیاں تراش رہی ہیں اس لئے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں ناشتہ اور دوپہر کے کھانے تیار ہو جاتے۔ دوسری ماما کا کام تمام گھر میں، کمروں میں، سائبانوں میں، آنگن میں، کھنڈر میں جھاڑو دینا صفائی کرنا بستر درست کرنا۔ یہ کام ذرا وقت لیتا۔ یہ صفائی کا کام دن میں دو بار ہوتا۔ صبح کی نماز کے فوراً بعد۔ شام کو عصر اور مغرب کے درمیان۔ مغرب کے وقت گھروں میں جھاڑو دینا معیوب اور نحس تھا۔ مغرب سے پہلے تمام کمروں میں لیمپ یا لالٹین روشن کر کے رکھ دی جاتی۔ اس کے علاوہ چاروں طرف سائبان میں ایک ایک لالٹین روشن کر کے چھپر یا چھت کی اولتی میں لٹکا دی جاتی۔ اس طرح کراسن تیل کے زمانے میں بھی گھروں میں چراغاں سا نظر آتا۔ اور لنکا میں وہ کام کر لیتیں جو اب بجلی کے قمقموں میں اور مرکری کی تیز چاندنی میں بھی نہیں کر پاتیں۔

گھر کے ملازم یا ماما یا نوکرانی، ملازم یا نوکرانی ہونے کے باوجود خاندان کے افراد ہوتے۔ انہیں پکارنے اور بلانے کا انداز مہذب اور شریفانہ ہوتا۔ مصرن بوا، برفاتن بوا، گل بہار بوا۔ میرے مکتب کی تعلیم کے دوران مصرن، برفاتن اور اوسیوا تھیں۔ اوسیوا کو میں نے یاد کر لیا۔ الحمدللہ الحمدللہ۔ مصرن، برفاتن تو بہت بعد تک رہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے میٹرک پاس کر لینے تک۔ برفاتن بیمار رہیں پھر ان کا انتقال ہو گیا اور مصرن بوا تو ساتھ ساتھ زندہ رہیں اور ساتھ ساتھ شہید ہو گئیں۔ اوسیوا یاد آ گئیں۔ یہ کچھ دنوں بعد میرے یہاں سے چلی گئیں۔ کہاں چلی گئیں، سنئے۔

یہ اکثر نماز صبح سے پہلے ہی گھر کی صفائی کا کام شروع کر دیتیں۔ ان کے ذمہ گھر کی صفائی ہی کا کام تھا۔ میں اکثر صبح کی نماز میں اٹھنے کے لئے انہیں کا ممنون ہوتا۔ یہ جھاڑو دے کر صفائی کرتے ہوئے پلنگ کے نیچے بھی گھس جاتیں۔ پلنگ کے اندر جھاڑو سے زمین صاف کرتی ہوئی ان کی پشت اکثر پلنگ پر میری پشت کو اچھال دیتی اور میں دھڑ پھڑا کر اٹھ جاتا اور دیکھتا کہ اوسیوا خالہ پلنگ کے نیچے جھکی ہوئی جھاڑو دے رہی ہیں۔ یہ ملازمہ تھیں لیکن گھر کے تمام بچے بچیاں انہیں خالہ کہتیں۔ شائد چھبیس ستائیس سال یا تیس کی عمر سانولہ رنگ اوسط خدوخال آنکھیں سیاہ اور بڑی۔ ہونٹ لمبے اور پتلے۔ ناک سیدھی ابرو صاف اور محراب دار پیشانی چوڑی

www.taemeernews.com

ٹھوڑی پتلی۔ بدن بہت گٹھا ہوا، تندرست اور توانا۔ قد اوسط نہ لمبی نہ ناٹی۔ عموماً سُرخ ساری اور سیاہ شلوکہ پہنتی تھی۔ پاؤں میں دلّی وال سُرخ جوتی۔ بڑی پھُرتی اور مستعدی سے کام کرتی۔ اس زمانے میں آقا اور ملازم، ملکینی اور نوکرانی کا فرق گرچہ بظاہر نمایاں تھا مگر دلوں کے اندر فرق نہ تھا۔ آج ظاہر کا فرق تو تقریباً ختم ہے لیکن باطن کا فرق ہے۔ اوسیوا ہم لوگوں کی خالہ نہیں تھی۔ دور کا بھی رشتہ نہیں تھا مگر بستی کا رشتہ تھا۔ اوسیوا کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔ وہ میرے محلّے کی رہنے والی تھی اس سے زیادہ کچھ واقفیت نہیں تھی۔ واقفیت جس چیز سے تھی اور جس واقفیت نے یہ چند سطور لکھنے پر مجبور کیا وہ پچپن سال کے بعد بھی میرے گوشۂ دل میں میری یادوں کے خزانے کا ایک حصہ ہے۔ اب وہ شاید اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ اور ہوگی بھی تو اب وہ کیونکر مجھے ڈھونڈھ نکالے گی۔ بچاری کو کیا خبر ہوگی کہ تیلہاڑہ میں پچاس باون سال پہلے والا کلیم یا کالو یا کلوا جس سے اس کو بہت پیار تھا اب پٹنہ میں یا ہندستان میں کلیم عاجز ہے؟ اگر زندہ ہوگی تو سمجھتی ہوگی کہ پینتالیس سال پہلے ایک آنچ میں تیلہاڑہ اپنے مکانوں مکینوں کے ساتھ ڈوبتوں اور ٹوپیوں کے ساتھ پانکڑ اور عیدگاہ کے ساتھ پھولوں اور پھلوں کے ساتھ، سنگھاڑا اور امرود کے ساتھ بیلے اور چمیلی کے ساتھ، آوازوں اور گنگناہٹوں کے ساتھ جل کر بھسم ہوگیا۔ اب کون اس خاکستر کو کریدنے والا ہوگا۔ اُسے کیا خبر کہ جب موسموں نے رنگ بدل دیا ہے پھولوں نے خوشبوئیں بدل دی ہیں، پھلوں نے ذائقے بدل دیے ہیں، مزاجوں نے افتاد بدل دی ہے، ہواؤں نے رفتار بدل دی ہے۔ ملکوں نے اپنا فاصلہ، زمین نے اپنی فصل اور آسمانوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔ جب آج کی یاد کل نہیں آتی۔ آج کا وعدہ کل نہیں یاد رہتا اور آج کا رشتہ کل نہیں یاد رہتا۔ آج بھی وہ شخص ہے جس کے بخار کو وہ آنچل بھگو بھگو کر چہرہ صاف کرکے کم کرنا چاہتی تھی جس کے آنسوؤں کو وہ اپنے ہونٹوں سے چوس لیا کرتی تھی جسے گلے لگا کر وہ گنگنایا کرتی تھی۔ وہی کلیم وہی کالو، وہی کلوا پچپن سال بعد اوسیوا خالہ کی کہانی لکھ رہا ہے اس کی پیشانی ابرو آنکھیں، ہونٹ اور ٹھوڑی کی تصویر بنا رہا ہے۔

www.taemeernews.com

ایک روز میں سائبان میں تیز بخار میں سو رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں اماں تھیں یا ہلسہ گئی ہوئی تھیں۔ چھوٹی اماں تھیں جو میری بہت دور کی چچی تھیں۔ بیوہ تھیں۔ وہ ہم سب گھر بھر کی چھوٹی اماں تھیں اور بہت کچھ ماں کا حصہ ان کے بھی سپرد تھا۔ وہ ذرا بھاری بدن کی تھیں میری طرف سائبان میں وہ بھی سو رہی تھیں۔ سامنے کے سائبان میں اوسیوا خالہ اپنی پلنگ پر سو رہی تھیں۔ مجھے دو روز سے تیز بخار تھا دوا ہو رہی تھی۔ شاید بخار رات کو بہت بڑھا۔ اس زمانے میں کون اتنا علاج وغیرہ کی طرف دھیان دیتا تھا۔ معمولی دوا دارو۔ کچھ جوشاندہ کچھ خانہ کچھ جھاڑ پھونک سے مسئلہ حل ہو جایا کرتا تھا۔ میری دوا شاید ڈاکٹر لالہ پرشاد کی چل رہی تھی۔ رات کو بخار بہت تیز ہوا میں سرسام کے عالم میں گویا جاگ گیا کچھ روتا ہوا کچھ اول فول بکتا ہوا پلنگ سے آنگن میں کود گیا۔ چھوٹی اماں کی نیند نہیں ٹوٹی۔ اوسیوا خالہ تڑپ کر اپنے پلنگ سے اٹھیں، ایک چھلانگ مار کر آنگن میں اتریں اور گویا مجھے گود میں اٹھا لیا۔ گرچہ میں گود میں اٹھانے کے قابل نہ تھا۔ وہ مجھے گود میں لئے لئے خود بھی رو رہی ہیں چیخ رہی ہیں۔ میرا بابو کیا ہے بابو میری آنکھوں کو چوم رہی ہیں، آنسوؤں کو چاٹ رہی ہیں۔ آنچل بھگو بھگو کر میری پیشانی پونچھ رہی ہیں۔ بڑی دیر کے بعد شاید مجھے کچھ افاقہ ہوا۔ وہ اسی طرح گود میں سائے مجھے پلنگ پر لئے بیٹھی رہیں۔ کچھ ہلتی رہیں کچھ گنگناتی رہیں یہاں تک کہ ضعف سے مجھے نیند آگئی۔ جاگا تو وہ اسی طرح آنچل پانی میں بھگو بھگو کر پیشانی اور سر صاف کر رہی تھیں۔ میں مسکرا دیا وہ بھی مسکرا دیں۔ میرا بخار کم ہو گیا تھا یا ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد کا منظر مجھے یاد نہیں ہے۔ اوسیوا جوانی تندرستی نسوانی طاقت، مستعدی پھرتی اور سرگرمیٔ عمل کا بے مثال نمونہ تھیں۔ اور لوگ تو کھانا پکانے کھانے اور گھر کی دوسری مصروفیات کے بعد بات چیت یا چھوٹی موٹی کہانیوں میں قصوں میں مصروف ہو جاتیں۔ اوسیوا کو جب کوئی کام نہیں رہتا تو اپنا جوڑا کھول کر دیر تک کنگھی کرتی رہتیں اس زمانے میں بال سے جوئیں نکالنے کا ذریعہ یہی کنگھی کرنا تھا۔ جوئیں تو نہیں ہوتیں۔ ایک آدھ کبھی کبھی کنگھی میں نظر آجاتی تو کنگھی سے ایک ہاتھ کے انگوٹھے پر اسے لے کر دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے سے اسے دبا دیتیں اور ہلکی سی پٹ سی آواز ہوتی اور پھر کنگھی کرنے لگتیں۔

www.taemeernews.com

ان کے بال بہت گھنے بہت سیاہ اور بہت لمبے اور بالکل سیدھے تھے۔ وہ غسل کرتیں، کٹھوٹ میں پانی رکھ کر اس میں سنہری چکنی گوری مٹی ڈال کر بار بار اپنے سر کو اس کٹھوٹ میں ڈالتیں اور مٹی سے بھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے خوب ملتیں یہ عمل تقریباً نصف گھنٹہ، پون گھنٹہ جاری رہتا۔ وہاں نہ صابن نہ خانہ شیمپو وہاں یہی گوری مٹی سب کچھ تھی صابن بھی، شیمپو بھی کریم بھی ہزلن بھی پوڈر بھی۔ گوری مٹی سے بالوں کو بدن کو چہرے کو صاف کر کے غسل کر کے دھوئی ہوئی سُرخ ساری اور سیاہ شلوکہ پہن کر دھوپ میں بال سکھانے اور کنگھا کرنے کو اوسیوا خالہ بیٹھتیں تو اُن کا پورا وجود، اُن کا سانولا رنگ، ان کا بدن ہاتھ پاؤں انگلیاں، بال کپڑے سب قدرت کے بنائے سنوارے نظر آتے جس میں انسانی صناعی کا شائبہ بھی نظر نہ آتا۔ وہ دیر تک نماز پڑھتیں اور کبھی کبھی تلاوت بھی کرتیں۔

ہاں تو اوسیوا خالہ کی شادی سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی تھی وہ غالباً میری شیر خوارگی کا زمانہ تھا۔ ان کے شوہر کا نام عبدالسلام تھا۔ وہ کانپور یا کسی اور دور کے شہر میں کوئی ملازمت کرتے تھے۔ سال یا دو سال وہ آتے جاتے رہے پھر ایک بار گئے تو وہ نہیں آئے۔ کوئی خط بھی نہیں، کوئی اطلاع بھی نہیں۔ وہ محلّے کے ایک غریب گھر کی لڑکی تھیں جن کے وسائل اور تعلقات خواہشیں اور توقعات، مسائل اور معاملات محدود ہوتے ہیں۔ کچھ کھوج خبر لی گئی۔ دریافت استفسار کیا گیا۔ اس میں سال دو سال گذر گئے۔ کچھ پتہ ٹھکانہ نہ ملا۔ مجھے اتنی تفصیل یاد نہیں کہ ان کے گھر والے کہاں تھے کہاں کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں سنی سنائی باتیں میرے حافظہ کی زینت ہیں۔ جب میں انہیں اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے کے لائق ہوا تو ان کے خاوند کو لاپتہ ہوئے سات آٹھ سال گذر چکے تھے۔ وہ میرے یہاں چلی آئی تھیں۔ شاید ان کے لوگ جن باقی نہیں رہے تھے یا مجھے علم نہیں میرا گھر ہی ان کا گھر میرے لوگ ہی ان کے لوگ تھے۔ ہمیں لوگوں سے ان کا رشتہ، ہمیں لوگوں سے اپنائیت قائم ہو گئی۔ وہ گھر کی ایک فرد کی طرح رہتیں مگر کچھ کچھ مجھے اندازہ ہوتا تھا، اُسی قدر جس قدر میں یہ محسوس کرنے کے قابل تھا یا اس وقت کے احساس کو صحیح معنویت دینے کے قابل اب ہوا ہوں تو دے رہا ہوں اور سمجھا رہا ہوں، کہ وہ یادوں کا

www.taemeernews.com

اور امیدوں کا ایک پیکر تھیں - وہ بھرپور سہاگن خود کو سمجھتی تھیں - چہرے کی دمک ہونٹوں کی لہک، آنکھوں کی چمک، آوازوں کی کھنک یہی کہتی تھی کہ

ابھی وہ آئے نہیں ہیں بس آنے والے ہیں

ان کا پورا وجود اس کا گواہ تھا۔ وہ پُر اُمید پُرشوق پُرجوش تھیں - ان میں زندگی کی حرارت مائل بہ ارتقا تھی اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ گھر میں سب سے زیادہ مستعد مشقت پسند بشاش اور متحرک تھیں - سستی، اضمحلال مایوسی کا سایہ بھی شاید ان سے ہو کر نہیں گذرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ زیور نہیں پہنتی تھیں مگر چوڑیاں کلائی میں چھنکارتی رہتیں - وہ مسکرا کر باتیں کرتیں اور خندہ پیشانی سے مشقت کے کام کو انجام دیتیں - تمام مکان خلوت اور کھنڈر میں دونوں وقت تنہا صفائی کرنا، لالٹین صاف کرنا تیل بھرنا، تمام بستر درست کرنا، ہر دوسرے روز تمام کھنڈر، سائبان اور بعض کمروں کو مٹی سے لیپنا پھر دیر تک کپڑے دھونا، غسل کر کے کنگھا کرنا نمازیں پڑھنا - کوئی بیمار پڑے تو اس کی تیمارداری وغیرہ وغیرہ کام تھے اور مشقت کے کام تھے مگر ان کاموں سے ان کی صحت اور نکھرتی، ان کا رنگ اور کھلتا ان کی توانائی اور اُبھرتی ان کی امیدیں اور جاگتیں اُن کی یادیں اور تازہ ہوتیں -

وہ بالکل پردہ نشیں ماما تھیں - ہمارے دیہاتوں میں دن کو کسی کے گھر جانے کا عورتوں میں رواج نہ تھا - برقعہ عموماً سفر میں استعمال ہوتا - محلے یا بستی میں کہیں جانے کے لئے کسی گھر میں ملنے کے لئے جانے والیاں عموماً شام کے بعد گھروں سے نکلتیں - دو تین عورتیں ایک ساتھ نکلتیں - چادر اوڑھ لیتیں - اور ایک ماما لالٹین کے ساتھ ہمراہ ہوتی - شام کو بعد مغرب کسی گھر میں ملنے کو جانے والیاں دو گھنٹہ رات گذرتے گذرتے واپس آجاتیں - خاطر تواضع عموماً صرف پان سے ہوتی - چائے کا بالکل رواج نہ تھا - میرے یہاں کوئی پان بھی نہیں کھاتا تھا لیکن مصرن بوا اور برفاتن بوا دونوں پان کی اونچی شوقین مامائیں تھیں - انہیں کا پاندان آنے والی مہمان عورتوں کی تواضع کے لئے استعمال ہوتا - بازار ہاٹ عموماً برفاتن بوا کے سپرد تھا - سر سے پاؤں تک چادر لپیٹ کر بازار جاتیں - پنساری، حلوائی، تنبولن یہاں کے سودے انہیں کے سپرد تھا مصرن بوا

www.taemeernews.com

کو پردے کا کم اہتمام تھا۔ یہ کبھی کبھی بغیر چادر کے بھی باناز نکل جاتیں۔ اوسیوا خالہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ کبھی کبھی شام کے بعد گھر کی عورتوں کے ساتھ دوسرے گھروں میں یہ بھی جاتیں۔

عبدالسلام کی بات کبھی کبھی گھر میں نکل جاتی۔ اوسیوا خالہ کے کان کھڑے نہیں ہوتے وہ معمولاً گھر کے کام میں یا اپنے کام میں لگی رہتیں۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ وہ پڑھنا لکھنا کتنا جانتی تھیں۔ قرآن تو پڑھتی ہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کتاب بھی ان کے ہاتھ دیکھی۔ مگر کتابوں کا مطالعہ ان کا معمول بالکل نہ تھا۔ میرے گھر میں کتابیں تھیں کوئی کتاب الماری یا صندوق سے باہر نکلی ہوئی رہتی تو کام کرتے ہوئے یا گذرتے ہوئے اُٹھا کر دو ایک منٹ دیکھ لیتیں پھر چھوڑ کر اپنے کام میں لگ جاتیں۔ دو باتیں اس عمر کی جب میں آٹھ دس سال کا تھا اور ان کے شوہر کے غائب ہوئے چھ سات سال ہو چکے تھے، یہ یاد ہے کہ وہ کام کرتے کرتے یا نہاتے نہاتے یا بالوں میں کنگھا کرتے کرتے چونک پڑتیں اور ایک طرف دیکھنے لگتیں۔ چند سکنڈ کے بعد پھر وہ مشغول ہو جاتیں۔ یہ بات اکثر اور کبھی کبھی ایک دن میں دو تین بار ہوتی۔ دوسری بات یہ کہ وہ جب کسی دن مشغول نہ ہوتیں، تو سری کا قلم اور دوات جو ہمارے مکتب کے استعمال کی گھر میں رہتی لے کر بیٹھ جاتیں۔ کچھ نشانات بناتیں یا کچھ لکیریں کھینچتیں۔ پھر انہیں ہوا میں اُڑا دیتیں۔ پھر انہیں سمیٹ کر چولھے میں جھونک دیتیں۔ کبھی کبھی گذرتے ہوئے اماں پوچھ بیٹھتیں۔

"کیا لکھ رہی ہو اوسیوا؟"

"لکھیں گے کیا بوبو گیندا کا پھول بنا رہے ہیں۔"

اور واقعی کبھی میری نظر پڑ گئی تو بے ترتیب ملی ہوئی ڈالیاں۔ جیسا ہم بچے کاغذ پر بنایا کرتے تھے اُن پرزوں کو ہوا میں اُڑاتے ہوئے وہ اوپر ہواؤں میں دیکھتیں اور مسکراتیں اور پھر ان پرزوں کو لوک کر مٹھیوں میں دبا لیتیں پھر کہیں پھینک دیتیں یا چولھے میں ڈال دیتیں۔ نماز کے بعد دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہتیں۔ دعا کے بعد بھی بیٹھی رہتیں۔ اور مسکراتی ہوئی اُٹھتیں۔ ان کی مسکراہٹ مجھے بہت یاد ہے۔ گرچہ ان کا چہرہ مسکراتا ہوا نہ تھا۔

www.taemeernews.com

چہرہ بہت سنجیدہ۔ مسکراہٹیں ہونٹوں سے ظاہر ہوتیں۔ جیسے کوئی ارادہ سے مسکراتا ہو۔ بالخصوص جب میں موجود ہوتا تو وہ بلا ارادہ مسکرا دیتیں۔ "کیا بات ہے ادسیوا خالہ؟"

"بتاؤں گی کالو" اور یہ کہہ کر کبھی میرا سر تھپک دیتیں کبھی پیشانی چوم لیتیں۔

ان کی شادی کو تقریباً نو دس سال ہو چکے تھے میری عمر نو دس سال کی تھی اور ان کے خاوند کو گم ہوئے تقریباً آٹھ سال گذر چکے تھے یا ممکن ہے زیادہ ہوئے ہوں۔ شاید جمعہ کا دن تھا وہ معمول سے زیادہ دیر تک نہاتی رہیں۔ بالوں کو گوری مٹی سے بہت دیر تک دھویا پانی ڈالتیں جھٹکتیں اور پھر مٹی لگا کر بالوں کو ہاتھوں سے ملتی رہتیں۔ بچپن میں سنتے تھے کہ عورتوں کا نہانا اور مردوں کا کھانا برابر ہے۔ یعنی مرد دیر تک باتیں کرتے ہیں اور کھاتے رہتے ہیں۔ اور عورتیں دیر تک چپ رہتی ہیں اور نہاتی رہتی ہیں۔

نہا کر فارغ ہوئیں تو حسب دستور سرخ ململ کی ساری اور سیاہ شلوکہ پہن کر بالوں کو سکھانے اور کنگھا کرنے بیٹھ گئیں۔ بھیگے ہوئے بالوں میں پہلے تو سر جھکا کر ہر طرف سے کنگھی چلاتی رہیں۔ سامنے پیشانی اور دونوں کن پٹیوں کی طرف گھنے بال سہرے کی طرح جھول رہے تھے اور وہ سر جھکائے ہر طرف کنگھی کر رہی تھیں۔ بال بالکل سیدھے اور لمبے تھے۔ پھر انہوں نے ناک کی سیدھ میں بالوں کے اندر کنگھی ڈال کر پیشانی سے بالوں کو دونوں طرف دو حصوں میں تقسیم کر دیا چہرہ نمایاں ہو گیا اور بال دونوں طرف کن پٹیوں پر جھولنے لگے اور ان کا چہرہ بے حد مسکراتا ہوا اور شگفتہ تھا۔ انہوں نے دونوں کن پٹیوں کی طرف کنگھی کرنی شروع کی بال سوکھنے لگے۔ سوکھے ہوئے بال بھیگے بالوں کے اندر سے سیاہ ریشم کے مہین دھاگے کی طرح اڑنے لگے۔ وہ دیر تک اس عمل میں مصروف رہتی تھیں اور جمعہ کی نماز کا وقت ہو رہا تھا میں نانا جان کے ساتھ سنگی جامع مسجد چلا گیا۔ واپس ہوا تو وہ ظہر کی نماز کے لئے مصلے پر کھڑی تھیں۔ باہر سائبان میں دسترخوان بچھا تھا۔ ہم نانا جان اور گھر کے دوسرے بچے اور اماں جان کھانے پر بیٹھیں۔ میں بہت جلد فارغ ہو کر کمرے میں جس میں ادسیوا خالہ نماز پڑھ رہی تھیں آ کر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ شاید ایک دو منٹ گذرے ہوں گے۔ ادسیوا قاعدے میں بیٹھی تھیں

www.taemeernews.com

کہ دروازے پہ کسی نے پکارا۔

"مولوی صاحب! مولوی صاحب!!"

میں نے دیکھا کہ پکار کے ساتھ اوسیوا خالہ نماز میں مصلے پر دائیں کروٹ گر گئیں۔

اُدھر نانا جان نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

آواز آئی "عبدالسلام"

"کون عبدالسلام؟"

"عبدالسلام، کانپور سے آیا ہوں۔"

اماں بھی "ایں" کر کے دسترخوان سے اُٹھ گئیں اور گھر میں ایک شور ایک ہلچل مچ گئی۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ میں اُٹھ کر اوسیوا خالہ کے قریب آیا۔ اور چیخا "امی جان! اوسیوا خالہ بیہوش ہو گئی ہیں۔"

اوسیوا خالہ آنکھیں بند کئے بیہوش پڑی تھیں۔ پانی کے چھینٹے دئے جا رہے تھے۔ شبنم برس رہی تھی، پھول کا چہرا نکھر رہا تھا۔ بہار منڈلا رہی تھی، ہواؤں کے رُخ بدل رہے تھے نسیم گنگنا رہی تھی۔ ہواؤں میں اُڑائے ہوئے سینکڑوں کاغذ کے ٹکڑوں پر بنائی ہوئی پھولوں کی بے ترتیب ڈالیاں یکے بادیگرے زندہ تازہ اور شاداب ہو کر آپس میں مل رہی تھیں، سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ آٹھ دس سال کی طویل مدت میں کبھی نہ سونے والی اُمیدیں جگنوؤں کی طرح اوسیوا خالہ کی چاروں طرف چھم چھم ناچ رہی تھیں۔ آٹھ دس سال پہلے کی شادی کی تجدید ہو رہی تھی پتے تالیاں بجا رہے تھے۔ شاخیں جھوم جھوم کر جھومر گا رہی تھیں۔ اوسیوا خالہ کے بال سج رہے تھے۔ وہ بال جو شب عروسی کی تازگی کو دس سال اپنے سینے میں حفاظت سے چھپائے رہیں دس سال کی شب گیری اور چمک اٹھی تھی۔ خوشبو اور زیادہ تیز اور بیدار ہو رہی تھی۔ اوسیوا خالہ کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی ان کے سنجیدہ چہرے کا وہ ایک حصہ بن گئے تھے مگر ان کا پورا وجود مسکرا رہا تھا۔ ان کی روح مسکرا رہی تھی۔ ان کا کبھی نہ ختم ہونے والا اعتماد

www.taemeernews.com

مسکرا رہا تھا۔ تیس سال کی عمر میں ان کا اعتماد اور یقین ان کے وجود کو جوانی کی نئی انگڑائیوں سے آشنا کر رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ خدا پر اور خدا کی بنائی ہوئی تقدیر پر اس سیدھی سادی دیہاتن عورت کا بھروسہ اور اعتماد کیا اپنی مثال رکھتا ہے؟ شاید نہیں۔ میں نے چار پانچ سال انہیں ہوش کی آنکھوں سے دیکھا۔ شعور کی نئی نئی انجان روشنیوں کے حلقے میں ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ انہیں ہر حال میں دیکھا سوتے جاگتے کام کرتے پسینے میں بھیگتے۔ چلتے پھرتے نہاتے بال سکھاتے کنگھی کرتے، بولتے مسکراتے گنگناتے مجھے یاد نہیں کہ اس سے زیادہ زندہ عورت میں نے دوسری دیکھی ہو۔ حسن، وقار، بردباری، تحمل، سنجیدگی، وضعداری ماں میں دیکھی۔ جو بے مثال تھی۔ بیوگی ایسے ماحول میں بھرپور سہاگ کی خوشبو اوسیوا میں دیکھی۔ اقبال کا شعر تو اسے معلوم نہ ہوگا لیکن جس کیفیت نے اقبال سے یہ شعر کہلوایا اس کیفیت کی زندہ اور متحرک تصویر اوسیوا کی زندگی تھی۔

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ زندگی ہجر میں لذتِ طلب

اس لذتِ طلب کی زندہ تصویر، اب میں سوچتا ہوں، اگر چوکھٹے میں کہیں آویزاں تھی تو وہ چوکھٹہ اوسیوا تھی۔

اوسیوا چند دن میرے یہاں رہیں۔ وہ اسی طرح کبھی کبھی آکر میرا پیار کر لیا کرتیں اور مسکرا کر گذر جاتیں وہ بالکل ویسی تھیں جیسے عبدالسلام کے واپس آنے کے پہلے تھیں کوئی فرق نہ تھا۔ پھر مجھے یاد نہیں وہ کہاں رہیں کہاں ہیں یا کہاں مریں۔

---

www.taemeernews.com

عبدالسلام کئی روز رہا۔ پھر اوسیوا کو لے کر شاید کانپور چلا گیا۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ وہ یا اوسیوا پھر کبھی میرے گھر آئی یا نہیں۔

اوسیوا کے شوہر عبدالسلام پر ایک دوسرے عبدالسلام یاد آ گئے۔ سید عبدالسلام شفیع نانا کے لڑکے۔ شاید یہی ایک لڑکا تھا۔ تین لڑکیاں ایک لڑکا۔ درگاہن خالہ کا ذکر "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں آیا ہے۔ آرہ کے ڈاکٹر امثل اکرمی سے بیاہی گئیں۔ وہی ڈاکٹر امثل صاحب جو میرے سفر "پٹنہ سے لاہور تک" میں میرے ہم سفر رہے۔ الحمدللہ دونوں بقید حیات ہیں۔ چھوٹی بہن ہانو خالہ کراچی میں اپنے بچوں کے ساتھ ہیں۔ منجھلی باکو خالہ اطہر نانا کے چھوٹے بھائی سید سے شادی ہوئی۔ جلد ہی بیوہ ہو گئیں اور شاید تیلہاڑہ میں شہید ہوئیں ـــ اور سب سے چھوٹے بھائی عبدالسلام۔ جب میں اسکول میں تھا تو وہ سائنس کالج پٹنہ میں پڑھ رہے تھے۔ ہم سے کچھ بڑے تھے۔ رشتے میں ماموں ہوئے مگر تعلق، قربت اور ہم نشینی کے سبب بے تکلفی سے میں انہیں صرف سلام کہا کرتا تھا۔ تیلہاڑہ میں ان کے جیسا ذہین کوئی دوسرا نہیں تھا۔ بے حد حاضر جواب، مباحثے اور مناظرے میں ماہر تھے۔ کبھی کسی کو لاجواب کئے بغیر نہیں چھوڑا۔ دبلے پتلے، میانہ قد، گندمی رنگ، ناک نقشہ اچھا، آواز متوازن، لہجہ سنبھلا ہوا، زبان صاف اور منجھی ہوئی، کپڑوں کے شوقین، کھانے میں میری ہی طرح بدشوق، ہمیشہ شیروانی پہنتے، کالج بھی شیروانی ہی میں جاتے، ٹوپی کم پہنتے، مذہب کے پابند لیکن مزاج کے آزاد۔ جو کہنا ہوتا منہ پر بے ٹوک کہتے۔ طالب العلم سائنس کے تھے، مگر جذبات سے مغلوب رہتے۔ میرے اُن چند رشتہ مند ساتھیوں میں تھے جن سے محبت بھی تھی اور بے تکلفی بھی۔ سفر حضر کے ساتھی بھی، خلوت انجمن کے ہم نشیں بھی ـــ میں بے زباں وہ زبان دراز، میں شرمیلا وہ بے حجاب، میں ہر شخص کی ماننے کو تیار۔ وہ ہر شخص سے منوانے کو بے قرار۔ لیکن میری انکی

www.taemeernews.com

خوب نبھتی ۔ تیلہاڑہ میں رہتے تو زیادہ وقت میرے ساتھ ہی گذرتا ۔ وہ مجھے چاہتے ہیں انھیں پیار کرتا ۔ کبھی کبھی مصرعے بھی موزوں کرتے، سنجیدگی اور مزاح کے بین بین ان کا انداز کلام تھا ۔ بدن کے کمزور تھے مگر ہمت کے بڑے قوی ۔ مجھے بھی اپنی روایات سے، تاریخ سے بڑی گہری محبت ہے ۔ وہ بھی اسلاف کے پرستار ۔ پرانے لوگوں پر کوئی حرف رکھتا تو چراغ پا ہو جاتے ۔ میں نے شاید دہلی کا پہلا سفر انہیں کے ساتھ کیا ۔ میں پٹنہ میں تھا ۔ اماں بھی یہیں تھیں ۔ ایک دن انہوں نے اماں سے کہا :

"امت بوبو ! میں دہلی جا رہا ہوں کلیم کو بھی میرے ساتھ کر دیجئے ۔"

"کاہے کو دہلی جا رہے ہو ؟"

"لال قلعہ دیکھنا چاہتا ہوں ۔"

"لال قلعہ کیا ہے بابو ؟"

"شاہجہاں بادشاہ کا بنوایا ہوا قلعہ ہے، مغل بادشاہ کی یادگار ہے ۔ نظام الدین اولیا بھی جائیں گے ۔ قطب شاہ کی لاٹ بھی جائیں گے ۔"

"اچھا ہے کلیم کو لیتے جاؤ ۔ باپ کے مرے سے گھبرا بھی گیا ہے ۔ جی بہل جائے گا ۔"

ناشتہ کے لئے کافی سامان ساتھ کر دیا گیا ۔ میں تو زیادہ تر پاجامہ کرتے میں رہنے کا عادی تھا ۔ شیروانی ساتھ رہتی لیکن پہننا کم ہوتا ۔ وہ ہمیشہ شیروانی میں رہے ۔ میں اب تک ٹخنے سے نیچے یا ٹخنوں تک شیروانی پہنتا ہوں ۔ وہ اس وقت بھی ٹخنوں سے اوپر پہنتے تھے ۔ ہلکے آسمانی رنگ کی شیروانی انہیں ہمیشہ محبوب رہی ۔ ریل پر چالیس سال پہلے اتنی بھیڑ کہاں ۔ انٹر کلاس میں شاہانہ سفر ہوا کرتا تھا ۔ فرسٹ کلاس تو عموماً خالی رہا کرتا تھا یا سرکاری بڑے عہدے دار سفر کرتے تھے ۔ سیکنڈ کلاس میں سیٹھ اور ساہوکار، انٹر کلاس میں عموماً اوسط درجے کے ہندو مسلمان شرفا ۔۔۔ ہم لوگ انٹر کلاس میں تھے ۔ سیٹیں کچھ بھری تھیں کچھ خالی تھیں ۔ اتفاق سے پورے کمپارٹمنٹ میں ہم ہی دو مسلمان تھے ۔ اس زمانے میں ریلوے کمپارٹمنٹ کے اندر خانے نہیں ہوتے تھے ۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بس سیٹیں ہوا کرتی تھیں اور تمام بیٹھنے والے لگاہوں کے

www.taemeernews.com

سامنے ہوتے تھے ۔ انٹر کلاس میں زیادہ تر پڑھے لکھے ہی لوگ سفر کرتے تھے ۔ ہمارے علاوہ جو تھے وہ بھی صاف ستھرے لباس میں تھے ۔ اور جیسے جیسے گاڑی بہار کی سرحد سے دور ہوتی رہی ۔ کپڑوں کی صفائی بول چال کی صفائی بڑھتی گئی ۔ اس زمانے میں بنارس سے بڑھتے ہی اردو بولنے والے اور اردو تہذیب سے تعلق رکھنے والے بڑھ جاتے ، بیشتر ہندو صاف اور شستہ اردو بولتے تھے ۔ لباس بھی ، لمبا کوٹ یا صاف دھوتی کرتہ اور کوئی کوئی پاجامہ شیروانی میں بھی نظر آجاتا ۔ چنانچہ ایک صاحب تقریباً پچاس سال کی عمر ، چست پاجامہ ، سیاہ شیروانی ، سیاہ ٹوپی اور سیاہ جوتا ، سُرخ و سپید رنگ بہت نمایاں تھے ۔ کم بولتے ، ضروری بات کسی سے کہنی ہوتی تو سلیس اور دُھلی ہوئی اردو ہوتی ۔ ہاتھ میں نہایت خوشبودار ، جلتی ہوئی اگربتی ہر وقت لئے رہتے ۔ ایک بتی جل چکتی تو دوسری نکال کر ماچس سے سلگا کر انگلیوں میں پکڑ لیتے ۔ ہم دونوں کو صاف ستھرا اور شیروانی پوش دیکھ کر شفقت سے ایک ایک اگربتی سلگا کر پیش کی اور ہم نے بھی نہایت احترام سے شکریئے کے ساتھ قبول کی ۔

ایک ادھیڑ عمر کے پنڈت جی بھی تھے ۔ ماتھے پر چندن لگائے ۔ مرزئی اور گھٹنوں تک دھوتی کندھے پر سفید سلک کی چادر ، موٹے تازے ، آواز بھاری ، آس پاس کے مسافروں سے مصروف گفتگو تھے ۔ بات مختلف منزلوں سے گذرتی کوئی سیاست پر آگئی ۔ پنڈت جی کو گفتگو کا سلیقہ تھا ۔ وہ موثر انداز میں بول رہے تھے اور اپنی ہمہ دانی سے دوسرے مسافروں کو مرعوب بھی کر رہے تھے ۔ سیاست پر ان کی گفتگو اناڑیوں کی سی نہیں ، ایک واقف کار اور آشنائے راز کے انداز کی تھی ۔ سیاست میں گفتگو کانگریس اور مسلم کی کشمکش کے موضوع پر آگئی ۔ اس وقت مسلم لیگی سیاست گہرے بادل کی طرح اُٹھ رہی تھی اور پورے ہندوستان پر چھائی جا رہی تھی ۔ لیکن بہر حال اس وقت سیاست بڑی حد تک سیاست ہی تھی ۔ اور اہل سیاست ہی کے ہاتھوں میں تھی ۔ آج کی طرح عوامی بیماری نہیں بنی تھی ۔ سیاست پر باتیں لوگ کم کرتے تھے ۔ کرتے تھے تو آج کی طرح سیاست کی باتیں مغز سے خالی نہیں ہوتی تھیں ، معقولیت کا دیوالیہ نہیں نکلا تھا ۔ عموماً منطقی انداز ہوتا اور تاریخی پس منظر میں ہوتا ۔

www.taemeernews.com

پنڈت جی کا بھی انداز اسی نوعیت کا تھا ـــــ وہ خواہ مخواہ تنقید یا مسلم لیگ پر اعتراض نہیں کر رہے تھے ۔ وہ منطقی انداز میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہندو اور مسلم سیاست کی تقسیم مناسب نہیں ہے ۔ مفید نہیں ہے ۔ دونوں کے میل میں دونوں کے جوڑ ہیں، اتحاد میں، اتفاق میں ہی بھلا ہے ۔ ہندو مسلم دونوں کو قریب ہونے اور قریب کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے ۔ ان کی باتیں اسی مرکزی اور بنیادی نقطے کے طور پر گردش کر رہی تھیں ـــــ عبدالسلام ـــ ٹھہریئے ۔ شاید نام میں مجھ سے کچھ چوک ہوگئی ۔ ان کا نام عبدالسلام نہیں شاید سلام اللہ تھا اور دوسری غلطی بھی ہوئی ـــــ مجھے یاد آیا کہ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے ۔ نام نظام الدین تھا ۔ بڑے ہنس مکھ اور بڑے سبک رفتار ۔ سلام اللہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز تھے ۔ نظام ماموں کے گالوں پر چھوٹی چھوٹی گھنی سیاہ داڑھی تھی ۔ کبھی غصہ نہیں کرتے ۔ بولتے تب بھی مسکراتے ۔ اور مسکراتے ہی ہوئے شہید ہوگئے ـــــ ہاں تو سلام پنڈت جی کی باتیں غور سے سن رہے تھے نہ ان کا سن تجربہ کار پنڈت جی سے مخاطبت کے قابل تھا ۔ نہ مصلحت اس کی اجازت دے سکتی تھی ۔ مگر پنڈت جی کی باتوں سے ان کا چہرہ ایسا ہو رہا تھا جیسے اُبلتی ندی کو باندھ میں مقید کیا جا رہا ہو ۔

سلام کبھی خاموش رہنے والے انسان نہ تھے ۔ گفتگو کے دریا میں کود جانا ۔ مباحثے کے سمندر میں چھلانگ لگا دینا ان کی فطرت کا خاصہ تھا ـــ اور وہ دریا میں کود پڑے ۔ سمندر میں چھلانگ مار ہی دی ۔ سلام جب بولتے تو پھر رُکتے نہیں ۔ جیسے ریکارڈ پر سوئی رکھ دی جائے یا ٹیپ چلا دیا جائے ۔ سلام بولنے لگے تو مجھے حیرت ہوئی ۔ وہ یوں اعتماد کے ساتھ جوش سے بول رہے تھے جیسے وہ سائنس کے نہیں پولیٹکس کے طالب العلم ہیں ۔ میں تو سیاسی سوجھ بوجھ اِس وقت بھی نہیں رکھتا ۔ اُس وقت مجھے سیاست کا کیا ہوش تھا ۔ مگر وہ جو کچھ بولے بعد کی تحقیق سے صحیح ثابت ہوا ۔ اب نہ تو ان کی پوری گفتگو یاد ہے نہ وہ تاریخی حقیقتیں میرے ذہن میں ہیں ۔ ان کا جواب یا گفتگو یا شرکت مباحثہ کا ماحصل، خلاصہ، لب ولباب یہ تھا :۔

"پنڈت جی ! ہم نے تو نہیں دیکھا ـــ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ ہم نے دہلی میں ماتھے پر

www.taemeernews.com

قشقہ کھینچا' ہری کیرتن میں شریک ہوئے۔ وید اور قرآن کا جلوس نکالا۔ اسی جوڑ میل اتحاد اور اتفاق کا ثبوت دینے کے لئے (رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ نے واقعی ایسا کیا تھا) ۔ اس سے پہلے مولوی پیر علی اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ پٹنہ میں پھانسی کے تختے پر چڑھ گئے۔ دہلی میں توپ کے منہ پر باندھ کر اڑا دیئے گئے۔ اور اس سے بھی پہلے بالاکوٹ کے میدان میں ہندوستان کے لئے جان دی۔ جیلوں میں بہت گئے' چکی بہت پیسا' شہر بدر ہوئے' اپنے گھروں میں چنوا دیا گیا۔ کالے پانی کی سزا پا گئے۔

کئی بار پنڈت جی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر سلام کے منہ سے باتوں کا تیز سیلاب نکلا تو تمام خس و خاشاک کو بہا کر لے گیا۔ پنڈت جی اچھے آدمی تھے، سچائی کو قبول کرنے والے آدمی تھے۔ وہ بھی کچھ بولے اور سلام پھر بولے اور بولتے رہے۔

کچھ دیر مناظرے کی سی کیفیت رہی۔ پنڈت جی مانتے بھی رہے' صفائی بھی کرتے رہے۔ تائید بھی کی تردید بھی کی۔ لیکن سلام نے بولتی بند کر دی۔ اور صرف انہیں کی نہیں پورے کمپارٹمنٹ کی۔ پورے کمپارٹمنٹ میں تقریباً بیس پچیس آدمی تھے۔ سب پڑھے لکھے خوش پوش' باخبر اور باہوش، سب غیر مسلم اور غالباً سب مہاسبھائی۔ اس لئے کہ کوئی کھدر پوش نہیں تھا۔ کوئی کانگریسی نہیں تھا اور پورے مجمع میں صرف ہم دو مسلمان۔ مگر دنیا سے انصاف اور دیانت داری اتنی مقدار میں نہیں اٹھی تھی جتنی اب اٹھ کر برباد ہو گئی۔ اب تو کسی مجمع کے سامنے دیانت کی' انصاف کی' حقیقت کی' سچائی کی بات کیجئے تو آواز آتی ہے" بس بھاشن بند کیجئے اور سرسوتی پوجا کے لئے چندہ لائیے۔" پورا کمپارٹمنٹ توجہ سے سلام کو سنتا رہا اور خاموش رہا جو تسلیم و رضا کی علامت ہے۔ پنڈت جی کے چہرے پر ناگواری یا گرانی کا کوئی اثر نہیں تھا۔

آخر میں وہی شیروانی پوش، اگربتی بدست اٹھے۔ ہم لوگ کے نزدیک آئے۔ سلام کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

"ہاں جی۔ مسلم لیگ جو چاہتی ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ہم نے جو بویا ہے ہمیں کاٹنا ہے۔ ملک کو ایک دن بانٹنا ہے۔ مگر ملک بنٹ کر بھی کیا چین سے رہے گا؟' کتنا خون نکلے گا'

www.taemeernews.com

کتنا آنسو بہے گا ــــ اور پھر سلام کی پیٹھ ٹھونکی "مسلم لیگ کے ہو تو مسلم لیگ کے رہو۔ میں مہاسبھائی ہوں اور میرا نام جوالا پرشاد ہے"۔

لطف یہ کہ دلّی سے واپسی میں بھی الٰہ آباد کے قریب پنڈت جی سے ٹرین ہی پر ملاقات ہوئی۔ وہ الٰہ آباد سے بنارس آرہے تھے۔ بنارس ہی ان کا مکان تھا ــــ ہم دونوں کو پہچان لیا۔ بیٹھے، مزاج پرسی کی۔

نہ مسلم لیگ بُری چیز تھی نہ کانگریس بری چیز ہے۔ جیسے جیسے انسان بُرا ہوتا گیا جماعتیں بھی خراب ہوتی گئیں۔ مسلم لیگ ملک بٹوانے کو نہیں بنی تھی۔ ملک کی سالمیت ہی کے لئے قائم ہوئی تھی تاکہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوستان میں انگریزوں والی ہی ترکیب اور انگریزوں والا منصوبہ ایک دوسرے پر نہ چلنے لگے ــــ لیکن انسان بتدریج بُرا ہی بنتا گیا اور زمین بٹ گئی۔ لیکن بٹنے کے بعد بھی کیا بٹائی رُک گئی ہے؟ پہلے گھر دو بھائیوں میں تقسیم ہوا اب بھائی کے بیٹوں ــــ بیٹیوں میں تقسیم ہونے کے آثار ہیں۔ ذاتوں میں اور زبانوں میں بٹائی ہونے والی ہے۔ پہلے لوگ آسمان دیکھ کر چلتے تھے تو زمین کا جھگڑا کم تھا۔ اب سارے لوگ زمین ہی دیکھ کر چلتے ہیں۔

ہم اور سلام اللہ دلی پہونچے۔ دہلی جنکشن اسٹیشن کے قریب ہی تاج ہوٹل تھا۔ سلام ہمیں لے کر وہیں گئے۔ ہوٹل کے مالک دو بھائی تھے اور جہاں تک مجھے یاد ہے شاید دونوں نابینا تھے۔ مگر یہ تحقیق فوری نہیں ہوسکی۔ دونوں بھائی ہوٹل کے مالک بھی تھے اور نوکر بھی۔ کمروں کی صفائی، ضروری سامانوں کا انتظام، دونوں بھائی کرتے تھے۔ دونوں بھائی شاید دہلی والے ہی تھے۔ گورے چٹے، جوان اور تندرست، بھرکلا سیاہ داڑھی، لنگی اور اس پر کُرتہ۔ ہم لوگ پہنچے تو ایک صاحب اسی ہیئت سے کمرے میں جھاڑو دے رہے تھے کھڑے ہوکر ہمارا استقبال کیا۔ ضرورت پوچھی اور کمرے کی طرف رہبری کی۔ استنجا خانہ، غسل خانہ بتایا، صابن، تولیہ سب کچھ لاکر رکھا۔ ہدایت کی کہ ہوٹل مکان کے نیچے ہے۔ ناشتہ کھانا کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ باتیں آنکھ ملا کر کرتے۔ بہت حد تک ہمیں پتہ نہ چل سکا کہ آنکھیں بینائی سے محروم ہیں۔

www.taemeernews.com

کمروں کے اندر باہر سائبان، آنگن میں یوں چل پھر رہے تھے جیسے آنکھ والے چلتے پھرتے ہیں۔ دوسرے دن یا شاید اسی دن جب ہم لوگ ایک دن کا کرایہ دینے لگے تو ہماری طرف ہاتھ کے بڑھنے کا کچھ ایسا انداز چند لمحوں کے لئے ہوا کہ ہمیں کچھ شبہہ سا پیدا ہوا اور پھر غور کیا تو دیدوں کی شکل سے پتہ چل گیا کہ اندھے ہیں۔ پھر ہم دونوں کے دلوں میں ان کی قدر بڑھ گئی اور ہم نے خود ان کی خدمت شروع کی۔ اور اس کے بعد بھی کئی سال تک ہم دہلی میں انہیں کے یہاں ٹھہرتے رہے۔ تقسیم کے بعد سفر ہوا تو نہ وہ ہوٹل تھا نہ ہوٹل والے۔ ہمیں زیادہ تحقیق کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ یہی سوچ کر دل کو تسلی دی کہ پاکستان چلے گئے ہوں گے۔ خدا جانے پاکستان گئے یا سوئے آسمان گئے۔

سلام ہمیں لال قلعہ دکھانے کو اور دیکھنے کو لائے تھے۔ سلام کو سیر تفریح لائی تھی۔ مجھے سیر تفریح سے نہ بچپن میں دلچسپی رہی نہ اب ہے۔ تاریخ سے اور تاریخ ساز ہستیوں سے البتہ لگاؤ رہا، تعلق رہا، ان کی یاد رہی اور انھیں یاد رکھنے کی تمنا اور خواہش ہمیشہ رہی اور اب بھی ہے۔ تیلہاڑہ کی مردہ ندی پر ٹوٹا ہوا پل ہمیشہ کچھ یاد دلاتا۔ اور میں شام کے جھٹپٹے میں چونے اور سرخی سے بنی ہوئی اس قدیم مستحکم تعمیر کے پردے میں ایسے لوگوں کا تصور کرتا رہا جو خود بھی پکے لوگ تھے اور ان کی ہر تخلیق پکی ہوتی تھی۔ کتنی صدیاں گذر گئی تھیں۔ سیلابوں نے، طوفانوں، زلزلوں نے اس کی چول ڈھیلی کر دی تھی لیکن دیواریں، منڈیریں اور سطح ایسی ہی پختہ تھی جیسے ابھی بنی ہو۔ ہر قدیم چیز ایسی ہی معلوم ہوتی ہے۔ جیسے رامائن ابھی کہی گئی ہو، شاہنامہ ابھی کہا گیا ہو۔ جیسے میر صاحب ابھی کھڑے باتیں کر رہے ہیں:۔

دنیا میں یا الٰہی مروت کو کیا ہوا — چھوڑا وفا کو ان نے محبت کو کیا ہوا
دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ — سو تم منہ بھی ہم سے چھپا کر چلے

جیسے کانوں میں چپکے چپکے میر صاحب سرگوشیاں کر رہے ہوں اور سامنے وہی منظر گذرتا جا رہا ہو۔

www.taemeernews.com

جیسے خاموش فلموں کا دور کہ پہلے تحریر پردے پر آتی تھی پھر منظر آتا تھا۔

بہرحال ہم دونوں لال قلعہ دیکھنے گئے۔ اسکول کی تعلیم کے دور میں مجھے تاریخ سب سے آسان موضوع معلوم ہوتا۔ اسی لئے میں نے اسکول میں تاریخ کی نصابی کتابیں کبھی نہیں پڑھیں۔ اینگلو سنسکرت اسکول کا ایک ہم سبق دوست مہندر گویا تاریخ کی ایک کتاب تھا۔ جس روز تاریخ کا امتحان ٹسٹ یا فائنل ہوتا وہ میرے کمرے میں لیلیٰ کا بچ آجاتا۔ کھانے پینے سے فارغ ہوکر میں پلنگ پر بیٹھ جاتا اور مہندر کرسی بغل میں اسٹوو، کیتلی، چائے، چینی رکھی ہوتی سامنے ٹیبل پر بیڑی کے بنڈل اور ماچس ہوتی۔ وہ چائے بناتا، بیڑی سلگاتا اور تاریخ بولتا، میں خاموش سنا کرتا۔ صبح ہو جاتی میں امتحان گاہ چلا جاتا، تاریخ کا پرچہ لکھ کر چلا آتا اور نتیجہ نکلتا تو نسو میں ستر پچہتر مل جاتے۔ تاریخ سے لال قلعہ کو جان چکا تھا۔ شاہجہاں کا اس میں قید ہونا، جہاں آرا کی باپ کی خدمت، لال قلعہ کے جھروکے سے جمنا کنارے تاج محل کا نظارہ، نادرخاں کی تلوار، دہلی کی غارت گری، محمد شاہ رنگیلے کا دربار، نورجہاں کی غزلخوانی۔ تخت طاؤس، کوہ نور ہیرا کی داستان، مرہٹوں کی یورش، غلام قادر روہیلہ کا استبداد، لال قلعہ میں شاہ عالم کی بیگمات کا بھوک اور پیاس سے دم توڑ دینا اور جہاں دم توڑنا وہیں پر لال قلعہ کے فرش کو کھود کر ان کا دفن کیا جانا۔ لال قلعہ اور لال قلعہ کے تاریخی پس منظر میں واقعات اور حادثات کی تصویریں ذہن میں پہلے سے آویزاں تھیں۔ ۱۸۵۷ء کا غدر، بہادر شاہ ظفر کی مصیبتیں اور آلام، بیٹوں کا سر بریدہ طشت میں آنا اور بہادر شاہ کا جسارت مندانہ خطاب ان تراشیدہ سروں سے ـــــ دہلی کا لال قلعہ دور ہونے کے باوجود ذہن کے پردے میں قریب ہی چھپا تھا۔ لال قلعہ پہونچا تو ذہن کی تصویر آنکھوں کے سامنے والی تصویر سے مشابہ ہوگئی ـــــ صرف یہ ہوا کہ جس کے بارے میں سنا کرتا تھا، خیال کیا کرتا تھا۔ وہ لال قلعہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ انگلیاں اس کی دیواروں کو چھو سکتی تھیں۔ اور کان ان واقعات کی آواز بازگشت سن سکتے تھے جو ان دیواروں دروازوں، کھڑکیوں، جھروکوں کے قریب اندر یا باہر ہوئے اور تاریخ کی کتابوں میں زندہ ہوگئے ـــــ یہاں تک پر انگریز فوجیوں کا پہرہ اور فصیل پر یونین جیک کا پھریرا ـــــ میرا لہو ان کے کام آئے ـــــ کس کی دولت کون لٹائے ـــــ

www.taemeernews.com

لال قلعہ کی سرخ دیوار اور انگریزوں کے سفید چہرے ـــ ان سرخ و سفید کے درمیان کتنی سیاہ کاریوں نے جنم لیا ـــ میری نظروں کے سامنے کلکتہ کے فورٹ ولیم سے دہلی کے لال قلعہ تک کا ڈرامہ زندہ ہوگیا ـــ تاریخ نے کلکتہ سے دہلی کا سفر جو صدیوں میں طے ہوتا چند برسوں میں ہی کرلیا ـــ سراج الدولہ سے بہادر شاہ ظفر تک کا سفر اور درمیان میر قاسم اور لالہ رام نرائن موزوں کی منزلیں سات سمندر پار سے تاجر بن کر عبا کے اندر تلواریں اور آستینوں کے اندر چھریاں چھپائے لوگ آئے ـ کلکتہ میں پہلا قدم، دوسرا قدم عظیم آباد میں اور تیسرا دہلی، بس ؎

ان کی بزم سے مقتل صحن سے مکان اپنا
اک قدم یہاں اپنا اک قدم وہاں اپنا

ان قدموں کو میر جعفر، راجہ درلبھ رائے، نظام الملک وغیرہ نے اپنے کندھوں پر رکھ کر کہاں سے کہاں پہونچادیا ـ لیکن ٹیپو سلطان نے اس پاؤں پر تلوار جو ماری تو وہ ناسور تو ہوگیا ـ شاید واقعہ سب کو معلوم نہ ہو یا یاد نہ ہو ـ امر سنگھ، کنور سنگھ، رانی جھانسی کی یادگار منانے والے اس وطن پرست مردمجاہد ٹیپو سلطان کو یوں بھولنا چاہتے ہیں جیسے سوتیلے بیٹے باپ کو بھلا دیتے ہیں ـ جس نے زندگی بھر دائیں بائیں آگے پیچھے دشمنانِ وطن پر وار تو کئے، مرتے مرتے بھی ایک ہاتھ لگا گیا ـــ ٹیپو کی آخری جنگ جس نے ہندوستان کا فیصلہ کیا اور جس میں اس کی مادی زندگی کا بھی فیصلہ ہوگیا ـــ اس میدانِ جنگ میں ایک انگریز ٹیپو سلطان کی لاش کو ڈھونڈھتا ہوا آیا کہ اس کی قیمتی اور تاریخی تلوار حاصل کرے ـ وہ تنہا آیا ـــ ٹیپو کی لاش بے جان پڑی تھی ـ انگلیاں تلوار کے قبضے پر جمی تھیں ـ اس انگریز نے انگلیاں قبضے سے الگ کرنی چاہیں ـ ٹیپو کا مردہ ہاتھ بلند ہوا اور بھرپور وار اس کے پاؤں پر ہوا وہ انگریز گرا ـ معلوم نہیں اُٹھ سکا یا نہیں ـــ ٹیپو کہیں نظر نہیں آتا ـ نہ تقریروں میں نہ تحریروں میں نہ تقریبوں میں نہ جلسوں میں ـــ پچیس تیس سال پہلے تک کلکتہ دھرم تلہ سے گذرتے تو سہ راہے کے کونے پر مسجد نظر آتی تھی ـ اب بھی ہے ـــ میناروں پر پیتل کے کلس تھے ـ وہ "ٹیپو سلطان کی مسجد" کہی جاتی تھی ـ خدا جانے اب کیا کہی جاتی ہے ـ یا کب تک کہی جاتی رہے گی ـ

جی ہاں ! تو ہم لوگ لال قلعہ پہونچے ـ سلام کا بھی شاید پہلا ہی سفر لال قلعہ کا تھا ـ میں نے

www.taemeernews.com

تو دہلی کی سرزمین پر پہلی بار قدم ہی رکھا تھا۔ پھاٹک سے گذر کر ان عمارتوں کی قطار سے گذرے جہاں انگریزوں کی فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ پھر روش سے ہوتے ہوئے اس مرمریں حوض کو دیکھتے ہوئے جو ہزاروں من وزنی ہے اور ایک ہی پتھر کے ٹکڑے سے تراشا ہوا ہے اور جے پور سے اس وقت آیا تھا جب نہ ریل تھی نہ کرین تھا۔ خدا جانے کس ذریعہ سے، کس سواری سے آیا تھا۔ — ہم لوگ دیوان عام کی سُرخ عمارت میں پہونچے۔ جہاں اب لال قلعہ کا مشہور یوم آزادی کا مشاعرہ ہوتا ہے۔ جس میں دس بارہ سال تک میں مستقل جاتا رہا۔ اور ایک سال بہت دل دُکھا تو ایک نظم پڑھ کر جس کا آخری بند یہ ہے، چلا آیا اور پھر کبھی نہیں گیا۔

یہ جشن، یہ جلوس، یہ جلسہ، یہ بارگاہ
یہ شاعری، یہ داد، یہ تحسیں یہ واہ واہ
یہ پیار کے معاملے یہ لطف کی نگاہ
سب جھوٹ سب مغالطہ سب جرم سب گناہ
شاعر ہیں رازہائے دروں جانتے ہیں ہم
دنیا کو ہر لباس میں پہچانتے ہیں ہم

لکھ اے کلیم حالِ دل اپنا اٹھا قلم
اشکوں کی روشنائی بنا آہ کا قلم
یہ بوجھ کیا اٹھائے کوئی دوسرا قلم
تیری زبان تیری کہانی ترا قلم

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابیؓ نے عرض کیا مجھے آپؐ سے بڑی محبت ہے۔ آپؐ نے فرمایا غور کر لو کیا کہہ رہے ہو۔ انہوں نے بار بار یہی عرض کیا مجھے آپؐ سے بڑی محبت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے چاہنے والوں کی طرف مصیبتیں، بلائیں یوں دوڑتی ہیں جیسے پانی ڈھلان سے نیچے کی طرف دوڑتا ہے"۔

www.taemeernews.com

دنیا جانتی ہے کہ یہی ہوا اور خوب ہوا۔ جی بھر کے مصیبتیں، بلائیں، آفتیں، تکلیفیں محبت کرنے والوں کی طرف دوڑیں۔ ہر محبت کا یہی خاصہ ہے، یہی نتیجہ ہے۔ مصیبتیں اور بلائیں ہی اسکی غذا، اس کا لباس، اس کا پیرہن، اس کا گھر، اس کا آنگن محبت کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں اس کا کوئی کنبہ نہیں، کوئی قبیلہ نہیں، کوئی خاندان نہیں۔ یہ تنہا پیدا ہوئی اور تنہا ہی رہتی ہے۔ اس کا کوئی سرپرست نہیں، کوئی نگہبان نہیں۔ یہ خود ہی اپنی سرپرست، خود ہی اپنی نگہبان ہے —— خدا کا بھی کوئی کنبہ، قبیلہ خاندان نہیں۔ خدا بھی تنہا ہے۔ خدا کا ایک نام محبت بھی ہے۔ محبت بھی تنہا، خدا بھی تنہا۔ محبت کو بھی لوگ ستاتے ہیں۔ خدا کو ستانے والے ہی دنیا میں زیادہ ہوئے۔ خدا سے بغاوت کرنے والے بھی اور اطاعت کرنے والے بھی۔ بغاوت کرنے والے کھل کر تکلیف پہنچاتے ہیں، اطاعت کرنے والے چھپ کر۔ مگر ستانے والے دونوں ہیں۔ محبت کو بھی ستانے والے سب ہیں۔ اس کے دشمن بھی، اس کے دوست بھی، روپ والے بھی، بہروپ والے بھی، مجنوں کو شہر والے بھی ستاتے تھے، لیلیٰ کے گھر والے بھی اور خود لیلیٰ بھی۔ ورنہ پھر معشوق کا نام ستمگر کیوں پڑتا؟ شہر کے لڑکے آوازہ کستے، تالیاں بجاتے، ذلیل کرتے، پتھر مارتے اور مجنوں پتھر کھا کھا کر جھومتا اور رقص کرتا۔ عجیب بات ہے کہ پتھر ہی محبت کو زخم بھی دیتا ہے اور مرہم بھی لگاتا ہے۔ محبت کو پھول دو تو صحت مند محبت بیمار ہو جاتی ہے۔ پتھر لگاؤ تو بیمار محبت صحت مند اور توانا ہو جاتی ہے۔ محبت کرنے والے خوش نام نہیں رہے، ہر دلعزیز نہیں رہے۔ رسوا رہے، بدنام رہے، خانہ برباد رہے، محبت کو فرش، مخمل نہیں ملا، پھولوں کی سیج نہیں ملی، موسم کی لوریاں نہیں ملیں، ساون کی پھواریں نہیں ملیں، اس کی قسمت میں بسنت نہیں، ہولی نہیں، دیوالی نہیں، چراغاں نہیں۔ اس کے باغ میں بہاریں بہت کم۔ خزاں بہت زیادہ، پت جھڑ ہی پت جھڑ، سکھاڑ ہی سکھاڑ۔ پھولوں کی ہنسی اس کی تقدیر میں بہت کم ہے۔ کلیوں کی مسکراہٹ، نسیم سحری کی سرسراہٹ بہت کم۔ اس کے دریا میں موجیں بہت اٹھتی ہیں۔ اس کے سمندر میں سکون نہیں۔ طوفان بہت آتے ہیں۔ بھنور ہی بھنور، گرداب ہی گرداب۔ اس کے ساحل ناہموار، اس کے راستے دشوار گذار۔ اس کا زیور زنجیریں، اس کا منصب رسن و دار۔ اس کی معصومیت پر سب ڈھلتے ہیں، مگر اس کی اٹھان سے ڈرتے ہیں، اس کے شباب سے جلتے ہیں۔

www.taemeernews.com

میرے اشاروں پر خوب غور کیجئے، اور پھر تجربوں کی کسوٹی پر کسئے۔

پندرہ سولہ سال کی عمر تک میری معصوم محبت سب کو پیاری لگی اور لگتی رہی، اور سب نے پیار کیا۔ زمین کی مٹی نے بھی آسمان کے تاروں نے بھی۔ چاندنی نے بھی، اندھیروں نے بھی، اپنوں نے بھی، غیروں نے بھی، مسلمانوں نے، کافروں نے، سب نے پیار کیا۔

بیس سال آتے آتے مٹی گرم ہونے لگی، ہوائیں تیز ہونے لگیں، ستارے چھپنے لگے، آسمان ٹوٹنے لگا اور آسمان ٹوٹ پڑا، بادل گرجنے لگے، طوفان اٹھنے لگے، سیلاب امنڈنے لگے، میں جلنے لگا، چیخنے لگا اور پھر ڈوبنے لگا۔ جل کر، چیخ کر، ڈوب کر ابھرا تو دنیا بدلی ہوئی تھی۔ اور گذری ہوئی دنیا کا دردناک گیت ہونٹوں پر تھا اور تصویریں الفاظ میں۔ بدلی ہوئی دنیا نے ان تصویروں کو دیکھا، گیتوں کو سنا۔ جیسے شہر والوں کے سامنے بانسری لئے کوئی خانہ بدوش آجائے۔ ہر اجنبی چیز پہلے اچھی لگتی ہے۔ شہر والوں کو خانہ بدوش اچھا لگا۔ اس کے گیت اس کے نغمے اچھے لگے، اس کی تڑپ اچھی لگی، اس کی آہیں کراہیں سب اچھی لگیں۔ اس کے پسماندہ جذبات، اس کی کھردری زبان، اس کا سیدھا سادہ بیان، اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ، موٹے جھوٹے خیالات، اس کی پرانی دہرائی باتیں، اس کی نوچی کھسوٹی روایتیں سب اچھی لگیں۔ نگاہیں اس کی طرف مڑنے لگیں۔ انگلیاں اٹھنے لگیں۔ لوگ دور تک پیچھے پھر پھر کر دیکھنے لگے، اشارے کرنے لگے۔

شاید ۱۹۵۲ء میں انجمن اسلامیہ ہال میں کل بہار مشاعرہ تھا۔ بہار کے ہر شہر سے اساتذہ کرام تشریف لائے تھے۔ غلام سرور صاحب مہتمم بھی تھے، منتظم بھی تھے اور نقیب بھی تھے۔ سید جعفر امام، محمد ایوب مرحوم ایڈوکیٹ صدارت کر رہے تھے۔ تمام بہاری سخن سنجوں، سخن فہموں، سخن شناسوں اور سخن گویوں سے انجمن اسلامیہ ہال ٹھسم ٹھس بھرا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہیں بھی بالشت بھر جگہ نہیں تھی۔ سید منور الہدیٰ آنریری مجسٹریٹ، پٹنہ سیٹی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ بیٹھیں تو کہاں بیٹھیں؟ سید علی عباس جو اس وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ دروازے کی چوکھٹ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ جمیل مظہری صاحب، اجتبیٰ رضوی صاحب،

www.taemeernews.com

پرویز شاہدی، علامہ عبدالمنان بیدل، شمس منیری، سریکاباری، شمس گیادی، پروفیسر مسلم عظیم آبادی، مہجور شمسی، مانوس سہسرامی، یاس بہاری۔ بس مشاعرہ گونج رہا تھا، جھوم رہا تھا، سج رہا تھا، جم رہا تھا۔

میں نے بھی سہمے سہمے لہجے میں، دھیمے دھیمے ترنم سے، جھجکے جھجکے انداز میں غزل پڑھی ؎

مجھے اس کا کوئی گلہ نہیں کہ بہار نے مجھ کو کیا دیا
تری آرزو تو نکال دی ترا حوصلہ تو بڑھا دیا
تری خو نے گرچہ ہر اک طرح مجھے نا امید بنا دیا
یہ میری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کر کے دکھا دیا
کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہیں اک چراغ جلا دیا
تجھے اب بھی میرے خلوص کا نہ یقین آئے تو کیا کروں
ترے گیسوؤں کو سنوار کے تجھے آئینہ بھی دکھا دیا

اور اشعار یاد نہیں رہے، مجموعے میں ہیں۔ منور الہدیٰ صاحب میری دائیں طرف دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ سیاہ شیروانی، سیاہ ٹوپی، گورے چٹے چہرے پر سنہری کمانی کی عینک۔ آنکھیں بند تھیں آنسو بہہ رہے تھے اور دیوار سے لگے لگے دائیں بائیں یوں جھوم رہے تھے کہ اغل بغل والوں کو شاید تکلیف ہو رہی تھی اور حضرت شاہ الیاس یاس بہاری مرحوم زور سے بول گئے۔ "بہت اونچے جا رہے ہو کلیم۔ بہت اونچے جا رہے ہو"۔

شاہ الیاس یاس صاحب بہاری مرحوم غالب کے گھرانے کے ایک صاحب طرز بزرگ شاعر تھے۔ میں نے بچپن میں اسلام پور خانقاہ کے مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے انھیں ایک بار دیکھا تھا اور ان کی غزل کا پہلا مطلع ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا ؎

آئی بہار آپ سے جانے لگا ہوں میں
دامن کی سمت ہاتھ بڑھانے لگا ہوں میں

www.taemeernews.com

اچھا چھوڑیئے ان کہانیوں کو۔ یہ کہانیاں پھر سناؤں گا۔ یہ تماشے، یہ مناظر پھر دکھاؤں گا۔ بہت کچھ کہنا ہے، بہت کچھ دکھانا ہے۔ آپ سنیں گے اور سر دھنیں گے۔ دیکھیں گے اور حیرت کریں گے مزا چکھیں گے اور رقص کریں گے۔ جھومیں گے اور گنگنائیں گے۔ اور پھر آپ ہی میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جن کے دل میں معاً ایک ٹیس دبے گا" ایک لہر داخل ہوگی۔ یہ لہر فطری نہیں ہے۔ اس کا پاور ہاؤس بعد میں بنا ہے۔ یہ فضا میں بنا ہے، اسے شیطان نے بنایا ہے۔ اس پاور ہاؤس کی لہر کو داخل کرنے کے لئے نئی نقلی عارضی رگیں بنائی گئی ہیں، جیسے آج کل ہر چیز پلاسٹک کی بنتی ہے۔ دل پلاسٹک کا، گردہ پلاسٹک کا، رگیں اور شریانیں پلاسٹک کی، جنہیں ڈاکٹر آپریشن کر کے انسانی جسم میں داخل کرتا ہے۔ شیطان اپنی بنائی ہوئی رگیں اور شریانیں آپریشن سے داخل نہیں کرتا۔ یہ خود بہ خود داخل ہوتی ہیں۔ غلط کمائیوں سے اور بغیر محنت کی کمائیوں سے اور غلط خرچ سے۔ غلط تشت، غلط صحبت، غلط مطالع، غلط مباحثہ، غلط مشغلہ سے، انسان یہ سب کرنے لگتا ہے تو جسم میں یہ نقلی اعضاء، رگیں اور شریانیں خود بہ خود فٹ ہو جاتی ہیں اور ان کا تعلق اس شیطانی پاور ہاؤس سے ہو جاتا ہے اور ٹھیک اس وقت جب آپ محبت سے، درد سے، چاہت سے، تعلق سے، لذت سے، فرحت سے جھوم رہے ہوں گے، سر دھن رہے ہوں گے، وہ رگیں، شریانیں جاری ہو جائیں گی اور پاور ہاؤس سے حسد و بغض، رشک، جلن کی لہریں آپ کے جسم میں داخل ہو جائیں گی اور پھر آپ پہلو بدلیں گے، ٹہلیں گے ــــ" کاش یہ شخص ایسا نہیں کہتا۔ ایسا نہیں پڑھتا۔" اس کی باتوں سے، اس کی تحریر سے، اس کے انداز سے، اسلوب سے، لہجے سے، اس کی نثر سے، نظم سے، غزل سے، ترنم سے، خیالات سے، جذبات سے آپ کو تکلیف ہونے لگے گی۔ آپ کوشش کریں گے کہ یہ مشاعروں میں نہ آئے۔ مجلسوں میں نہ آئے۔ اس کی کتاب نہیں شائع ہو۔ اس کا مضمون نہیں چھپے۔ پبلشر کو بہکا دیا جائے گا، ایڈیٹر پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ بیچارہ پبلشر پریشان، ایڈیٹر حیران ؎

گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

ثبوت سنئے۔ "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" چھپنے لگا۔ بزم کاف والوں کے پاس لوگ پہونچنے لگے۔

www.taemeernews.com

"یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟' اتنا خرچ کر رہے ہیں؟ یہ پیسے بزنس میں لگائیے فائدہ ہوگا۔ یہ ہندوستان ہے۔ یہ اردو ہے۔ آپ کو کیا جنون ہے؟ یہاں اُردو کی دو چار روپے کی کتاب پچاس فیصد کمیشن پر بھی مشکل سے فروخت ہوتی ہے۔ آپ لوگ ایک سو دس روپے کی کتاب چھاپ رہے ہیں؟"

اور جب کتاب چھپ گئی۔ صدر جمہوریہ نے اس کا اجرا کیا۔ دہلی نمائش میں گئی۔ لندن نمائش میں گئی۔ صدر جمہوریہ نے پبلشر اور پرنٹر کو نیشنل ایوارڈ دیا۔ حکومتِ ہند نے اور محکمہ اطلاعات امریکہ نے سو سو جلدیں خریدیں۔ ایک جلد آنجہانی کنہیا لال کپور کے ہاتھ لگی۔ انہوں نے ایک مضمون لکھا۔ "آجکل" میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ اس وقت ایڈیٹر صاحب ایک بہاری صاحب بہادر تھے۔ مضمون کپور صاحب کو یہ لکھ کر واپس کیا کہ "ہم زندوں پر مضمون نہیں چھاپتے۔" کپور صاحب نے میرے مرنے کا انتظار نہیں کیا۔ "نیا دور" کو بھیجا۔ بھلا منڈلی بیل تلے آتی؟ جواب آیا فی الحال بہار کے کسی فنکار پر ہم مضمون کی گنجائش نہیں رکھتے۔" کپور صاحب بے حد بدمزہ ہوئے مضمون ضروری نوٹ اور خط کے ساتھ بزم کاف والوں کو بھیج دیا۔ ہم نے منع کر دیا کہ کسی رسالے میں نہ بھیجئے۔ وہ مضمون "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کے پاکستانی ایڈیشن میں دو سال قبل شامل کر لیا گیا ہے — کسی نے دو جلدیں ساہتیہ اکیڈمی کو بھیج دیں۔ معلوم ہوا، سو کتابوں میں تیس کتابوں کا انتخاب ہوا۔ اس میں یہ کتاب آگئی ہے۔ پھر خبر ملی تیس میں تین کتابیں منتخب ہوئی ہیں، اس میں بھی آگئی ہے۔ آخر میں تین کتابوں میں کسی ایک پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ ملنا تھا۔ اس سال تین ماہرین شعر و ادب کے بورڈ میں شاید آل احمد سرور صاحب اور حبیب تنویر صاحب بھی تھے۔ اس سال کسی کتاب پر ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ "ڈکونہ موکو چولھے میں جھونکو"۔

انہیں مدیر "آجکل" کو جو میرے دور کے عزیز بھی ہیں اور دوست بھی تھے اور میری بڑی قدر کرتے تھے، بہت محبت کرتے تھے۔ جب کسی مشاعرے میں دہلی جاتا، اپنے یہاں ٹھہرانے پر اصرار کرتے۔ دو ایک بار زبردستی پکڑ کر مع سامان اپنے بنگلے پر لے گئے۔ بڑی ضیافت کی مستقل مہمان رکھا۔ جب پٹنہ آتے مجھ سے ملتے۔ میں نے اپنی کتاب ہدیۂ محبت کہہ کر بھیجی۔ کچھ انہیں

www.taemeernews.com

لکھا تو نہیں۔ توقع تھی کہ وہ اپنے گراں قدر تبصرے سے نوازیں گے۔ کتاب کی رسید میں ایک کارڈ آیا جس پر صرف دو تین سطریں تھیں اور کتاب کے متعلق صرف ایک بات "کیا پہچان کا املا آپ یونہی لکھتے ہیں؟"

میں نے اس کا جواب انہیں ایک سے بھی کم سطر میں لکھ کر بھیج دیا کہ "کیا پوری کتاب میں صرف یہی ایک بات آپ کو لکھنے کے قابل ملی؟" آج تقریباً سات سال ہوئے پھر نہ ان سے دہلی میں کبھی ملاقات ہوئی نہ پٹنہ میں۔ حالانکہ وہ ہر اس مشاعرے میں موجود رہتے ہیں جس میں میں شریک رہتا ہوں۔ پٹنہ آتے ہیں اور میرے قریب ہی اپنے ایک عزیز کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔

بس ایک خطا کر کے گنہگار ہوئے ہم

ایسے حضرات آپ کی مجلسوں سے، نشستوں سے، حلقۂ تعلقات سے دور نہیں ہوں گے۔ آس پاس ہی ہوں گے۔ میرے بھی اغل بغل ہی ہیں۔

یہ بات مجھ سے جو چاہے جہاں کہلوائے
ڈبونے والے یہی ہیں اغل بغل والے

ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فردوسی، حافظ، عرفی، صائب، میر، غالب، اقبال سب کے ساتھ رہے لیکن وہ لوگ مرد میدان بھی تھے۔ قلم ان کا حسد اور رشک ہی کی تحریک سے چلتا تھا لیکن وہ مخلص بھی تھے وہ سر محفل ٹوکتے بھی تھے، اعتراض کرتے بھی تھے، اختراض چھاپتے بھی تھے۔ ان کے یہاں تضحیک کا پہلو ضرور نمایاں ہوتا تھا لیکن کہیں کہیں تنقید بھی چھپی رہتی تھی۔ وہ لوگ میدان میں رہتے تھے۔ زندہ لوگوں میں تھے۔ روشناس خلق تھے۔ عمر جاوداں کے لئے چور نہیں بنتے تھے۔ اسی لئے شاد نے دونوں پہلوؤں کی طرف نشاندہی کی ہے ؎

کہا کیا کیا نہ یاروں نے ادھر روئے سخن کر کے
مگر بیٹھے ہیں خاموشی کو ہم قفل دہن کر کے

اور پھر یہ بھی کہا ؎

بتا دیا مجھے۔ سچ۔ سچ کے راستہ چلنا
خدا بھلا کرے اے شاد نکتہ چینوں کا

www.taemeernews.com

اب وہ بات کہاں - ان کی باتیں ٹھوس بنیادوں پر ہوتی تھیں - اب تو یہ حضرات ہی ٹھوس بنیادوں پر نہیں، بات کے لئے بنیاد کیا تلاش کریں گے - ان کا کام بندگی سلام پر چلتا ہے حاضری صبح و شام پر چلتا ہے - نظیر نے نسخہ بتایا ہے ؎

چند دن جس کو خوشامد سے کیا جھک کر سلام
وہ بھی خوش ہو گیا اپنا بھی ہوا کام میں کام

چند دن سلام کرنے سے کام بن جائے تو سر کون رگڑے، بھیجا کون کھائے، دل کون جلائے، یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے - لیکن ایسے سر پھرے کہاں ؟ ؎

اے عشق مل سکیں گے ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے

تو پہلے عیب کرنے کا بھی لوگوں کو ہنر معلوم تھا - ایک سلیقہ زندگی کا تھا جس کا پرتو ان کے ہر عمل پر تھا - برائی بھی کرتے تھے تو حسن کے ساتھ، اعتراض بھی کرتے تھے تو خوبصورتی کے ساتھ - بھوتے استرے سے بھی ایسی حجامت بنا دیتے تھے کہ سر سہلانے کا بھی احساس اور ضرورت باقی نہیں رہتی تھی - اب تو بولنے کا بھی شعور نہیں - بولیں تو کیا بولیں، لکھیں تو کیا لکھیں - پہلے تو ان پڑھ دیہاتیوں کا بھی ذہن رسا ہوتا تھا - اب تو پڑھے لکھوں، ڈگری یافتوں کے دماغوں کی سڑکیں اور شاہراہیں بھی ٹوٹی، ویران اور ناہموار ہوتی ہیں جس پر کسی خیال کا گذرنا مشکل ہوتا ہے - میرے دیہات میں ایک بار برات آئی - نوشہ دروازہ لگنے کو آیا - نوشہ والے ایسے موقعوں پر شائستہ اور کبھی ہلکے نا شائستہ مذاق کا دریا بہا دیتے ہیں - خوب نوک جھونک ہوتی ہے - سرات والے بھی تیاری کر کے رکھتے ہیں دروازے کے قریب رکھی ہے - دروازے پر سرات والے پریڈ لگائے کھڑے ہیں اور پالکی کی دوسری طرف برات والے براجمان ہیں - دونوں طرف سے جملوں کے تیر چل رہے ہیں، فوارے اڑ رہے ہیں، پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں، مصرعے بھی بن رہے ہیں، نعرے بھی چست ہو رہے ہیں - قہقہے پر قہقہے ہیں - دونوں فوجیں ایک دوسرے کو شکست دینے کی کوشش کر رہی ہیں - لیکن دونوں میں کوئی گرنے کا نام نہیں لیتا تھا - میری بڑی بہن محمودہ مرحومہ کی شادی ہونے لگی - اکرام بھائی پالکی پر پھاٹک کے

www.taemeernews.com

پاس منہ پر رومال رکھے بیٹھے ہیں۔ اکرام بھائی خود بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ایک بذلہ سنج، فقرہ ساز، جملہ بند، حاضر جواب۔ اور انہوں نے چُن چُن کر شاہو بیگہہ کے چھٹے ہوئے جوانوں اور بزرگوں کو لایا تھا۔ جن میں مرحوم پروفیسر ڈاکٹر عبدالمجید شمس بھی تھے۔ شاہو بیگہہ کے ذہین اور ماہرین فقرہ سازوں کا ایک پرا تھا جو پالکی کی دوسری طرف کھڑا تھا اور میرے مکان کے پھاٹک پر۔ موسی بنی گھاٹ شیلا کے جنگلی علاقے میں کسی چھوٹے موٹے بزنس میں مصروف عبدالعزیز چچا تھے۔ جن کا ذکر" جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی میں آیا ہے۔ ایک ہاتھ ان کا مڑتا نہیں تھا مشکل سے ٹوٹے پھوٹے خط میں اُردو لکھ لیتے تھے۔ میرے گھر میں اس مذاق کا کوئی نہیں۔ بھائی جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اعظم نانا وغیرہ باورچی خانے میں مصروف تھے۔ مگر جناب وہ بات دیکھی کہ اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ شاہو بیگہہ کے ماہرین مذاق کی فوج اس ادھیڑ تقریباً جاہل دیہاتی عبدالعزیز چچا کے مقابلے میں گرد تھی۔ یہ جنگ ہوتی ہے" ڈولا چھکی" کے مطالبے پر۔ وہ بہرحال رسماً کوئی رقم دے دی گئی اور شاہو بیگہہ کی فوج تقریباً کھسیانی ہو کر پالکی کے پاس سے ہٹ گئی۔

ہاں تو یہ بات ضمن میں نکل آئی۔ بات وہ تھی کہ میری بستی میں ایک دوسرے گھر میں بارات آئی۔ نوشہ دروازہ لگنے کو آیا تو برات والوں کے مقابلے کو کوئی پارٹی وہاں پر نہیں تھی۔ نوشہ بغیر ڈولا چھکی کی ادائیگی کے اندر چلا گیا مگر براتی والے تشنہ دہن، تشنہ لب نظر آ رہے تھے۔ کوئی مذاق کرنے کو ملا نہیں۔ کوئی مقابلے کو آیا نہیں ــــ اتفاق سے قریب ہی چوکی کے فرش پر ایک دیہاتی لڑکا کرتہ پاجامہ پہنے معصوم خاموش بیٹھا تھا۔ ایک صاف ستھرے براتی کی رگِ مذاق پھڑکی۔ اس لڑکے کے قریب آئے جھک کر کہا" بابو تمہارا نام کیا ہے؟"ــ اس لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا" شریف الدین" اتفاق سے اس براتی صاحب کا نام" شرافت حسین" تھا۔ انہوں نے کہا: " آہا تمہارا نام شریف الدین ہے؟" پھر اپنی طرف اشارہ کر کے تب تو تم میں شرافت کا نطفہ ضرور شامل ہوگا۔" وہ لڑکا بیچارا کیا سمجھتا خاموش رہا۔ انہوں نے دو ایک بار اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور کہا" بولو نا بابو، تم میں شرافت کا نطفہ ہے نا؟" وہ کچھ رویا رویا سا ہو گیا۔ اتفاق سے اس لڑکے کا دیہاتی باپ بھی کہیں قریب ہی میں تھا۔ بچہ رونے لگا تو وہ پاس آیا، بچے کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور کہا" چل بیٹا مت رو،

www.taemeernews.com

شرافت کی ایسی تیسی، شرافت کے باپ کی ایسی تیسی، شرافت کی ماں کی ایسی تیسی، شرافت کے دادا کی ایسی تیسی، شرافت کی دادی کی ایسی تیسی، شرافت کے نانا کی ایسی تیسی، شرافت کی نانی کی ایسی تیسی، شرافت کے پردادا کی ایسی تیسی، شرافت کی پردادی کی ایسی تیسی، شرافت کے پرنانا کی ایسی تیسی، شرافت کی پرنانی کی ایسی تیسی....'' اور خدا جانے اس نے سات پشت گنائے یا چودہ پشت۔ اس دیہاتی نے آگے پیچھے کا پورا شجرا ادھیڑ کر رکھ دیا۔ بیچارے شرافت حسین صاحب ہکا بکا منھ دیکھتے رہ گئے ـــــ اسے کہتے ہیں سلیقۂ گفتار۔ جس کی جوتی اسی کا سر۔ اور اسی کو کہتے ہیں کہ نہ ہڑے لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اب آپ ملکوں ملکوں ڈھونڈ آئیے، ایسی باتیں سنیں گے؟ اب تو یہ ہوتا ہے کہ ٹٹی کی آڑ میں بیٹھتے ہے اور بھوتری چھری سے ذبح کرتے ہیں ـــ اکبر نے کہا تھا: ؎

کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمن

اب میاں جمن کہاں؟ کانسل میں دیکھئے یا مسجد میں، اب تو تمام سید ہی سید ہیں۔ پہلے گلیوں گلیوں میں میاں جمن تھے تو کونسل پر بھی کنٹرول تھا اور مسجد پر بھی۔ اب تمام سید آگئے تو نہ کونسل کنٹرول میں رہا نہ مسجد رہی۔ پہلے ذرّے کا دل چیرا جاتا تو لہو خورشید کا نکلتا تھا۔ اب خورشید کے لہو سے ذرّے بے نیاز ہو گئے یا محروم ہو گئے۔ سب کے یہاں اپنا جنریٹر ہے۔ پاور ہاؤس سے سب کا کنکشن ختم۔ اور سچ پوچھئے تو پاور ہاؤس میں بھی پاور کہاں رہا۔ زیادہ تر تو بلیک آؤٹ ہی ہے۔ لامحالہ الگ الگ جنریٹر کی ہی ضرورت پڑے گی۔ باپ کا علم بیٹے کو کیا ازبر ہو جب ابا جان ہی علم سے خالی ہو گئے۔

دوسری جنگ عظیم جاری تھی جرمن کا حلیف جاپان میدان میں آچکا تھا۔ میں کلکتہ میں انٹرنس کے امتحان سے فارغ ہو کر مقیم تھا۔ لڑائی ہندوستان کی سرحد کے قریب آگئی تھی۔ مشرقی محاذ گرم ہو رہا تھا۔ اس لئے کلکتہ کے بڑے تجار اور صنعت کار اور سرمایہ دار متوحش، پریشان اور خوف زدہ تھے۔ مگر دیوانوں کا کاروبارِ شوق جاری تھا۔ کلکتہ کے منومنٹ میدان میں وہ عالم اب کہاں جب اس کے

www.taemeernews.com

سبزہ زار میں رائے بہادر سکھ لال کرنانی اور سیٹھ جیون بخش کے دوش بدوش کلکتہ کا کوئی رکشہ والا یا چاندنی چوک کی کسی دکان کا ملازم اور ان جیسوں کے ایسے سینکڑوں صبح صادق کے اندھیرے سے طلوع آفتاب کی جگمگاتی ہوئی روشنی تک چہل قدمی کرتے تھے۔ لپکتے تھے، کبھی دوڑتے تھے، کبھی شبنم اور گھاس پر سو جاتے تھے، شبنم ملی ہوئی مٹی ہاتھوں پر اور گردنوں پر ملتے تھے۔ دور دور تک سناٹا رہتا تھا۔ اب تو میدان پہچانا ہی نہیں جاتا۔ تعداد تو انسانوں کی ضرور بڑھی ہے مگر تعداد سے بہت زیادہ ہر انسان کا پیٹ بڑھ گیا۔ چھ انچ کا پیٹ اب خدا جانے چھتیس انچ کا یا بہتر انچ کا ہو گیا ہے۔ اس پیٹ نے انسان کا سب کچھ اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ کھانا، کپڑا، مکان، ضروریات عشق سب کچھ اسی میں ہے۔ یہ آسودہ ہوئے تب سب آسودہ ہوں۔ اور بھلا پیٹ کہیں آسودہ ہوتا ہے؟ بچپن میں کئی سال میں کلکتہ میں رہا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران بھی اور اسکول کے بعد بھی۔ وہاں ہوٹل بھی تھے، چائے خانے بھی، سڑک دسترخوان بھی سگران کا وقت مقرر تھا۔ وہاں لوگ دیر سے سوتے تھے اور سویرے اُٹھتے تھے۔ آفتاب نکلتے نکلتے ہوٹل، چائے خانے اور سڑک دسترخوان آباد ہو جاتے۔ رکشہ والے، جھانکھا والے، ٹھیلے والے، قلی مزدور، فٹن کے کوچبان، سائیس، مکانوں کے پہریدار، دربان، آفس کے بابو، دکان کے ملازمین، فٹ پاتھ کے کنارے تین چار پیسے کی ڈبل روٹی، تین چار پیسے کی اچھی گاڑھی، لبریز، لب سوز اور لب دوز چائے کھا پی کر دوپہر تک کے لئے آسودہ مطمئن اور آمادۂ مشقت ہو جاتے۔ پھر عموماً چائے خانوں اور فٹ پاتھ کے دسترخوانوں کا ٹاٹ اُلٹا ہوا نظر آتا۔ یہ دکان بس سویرے کا سویرے ہی کھلتی۔ یہ دورانِ جنگ کی بات ہے ورنہ جنگ سے پہلے تو خالص گھی میں شیرہ ٹپکتی ہوئی ہتھیلی بھر کی موٹی لمبی چوڑی جلیبی دو پیسے کو اور اتنی ہی بڑی اور موٹی کچوری گھی اور مسالوں کی خوشبو پھیلاتی ہوئی پیٹ میں اُتار کر بغیر چائے کے ڈکار لے کر لوگ نکل جاتے اور دوپہر تک پیٹ پوجا سے بے نیاز بے خبر اور بے پروا اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے۔ دوپہر ہوتی تو ہوٹل میں دو پیسے کی دو گرم گرم تندوری روٹیاں دو پیسے کے سالن اور ایک پیسے کی دال انہیں پھر رات تک کے لئے پیٹ کی فکر سے آزاد کر دیتی۔ میں نے اچھی خوراک کھاتے دیکھا، اہتمام کا دسترخوان دیکھا، جم کر کھاتے اور ڈکار لیتے دیکھا مگر کھانے پر مرتے اور کھانے پر دیوانے ہوتے نہیں دیکھا۔ جنگ کے

www.taemeernews.com

دوران بھی گرانی بڑھی تو دو آنے میں ناشتہ، چار آنے میں کھانا لوگ کھا لیتے تھے۔ پھر کام میں لگے رہتے تھے۔ نہ بار بار چائے کی احتیاج تھی نہ تحت القہوہ کی۔ سب کا وقت مقرر تھا۔ اور وقت سے پہلے یا وقت کے بعد بے وقت کام کرنے کی عادت عام طور سے مفقود تھی۔ اب کلکتہ میں کیا کسی شہر میں، گاؤں میں چلے جائیے دو دو قدم پر جھنڈ کے جھنڈ لوگ گلے بیل کی طرح چبا رہے ہیں باتیں کر رہے ہیں، گلاسوں میں چائے پی رہے ہیں، ہنس رہے ہیں اور مغلظات بک رہے ہیں۔ اس لئے اب کلکتہ کا منومنٹ کا میدان پہلے جیسا نہیں رہا۔ میدان کے قریب پہنچنے پر بھی میدان نظر نہیں آتا۔ دکانیں، مارکٹ، گومٹیاں، خوانچے، ٹھیلے جال کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ میدان کا چپہ چپہ ان سے روپوش ہے۔ اور ان گومٹیوں، دکانوں، ٹھیلوں اور خوانچوں کے سامنے بوڑھے، جوان، بچے، سجی، سنوری عورتیں، بیاہتائیں، کنواریاں، اچھی ساریوں، شلواروں اور دوپٹوں اور سینڈلوں میں کھڑی منہ چلا رہی ہیں۔ ایک ہاتھ میں ٹھونگا ہے دوسرے میں تار کی قیمی ہے۔ اسی عالم میں دوپٹہ سنبھال رہی ہیں، ساری درست کر رہی ہیں۔ جھک جھک کر سینڈل دیکھ رہی ہیں، آلتا لگی ہوئی بدخوارہ انگلیاں الٹ پلٹ کر دیکھ رہی ہیں مگر ہر حال میں منہ چل رہا ہے یا چائے کا گلاس چھلک رہا ہے۔

تو اس بھیڑ نے منومنٹ کے میدان کی جان لے لی، اس کا کچومر نکال دیا، اس کا چہرہ بگاڑ دیا، اس پر کود پھاند کر گویا اس کا وجود ہی ختم کر دیا۔ ورنہ آنے والے اپنی اپنی گاڑیوں پر، ٹرام پر، بسوں پر دور ہی رہتے اور کلکتہ کے قطب مینار منومنٹ "ماور" کے چاروں طرف سرسبز و شاداب میدان، جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں، فوارے، چشمے، تالاب، ارون پارک کی حسین روشیں پھولوں کے کنج اور جھاڑیاں جنت کا نمونہ بن کر نگاہوں کو متوجہ کر لیتیں اور اسی میدان کے ایک گوشے میں آئی۔ ایف۔ اے کی عظیم اور وسیع گیلری اور آئی۔ ایف۔ اے کا طویل اور عریض کلب دور سے نظر آتا اور اسی کے ارد گرد محمڈن اسپورٹنگ، موہن بگان، ایسٹ بنگال، ایریین کلب کے خیمے اور دور دور تک پھیلی ہوئی۔ جس دن محمڈن اسپورٹنگ کا میچ ہوتا تو کلکتیا بنگالی اور کلکتیا بہاری اور پورے ہندوستان کے سب سے بڑے غدار شہر کی بڑی آبادی، مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ

www.taemeernews.com

خضر پور، مٹیا برج، علی پور، راجہ بازار، نارکل ڈانگہ، ہوڑہ، ٹکیا پاڑہ، پھول بگان، انٹالی، پارک سرکس وغیرہ کے دور اور نزدیک علاقوں کے بوڑھے، جوان اور کمسن، صبح ناشتہ کر کے دن کے لئے رومال میں روٹیاں اور بوتل میں پانی لے کر آٹھ نو بجے صبح ہوتے ہوتے فٹ بال گراونڈ کی گیلری میں جگہ لینے کو آموجود ہوتے اور صبح آٹھ نو بجے سے چار بجے سہ پہر تک میچ شروع ہونے سے پہلے محمڈن اسپورٹنگ کے کھلاڑیوں کے اشتیاق میں یوں بیٹھے رہتے جیسے مصر کے بازاروں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی دیدار کے لئے لوگ منتظر رہتے ہوں گے ـــــ اور تین بجے سے چاندنی چوک صوبیدعلی مینشن میں تیز چہل پہل شروع ہو جاتی، گاڑیاں پارک ہونے لگتیں، بھیڑ جمع ہونے لگتی۔ یہی صوبیدعلی بلڈنگ محمڈن اسپورٹنگ کلب کا صدر مقام تھا اور خاں صاحب صوبیدعلی کلب کے مہتمم، منتظم مدار المہام اور سکریٹری تھے۔ خاں صاحب اپنی بلڈنگ پر برآمد ہوتے جس طرح کوئی مست و سرور باپ فخر و ناز سے اپنے لائق، ہنرمند اور ہر دلعزیز بیٹوں کو لے کر نکلتا ہے۔ خان صاحب صوبیدعلی محمڈن اسپورٹنگ ٹیم کے درمیان وقار سے جھومتے جھامتے برآمد ہوتے۔ آگے آگے جمعہ خاں بلوچستانی سرخ و سفید، ان کے پیچھے عبدالرشید، صمد، معصوم، عثمان اور شہرۂ آفاق گول کیپر بچہ خاں وغیرہ وغیرہ۔ اور بڑی بڑی گاڑیاں کھلاڑیوں کو لے کر فر فر میدان کی طرف نکل جاتیں اور فٹ بال گراونڈ کے لاکھوں خلق سے نعرہ یوں نکلتا کہ میدان کے ارد گرد کی دور والی آبادیاں چورنگی، دھرم تلہ، ڈلہوزی اسکوائر، سنٹرل اوینو وغیرہ کے علاقے گونج اٹھتے اور دیر تک صدائے بازگشت سنائی دیتی۔

مجھے کشتی کے علاوہ کسی اور کھیل سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ بچپن سے ہی پہلوانوں سے ملنا اور دیکھنا، سننا، بیٹھنا، اٹھنا رہا۔ رستم دوراں گاماں پہلوان کے علاوہ تمام شہرۂ آفاق کشتی گیروں سے قریب یا دور کی صاحب سلامت رہی۔ چھوٹے گاماں، حمیدہ پہلوان، فیروز پہلوان، نواب پہلوان، گاما کے تینوں بھتیجے بھولو، اسلم اور گوگا جو پاکستان کے رستم زماں بنے ـــ بنسی سنگھ جو کلکتہ کے راجہ اندر ملک کا خاندانی پہلوان تھا۔ راجہ کے پوتوں کی قیمتی انگریزی وزنی گاڑیوں کے پچھلے حصے پکڑ کر سیدھی کھڑی کر دیتا تھا اور پچھلے حصہ

www.taemeernews.com

کو تھام کر چلتی گاڑی کے ساتھ میلوں دوڑتا۔ ساڑھے چھ فٹ کا قد اور ایک گز چکلا سینہ۔ گاماں سے کشتی کا خواہش مند ہوا اور کھل کر چیلنج کیا۔ گاماں نے لنگوٹ اُتار دیا تھا۔ کہا کہ میرے عزیز! حمیدہ سے کشتی لڑو۔ جیت جاؤ گے تو تمہارے لئے پھر لنگوٹ کس لوں گا۔ بنسی سنگھ اور حمیدہ سے کشتی ہوئی۔ اور حمیدہ نے بنسی سنگھ کا بایاں بازو توڑ دیا۔ عدالت نٹ اور اس کا بھائی ایسی خوبصورت کشتیاں لڑتے کہ سینما ہال کے تماش بین بھی عدالت نٹ کی کشتیاں دیکھنا نہ بھولتے۔ یہ دونوں بھائی فن کشتی گیری کے شعبدہ باز بھی تھے۔ ایسے ایسے داؤں ایجاد کرتے اور ان داؤں کے ذریعہ فریق کو اس طرح پیچ و تاب دیتے اور خود اس خوبصورتی سے ہر گرفت سے نکل جاتے کہ پورا مجمع تالیوں سے گونج جاتا ــــ

تو کشتی کے علاوہ کسی کھیل سے دور یا نزدیک کا سروکار نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ چنانچہ دھرمتلہ اسٹریٹ، چورنگی، بنٹنک اسٹریٹ اور چاندنی کی طرف سے گذرتے قطار در قطار لوگوں کو دیکھتا۔ ایک ہاتھ میں پوٹلی دوسرے ہاتھ میں بوتل۔

"ارے بھئی یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں ــ؟"

"یہ محمڈن اسپورٹنگ کے شائقین ہیں۔"

کھیل سے دس گھنٹے اور کبھی کبھی چوبیس اور چھتیس گھنٹے پہلے۔ جب کسی اہم غیر ملکی ٹیم سے مقابلہ ہوتا، دو دو دن کا کھانا پانی ساتھ لے کر گیلریوں پر گذارتے۔ کھانا وہیں، سونا وہیں، نماز وہیں ــ اور ہاں یہ لکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ مجھے بھی ایک شوق تھا اور ایک عادت تھی۔ سینما دیکھنے کا شوق اور روزہ رکھنے کی عادت۔ کمسنی میں بھی روزہ کبھی ناغہ نہیں ہوا اور روزہ میں بھی سینما دیکھنے کا شوق نہ چھوٹا۔ کبھی کبھی رمضان المبارک میں بھی۔ تین بجے کا شو جب سینما میں گذرتا تو رومال میں افطار کا سامان ہوتا اور چھوٹے تھرمس میں پانی۔ فلم دیکھتے ہوئے سینما ہال کی کرسی پر گھڑی دیکھ کر وقت پر یوں افطار ہوتا کہ نگاہیں سینما کے پردے پر ہوتیں اور ہاتھ افطار کے سامان پر۔ درمیان میں وقفہ ہوتا تو وہیں برآمدے میں کہیں پر رومال بچھا کر مغرب کی نماز بھی ادا ہو جاتی۔ کوئی اچھی فلم آتی تو اسے نہ دیکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا اور ترک روزہ کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لئے میٹنی شو

www.taemeernews.com

میں یہ شوق پورا کیا جاتا کیوں کہ اور وقتوں میں ترک ترادیح کا سوال بھی آجاتا۔ بہر حال یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان بھی نہیں ہوا تھا، وطن سے دوری گھر سے دوری، تنہائی، سنیما بینی بگڑنے کی علامت نہیں تھی بگڑنے سے حفاظت کی علامت تھی۔ کیونکہ اس شوق نے کلکتہ کے آزاد ماحول میں بہت سے گناہوں سے اور بے راہ رویوں سے بال بال بچالیا۔ "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" اس کی تفصیل ہے۔

گیلریوں میں بارہ گھنٹے، چوبیس گھنٹے اور چھتیس گھنٹے گذارنے والی محمڈن اسپورٹنگ کے شائقین، مخلوق کے علاوہ شائقین کا ایک اور بھی بہت بڑا گروہ تھا۔ جو ٹکٹ لے کر روزانہ کھیل دیکھنے کی نہ استعداد رکھتا تھا نہ اتنا وقت۔ ایسی بہت بڑی مخلوق بیچ سے دو تین گھنٹے پہلے سڑکوں سے گذرتی۔ ان کے کندھوں پر ایک چیز ہوتی۔ لکڑی کے تین چار فٹ لمبے دو ڈنڈوں کے اوپر ایک دس انچ کا آئینہ فٹ ہوتا اور اسی طرح دس انچ کا دوسرا آئینہ لکڑی کے نچلے سرے پر نصب ہوتا۔ یہ مخلوق گیلری کے چاروں طرف لاکھوں کی تعداد میں پھیلی رہتی۔ آئینہ والی چھوٹی سیڑھی ان کے کندھوں پر ہوتی۔ اوپر کے آئینہ کا رخ گراؤنڈ کی جانب ہوتا جس میں کھیل کے میدان کا مکمل منظر منعکس ہوکر نیچے والے آئینے میں منتقل ہوتا۔ اس طرح چہار دیواری کے باہر کھڑے کھڑے بھی پورے کھیل کی پوری تفصیل ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی اور وہ کھیل سے بغیر پیسوں کے ویسے ہی لطف اندوز ہوتے جیسے گیلریوں میں ٹکٹ لے کر بیٹھنے والے۔ انہیں کے تبصرے زیادہ نمایاں رہتے۔ انہیں کا شور اور انہیں کا فیصلہ زیادہ موثر ہوتا اور کھیل پر، کھیلنے والے پر بھی ان کا اثر پڑتا۔ اس لئے کہ گیلری کے اندر والی تعداد سے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی۔ یہ آئینہ میں کھیل دیکھتے، کھلاڑیوں کو دیکھتے، ان کے ہنر کو، ان کی مہارت کو اور ان کے عیب اور نقص کو دیکھتے، مہارتوں پر خوشی کے نعرے لگاتے، غلطیوں پر شور مچاتے، محمڈن اسپورٹنگ کے کھلاڑیوں کو للکارتے۔ مخالف ٹیم والوں کو ڈانٹتے۔ محمڈن اسپورٹنگ کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے، برا بھلا بھی کہتے اور گالیاں بھی دیتے۔ گالیاں گالیاں نہیں ہوتیں۔ کلکتہ کی بولی کا ایک جزو ہوتیں۔ گالیوں کا شمار بولنے والے کے تعلق اور قربت کی علامت ہوتا۔ "سالہ بیٹا" ــ "ابے سالہ" ــ "ابے سالے" ــ دوستی محبت

www.taemeernews.com

قربت کے اظہار میں بے تکلف اور بے ساختہ استعمال ہوتا۔

جی ہاں، تو یہ کاروبارِ عشق بھی کلکتہ میں جاری تھا اور برما میں ہندوستانی سرحدوں کے قریب عالمی جنگ بھی جاری تھی۔ خطرات قریب آرہے تھے، جنگ کی آنچ محسوس کی جارہی تھی، چیزوں کے دام بڑھ رہے تھے، سٹے کا بازار سرد ہوگیا تھا۔ جہازوں کی آمد کم تھی۔ مالوں کی درآمد اور برآمد بہت کم ہوگئی تھی۔ لیکن یہ کاروبارِ زندگی اور کاروبارِ شوق میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہی چہل پہل تھی۔ اخبار اور رسالے ویسے ہی نکل رہے تھے، سنیما ہال اور تھیٹروں میں وہی ہجوم تھا، گاڑیاں اسی تیز رفتاری کے ساتھ سڑکوں پر چیختی پھرتی تھیں۔ رکشہ والوں کی ٹن ٹن، ٹھیلے والوں کی ہڑ ہڑ، ٹرام کی گھڑ گھڑ، بسوں کی دھڑ دھڑ، پالکی گاڑیوں اور فٹن گاڑیوں میں جتے ہوئے گھوڑوں کی ہنہناہٹ، چابکوں کی سرسراہٹ، موٹر کاروں کی پوں پوں (اس زمانے میں بجلی کے ہارن بہت کم آئے تھے)۔ خوانچہ والوں کی پکار "حلوا گرم، گرم حلوا، گرم حلوا، حلوا حلوا، گرم گرم" اور دو آنے میں صاف پتے کے ٹھونگے کے اندر گھی اور میوہ جات کے تراشوں کے ساتھ گھی میں تیرتا ہوا سوجی کا حلوا واقعی حلق کو تر کر دیتا۔ صبح کو "گرم حلوا گرم، حلوا، گرم حلوا" کی صدا لگانے والا، خوانچہ بردار ادھیڑ عمر کا بھاری بھرکم گجراتی، سفید لمبا کرتا، سفید دھوتی، سفید ٹوپی شام بیسنی سیو فروخت کرتا "کھائیے کڑا کڑ کھائیے۔ کھائیے کڑا کڑ کھائیے۔" صبح کو حلوا شام کو کڑا کے دار خستہ سیو۔ ایک ملازم بڑی دیگچی سر پر رکھے ہوئے اور خوانچے والا سیٹھ نما آدمی بغل میں لمبا مونڈھا دبائے گال پر ہتھیلی رکھ کر زور زور سے آواز لگاتا۔ میں نے اکثر دونوں چیزیں کھائیں۔ میں نے تعریف کی اور اس نے آشیرواد دی۔ خوانچہ سر پر اٹھاتے اٹھاتے اور آواز لگاتے لگاتے واقعی وہ بڑا سیٹھ بن گیا، کوٹھیاں بن گئیں، گاڑیاں آگئیں مگر وہ یہ سب ہونے کے باوجود جب تک صحت اجازت دیتی رہی، خوانچہ کے ساتھ آواز لگاتا رہا۔ خوانچہ والا خوانچہ والا ہی رہا۔ اس کے بعد اس کے لڑکے صوفے پر بیٹھنے لگے اور کاروں میں گھومنے لگے۔

www.taemeernews.com

سیّد احسن الظفر جو میری بیوی کے چچا ہوئے علی گڈھ میں پڑھ رہے تھے۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد شادی ہوگئی۔ پھر بیمار پڑ گئے۔ اچھے ہو گئے مگر پڑھنا چھوٹا تو چھوٹا۔ بہت بڑا گھر پرانے رئیس کا خاندان۔ بڑی شیخائن کا قبیلہ۔ بالکل محل کے ایسا مکان دوستوں کا جمگھٹا۔ مسلم لیگی سیاست کا دور اِس کا چسکا بھی پڑا مگر سنبھلے رہے لیڈر نہ بنے۔ قاضی سعید صاحب مرحوم نے پٹنہ سیٹی انجمن ترقی اردو کا سکریٹری ان کو بنا دیا۔ بلند و بالا شخصیت، خوش رو خوش گفتار دوستی یاری میں وقت گذرنے لگا۔ شطرنج کا شوق بھی ہوا۔ ایک سے ایک کھلاڑی جمع ہو گئے۔ خود اِن کے بھتیجے یعنی میری بیوی کے بڑے بھائی سید ظہیر احسن، اچھے شطرنجی۔ شام سے بساط بچھی تو صبح ہو جاتی۔ ڈاکٹر غیاث صاحب دوسرے کھلاڑی، جوڑی بدلتی رہتی۔ کبھی شطرنج، کبھی شاعری، کبھی غزل خوانی اچھی خاصی ہما ہمی رہنے لگی۔ پڑھنے کا دھیان کسے آیا۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ سلیقے سے رہتے تھے۔ اصراف کا امکان نہ تھا۔ آرام اور قناعت سے گذر ہو رہی تھی۔ ۱۹۴۶ء کا فساد ہوا۔ بڑوں بڑوں کی ہوا اُکھڑ گئی۔ جو براہ راست متاثر نہیں تھے ان کے کان بھی کھڑے ہو گئے، دل دھڑکنے لگے۔ زندگی پھیلی ہوئی تھی سمٹنے لگی۔ بستیاں علاقے اُجڑ گئے۔ شہر کی ریاست تو علاقوں اور گاؤں ہی پر منحصر تھی۔ زمینداروں کے کارندے بھی کچھ شوخ ہوئے۔ پھر دو تین ہی سال میں ہوا گرم چلنے لگی کہ زمینداریاں ختم ہو رہی ہیں زمین سرکار لے لے گی اور براہ راست رعیت لگان سرکار کو دیں گے۔ احسن چچا بھی کچھ سوچنے لگے۔ غیر محتاط تو پہلے بھی نہ تھے کچھ زیادہ محتاط ہو گئے۔ عمر میں ہم سے بارہ پندرہ سال بڑے تھے۔ مجھے مانتے بھی اور دوست بھی بناتے۔ عزیزم عزیزم کی رٹ بھی لگا دیتے اور چوری چھپے دو ایک نصیحت بھی کر دیتے اور چوری چھپے ہی مجھ سے بھی کچھ مشورے لے لیتے

www.taemeernews.com

ایک روز کہنے لگے عزیزم کیا خیال ہے پڑھنا پھر شروع کردوں ؟ میں خود میٹرک کر کے بیٹھا ہوا تھا۔ دس سال ہو گئے تھے مقدر نے اتنا سکھا دیا تھا اور حادثات نے اتنا پڑھا دیا تھا کہ اب پڑھائی کی یاد بھی نہیں آتی تھی۔ پٹنے مٹنے کے بعد تکیہ چادر بیچ کر پیٹ بھرنے کا اور رو گا کر کے دل کو بہلانے کا سامان کر رہا تھا۔ مگر احسن چچا کا مسئلہ دوسرا تھا۔ وہ رئیس تھے اور مستقبل میں بھی کسی نہ کسی سطح پر اس ریاست و امارت سے رشتہ باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اور اس کے لئے فکرمند تھے۔ مجھے تو کوئی ہوس ہی نہ تھی۔ ارمان تو بہت تھے مگر ان کا رُخ مڑ چکا تھا۔ خود بننے سے زیادہ دوسروں کو بنانے کی تمنائیں زیادہ ہونے لگی تھیں۔ شاعری اس لئے جزوِ پیغمبری کہی جاتی ہے کہ دردِ تنہا دردِ زمانہ بننے لگتا ہے اور اس طرح کے خیالات اور جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں کہ

یہاں سب کرو دل نہ ہرگز لگاؤ
ہم اِس دھوکے میں آگئے تم نہ آؤ

بس اسی کی مستی نے اور تمام خواہشات پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ میں نے بے تامل مشورہ دیا کہ احسن چچا ضرور تعلیمی سلسلہ کر دیجئے۔ اب ریاست، زمینداری کا بھروسہ نہیں۔ چنانچہ انہوں نے علی گڈھ کا رُخ تو نہ کیا۔ بی۔ این کالج میں داخلہ لے لیا اور بی۔ اے کرنے لگے۔ گریجوئٹ ہوئے اور پھر قانون کے گریجوئٹ بن گئے۔ سیاہ شیروانی بنوائی اور ترکی ٹوپی پہن کر وکالت خانے میں بیٹھ گئے۔ خوش رو تھے ہی، خوش گفتار تھے ہی، ذہین تھے ہی۔ وکالت چل پڑی۔ کچھ روز کے بعد ہلکی پھلکی شہری سیاست میں بھی حصہ لینے لگے۔ پٹنہ کارپوریشن بن گیا تو کارپوریشن کا کونسلر کے انتخاب میں کود پڑے۔ انتخاب جیت گئے۔ شام کو کلکٹریٹ سے ووٹ شماری کے بعد اِن کی کامیابی کا اعلان ہوا اور ہمدردوں بہی خواہوں نے کلکٹریٹ سے ہی ان کا جلوسِ کامیابی نکالا۔ فٹن پر یہ بیٹھے ساتھ کچھ ہمنوا اور ہم راز بیٹھے اور ایک تعداد نعرہ لگاتی ہوئی چلی۔ نعرہ لگانے میں سب سے نمایاں اور ممتاز شخصیت غلام سرور صاحب موجودہ اسپیکر بہار ودھان سبھا کی تھی۔ غلام سرور صاحب مسلم سیاست کے پٹنہ میں روح رواں بنتے جا رہے تھے وہ حکمتِ وقت

www.taemeernews.com

سے متصادم ہونے میں بیباک مستعد شخص تھے۔ اِن کے حوصلوں نے بہت دور تک ان کا ساتھ دیا۔ خیر ان کے بارے میں انشاء اللہ آیندہ عرض کروں گا۔ تو جلوس نکلا اور میرے مکان کے سامنے سے ہی رد شنبوں اور تمغوں کے ساتھ گذرا۔ میں نے بھی ایک نظم لکھ دی۔ احسن چچا کو بھیجدی۔ احسن چچا نے اسے شائع ہونے کو بھیج دیا۔ تو احسن چچا پٹنہ کارپوریشن کے کانسلر رہے پھر دوسرے انتخاب میں ڈپٹی میئر بنے اور تیسرے انتخاب میں میئر بن گئے۔ اس سے آگے انہوں نے قدم نہیں بڑھایا۔ مطمئن اور قانع رہے۔ اگر آگے کا ارادہ کرتے تو کارپوریشن سے اسمبلی تک کا سفر آسان تھا۔ مگر احسن چچا اس طرف متوجہ نہ ہوئے۔ شہر کی ممتاز شخصیتوں میں رہے باعزت اور باوقار رہے کھویا کم جو پایا اسے حفاظت سے رکھا۔ وکالت جاری رہی کارپوریشن چھوڑنے کے بعد شہر کے مسلمانوں کے معتبر مشیر رہے۔ خدمت سے باز نہ آئے مخدوم بننے کی شاید خواہش نہ تھی۔ ورنہ یہ منزل ان کے لئے دور نہیں رہتی۔ سگرٹ اور چائے کی کثرتِ استعمال نے صحت پر آہستہ آہستہ حملہ شروع کیا۔ اکثر بیمار ہوئے اچھے ہوئے پھر گرے اور ایسا لگا کہ شاید اب نہ اُٹھ سکیں گے۔ مگر قوت ارادی غضب کی تھی۔ ہمیشہ حوصلہ مند اور متحرک رہے۔ برسوں اسی عالم میں گذار دیئے۔ اچھے ہوتے پھر وکالت شروع کر دیتے ورنہ چارپائی پکڑ لیتے۔ دماغ حاضر زبان قابو میں۔ بیماری میں بھی ظرافت کے گہر لٹاتے رہتے اور دوستوں کے دل باغ باغ کرتے رہتے۔ چار پانچ سال ہوئے مرض اثر دماغ پر ہونے لگا۔ باتیں کم ہو گئیں۔ اکثر چپ رہنے لگے۔ اس عالم میں بھی میں پہونچ جاتا تو لیٹے رہتے تو اہا ہا کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھتے۔ بیٹھے رہتے۔ کھڑے ہونے کی کوشش کرتے مگر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ پکارتے۔

"حویلی! حویلی!! دیکھو کلیم بابو آئے ہیں۔"

بیوی کو ہمیشہ حویلی کہتے۔ چچی بھی مسکراتیں۔

"ہاں ہاں دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں"

مگر وہ چپ نہیں رہتے۔

"حویلی! حویلی!! دیکھو کلیم بابو آئے ہیں۔ کہاں ہو رضیہ (بیٹی کا نام) دیکھو کلیم بابو

www.taemeernews.com

آئے ہیں۔" میں بیٹھ جاتا۔ وہ باتیں نہیں کر سکتے۔ بس خوشی کے مارے بے قابو رہتے۔ ہنستے رہتے۔ چند ماہ ہوا انتقال ہوا۔ میں نے ہی قبر میں اُتارا۔ میرے دل کا تقاضہ ہوا کہ ایسا کروں۔ ان کا غم مجھے ہے ان کے گھر والوں کو بھی، اتنا نہیں جتنا مجھے وجہ یہ کہ وہ بہت دن بیمار رہے اور گھر والوں سے بہت خدمت لی۔ میرے لئے وہ ہمیشہ تندرست رہے ہمیشہ بے ساختہ محبت کرتے ہوئے۔

تو جب احسن چچا نے دس بارہ سال یا پندرہ سال بعد بی۔ اِن۔ کالج میں بی۔ اے میں داخلہ لیا میں انہیں روزانہ کلاس آتے دیکھتا۔ دو سال کے بعد امتحان ہوا اور اس کے بعد نتیجہ نکلا تو احسن چچا شاداب و شگفتہ ہنستے مسکراتے پہلے میرے ہی پاس آئے۔

"عزیزم کلیم بابو! تو میں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ دیکھو پندرہ سال کا بھاگا ہوا قیدی ہوں۔ معمولی بات نہیں ہے عزیزم بہت بڑا کام کر لیا ہے۔"

"بیشک بڑا کام کر لیا ہے احسن چچا مبارک ہو۔ مگر اتنا بڑا کام نہیں کہ اتنا فخر کیا جا سکے۔"

پھر میں محض مذاقاً اور نہایت بے ساختگی میں بول گیا۔

"کہیے تو میں بھی پاس کر کے دکھا دوں۔"

میری زبان سے نکلنا غضب ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میں نے ایک دنیا سے اچانک کسی دوسری دنیا میں چھلانگ لگا دی۔ میرے ذہن سے ایک پردہ ہٹ گیا۔ وہ بات جو کبھی تحت الشعور میں بھی محسوس نہیں ہوئی یک بیک زبان سے نکل گئی۔ احسن چچا بول اُٹھے:

"عزیزم تم تو میٹرک کر کے بیٹھے ہوئے ہو۔ تیرہ سال ہو گئے اب کیا پڑھو گے اور کیوں پڑھو گے اور پڑھ کر کیا کرو گے؟"

بیشک پڑھ کر کیا کروں گا؟ کس کام آئے گی ڈگری؟ عمر کے اُنتیس ۲۹ سال گذر چکے تھے مگر مجھے احسن چچا کی بات سنائی نہ دی اور اپنا ضمیر بھی مجھے روک نہ سکا۔ جیسے کسی غیبی طاقت نے میرے بول کے ساتھ میرے دل میں اتر کر میرے رخ کو ایک طرف موڑ دیا اور میرے

www.taemeernews.com

قدموں کو چلا دیا۔ میں اسی وقت اُٹھا۔ سامنے بی۔ ان کالج کا آفس تھا۔ پہونچ گیا اور ہیڈ کلرک سے کہا۔ "میں انٹرمیڈیٹ کا پرائیوٹ امتحان دینا چاہتا ہوں" (اس وقت پٹنہ یونیورسیٹی میں پرائیوٹ امتحانات بھی رائج تھے) کلرک نے کہا۔ درخواست دینے کی آخری تاریخ بھی دو دن پہلے ختم ہوگئی۔ میں نے پوچھا کوئی صورت ہے۔ بولے کوئی صورت نہیں بجز اس کے کہ آپ بہار یونیورسیٹی سے امتحان دیں۔ وہاں درخواستیں لی جارہی ہیں۔ اسی وقت دفتر میں میرے مخلص دوست جو میری شاعری کے عاشق تھے۔ رائے سچتانند سنہا ایڈوکیٹ کسی کام سے پہونچ گئے۔ مجھ سے دفتر آنے کا سبب پوچھا۔ پھر اسی وقت مجھے ساتھ لئے باہر آئے۔ بولے شیروانی پہن لیجئے اور ابھی فوراً میرے ساتھ بارڈھ چلئے۔ میں تیار ہوگیا۔ اسٹیشن پہونچے اور شام تک ہم لوگ بارڈھ پہونچ کر الونگرہ نرائن کالج بارڈھ کے پرنسپل پروفیسر سورج پرشاد سنگھ سے ملنے جارہے تھے۔ سورج بابو پہلے بی۔ ان کالج ہی میں ہندی کے پروفیسر تھے۔ پھر بارڈھ کالج کے پرنسپل بنے۔ مخلص اور محبت دار انسان تھے اور مجھے پسند کرنے والوں میں تھے۔ ہم لوگ سورج بابو کے پاس پہونچے۔ اسی وقت رات کو دفتر کھلوا کر فارم منگوا کر خانہ پُری ہوئی دستخط ہوا۔ فیس پیش کی گئی اور شب کے نو دس بجے ہم لوگ پھر بارڈھ سے پٹنہ جنکشن کے لئے ریل پر روانہ ہورہے تھے۔

انگریزی کے ساتھ نفسیات، معاشیات اور فارسی انٹرمیڈیٹ کے موضوعات طے ہوئے۔ امتحان، ایک ماہ سے کچھ زیادہ وقفہ تھا۔ جو بہت کم تھا دو سال کا نصاب ایک ماہ میں تیار کرنا تھا۔ یہ ۱۹۵۳ء کا آخری حصہ تھا شاید نومبر کا مہینہ تھا۔ میں گھر آیا۔ بیوی سے ماجرا بیان کیا۔ وہ بھی متعجب ہوگئی کہ یہ نئی بات آپ کو کیا سوجھ گئی۔ اب پڑھ کر کیا نوکری کیجئے گا۔ اب ملازمت ملنے کا سن کہاں؟ مگر یہ سب بات سننے غور کرنے کی نہیں تھی۔ ملازمت کا کیا سوال۔ نہ اس کی احتیاج نہ اس کا شوق نہ طلب اور نہ اس کا وقت۔ مگر ایک فیصلہ ہوگیا۔ اور یہ فیصلہ میں نے نہیں کیا کسی اور نے کیا اور اسی فیصلہ کرنے والے کا ہاتھ مجھے بڑھا رہا تھا۔ رائے ہوئی کہ اب پٹنہ میں پڑھنا مشکل ہے۔ یہاں دوکان دیکھو گے یا پڑھو گے۔ بس بارڈھ ہی چلے چلو۔

www.taemeernews.com

ایک ماہ وہیں رہنا، وہیں پڑھنا، وہیں امتحان دینا۔ مگر ایک ماہ گھر چھوڑ کر رہنا طبعاً مجھ سے ممکن نہ تھا۔ بہر حال جانا ضرور تھا۔ دوسرے دن سے تیاری شروع ہوئی۔ انگریزی، سائیکالوجی، اکنامکس کی نصابی کتابیں خریدی گئیں۔ سب انگریزی میں اس لئے کہ اردو میں یہ کتابیں دستیاب نہیں تھیں۔ اور انگریزی میں مجھے نسبتاً سمجھنے میں آسانی بھی تھی۔ اس کے بعد تلاش ہوئی ایک ملازم کی جو میرے ساتھ رہے، کھانا پکائے۔ وہ بھی مل گیا۔ پھر رفیق انیس اور تعلیمی معاون کی تلاش ہوئی۔ غلام مصطفےٰ میرے پڑوسی تھے۔ بی۔ اِن کالج ہی سے گریجوئٹ ہو چکے تھے۔ اب ایم۔ اے کی تیاری کر رہے تھے یا ملازمت کی تلاش میں تھے۔ میری رفاقت اور معاونت کے لئے تیار ہو گئے۔ ایک ہفتہ بعد ہم تینوں مع سامان اور باورچی خانے کی ضروریات باڑھ پہونچے۔ اختر حسین صاحب جو وہاں کے رئیس تھے۔ میرے واقف اور آشنا تھے کے مکان میں قیام طے پایا۔ انہوں نے اپنی خلوت ہم لوگوں کو عطا کر دی۔ پہلے دن انہیں کے یہاں دعوت رہی۔ دوسرے روز سے باورچی خانہ آباد ہوا اور کلاس شروع ہوا اور یوں کہئے کہ مصطفےٰ میرے ٹیچر بھی تھے اور ہم سبق بھی۔ آئی اے، بی۔ اے میں نفسیات اور معاشیات ہی ان کا موضوع بھی تھا۔ ہم لوگ سبق اجتماعی حیثیت سے پڑھتے بحث کرتے اور پھر فیصلہ کرتے۔ ایک ہفتہ رہ کر دو تین روز کے لئے آئے اور پھر روانہ ہوئے۔ مجموعی طور پر دو ہفتہ باڑھ میں قیام رہا۔ ٹسٹ امتحان یعنی داخلہ کا امتحان وہیں الٰہ آباد گرلز کالج میں دیا۔ تین روز میں انگریزی، فارسی، سائیکالوجی اکنامکس کے ٹسٹ امتحانات ہوئے۔ چوتھے دن واپس پٹنہ آئے۔ ایک ہفتہ کے بعد سورج بابو نے خبر دی تم سینٹ اَپ ہو گئے۔ آکر اپنے پرچے دیکھ لو۔ چاروں موضوعات کے ایک ایک پرچے تھے۔ الٰہ آباد گرلز کالج میں فارسی کے پروفیسر وہیں باڑھ ہی کے ایک رئیس تھے مجھے بخوبی جانتے تھے اور میں بھی انہیں جانتا تھا۔ میرے دوست سید محمد عُرف مُدّن صاحب کے عزیز تھے۔ نام ..... تھا۔ انہوں نے کچھ دوستانہ نرمی اور کچھ پروفیسرانہ گرمی کے لہجہ میں فارسی امتحان کا پرچہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"آپ کی فارسی کمزور ہے کلیم عاجز صاحب بہر حال آپ میرے دوست ہیں۔

www.taemeernews.com

میں نے آپ کو پاس کر دیا ہے ۔ ۴۱ نمبر دے دیا ہے ۔ ذرا محنت کیجئے گا۔ اصل میں فارسی کی طرف اب توجہ کم دی جانے لگی ہے ۔ فارسی پھر بھی غیر ملکی زبان ہے ۔ اردو تو گھر کی زبان ہے ۔ فارسی میں محنت کرنی پڑے گی ۔"

وہ سمجھتے تھے کہ بے چارہ اردو کا شاعر ہے میٹرک تک فارسی پڑھی ہوگی ۔ میں فارسی میں ایم ۔ اے ہوں اِس وقت تو ذرا رعب گانٹھ ہی دو ۔ اُن بے چارے کو یہ خبر کہاں تھی کہ چٹائی نشیں مولویوں نے فارسی یوں گھول کر پلا دی ہے کہ اوسط درجے کے فارسی ماسٹر ڈگری اور گریجوئٹ ڈگری والوں کو ہم مکتبیوں سے فارسی پڑھنی ہوگی ۔ میں نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا ۔ پرچہ سمیٹ کر رکھ لیا ۔ جی چاہتا تو ان کا امتحان لینا شروع کرتا ۔ پاس کر دیا غنیمت ہے ۔ ۴۱ نمبر دیا تھرڈ ڈویژن ہی سہی فیل تو نہیں کیا ۔ انگریزی کے پرچے میں ۳۶ ۔ سائیکلوجی اکنامکس وغیرہ میں سکنڈ ڈویژن ۔ دو ماہ بعد انٹرمیڈیٹ فائنل کا امتحان نالندہ کالج بہار شریف میں ہوا ۔ میں امتحان کے دن صبح بہار شریف جاتا اور شام کو واپس آجاتا ۔ اس زمانے میں کاپی پر چوری سے جوابات نقل کرنا تو درکنار چوری چھپے کسی سے سرگوشی میں پوچھنا بھی غلط بات سمجھی جاتی تھی ۔ چنانچہ فائنل امتحانات کے پرچوں میں دو ایک روز ایک لڑکے نے سرگوشی میں مجھ سے مدد لینی چاہی میں نے بتا دیا ۔ دوسرے روز یہی ہوا تو پاس کے ایک تیسرے لڑکے نے گارڈنگ کرنے والے کو پکارا کہ دیکھئے سر یہ لڑکا Disturb کرتا ہے ۔ مختصر یہ کہ دنیا کس قدر بدل گئی ۔

انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ برآمد ہوا ۔ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس کر گیا ۔ فارسی میں 75% انگریزی کے پرچوں میں 54% اور سائیکلوجی اکنامکس میں فرسٹ کلاس ۔ اب گاڑی چلی تو چلی ۔ پٹنہ کالج اور بی ۔ ان کالج دونوں میں داخلہ کی درخواست دے دی ۔ اردو تو گھر کی تھی اس میں آنرس کیا لوں ۔ میری رائے انگریزی یا اکنامکس میں آنرز لینے کی تھی ۔ میرے ایک دوست عبدالستار جو میرے پڑوسی تھے ۔ اب I.A.S میں افیسر ہیں ۔ سال یا دو سال قبل بی ۔ اِن کالج سے بی ۔ اے آنرس کر چکے تھے ۔ بولے نہیں کلیم صاحب آپ اردو میں آنرس

www.taemeernews.com

رکھئے آپ کو پوزیشن آجائے گا۔ میں کہتا اردو میں آنرس کیا تو کیا تیس مارخانی کی۔ بولے اکنامکس میں تیس مارخانی نہیں ہو سکے گی۔ فرسٹ کلاس بھی آجائے گا تو آپ کے شایانِ شان نہ ہوگا۔ خدا جانے کیوں مجھے ماننا پڑا اور فارم میں اکنامکس کاٹ کر اردو میں آنرس لکھ دیا۔ داخلہ پٹنہ کالج میں بھی اور بی۔ ان کالج میں بھی ہو رہا تھا۔ مگر داخلہ بی۔ اِن کالج میں لیا اس لئے کہ

ان کی بزم سے مقتل صحن سے مکاں اپنا
اک قدم یہاں اپنا اک قدم وہاں اپنا

دوکان بھی دیکھتا رہا اور کلاس بھی کرتا رہا۔ اور قریب کی مسجد میں نماز بھی ادا کرتا رہا۔ بی۔ اے میں بھی اکنامکس کا پرچہ رکھا اس لئے اکنامکس سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ لیکن اکنامکس کا گھنٹہ کرنے کا موقع بہت کم آیا۔ یہ گھنٹہ ٹھیک نماز جمعہ کے خطبے کے وقت ایک بجے ہوتا تھا۔ میں نے کبھی کلاس مکمل نہیں کیا۔ اپنے کسی ہندو دوست سے رول کال میں بول کہہ دینے کہتا۔ اور نماز جمعہ کے بعد کلاس ختم ہونے کے پندرہ بیس منٹ پہلے کلاس میں آجاتا اور کلاس ختم ہونے کے بعد کلاس سے نکلتے ہوئے اپنے اکنامکس کے دونوں استاد کپور صاحب اور کبھی بوس صاحب کو سلام کرتا۔ کچھ تو اس لئے کہ ان پر ظاہر ہو کہ میں کلاس میں ہوں۔ گرچہ میں سمجھتا ہوں کہ انہیں بھی یہ علم تھا کہ میں نماز جمعہ کے لئے چلا جاتا ہوں۔ دوسرے اس لئے کہ میرے یہ دونوں اکنامکس کے استاد واقعی میرے استاد تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق اتنا مشفقانہ میرے ساتھ تھا کہ اب بھی یاد کرتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ بوس صاحب بنگالی تھے اور اپنے شعبہ کے صدر تھے اور کپور صاحب پنجابی تھے اور اردو داں تھے۔ لہجہ کی پنجابیت ختم ہو گئی تھی اور خالص اردو ئیت نمایاں تھی۔ وہ خالص اردو میں گفتگو کرتے خواہ کسی ہندو غیر اردو داں سے ہی کیوں نہ ہو۔ بوس صاحب اردو نہیں جانتے تھے مگر اردو ہی میں بات کرتے تھے۔ دونوں مجھے ویسا ہی مانتے۔ جیسے میرے بچپن یا اسکول کے زمانے کے ایک استاد پنڈت ترپاٹھی مجھے مانتے تھے یا میرے بچپن کے گرد منشی سوداگر لال۔ میں بھی کالج میں بوس صاحب کو اور کپور صاحب کو دیکھ کر قلب میں ایک فرحت محسوس کرتا۔

www.taemeernews.com

جناب نوبی ۔ ان کالج میں داخلہ لینے کے بعد جب میں پہلے دن اردو آنرس کا کلاس کرنے پٹنہ کالج گیا ۔ تو اس دن پہلا کلاس ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب کا تھا یہ ۱۹۵۴ء کے وسط کی بات ہے ۔ اختر صاحب سے قربت اور واقفیت کو چار سال ہو چکے تھے ۔ پٹنہ کالج بزم ادب کے سالانہ جلسہ میں پہلی بار انہوں نے مجھے دیکھا اور پہلی بار یہ غزل سنتے ہوئے

جہاں فریاد بھی گوشِ نزاکت پر گراں گذرے
ہم ایسی بے کسی کی زندگی سے مہرباں گذرے

اپنے رفیق پروفیسر نواب کریم سے حیرت سے پوچھا تھا کہ یہ چنگاریاں کہاں سے نکل رہی ہیں تو نواب کریم صاحب نے جواب دیا تھا کہ تیلہاڑہ کی خاکستر سے ۔ تو اختر صاحب نے اسی دن مجھے دیکھا ، مجھے سنا اور مجھے جانا اور بزم ادب کے ہر جلسے میں مجھے سن کر اپنی رگوں میں خون کی روانی تیز کر لیتے ، اور آنکھوں میں چمک بڑھا لیتے ۔ تو اس دن پہلی بار مجھے کلاس میں داخل ہوتے دیکھ کر اختر صاحب کھڑے ہو گئے اور یہ سمجھ کر کہ میں ان سے ملنے آیا ہوں اپنے بائیں طرف آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا آپ یہاں تشریف رکھئے اور دوسرے لڑکوں سے کہا ۔ چند منٹ باہر جائیے ۔ ان سے بات کر کے فوراً آپ لوگوں کو بلاتا ہوں ۔ میں نے کہا میں کلاس کرنے آیا ہوں ۔ میں نے بھی بی ۔ اے آنرس میں داخلہ لے لیا ہے تو وہ متعجب ہوئے اور کہا کیا ضرورت ہے ؟ آپ اپنا مشغلہ جاری رکھتے وہ خود ایک مستقل پڑھائی ہے اور اس کی کوئی میعاد نہیں ہے ۔

دو سال بی ۔ اے آنرس کے گزرے ۱۹۵۴ء ۱۹۵۵ء ۔ روزانہ دو کلاس آنرس کے پٹنہ کالج میں ہوتے تھے ۔ میں ۹ بجے خراماں خراماں گھر سے نکلتا تھا ۔ اور کلاس سے پانچ منٹ قبل پٹنہ کالج پہونچ جاتا تھا ۔ فسادات کو آٹھ سال گذر چکے تھے ۔ اور میری عمر تیئس کو پہونچ رہی تھی ۔ میرا غم میری رگ رگ میں سما کر میرے خون کا حصہ اور میری حرارت کا جزو بن چکا تھا ۔ میرا غم میری زندگی تھا اور میرا غم میری زندگی ہے اور میں اپنی زندگی کی توانائی پر خود بھی رشک کرتا ہوا ۔ اس توانائی نے کم غذا میں زیادہ طاقت ، کم نیند میں زیادہ بشاشت

www.taemeernews.com

کم آرام میں زیادہ راحت بخشی ہے۔ گھر سے کالج تک تقریباً ایک میل یا ایک کیلو میٹر کی مسافت پندرہ منٹ میں عافیت سے پوری ہوتی تھی اور میں ہر طرح سے چوکنا اور چاق و چوبند کلاس میں پہونچتا تھا۔ پسینے کے قطرے مجھے فرحت بخش دیتے سانس پر جلا ہو جاتی ذہن تیز اور حافظہ باریک ہو جاتا۔ خون کی روانی میں سرعت اور سہولت بھی آجاتی۔ میری صحت پر لوگ رشک کرتے تھے۔ میرے غم اور میرے درد دل اور دردِ جگر نے مجھ سے ایسے شعر کہلوائے۔

زندگی اور غم کا رشتہ پھول اور شبنم کا ہے
اشک بہتے جائیں گے چہرے نکھرتے جائیں گے

تو واقعی غم نے میری صحت پر بہار بنادی اور آنسوؤں نے چہرے پر نکھار لادی۔ میں سینکڑوں میں ہزاروں میں ایک تھا۔

یکتا رہے ہیں اور ہزاروں میں رہے ہیں
ہم خاک نشیں شاہ سواروں میں رہے ہیں

میرا غم میرے دل میں تھا اور میری آنکھوں میں تھا۔ میرا چہرہ اُداسی، سنجیدگی صحت اور تازگی کا آئینہ تھا۔ اور میری آنکھیں اداسی کی چمک کا ایک ایسا نمونہ تھیں کہ میں نے خود ایسی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ آپ کو بھی یہ سطریں پڑھتے ہوئے میں متعجب کردوں کہ میں نے بس گذشتہ رات ہی اپنا پینتس چھتیس سال پہلے والا یعنی اپنی تیس سال کی عمر والا چہرہ خواب میں دیکھا۔ پینسٹھ چھیاسٹھ سال والے کلیم کے خواب میں تیس سال والا کلیم آیا۔ مجھے خواب یاد نہیں مگر خواب میں آیا ہوا چہرہ یاد ہے۔ اسی واسطے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ شاید خواب میں آنے کا یہی منشار قدرت تھا کہ میں یہ سطریں لکھوں۔ میں گھر سے کالج روانہ ہوتا۔ سفید پاجامہ، سفید کرتہ تمام بٹن کھلا ہوا بنیائن اور کرتے کے درمیان ہلکے رنگ کا سوئٹر۔ کرتہ سفید باریک ململ کا اور سیاہ مخمل کی ٹوپی۔ گلے میں ہلکے رنگ کا اونی گلوبند۔ سردیوں کے زمانے میں تیز چال سے روانہ ہوتا تو بغیر شیروانی بھی پسینے کے ہلکے قطرے پیشانی پر نمودار ہو جاتے تو اکثر راستے میں گذرتے لوگ مجھے دیکھتے اور شاید رشک کرتے۔ لیکن مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی ہر دیکھنے والا اپنی نظریں جھکا دیتا۔

www.taemeernews.com

میں یہ سمجھتا ہوں کہ میری آنکھوں کا رعب اس پر آجاتا۔ ایسی آنکھ ایسی آنکھ۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک جہاں کا پورا غم اِن آنکھوں کی دو مختصر کٹوریوں میں آگیا ہے۔ میرے پاس بازوؤں سے سرنک کی ایک تصویر تھی۔ میں نے بڑی حفاظت سے وہ تصویر رکھی تھی لیکن اب کہیں غائب ہوگئی۔ میں نے خود اپنی تصویر میں اپنی آنکھوں پر غور نہیں کیا تھا۔

میں نے پہلی مرتبہ غور سے دیکھا تو ایسا لگا وہ آنکھیں مجھے بہت پیار سے بلا رہی ہیں وہ مجھے بُلالیں گی اور اندر کرلیں گی اور دور تک حدِ نگاہ تک غموں کے اتھاہ سمندر میں مجھے ڈبودیں گی اور وہ سمندر بڑا خوبصورت ہوگا۔ اس کا پانی بہت شیریں ہوگا اور بہت رنگیں ہوگا۔ وہ رنگ نہیں جو دنیا میں نظر آتا ہے بہت انجانا رنگ بہت پیارا رنگ اور سمندر میں سب کچھ ہوگا۔ محبت پیار دوستی وفا راحت سکون رنگ خوشبو لذت موسیقی نغمہ پھول شبنم چاندنی شفق شہد شراب۔ وہ سب کچھ جو دنیا کھو چکی ہے کھو کر بھول چکی ہے، بھول کر پاگل ہوگئی ہے اور پاگل ہوکر سب کو کاٹ کھا رہی ہے۔ وہ سب کچھ جو ایک عاشق چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ جو ایک شاعر چاہتا ہے' وہ سب کچھ جو ایک ماں بیٹے سے چاہتی ہے، وہ سب کچھ جو ایک بیٹا ماں سے چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ جو ایک بلبل باغ سے اور باغ کے پھولوں سے چاہتی ہے' وہ سب کچھ جو باغ بہار سے چاہتا ہے۔ وہ سب کچھ جو کسان کھیت سے چاہتا ہے' کھیت ابر سے چاہتا ہے، جو چکور چاند سے اور چاند چکور سے چاہتا ہے وہ سب کچھ جو انسان زندگی سے اور زندگی انسان سے چاہتی ہے، وہ سب کچھ جو رعیت حکومت سے اور حکومت رعیت سے' جو خدا بندے سے چاہتا ہے اور بندہ خدا سے تمام چاہتیں' تمام خواہشیں' تمام آرزوئیں' تمام امیدیں' تمام منتیں۔ مختصر یہ کہ تمام جنتیں جن کا وعدہ انسان سے ہے۔ یہ غم انگیز آنکھوں کا حسن اور کشش اور ان کی وسعت اور گہرائیاں اور بلندیاں ہیں۔ انسان کی اِن دو آنکھوں میں کیا نہیں اور وہی مجھے اپنی اُس چھوٹی سی تصویر کی آنکھوں میں نظر آیا۔ اب میں سوچ رہا ہوں اور تین چار سال پہلے دیکھی ہوئی اپنی اس تصویر کی آنکھوں کی کشش اس طلسمی کشش کی کیفیت کو محسوس کر رہا ہوں تو مجھے اپنی

www.taemeernews.com

شاعری میں، اپنی غزلوں میں زیادہ عظمت اور لذت اور کیفیت کا احساس مجھے خود ہو رہا ہے۔ میں نے رات اپنی اس پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ سال پہلے صورت کی خود جھلک دیکھی تو میں اس طرح چونک اٹھا جس طرح کبھی کبھی اپنی ماں یا باپ کے چہرے کو دیکھ کر محبت سے چونک اُٹھا ہوں۔ میں خود اپنے چہرے کو دیکھ کر خواب میں چونک اُٹھا۔

اب میں اپنی وہ آنکھیں پہچان نہیں سکتا۔ اور دوسرے بھی میری وہ آنکھیں دیکھ نہیں سکتے۔ اس وقت میں عینک نہیں لگاتا تھا۔ ۱۹۵۷ء سے مجھے عینک لگانے کی ضرورت پڑ گئی۔ اور وہ تصویر ۱۹۵۶ء کی تھی۔ اب برابر میری آنکھوں کا نمبر بڑھتا جا رہا ہے اور اب وہ میری آنکھیں کہاں ان میں موتیا بند کا پانی آ رہا ہے۔ ایک آنکھ میں ۹۰ فیصد آ چکا ہے دوسری میں پچاس فیصد۔ اب وہ آنکھیں بنیں گی بھی تو وہ سمندر کہاں نظر آئے گا۔ وہ راستہ کہاں نظر آئے گا جو خدا جانے کہاں لیجاتی تھیں کہاں پہونچاتی تھیں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ وہ تصویر گم ہو گئی۔ وہ آنکھیں تو اب نہیں لیکن ان آنکھوں کی تصویر تو تھی۔ وہ تصویر ایک نہایت ماہر فوٹو گرافر چودھری کی کھینچی ہوئی تھی۔ مونالیسا کی آنکھوں میں لیونارڈو ڈاونسی کے کمال مصوری سے جو کیفیت حسن و نشاط پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے چودھری کی بنائی ہوئی اس تصویر میں کیفیت حسن عم نظر آئی جس میں خود میری شناخت اور پہچان چھپی ہوئی تھی۔ میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اب دیکھا تو پہچانا۔ آنکھوں کو بھی پہچانا اور آنکھوں والے کو بھی۔ کلیم کی پہچان اس کی آنکھوں میں تھی جسے میں خود نہیں جانتا تھا۔ اور مجھے یاد آیا کہ ۱۹۳۹ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے مہمانوں میں خان بہادر حبیب الرحمن خاں شیروانی جب سینٹ ہال کے باہر سائبان میں مستقل ٹہل رہے تھے خاموش اور سست تو اُن کی خاموشی اور اداسی اور مسلسل سائبان میں چلتے رہنے سے متاثر ہو کر میں نے گستاخی کی تھی اور ایک کمسن والنٹیر ہونے کے باوجود بے ساختگی سے پوچھ بیٹھا تھا کہ حضور آپ اس قدر خاموش کیوں ہیں۔ اور انہوں نے میرے سوال کی بے ساختگی سے چونک کر مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر آنکھوں میں جھانک کر بے ساختہ کہا تھا کہ "جوان لوگ ہمارے جان لوگے

www.taemeernews.com

وقت خود بتا دے گا۔" انہوں نے میری آنکھوں میں کوئی بات دیکھی تھی۔ اور وہ بات اور دوسروں کو بھی نظر آئی تھی مثلاً مسلم اسکول میں رضاکارانہ طور پر بغیر تنخواہ پر خدمت کے لئے اپنے کو پیش کرنے والے استادوں میں اوروں کے ساتھ ماسٹر عباس صاحب تھے جو انگریزی پڑھاتے تھے۔ جب میں نے نویں کلاس کا امتحان دیا اور میرے پرچے اتنے اچھے آئے کہ ٹیچروں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ میرا داخلہ بجائے دسویں گیارہویں کلاس میں ہو۔ تو عباس صاحب نے بلا کر مجھے آٹھ عدد یا کم و بیش کاپیاں دیں اور دس کلاس کے سوالات دیئے کہ آٹھوں کاپیاں میں ان کے سامنے لکھوں تو میں نے حیرت سے آنکھیں اُٹھا کر انہیں دیکھا اور کہا سر کیا یہ تمام کاپیاں آج ہی اور یہیں لکھ کر دیدوں؟

انہوں نے بغیر میری طرف دیکھے کہا ہاں جی۔ تمہارا Double Promotion کرنا ہے۔ یہ دسویں کلاس کے سوالات ہیں اور ان کے جواب کے لئے کاپیاں ہیں۔ مختصر سوالات ہیں پانچ چھ گھنٹے میں لکھ لوگے۔ میرے سامنے لکھو۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا اور میں اپنی بھرپور نظروں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پانچ چھ سیکنڈ تک خاموش مجھے دیکھتے رہے اور ایسا لگا کہ ان کی آنکھوں میں کچھ نمی اور چمک پیدا ہو رہی ہے۔ انہوں نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اچھا تم ان کاپیوں کو اور سوالات کو گھر لے جاؤ۔ کل پرسوں جب چاہو لکھ کر مجھے دیدو" یہ کہہ کر وہ پھر مجھے یا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پانچ سیکنڈ تک دیکھتے رہے اور پھر آنکھیں نیچی کر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔

اور جب میں نے انٹرنس پاس کر لیا۔ اپنے اسکول میں اول اور پورے بہار میں پانچویں پوزیشن آئی تو مسلم اسکول کا ایک خاص جلسہ ہوا۔ میں اپنی بستی میں تھا۔ مجھے بلایا گیا۔ اس جلسہ کی صدارت سید محمد امیر صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پٹنہ کر رہے تھے۔ اور مجھے ایک بہت بڑا چاندی کا مڈل عطا ہوا۔ جب میں مڈل لینے کلکٹر صاحب کے قریب گیا تو مڈل لیتے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے میری نظروں سے نظریں برابر کیں تو محسوس ہوا کہ

www.taemeernews.com

مصافحہ کے لئے میرے ہاتھ میں پڑے ہوئے ان کے ہاتھ نے گرفت سخت کردی اور کئی سیکنڈ تک وہ میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے میری آنکھوں کو دیکھتے رہے پھر بولے۔

"کیا کرتے ہو؟"

"کچھ نہیں کرتا ہوں آگے پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

"نہیں تمہیں تو کچھ کرنا ہے۔ پڑھنے کے علاوہ۔"

"جی کیا کروں فرمائیے؟"

"میں نہیں بتا سکتا شاید وقت بتادے۔"

شاید اور بھی کچھ کہا جو مجھے اس وقت یاد نہیں۔ آٹھ سال پہلے اس کتاب کی قسطیں لکھتے ہوئے میں نے کسی قسط میں کچھ اور باتیں جو انہوں نے کہی تھیں لکھی تھیں۔ مگر وہ لکھی ہوئی قسطیں میرے پاس نہیں اور حافظے سے بھی بات اتر گئی۔ تو ان آنکھوں کو جنھیں باون سال پہلے خاں بہادر حبیب الرحمن خاں شیروانی نے دیکھا تھا۔ اور پچاس سال پہلے ماسٹر عباس صاحب نے دیکھا تھا اور انچاس سال پہلے کلکٹر محمد امیر صاحب نے دیکھا تھا۔ میں نے ایک تصویر میں چار پانچ سال پہلے دیکھا تھا وہ تصویر پٹنہ کالج کے دور کی مجھے کہیں مل گئی۔ اور اس وقت وہ بھی موجود نہیں۔ میں نے ان آنکھوں کو، ان آنکھوں میں چھپے ہوئے کلیم عاجز کو اور ان آنکھوں میں چھپے ہوئے کلیم عاجز کی تاریخ کو، آنے والے حادثے کو، آئے ہوئے حادثے کو، کلیم عاجز کی شاعری کو، کلیم عاجز کے فن کو فکر کو درد کو غم کو اور ان سب سے مل جل کر بنی ہوئی شخصیت کو دیکھا تھا۔ اور کلیم عاجز نے اس کلیم عاجز کو پہچان لیا تھا جو اس سے ہمکلام رہتا ہے ہم قیام رہتا ہے ہم خلوت رہتا ہے۔ ہم راہ رہتا ہے ہم دوش رہتا ہے الجھتا ہے، لڑتا ہے، روتا ہے گاتا ہے روٹھتا ہے منتا ہے جو کلیم عاجز سے اس قسم کے اشعار کہلواتا رہتا ہے:

جب تک تو کلیم اپنی غزل گائے نہیں ہے
ہم کیا کریں ہم کو تو مزا آئے نہیں ہے

www.taemeernews.com

ہر چند ترا درد سنا جائے نہیں ہے
لیکن بے سنے بھی تو رہا جائے نہیں ہے

کاہے کلیم اتنے بُرے ہوتے جاؤ ہو
دل چھید ڈالے ہے جو غزل تم سناؤ ہو

بی۔ اے آنرس بڑی امتیازی شان سے پاس کیا۔ نہ صرف یہ کہ پوری یونیورسیٹی میں اول آیا بلکہ Distinction بھی۔ مجھے تین مڈل ملے۔ اس سال آخری بار کنووکیشن (convocation) کی تقریب تھی۔ اس کے بعد بغیر کنووکیشن کامیاب طلبار کو یونیورسیٹی آفس سے ہی ڈگری دے دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نئے گورنر تھے۔ انہوں نے خطاب کیا اور سندیں دیں۔ جب کسی کا نام پکارا جاتا، تالیاں بجتیں۔ اور یہ تالیاں سند لے کر واپس آنے کے وقت بھی بجائی جاتیں۔ میرے لئے نیا تجربہ تھا۔ ہمارے زمانے میں نہ مکتب میں ایسا ہوا نہ اسکول میں۔ اسکول میں مڈل دینے کی ایک خاص تقریب ہوتی تھی۔ اسکول ہی کے ایک ہال میں۔ وہاں تالیاں نہ تھیں۔ جب میرا نام سند لینے کے لئے پکارا گیا۔ میں اُٹھنے لگا کہ تالیاں بجیں اور میں بیٹھ گیا۔ کیوں؟ میری کتابیں پڑھ جائیے، سوانح پڑھ جائیے۔ جلسوں میں سب سے الگ کسی کونے میں، کلاس میں سب سے پیچھے بنچ پر۔ مشاعروں میں سب سے کنارے کسی کی پشت کی اوٹ میں۔ جب مشاعروں میں میرا نام پکارا جاتا ہے تو کچھ کچھ اب بھی لگتا ہے جیسے بیچ مجمع میں کوڑے لگائے جائیں گے۔ سہما تھرتھراتا اٹھتا ہوں اور کانپتا ہوا لاؤڈ اسپیکر تک آتا ہوں اور لرزتا ہوا پڑھنا شروع کرتا ہوں۔ اور جب شروع کر لیتا ہوں تو کڑا نیرے ہاتھ میں ہوتا ہے اور سامعین کی پیٹھ سامنے ہوتی ہے۔ تعریف و تحسین داد و ستائش کے ماحول میں، اب بھی مجھے حجاب اور خوف سا معلوم ہوتا ہے

www.taemeernews.com

بہر حال تالیوں کے شور میں بیٹھ گیا مگر پھر اٹھا، اسٹیج تک آیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے پہچانتے تھے مسکرا رہے تھے۔ ان سے سندلی مصافحہ کیا اور واپس آکر بیٹھ گیا۔ بیٹھا تھا کہ اناؤنسر نے پھر پکارا۔

"یونیورسیٹی میں اوّل آنے کے لئے یونیورسیٹی گولڈ مڈل"

پھر تالیاں۔ اور میرا پاؤں اُٹھتے ہوئے کانپنے لگا۔ کوشش کرکے اُٹھا۔ اسٹیج تک پہنچا مڈل لیا سلام کیا مصافحہ ذرا لمبا ہوا۔ واپس آگیا۔ بیٹھا تھا کہ پھر اناؤنسر کی آواز آئی۔

"بی۔ ان کالج میں پہلا گولڈ مڈل لانے کے لئے بہار نیشنل کالج کی طرف سے گولڈ مڈل" (گذشتہ ۱۶ سال سے بی۔ ان کالج میں کسی نے گولڈ مڈل حاصل نہیں کیا تھا) اور پورا جلسہ، پورا پنڈال تالیوں سے گونجنے لگا اور میرے پاؤں من من بھر کے ہوگئے۔ اب تو

چاہوں کہ اٹھوں لیکن اٹھا جائے نہیں ہے

مجھے اُٹھنے میں دو تین منٹ لگ گئے۔ بہر حال سر جھکائے اُٹھا شرماتا لجاتا ڈائس تک پہونچا۔ مڈل دیتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے مبارک باد دی۔ گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ اور میں مڈل لے کر واپس جاکر کرسی پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اناؤنسر نے پھر ہتھوڑا چلایا۔

"اردو کمپوزیشن میں Distinction لانے کے لئے سفٹن گولڈ مڈل"

اور میں بجائے کرسی پر بیٹھنے کے پنڈال سے باہر کی طرف چلا۔ میری بغل میں بیٹھے ہوئے میرے ساتھی مرتاض الدین مرحوم اور نذر خالق نے اُٹھ کر مجھے پکڑا۔ اور پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ دو سکوریٹی گارڈ کے درمیان میں اسٹیج تک آیا۔ مڈل دے کر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ پکڑ کر دیر تک زور زور سے ہلایا۔ اور میں دونوں ساتھیوں کے درمیان یوں واپس ہوا جیسے چوری کے جرم میں جج کی زبان سے سزا کا فیصلہ سن کر واپس ہو رہا ہوں۔

ام اے میں شاید ہم لوگ آٹھ ساتھی تھے۔ اور بیشتر ساتھی ایسے تھے جو ذہین تھے اور ان کا پس منظر بھی تعلیمی رہا تھا۔ مولوی صاحبان کے زیر تربیت رہے تھے۔ فارسی نہیں تو اردو کی بنیادیں استوار تھیں تعلیم کی اہمیت بھی جانتے تھے اور اس کا ذوق بھی تھا۔ محنت کے

www.taemeernews.com

بھی عادی رہے تھے اس سے پہلے ام۔ اے میں بھی محنت سے جان چُرانے کا ذہن بالکل نہ تھا۔ کچھ ایسے ساتھی تھے جو کتابوں پر خوب دھیان دیتے تھے۔ نصاب کے علاوہ حوالوں پر بھی خوب عبور تھا۔ اردو کی تاریخ اور لسانیات پر گہرے مطالعہ کا ذوق تھا۔ ایسی ایسی کتابیں بھی پیش پاافتادہ کے طور پر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں جن کا نام بھی آج ام۔ اے کے طالب العلموں کو معلوم نہیں ہوگا۔ صرف دو طالب العلم ایسے تھے جو مطالعہ سے گھبراتے تھے۔ ان دو میں ایک میں تھا۔ اور دوسرے مرتاض الدین مرحوم۔ میں زیادہ سے زیادہ نصاب کی ضروری کتابوں تک اپنا تعلق محدود رکھتا تھا۔ مرتاض الدین نصاب کے علاوہ چند متعلقہ کتابوں کے مطالعوں پر اکتفا کرتے تھے۔ مرتاض الدین بہت ذہین تھے اُن کی ذہانت نے ان کا ہمیشہ ساتھ دیا اور پورے کلاس میں ان کے جیسا حاضر جواب اور گفتگو پر قادر و غالب کوئی نہ تھا۔ میں تو گویا بالکل گونگا تھا اس لئے پیچھے ہی رہتا تھا۔ سعید رضا گہر نذر خلیق وغیرہ بھی بولنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر مرتاض الدین سے پسپا رہتے۔ کلاس میں یہ چاروں صفِ اوّلیں میں تھے۔ ان کے علاوہ ہم لوگ چار حاشیہ نشیں تھے اور میں تو

صفِ آخریں سے بھی دور تر جو اشارا ہو تو وہیں سہی

پٹنہ یونیورسٹی میں کلاس مخلوط چلتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے ہیں۔ لیکن اتفاق سے ہمارے کلاس میں صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ جسے مرتاض الدین نے "تعزیہ" کا لقب دیا تھا۔ نہایت سنجیدہ، نہایت کم گو کم آمیز اور محتاط۔ نام بھی اتفاق سے زاہدہ تھا اور بالکل اسم بامسمّیٰ لڑکی تھی۔ ہم سے اوپر جو سینئر کلاس تھا اس میں لڑکیوں کا ہجوم تھا اور شاید لڑکوں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی۔ اور سب تڑاق پڑاق اور تیز طرار۔ گرچہ اکثر لڑکیاں برقعہ ہی میں تھیں۔ زاہدہ کا برقعہ واقعی برقعہ تھا۔ جو ہمیشہ ایک حال میں اپنا فرض انجام دیتا تھا۔ مرتاض الدین اور دوسرے ساتھیوں کو اس کا افسوس تھا۔ میرے تمام ساتھی صاحب کردار تھے۔ شرافت نفسی اور شریف النفسی کے مثال تھے۔ مگر کبھی کبھی رگِ مذاق اُبھرتی مگر سرد ہو کر رہ جاتی۔ وہ کہتے کہ بس کلیم عاجز صاحب آپ رہئے اور زاہدہ رہیں۔ ہم لوگوں کا اس کلاس میں گذر نہیں ساتھیوں

www.taemeernews.com

نے تعزیہ پر ایک نظم بھی بہ جبر مجھ سے لکھوائی کہ کلاس میں جب استاد نہ ہوں گے تو زاہدہ کو سنا کر پڑھی جائے گی اور پھر اسے دے دی جائے گی۔ مگر یہ جرأت کبھی نہیں ہوئی۔ نظم لکھی رہی۔ لیکن نہ پڑھی جا سکی نہ زاہدہ کو دی جا سکی۔ ام۔ اے کرنے کے بہت دنوں بعد میں نے ہی زاہدہ کو دیدی کہ دیکھو ساتھیوں نے تمہارے متعلق کن خیالات کا اظہار مجھ سے کروالیا۔ وہ مجھ سے مانوس تھی اور کبھی کبھی کتابیں مانگنے میرے گھر آجاتی۔ پھر اس کی شادی ہوگئی اور وہ مشرقی پاکستان چلی گئی۔ دس بارہ سال بعد جب میں ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان گیا تو خاص اس سے ملنے جیشور گیا۔ جہاں وہ اور اس کے شوہر دونوں سرکاری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ وہاں دیکھا تو زاہدہ نے پردہ ترک کر دیا تھا ساری پہن کر اسکول جاتی تھی۔ بنگالیوں کا معاشرہ غالب آچکا تھا۔ میں نے ہلکے انداز سے اس انقلاب کی طرف اسے متوجہ کیا۔ وہ کچھ نادم ہوئی مگر خاموش رہی۔ گھنٹے دو گھنٹے کی ملاقات تھی۔ اس لئے زیادہ اس موضوع پر توجہ دینے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ میں چلا آیا اور انقلاب آیا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ بہت سے اپنے ہمیشہ کے لئے پرائے ہوگئے۔ بہت سے جانے مستقل طور پر انجانے رہ گئے۔ آٹھ سال بعد کراچی گیا تو اتفاق سے تذکرہ نکل آیا۔ معلوم ہوا زاہدہ کراچی میں ہیں لیکن مجھے ملنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سات آٹھ بار جانا ہوا۔ کبھی کبھی اس کی طرف سے پیغام بھی آیا۔ مگر کوئی رہبر نہیں ملا۔ اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔ ابھی تین چار سال پہلے۔ ایک رہبر مل گیا جو اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے زاہدہ کے مکان میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خبر کرائی۔ اس کے دو نوجوان لڑکے آگئے۔ باتیں ہوئیں۔ پھر اس کے شوہر جو میرے دوست ہیں آگئے۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ لڑکے چلے گئے شوہر صاحب بیٹھے رہے۔ میں گھڑی دیکھتا رہا۔ پندرہ منٹ گذر گئے۔ میں نے پھر کہلوایا۔ معلوم ہوا ہاں آرہی ہیں۔ پھر پندرہ منٹ گذر گئے مجھے بہت الجھن ہوئی۔ میں نے ان کے شوہر سے کہا بھئی اتنی دیر میں کیسے انتظار کر سکتا ہوں۔ وہ بولے ابھی غسل کرنے گئی ہیں۔ میں نے کہا چند منٹ کے لئے غسل کی کیا ضرورت تھی۔ خیر پھر انتظار کرتا رہا دس منٹ اور گذرے۔ میں بے قابو ہوگیا۔ بھئی یہ کیا بات ہے اور کہاں کا اخلاق ہے۔ معلوم ہوا بس آرہی ہیں۔ پانچ سات منٹ اور گذر گئے اس کے بعد زاہدہ تشریف لائیں۔ غسل کرکے، بال

www.taemeernews.com

سنوار کر، پوڈر لگا کر۔ میں بالکل ہی چراغ پا ہو گیا اور میں نے ان کے شوہر کے سامنے ہی کہہ دیا کہ "نائدہ لی جس وقت ہم دونوں جوان تھے اُس وقت تو یہ اہتمام نہ تھا اب کہ ہم دونوں اس دور سے بہت دُور چلے گئے یہ حماقت نہیں تو اور کیا۔ کراچی جیسے شہر میں تم نے میرے پینتالیس منٹ ضائع کر دیئے" یہ کہہ کر میں اُٹھا اور باہر چلا آیا۔ پھر اس طرف رُخ بھی نہیں کیا۔

ام۔ اے کے کلاس چلتے رہے۔ میری وضع داری کالج بھر میں مشہور تھی۔ آنرس میں زیادہ تر کُرتے پاجامے میں آجایا کرتا تھا۔ ام۔ اے کے دوران میں نے شیروانی اہتمام سے پہننی شروع کی۔ بغیر شیروانی کبھی کلاس میں نہ آتا۔ اس زمانے میں صرف جمیل مظہری صاحب اہل شیروانی تھے۔ وہ میرا بہت لحاظ کرتے اور مجھ سے امتیازی رکھ رکھاؤ برتتے۔ مجھ سے کوئی خدمت کے لئے کبھی نہیں کہتے۔ اس لئے ان کی خدمت میں اوروں سے میں ہی سبقت کر جاتا اور وہ مجھ سے خفا ہو جاتے۔ کبھی کبھی کلاس میں مجھ سے اشعار کی فرمائش کر دیتے۔ بہت اصرار کرتے تو مجبوراً دو چار شعر سنانے پڑتے۔ بہت خوش ہوتے اور بہت تعریف کرتے۔ ایک دن ٹیوٹوریل کلاس انہوں نے لیا۔ اور غالب کا ایک شعر تشریح کے لئے دیا۔ ہم سب لوگوں نے تشریح کر دی۔ کاپیاں پیش ہوئیں۔ دل میں سے کسی کو ۴½ کسی کو ۵ مجھے انہوں نے ۵½ نمبر دیا لیکن کہا "کلیم عاجز صاحب یہ سخت افسوس کا مقام ہوگا اگر آپ کو فرسٹ کلاس نہیں آیا۔ (میں بھول گیا یہ واقعہ بی۔ اے آنرس کا ہے ام۔ اے کا نہیں) بہرحال یہ واقعہ کہنا تھا اُن کی بات پر میں چونک پڑا۔ بچپن سے اس وقت تک، مکتب میں، اسکول میں، کسی کلاس میں، کسی علمی ادبی مقابلے میں کسی امتحان میں سیکنڈ کبھی نہیں ہوا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جمیل صاحب ایسی بات فرما رہے ہیں؟ پھر یاد آیا کہ اسکول میں ایسا ایک بار ہوا تھا۔ میرا ڈبل پروموشن نویں کلاس سے دسویں کے عوض گیارہویں کلاس میں ہوا چند ماہ ہی بعد Pretest ہوا تو نظیر حیدر مرحوم اول آئے۔ صلاح الدین مرحوم کو دوسری پوزیشن ملی۔ مجھے تیسری۔ پھر ٹسٹ ہوا تو نظیر حیدر مرحوم اول آئے میں دوم۔ فائنل ہوا تو پورے اسکول میں میں تھا اور نظیر حیدر مرحوم کو دوسری پوزیشن ملی۔ بہرحال آنرس کا امتحان اور میرا نتیجہ نکلا تو جمیل صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ مبارکباد دینے کو اہتمام سے رکشہ کر کے آئے۔ دروازے پر مجھے پکارا میں باہر نکلا تو معانقہ کیا اور بے حد خوشی

www.taemeernews.com

کا اظہار کیا۔ میں رکشہ کا کرایہ دینے لگا تو خوشی یک بیک خفگی میں بدل گئی "تم مجھے ذلیل سمجھتے ہو! مبارک باد دینے آؤں اور رکشہ کا کرایہ تم سے لوں" وہ جانے لگے۔ جمیل صاحب کا یہ اندازِ زود رنجی کبھی کبھی اُبھر آتا اور فوراً دفع ہو جاتا۔ میں نے معافی مانگی۔ خوش ہو کر میرے ساتھ اوپر آئے۔ کھانے کے بہت شوقین تھے۔ تعریف کر کر کے کھاتے رہے۔ تعریف جمیل صاحب کا مزاج تھا۔ وہ کسی پر تنقید نہیں کرتے۔ اور تعریف میں کبھی اعتدال سے بہت بڑھ جاتے۔ جو اُن کے مزاج شناس تھے وہ سمجھ جاتے کہ یہ مدح ممدوح کا دماغ خراب کرنے کے لئے ہے۔ اور واقعی دماغ خراب ہوا۔ کئی مثالیں سامنے ہیں کہ جمیل صاحب کی تعریف نے کسی کا مزاج خراب کیا مغرور ہوا۔ اور آخر شعر و ادب سے گیا۔

ام۔ اے میں ایک واقعہ اہم اور دلچسپ ہے۔ یہ واقعہ دو اعتبار سے میرے لئے اہم ہے کسی دوسرے کے لئے ہو یا نہ ہو۔ ایک تو یہ کہ یہ واقعہ ہے اپنی محدود اور متعین دنیا سے کسی حد تک میرے باہر آجانے کا یعنی میرے خیال اور عمل کی دنیا محدود ہے ۱۹۴۷ء سے پہلے بھی اور اس وقت میں علم ادب و شعر کی دنیا کا آدمی ہوں۔ اسی کا تعلق خیال و افکار سے بھی ہے عمل سے بھی۔ معیشت کا تعلق میرے خیال و افکار سے نہیں۔ کمانا ایک ضرورت ہے تاکہ حصولِ رزق کا بہانہ بن سکے۔ کمانا میری خواہش نہیں اگر بغیر کمائے حصولِ رزق کا سامان ہو سکتا تو میں نہ دوکان کرتا نہ یونیورسٹی کی ملازمت، یکسو ہو کر دعوت کا کام کرتا۔ شعر و ادب بھی اسی عملی دعوت کے راستے ہیں۔ اور رزق کا مفہوم بھی وہ نہیں جو اب دنیا سمجھتی ہے۔ سادگی اپنا آئیڈیل ہے۔ نہ کوٹھی نہ محل نہ گھوڑا نہ گاڑی نہ خدم نہ حشم نہ ہالی نہ موالی نہ ہٹو نہ بچو۔

اِس غریبی میں بھی چلتے ہیں سر اونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کلہدار ہیں اپنے گھر کے
دن بسر کر کے مشقت کی کڑی دھوپ میں ہم
شب کو سو رہتے ہیں ہاتھ اپنا سرہانے دھر کے

شاعری نہیں ہے حقیقت ہے آؤ اور اب بھی دیکھ لو۔ پدم شری صاحب کہاں رہتے ہیں کیسے رہتے

www.taemeernews.com

ہیں کیسے اور کیا کھاتے ہیں کیسے اور کہاں سوتے ہیں۔ میرے کھانے کپڑے پر میرا کتنا خرچ ہوتا ہے یہ تحقیق طلب نہیں قابل دید ہے۔ میں نے اقبال کے اس مصرع میں خود کو ڈھال لینے کی کوشش کی ہے اور کوشش جاری ہے۔

اُس کی تمنا قلیل اس کے مقاصد جلیل

میں نے اپنی ضرورتوں میں اتنی سادگی رکھی ہے کہ میرے سبب سے کسی دوسرے کو کم سے کم تکلیف پہونچے۔ مقابلہ، ریس اور competition اور حسد اور رشک موازنہ مباحثہ ان چیزوں سے مجھے بڑی وحشت ہے۔ عوام میں عزت، شہرت، پبلسٹی اشاعت نام نمود نعرہ اور استقبال وغیرہ سے نفرت ہے اور آج کی نسل انہیں چیزوں پر مرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عمر کو پہونچنے کے بعد بھی سیاست میرے لئے غیر دلچسپ ہی نہیں کسی حد تک قابل نفرت ہے۔ لیکن ام۔اے کے ساتھیوں نے مجھے تھوڑی دیر کے لئے اِس تلخ گھونٹ کا مزا لینے کے لئے مجبور کر دیا۔

"پٹنہ یونیورسیٹی بزم ادب" ایک نہایت مقتدر باعزت اور باوقار ادارہ تھا۔ تھا اس لئے کہ اب نہیں ہے۔ اب دنیا سے وقار اور عزت کی چیزیں ختم ہوتی جارہی ہیں۔ جو قدریں انسانیت کا شرف تھیں وہ زندگیوں سے نکلتی گئیں اور جو بے وقعت اور بدنام صفتیں تھیں وقار اور عزت کی جگہوں پر قابض ہوتی گئیں۔ خلاصہ یہ کہ اب نہ یونیورسیٹی میں "بزم ادب" ہے، نہ ادب کا کوئی ذکر ہے نہ ادب کا کوئی چرچا ہے۔ بزم ادب پٹنہ یونیورسیٹی کا وقار پچاس چالیس سال پہلے تک تقریباً وہی تھا جو مسلم یونیورسیٹی اسٹوڈنٹس یونین کا تھا۔ بزم ادب کے سکریٹری کا انتخاب باضابطہ الیکشن کے قاعدے پر ہوتا تھا۔ یونیورسیٹی کے اور کالج کے طلبا فیس دے کر اس کے ممبر بنتے تھے۔ جو ممبر نہیں ہوتا اسے حقِ انتخاب نہیں ہوتا۔ میرے ام۔اے میں داخلے سے پہلے زین الدین مرحوم ایڈوکیٹ، ڈاکٹر وسیم احمد صدر شعبۂ انگریزی جامعہ ملیہ دہلی، پروفیسر اکرام شبنم صدر بہار کالج ٹیچرس ایسوسی ایشن وغیرہ اس کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ میں نے داخلہ لیا۔ اس وقت شاید پروفیسر اکرام شبنم سکریٹری بزم ادب تھے۔ ہم لوگ کلاس میں تھے کہ میرے ساتھی مرتاض الدین اور خالد رشید صبا مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔

www.taemeernews.com

"کلیم بھائی! تم کو بزم ادب کے سکریٹری کا انتخاب لڑنا ہے۔"

"میاں ہم تو ام۔اے میں آگئے۔ اور اس سے دس بارہ سال پہلے آجاتے۔ مگر نہ یہ جانتے ہیں کہ انتخاب کسے کہتے ہیں اور لڑنا کیسا ہوتا ہے۔"

"بہر حال اب جاننا ہوگا۔"

"تو معافی برد ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند ست آشیانہ"

تو آشیانہ نیچے لانا ہوگا اور دام میں الجھنا ہوگا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اکرام سبنم کی مدت انتخاب ختم ہو رہی تھی۔ نیا الیکشن ہونا تھا اور یہ کہ اب کی بار عبدالمغنی صاحب سکریٹری کے امیدوار ہیں۔ ان کے مقابلے کے لئے میرے جیسے ناتواں پہلوان کو اکھاڑے میں لانے کی حماقت یہ میرے ساتھی حضرات کرنے والے تھے۔

عبدالمغنی صاحب سے میں واقف تھا۔ وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے مشہور طلبا میں تھے۔ مشہور اس اعتبار سے کہ وہ شہری اور مقامی سیاست میں بہت کھل کر نمایاں حصہ لیتے تھے سیاسی جوڑ توڑ اور جتھا بندی میں انھیں کافی مہارت تھی۔ اپنی تقریروں کے ذریعہ بہت جلد اپنی حمایت پر ساتھیوں کو آمادہ کر لیتے۔ مدرسہ شمس الہدیٰ کے مشہور و معروف پرنسپل مولانا ریاست علی ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد کے منہ لگے اور سر چڑھے اور ہندوستان کی مرکزی سیاست میں دخل و عمل رکھنے والے اہم شخصیت تھے۔ اُن سے بھی بہت لمبی چوڑی جنگ عبدالمغنی صاحب لڑ چکے تھے۔ اور شاید کسی حد تک ندوی صاحب کو اپنی مہارت سے مرعوب بھی کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ بھی شہر میں مختلف شہری، مذہبی اور سیاسی مسائل میں خم ٹھونک کر کود چکے تھے اور اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور قیادتی استعداد کا طلبا میں لوہا منوا چکے تھے۔ مدرسے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ پٹنہ کالج میں داخل ہوئے اور تیسرے ہی سال میں تھے کہ بزم ادب پٹنہ یونیورسٹی کے سکریٹری شپ کے امیدوار بن کر میدان میں کود گئے۔ گرچہ روایتاً یہ بات چلی آرہی تھی کہ بزم ادب کے سکریٹری کے لئے انتخاب وہی لڑتا تھا جو گریجویشن کرنے کے بعد یونیورسٹی پوسٹ گریجویٹ کلاس میں داخل ہو چکا ہو گرچہ

www.taemeernews.com

بزم کے ضابطے میں یہ شرط نہیں تھی مگر ابتدا سے یہی روایت چلی آرہی تھی ۔ قانونی طور پر ان کی امیدواری میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اس لئے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھ سکی حسب طبیعت انہوں نے پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسیٹی میں اپنی تنظیمی صلاحیت سے اچھا خاصا حلقہ طلبا کا اپنے قریب کرلیا تھا جس میں اردو داں، غیر اردو داں، مسلم غیر مسلم ہر طرح کے طلبا تھے ۔ ان کا رعب اور ان کے پیچھے کارناموں کی دھاک طلبا اور اساتذہ دونوں پر تھی ۔ اس لئے ان کے مقابلے میں امیدوار بننے کو راضی آمادہ اور تیار کوئی نہ تھا ۔ تو لوگوں نے گاما کے مقابلے میں چاراپلی پہلوان کو کھڑا کرنا چاہا اور لے دے کر میرے پیچھے پڑ گئے ۔ میں کہ سیاست کی سین سے مقابلے کی میم سے اور الیکشن کی الف سے بھی واقف نہیں اور طبیعت مستزاد کہ گوشہ گیر، کم آمیز، کم سخن منہ چور ۔ بقول غالب نکما اور شاعر ۔ شاید یہ عیوب میرے ساتھیوں کی نگاہوں میں ہنر بن گئے تھے ۔ وہ تلوار کے مقابلے کے لئے شاخ گل فولاد کے مقابلے کو ریشم انگارے کے مقابلے کو شبنم لانا چاہتے تھے ۔ مختصر یہ کہ میں ہزار بیزاری کا اظہار کرتا رہا معذوری پیش کرتا رہا انکار کرتا رہا نالاں ہوتا رہا ۔ مگر لوگوں نے میری طرف سے درخواست دے دی، اس کی تائید بھی کردی اور میرے انٹرویو کے بغیر اختر اورینوی صاحب نے منظور بھی کرلی ۔ اور میں پا بہ دست دیگراں دست بہ دست دیگراں میدان میں لا کھڑا کر دیا ۔

میں شام کو نماز مغرب سے کچھ پہلے اپنی دکان میں بیٹھا تھا کہ عبدالمغنی صاحب تشریف لائے ۔ وہ میری قدر کرتے تھے ۔ کسی حد تک میری نیکی اور خاموشی سے متاثر تھے ۔ میں ان کے چھوٹے بھائی مظفر اقبال کا ہم سبق تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ اردو ام ۔ اے کلاس میں تھے ۔ نماز مغرب کا وقت ہوگیا ۔ سلام کلام اور چائے کے بعد میں نے مصلی بچھایا انہیں امام بنایا ۔ مغرب کی نماز پڑھی ۔ نماز سے فارغ ہوکر مصلی پر بیٹھے ہی ہوئے عبدالمغنی صاحب نے کہا میں تم سے ایک اہم بات کرنے آیا ہوں ۔ ان کے لہجہ میں سنجیدگی بھی تھا اور خلوص بھی تھا ۔ وہ بالکل سچائی سے بول رہے تھے ۔ انہوں نے مختصراً کہا بغیر تمہید کے کہا اس لئے مجھے تقریباً ان کے الفاظ یاد ہیں وہ بولے :

www.taemeernews.com

"میں نہایت خلوص سے کہتا ہوں کہ تم سکریٹری شپ کے مقابلے سے الگ ہو جاؤ اپنی درخواست واپس لے لو۔ مجھے اپنی فتح کی خوشی سے بہت زیادہ تمہاری شکست کا افسوس ہوگا۔"

میں نے کہا" میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ بہت مجبور کیا گیا ہوں گرچہ یہ کام میری مرضی اور منشا اور طبیعت کے خلاف ہے لیکن جب بات آگے بڑھ گئی تو میں اپنے ساتھیوں کے اعتماد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ مجھے نہ فتح سے مطلب ہے نہ شکست سے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی دلداری سے مطلب ہے۔

عبدالمغنی صاحب اُٹھ کر چلے گئے۔ اور پھر الیکشن کی تیاری دونوں جانب سے اس شد و مد اس جوش و خروش اس تندہی اور طمطراق سے ہونے لگی کہ بالکل اسمبلی اور پارلیامنٹ کے انتخاب کا نقشہ سامنے آگیا اور لوگ کہنے لگے کہ بزم ادب کا الیکشن اِس دھوم سے تو کبھی نہیں ہوا تھا اور بعد میں تو ہوا ہی نہیں بلکہ الیکشن ہی پھر نہیں ہوا۔ بس یوں ہی برائے نام جلسہ ہوا ووٹنگ ہوگئی اور نام کا اعلان ہوگیا۔ پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسیٹی کی دیواریں مختلف پوسٹروں اور اعلانات سے بھر گئیں۔ درختوں پر پوسٹر لگائے گئے۔ کالج کے برآمدوں میں اندر کی سڑکوں پر کھلی اور چاک سے بڑے بڑے نقشے بنائے گئے۔ ان نقشوں میں نعرے، اپیلیں، ترغیبیں اردو میں انگریزی میں اس حسن سے داخل کی گئیں کہ کالج اور یونیورسیٹی کی دیواریں، ستون اور راستے مصوری کے فن کا ایک ایگزیبیشن بن گئے۔ کلاسوں اور یونیورسیٹی کے گارڈن میں، لان میں ہر طرف جلسے، تقریریں۔ بس نہ پوچھئے ہفتوں تک ایسا لگا کہ کم از کم بہار اسمبلی کا انتخاب تو ضرور ہے۔ ممبر شپ کی کوششیں دونوں طرف سے ہو رہی تھیں۔ اس زمانے میں بزم ادب کی ممبری فیس شاید ایک روپیہ یا بارہ آنے تھی۔ بیشتر لڑکے خود ممبر بن رہے تھے اور کچھ تعداد ایسی بھی تھی جنہیں امیدواروں کی طرف سے فیس دے کر ممبر بنایا جا رہا تھا۔ اس سلسلہ میں میری طرف سے رقم پیش کرنے والوں میں دو صاحبان بہت پیش پیش تھے۔ اور شاید دونوں شعبۂ جغرافیہ کے پوسٹ گریجوئٹ اسٹوڈنٹ لیڈر تھے۔ علی صاحب اور اسرار عالم صاحب اِن حضرات نے تقریباً ایک سو ممبر بنائے۔ یہ حضرات بظاہر میری طرف سے کام کرنے والے تھے مگر دراصل یہ حضرات عبدالمغنی صاحب

www.taemeernews.com

کے پرجوش طرفداروں میں تھے۔ یہ انکشاف انتخاب کے دن ہوا جب یہ حضرات ہوسٹلوں سے چن چن کر ممبر بنے ہوئے طلبا کو لاتے تھے عبدالمغنی صاحب سے ملواتے تھے اور ان کی حمایت میں ووٹ ڈلواتے تھے۔

ہوسٹل اور لاج میں رہنے والے اکثر طلبا مدرسہ کے فارغین تھے وہ تمام کے تمام عبدالمغنی صاحب کے حلقہ بگوش تھے۔ اس کے علاوہ تمام سیاست زدہ طلبا عبدالمغنی صاحب کے مداحوں میں تھے۔ غیر جانب دار طلبا کی بھی اکثریت عبدالمغنی صاحب کی طرف مائل تھی اس لئے کہ میں نہ کالج میں مشہور نہ یونیورسیٹی میں۔ میری کم سخنی اور کم آمیزی میرا عیب تھی۔ صرف اُردو کلاسز کے طلبا میں میرے جاننے والے طلبا میرے ہمراہ تھے۔ اور ایسے غیر مسلم سینئر طلبا جو ادب و شعر کے رشتے سے میرے کچھ قریب تھے۔ ایسے طلبا کے سربراہوں میں پی۔ ان شرما جو کامرس کالج کے پرنسپل ہوئے اور بہار کانسل کے ممبر بھی ہوئے۔ سی۔ کے پانڈے جو اب صدر شعبۂ ہندی ہیں۔ ورنہ اردو داں غیر اردو داں طلبا کی اکثریت عبدالمغنی صاحب سے واقف ان کی سیاسی کارکردگی ان کی تنظیمی استعداد اور ان کے بے باک اور بے جھینپ گفتگو سے متاثر تھی۔ اس لئے عبدالمغنی صاحب کو اپنی فتح کا یقین ابتدا ہی سے تھا کیونکہ اس سے پہلے کسی معرکے میں انہیں شکست ہوئی تھی نہ پھر بعد میں ہوئی۔ ان کی تاریخی ڈائری ان کی کامیابیوں کے اندراج سے بھری ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ شیر بہار غلام سرور جیسی بلند و بالا شخصیت کو بھی انہوں نے اردو کے پلیٹ فارم پر پچھاڑ کر ہی چھوڑا۔ لیکن پورے پٹنہ میں اور پوری یونیورسیٹی کی سطح پر دو تین باتیں ایسی تھیں جو نتیجتاً اُن کی کامیابی کے راستے میں حائل تھیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے برسوں کی بنی ہوئی روایت توڑی تھی۔ وہ بی۔ اے کے تیسرے ہی سال میں تھے۔ ایم اے کے پہلے سال میں پہونچنے کا انتظار نہ کر کے دو سال قبل ہی سکریٹری کا انتخاب لڑنے کو تیار ہو گئے۔ سنجیدہ طلبا میں یہ بات پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ دوسری بات یہ کہ وہ اردو ادب کی دنیا سے روشناس نہ تھے۔ وہ مدرسہ کے طالب العلم

www.taemeernews.com

تھے۔ اب دو تین سال قبل پٹنہ کالج میں آئے تھے۔ اور تیسری اہم بات یہ تھی کہ یونیورسٹی کے طلبا عام طور سے بھی اور خاص طور سے ان کے حلقے کے طلبا بھی ان سے مرعوب ضرور تھے۔ مگر متاثر مجھ سے اور میری شاعری سے تھے۔ یہی دو تین مہرے میرے چند دور بیں اور مزاج شناس ساتھیوں کے پیش نظر تھے جو فضا اور ماحول سے عبدالمغنی صاحب کی تمام توانائیوں، سیاسی محاذ آرائیوں، گروہ بندیوں اور تقریری معرکہ آرائیوں کے مثبت اثرات کے باوجود اور دوسری طرف میری خاموشی کم آمیزی اور پس رفتاری کے منفی اثرات کے باوصف انہیں پُرامید رکھتی تھی۔ مرتاض الدین اور میرے دوسرے تمام ساتھی بھی سیاسی مصالح سے ناواقف تھے بجز خالد رشید صبا کے جو سیاسی گھرانے ہی کے ایک فرد تھے اس کے باوجود عبدالمغنی صاحب کی تمام سیاسی تدبر اور تنظیمی صلاحیتوں سے وہ متاثر نہ تھے۔

چنانچہ جناب انتخاب کا دن آیا۔ شاید پولس بھی حفاظت کے لئے آئی اور تمام یونیورسٹی کا حلقہ پُرجوش کام کرنے والوں سے بھر گیا۔ میرے حلقے میں تو صرف مرتاض الدین، خالد رشید صبا، ست دیو سنگھ، سعید رضا گہر، نذر خالق اور جمال وغیرہ تھے۔ عبدالمغنی صاحب کا حلقہ کالج اور یونیورسٹی کے ممتاز مشہور اور نمایاں طلبا پر مشتمل تھا۔ ان کا نام نہیں لوں گا کہ ان میں اکثر اب بھی روشناس ہیں۔ قوت کارکردگی اور جوڑ توڑ کی صلاحیت میرے کسی ساتھی میں نہ تھی۔ اور میرے تمام ساتھی میری ہی طرح منہ چور، کم سخن اور ناتواں قسم کے لوگ تھے۔ خالد رشید صبا تو شاید الیکشن کے دن کالج آئے بھی نہیں۔ آئے بھی ہوں گے تو ووٹ ڈال کر واپس چلے گئے ہوں گے۔ صرف دو ساتھی ہمارے تھے جو مخالفتوں کے سیلاب میں چومکھی لڑ رہے تھے۔ مرتاض الدین اور سعید رضا گہر۔ یہ دونوں جسمانی طور پر قوی نہ ہونے کے باوجود دلیر اور حاضر جواب تھے۔ لیکن میرے ساتھیوں کو یہ امید تھی کہ یونیورسٹی طلبا میں اچھا خاصہ حلقہ ہے جو خارجی اور وقتی اثرات سے متاثر نہیں ہوتا غیر جانب دار ہے، دیانت دار ہے انصاف پسند ہے۔ حقیقت شناس ہے۔ ان میں دو نام میں لکھ چکا ہوں۔ پی۔ ان شرما اور

www.taemeernews.com

سی کے پانڈے ۔ دو نام مجھے اور یاد ہیں شمشیر سنگھ اور ایک لڑکی پربھا سنہا۔ یہ دونوں پولیٹکل سائنس کے اچھے طلبا میں تھے۔ اِس کے علاوہ انگریزی کے اکرام شبنم جو بعد میں انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ شفیع جاوید جو اب ڈائرکٹر تعلقات عامہ بہار ہیں۔ اردو کے ضیا جو متھلا یونیورسیٹی کے صدر شعبۂ اردو ہیں۔ خلیل احمد جو ہائی کورٹ کے سینیر ایڈوکیٹ ہیں۔ انوار احمد جو پٹنہ یونیورسیٹی کے صدر شعبۂ فارسی ہیں، قمر اعظم جو ان دنوں بہار گورنمنٹ میں کہیں ڈپٹی سکریٹری ہیں۔ اور نسیم احمد جو اب ڈی آئی جی پولس ہیں۔ مگر یہ تمام حضرات عبدالمغنی صاحب کی سیاسی حکمت آرائیوں سے اتنے مرعوب تھے کہ کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ پس پردہ ہی رہتے تھے۔

تو جناب انتخابات شروع ہوئے جوق در جوق ووٹر آنے لگے۔ کیو لگنے لگا۔ اختر اورینوی صاحب ڈاکٹر صدرالدین صاحب Presiding Officer تھے۔ اور میری طرف سے تنہا پولنگ ایجنٹ مرتاض الدین تھے Ballot Box والے کمرے میں ووٹنگ چک کرنے کو بیٹھے تھے۔ میں ظہر کے وقت تک پٹنہ کالج میں رہا پھر گھر چلا آیا۔ ظہر کی نماز پڑھی، کھانا کھایا تھوڑی دیر آرام کر کے عصر کی نماز کی تیاری کر رہا تھا میرا مکان ان دنوں بی۔ این کالج کے سامنے گلی میں دو تین مکان کے بعد تھا۔ مصلّی بچھا رہا تھا کہ سڑک ہی سے زور سے آواز آئی "کلیم بھائی"! اور میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ سعید رضا گھر رکشے سے کود کر دونوں ہاتھ اوپر پھیلائے ہوئے دوڑے آرہے ہیں۔

"کلیم بھائی مبارک باد! مبارک باد مبارک باد!"

سیڑھیاں چھلانگتے ہوئے کوٹھے پر آکر اس زور سے معانقہ کیا کہ میں گرنے کے قریب ہوگیا۔

"کلیم بھائی چلئے مرتاض الدین بہت بیمار ہوگئے ہیں"۔

نماز پڑھ کر ان کے ساتھ اقبال ہوسٹل آیا تو مرتاض الدین کمرے میں چوکی پر کمبل اوڑھے ہوئے لیٹے تھے اور چاروں طرف لڑکوں کا ہجوم تھا۔ کوئی سر دبا رہا تھا کوئی پاؤں سہلا رہا تھا

www.taemeernews.com

کوئی گردن اور بدن دبا رہا تھا۔ اور وہ بہت آہستہ آہستہ بول بھی رہے تھے کچھ مسکرا رہے تھے کچھ ہنس رہے تھے۔ آواز میں بڑی نقاہت تھی لیکن چہرہ خوشی سے شگفتہ تھا۔ صبح نو بجے سے شام تک وہ سخنی کمزور آدمی پولنگ ہال میں بیٹھا رہا۔ ایک ایک ووٹر کو چک کرنا، بوگس ووٹروں کی نشان دہی کرنا، امیدوار یم میں ووٹ شماری کرنا۔ ایک طاقت روحانی تھی دوسری طاقت محبت کی تھی جس نے اس مرد نحیف و نزار کو ایک سچے مقصد اور ایک سچے ارادے سے ذہن دماغ دل اور جسم کی پوری بیداری کے ساتھ مشقت میں آٹھ گھنٹے بغیر کسی وقفے کے ڈبوئے رکھا۔ اور جب نتیجہ کا اعلان ہوگیا۔ وہ سچی لگن کامیاب ہوئی، سچا مقصد حاصل ہوا، سچا ارادہ پورا ہوگیا، تو پیاس، بھوک اور تکان کی شدت سے مرتاض الدین وہیں کمرے میں نیم بیہوش ہو کر گر گئے۔ لوگ ہوسٹل کے کمرے میں لائے۔ کچھ ٹھیک ہوئے ہلکے ہلکے بولنے لگے مسکرانے لگے۔ اسی عالم میں کمرے کے اندر داخل ہوا تو "کلیم بھائی" کہہ کر کمبل ہٹا کر کچھ نیم دراز ہو کر مجھ سے معانقہ کرنا چاہا کہ پھر نیم بیہوش ہو کر پلنگ پر گر گئے۔

اسی دن شام کے بعد اقبال ہوٹل کے کمروں سے ایک جلوس نکلا۔ اکرام شبنم، شفیع جاوید یہ دونوں جلوس کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جلوس اور کچھ نہ تھا ہلکے ترنم سے کچھ گایا جا رہا تھا اور ہر تان پر شفیع جاوید ذرا جھک کر یوں گھوم جاتے تھے جیسے کوئی ماہر رقاص رقص کے شباب میں چرخی لیتا ہے یا لیتی ہے۔

اسی شب کو پٹنہ کالج کے سامنے پنٹو ہوٹل میں تقریباً چالیس پچاس سینئر طلبا جمع ہوئے۔ مبارک حسین ایک نہایت ہی قوی ہیکل اور بلند و بالا، ہم لوگوں کا ہم عصر۔ جو مجھ سے الیکشن کے دوران اکثر کہا کرتا کہ کہو تو عبدالمغنی کو گود میں اٹھا کر کہیں پھینک آئیں۔ اور یہ بات کوئی بہت مشکل نہ تھی۔ اس کام کے شایان شان وہ تھے اور میں ہنس دیتا کہ مبارک بھائی کیا آپ نے اسے بالکل سچ مچ الیکشن کا میدان ہی بنا دیا تو مبارک اور ارشد ملک اور اقبال ملک اور اقبال ہوسٹل کے لڑکے چائے پر اور بسکٹ پر ٹوٹ رہے تھے اور تقریر کر رہے تھے کہ یہ سچائی کی فتح ہے، حقیقت کی فتح ہے، ادب و شاعری کی فتح ہے، سیاست پر انسانیت

www.taemeernews.com

کی فتح ہے، تقریر پر خاموشی کی فتح ہے، عقل پر عشق کی فتح ہے، غرور پر انکسار کی فتح ہے۔ اور عبدالمغنی صاحب کی پہلی شکست ہے۔

اس فتح و شکست کے فوراً بعد ایک دوسرا واقعہ اسی نوعیت کی فتح و شکست کا پیش آیا اردو اسٹوڈنٹس فیڈریشن ایک تنظیم بہار میں تھی جس کے صدر ایک سکھ افسانہ نویس اور انقلابی مسٹر ہربنس سنگھ دوست تھے۔ جمشید پور میں رہتے تھے۔ پٹنہ میں ایک نائب صدر کا انتخاب ہونا تھا۔ لوگوں نے مجھ سے کسی طرح کا پختہ استمزاج لئے بغیر میرے نام کا اعلان کر دیا۔ میں انکار کرتا رہا۔ انجمن اسلامیہ ہال میں انتخابی جلسہ تھا۔ پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب سابق صدر شعبۂ اردو اس انتخاب کے رہنما اور ذمہ دار تھے۔ پورے بہار سے طلبار کے وفود آئے تھے اور انجمن کا ہال لبالب بھرا ہوا تھا۔ نعرے اور تقریریں ہو رہی تھیں۔ عبدالمغنی صاحب اس عہدے کے زبردست اُمیدوار تھے اور پورے صوبے سے اپنے حواخواہوں کو بلایا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو خبر کئے بغیر ایک پرزے پر نائب صدارت کے عہدے سے استعفا اور الگ رہنے کا ارادہ لکھ کر پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب کو چپکے سے دے دیا تھا۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے جیب میں رکھ لیا۔ اس زمانے میں غلام سرور صاحب نے جو ریاستی انجمن ترقی اردو کے باوقار ذمہ دار اور صدر تھے عبدالمغنی صاحب کی سیاسی استعداد دیکھ کر اپنا دست و بازو بنا کر ساتھ رکھ لیا تھا۔ ٹھیک جلسہ کے شباب کے وقت انجمن اسلامیہ ہال میں میرے پاس آئے۔ اور کہا اردو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا نائب صدر عبدالمغنی کو ہونے دیجئے۔ آپ ریاستی انجمن ترقی اردو میں جنرل سکریٹری کی حیثیت سے آجائیے۔ میں نے کہا نہ میں فیڈریشن کا نائب صدر بننا چاہتا ہوں نہ ریاستی انجمن ترقی اردو کا جنرل سکریٹری۔ مجھے صدارت اور نظامت سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ کسی قدر نفرت ہے میں تو مارا بندھا ہوا تھا وہ بندھن بھی توڑ چکا ہوں اور عارضی صدر حافظ شمس الدین صاحب کو اپنا استعفا نامہ دے چکا ہوں۔ ہال میں ہنگامے تھے۔ نعرے تھے۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کلیم عاجز صاحب کو

www.taemeernews.com

نائب صدر نہیں بننا چاہئے۔ وہ سیاست کے آدمی نہیں ہیں۔

حافظ شمس الدین صاحب نے کہا ان کا استعفا نامہ میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔

یہ سننا تھا کہ ہال میں طوفان آگیا۔

"یہ نہیں ہوسکتا وہ استعفا نہیں داخل کرسکتے۔ یہ اردو اسٹوڈنٹس کی توہین ہے۔ ہم انہیں ایسا کرنے نہیں دیں گے۔"

بخدا مجھے اس کے بعد بالکل یاد نہیں کیا ہوا۔ اتنا بھی غلام سرور صاحب کی اُس بات کے حوالے سے مجھے یاد تھا جو میں نے اوپر لکھا۔ شاید وہ جلسہ برخاست ہوگیا۔ کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ اور پھر یہ بات پس پشت چلی گئی۔

ہم تک ہی رہا آداب مئے و مینا

یہ گرما گرمی میری ہی وجہ سے تھی۔ ہم ہٹے تو میدان خالی ہوگیا۔ تو اس کے بہت دنوں بعد جب عبدالمغنی صاحب نے کسی طرح غلام سرور صاحب سے ترک تعلق کرکے خود صدر انجمن ترقی اُردو بن گئے تو میں ایک دن رستے سے گذر رہا تھا۔ غلام سرور کا رکشہ مخالف سمت سے آتا ہوا تیزی سے میرے قریب سے گذرنے لگا تو میں نے جلدی میں زور سے حضرت سعدی شیرازی کا یہ شعر پڑھا

کس نیاموخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

اور غلام سرور صاحب ہنستے ہوئے ہاتھ اُٹھاتے اور سر ہلاتے ہوئے گذر گئے۔

مجھے یاد نہیں کون سال تھا جب میری پہلی ملاقات غلام سرور صاحب سے ہوئی۔ جب میں نے شاعری شروع کی تو غلام سرور صاحب ایم۔ اے کرکے یونیورسٹی سے نکل چکے تھے بلکہ فارغ ہوئے کئی سال گذر چکے تھے۔ ان کے متعلق سنا تھا اور سنتا تھا کہ وہ اچھے اسٹوڈنٹ رہے ہیں۔ شعر و ادب کا اچھا مذاق رکھتے ہیں مگر مغرور ہیں۔ شعر گوئی اور غزل خوانی کو دو تین سال گذر چکے تھے۔ پٹنہ کالج، بی۔ ان کالج، سائنس کالج کے جلسوں میں شعر پڑھ چکا تھا مگر ان جلسوں میں وہ موجود نہ تھے۔ دانا پور میں کسی بزم کی طرف سے

www.taemeernews.com

ایک طرحی مشاعرہ ہوا اور مجھے اصرار سے طرح پر غزل پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ نہ طرح یاد ہے نہ غزل نہ وہ غزل مجموعہ میں موجود ہے۔ ایک مصرع شاید میرا یوں تھا۔ "اب پھول کہاں ہیں مدت سے کانٹوں پہ گذارا کرتے ہیں" چند ساتھی مجھے لے کر دانا پور گئے۔ مشاعرہ کسی سینما ہال میں تھا۔ اچھے خاصے لوگ تھے۔ فرش کی نشست تھی۔ اور میری نشست کے قریب ہی دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے کسی ساتھی نے کہا غلام سرور صاحب ہیں۔ ایک سانولا دبلا پتلا جوان معمولی کپڑے کا کرتہ اور علی گڑھ پاجامہ ننگے سر، بال پیشانی پر بکھرتے ہوئے۔ دایاں پاؤں بائیں زانو پر رکھے اپنا بایاں ہاتھ تلوؤں پر پھیر رہا تھا۔ جو کسی حد تک انانیت اور تکبر کی علامت ہے آنکھیں تیز اور ذہین اور چمکتی ہوئی مضطرب اور بے قرار۔ ان کے ساتھ دوسرے صاحب کو میں پہچان رہا تھا۔ وہ میرے دور کے عزیز اور رشتہ دار تھے۔ شاید دانا پور کالج میں پڑھا رہے تھے۔ پروفیسر شہباز۔ شہباز صاحب سے صاحب سلامت ہوئی تو غلام سرور صاحب سے بھی مصافحہ ہوا۔ اور اندازہ ہوا کہ ان کی آنکھیں کس قدر طنز آمیز حقارت سے کہہ رہی ہوں کہ اچھا آپ ہی کلیم عاجز ہیں۔ بہر حال مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ تو طے شدہ اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔ ابتدا سے اس وقت تک کسی چھوٹی یا بڑی مجلس، نجی یا عوامی مشاعرہ گھر یا باہر کی نشست میں میری غزل ہمیشہ اول نمبر پر رہی۔ چونکہ ؎

یہ طرز خاص ہے کوئی کہاں سے لائے گا
جو ہم کہیں گے کسی سے کہا نہ جائے گا

اور کسی سے نہ کہا گیا۔ بہر حال تو میں غزل پڑھنے لگا تو غلام سرور صاحب پہلے تیز نظروں سے مجھے دیکھتے رہے پھر تکلف ٹوٹا اور ہلکے پھلکے داد شروع ہو گئی۔ پھر دانا پور میں غلام سرور صاحب ہی کے اشارے سے اور طرحی مشاعرے ہوئے۔ میرے پہلے مجموعہ میں وہ غزلیں ہیں۔ دوسرا طرحی مشاعرہ کسی مکان کے باہر پنڈال میں ہوا۔ دانا پور اور پٹنہ کے اکثر کہنہ مشق اور نوجوان شعرا اور منتخب سامعین موجود تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت کا پورا مجمع ہی منتخب

www.taemeernews.com

ہوتا تھا۔ پرانوں کا خون بدن میں بھی باقی تھا۔ دل اور جگر میں بھی۔ پرانوں کی بصیرت نگاہوں میں تھی۔ پرانی آوازوں کی گونج زبان اور بیان کی جھنکار کانوں میں تھی، نئی نئی آزادی آئی تھی کیا کیا لینے کے بعد اور وصول کرنے کے بعد آئی تھی۔ اور آئی تھی تو کیا کیا لے کر آئی تھی۔ یہ داستان ذہنوں میں تھی، دلوں میں تھی اور بیس پچیس سال تک یہ پورا ماحول اپنی تمام تفصیلات اور خصوصیات کے ساتھ ذہنوں میں شعور میں زندہ اور تندرست تھا۔ آہستہ آہستہ روایات سے اور روایات کے پردے میں پوشیدہ حقیقتوں سے رشتہ ٹوٹنے لگا۔ انہیں جوڑنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ نہ مدرسوں میں نہ خانقاہوں میں نہ اداروں میں نہ تعلیم گاہوں میں، نہ گھروں میں ہوئی نہ بازاروں میں نہ جھونپڑوں میں نہ محلوں میں نہ کچہریوں میں نہ عدالتوں میں نہ خلوتوں میں نہ انجمنوں میں۔ پہلے یہ کوشش ہر جگہ ہوتی تھی اپنے بھی غیر بھی کرتے تھے۔ جب ایسی کوششیں تھیں تو پورا ماحول تسبیح کے دانوں کی طرح ایک سے ایک وابستہ ہم آہنگ ہم وزن ہمدوش ہم رکاب رہا۔ مجاز پٹنہ آئے اپنی نظم نرس نورا پڑھی تو لوگوں نے کہہ دیا کہ جاؤ علی گڈھ میں طبق کو ٹوپھر شاعری کیجیو۔ نوح ناروی زبان پر ناز کرتے ہوئے تشریف لائے۔ اور اپنے تخلص کی مشہور روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مقطع ارشاد کیا ؎

کہا اے نوح روئیں ہم؟ کہا اے نوح روؤ تم
کہا طوفان کا ڈر ہے کہا طوفان تو ہوگا

تو یاروں نے پنسل نکالا اور اخبار کے ٹکڑوں پر موزوں کر کے مجمع میں پڑھ دیا اور سڑکوں گلیوں میں زور زور سے الاپتے پھرے :

کہا املی کو کھائیں ہم کہا املی کو کھاؤ تم
کہا جریان کا ڈر ہے کہا جریان تو ہوگا
کہا سڑکوں پہ موتیں ہم کہا سڑکوں پہ موتو تم
کہا چالان کا ڈر ہے کہا چالان تو ہوگا

www.taemeernews.com

کہا رمنہ میں جائیں ہم کہا رمنہ میں جاؤ تم
کہا منّان کا ڈر ہے کہا منّان تو ہوگا

درجن بھر اشعار ٹکڑوں پر اِدھر اُدھر کہہ کر پھینک دیئے۔ یہ بات بہت دنوں تک سب کے پیش نظر اور قریب دل تھی کہ

یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے

تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ نوجوان سے بوڑھے تک۔ شہری سے دیہاتی تک عالم سے اَن پڑھ تک زندہ تھے اور ظاہر و باطن سب زندہ تھا۔ اب صرف ایک چیز زندہ اور تندرست ہے "ہوس زر" چاہے سب کچھ دے کر ہی کیوں نہ ہو۔ تو مشاعرہ طرح پر ہو رہا تھا غزلیں پڑھی جا رہی تھیں۔ شاید ۱۹۵۲ء کا زمانہ تھا تو میں نے اپنی طرحی غزل پڑھی

دل دے چکے ہیں عہد وفا کر چکے ہیں ہم
پہلے ہی اپنے حق میں بُرا کر چکے ہیں ہم
وہ انجمن اب اہلِ ستم کی ہے جلوہ گاہ
روشن جہاں چراغِ وفا کر چکے ہیں ہم
دنیائے عشق وادیٔ پُر خار ہی سہی
اب تو جنوں کو برہنہ پا کر چکے ہیں ہم

غلام سرور صاحب مست ہو رہے تھے جھوم رہے تھے۔ اور جب یہ شعر پڑھا ؎

کس کس جگہ بیاضِ وطن سے مٹاؤ گے
ہر ہر ورق پہ مہرِ وفا کر چکے ہیں ہم

تو داد دیتے دیتے نیم دراز ہو گئے۔ تو غلام سرور صاحب کا تمام تکلف ٹوٹ گیا۔ اور اسی دانا پور میں شاید کھگول میں سرکاری مشاعرہ ہوا۔ یہ مشاعرہ بجز طرحی تھا۔ جگن ناتھ آزاد صاحب آئے ہوئے تھے۔ اس وقت تو ہر جگہ جگن ناتھ آزاد کا طوطی بولتا تھا۔ جب وہ اپنے وطن لائل پور

www.taemeernews.com

(پاکستان) سے جُدا ہونے کی تمہید کے ساتھ اپنی دو تین مشہور غزلیں ہر مشاعرے میں پڑھا کرتے تھے ۔ دیوانوں پہ کیا گذری، میخانوں پہ کیا گذری، والی غزل اور مہماں لے کے آیا ہوں ارماں لے کے آیا ہوں ۔ اور ہٹ ہوا کرتی تھی ۔ یہ مشاعرہ جگن ناتھ آزاد صاحب سے پہلی ملاقات کا تھا اور پہلا ساتھ کا تھا ۔ اتفاق سے مجھے ان کے بعد پڑھنے کو بلایا گیا ۔ شاید اس لئے کہ وہ مہمان تھے ان کو خوب سننا چاہتے تھے ۔ تو مجھے بلایا گیا تو میں نے اپنے رنگ کی ٹوٹی پھوٹی غزل پڑھی ۔ بغیر کسی خاص جذبے کے، بغیر کسی ارادے کے ۔ میں کس وقت کہاں کیا پڑھوں گا کچھ نہیں سوچتا ۔ بس وقت پر جو یاد آگیا پڑھ دیا چنانچہ غزل شروع کی ۔

کلیجہ تھام تو روداد غم ہم کو سنانے دو
تمہیں دُکھا ہوا دل ہم دکھاتے ہیں دکھانے دو
اسی کے دَم سے تھوڑی روشنی ہے خانۂ دل میں
بجھاتے کیوں ہو شمع آرزو کو ۔ جھلملانے دو
یہ بجلی اس دلِ خوابیدہ کو اک تازیانہ ہے
مری محرومیوں پر آسماں کو مسکرانے دو
سنا ہے عشق کی معراج پنہاں ہے شہادت میں
چھُری کھینچو ہمیں بھی اپنی قسمت آزمانے دو
نہ داغ آئے گا اپنے دامنِ حسنِ طبیعت پر
وفا پر میری جو تہمت لگاتے ہیں لگانے دو

سردی کا زمانہ تھا ۔ غلام سرور صاحب تو پورے یونیفارم میں تھے ۔ سرج کی شیروانی، گرم ٹوپی موٹہ ۔ وہ تو زانو پر کہنی ٹیکے، ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے سر جھکائے خدا جانے سوچ رہے تھے یا رو رہے تھے ۔ مگر پورا مجمع ان کا کام کر رہا تھا ۔ واہ واہ کا وہ شور تھا کہ سچ مچ چھت پٹ رہی تھی ۔ اور رہ رہ کر یہ آواز اُبھرتی تھی ۔ "سبحان اللہ کیا جواب دیا ہے" ۔ "واہ واہ کیا دندان شکن جواب دیا ہے" اور میرے فرشتوں کو بھی اس وقت تک خبر نہ ہو سکی کہ وہ کیا سوال تھا جس کا جواب

www.taemeernews.com

میں نے دیا۔ ویسے سوال وجواب، تو میری غزلوں کا خلاصہ ہے بنیادی موضوع ہے مگر اس وقت جگن ناتھ آزاد صاحب نے کس طور سے غزلیں پڑھی تھیں کیا انداز اختیار کیا تھا کہ میری ایک غزل کے چار پانچ چھ شعروں میں سب کا جواب ہو گیا۔

اس کے بعد سے تو غلام سرور بالکل کلیم عاجز ہو گئے۔ جیسے کلیم عاجز ان کے لئے سب کچھ ہے۔ ان کا شاعر بھی' ان کا ہم آواز' ہم خیال بھی۔ ان کا رفیق کار اور شریک سفر بھی۔ ان کی شخصیت پر لکھنا الگ موضوع ہے۔ وہ پہلو اختیار نہ کروں گا وہ لمبی کہانی ہو جائے گی۔ وہ کہیں گے تو لکھ دوں گا اور انشاء اللہ جو لکھ دوں گا وہ ان مٹ ہو جائے گا جس طرح مرزا فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی نذیر احمد پر جو لکھ دیا وہ یادگار ہو گیا۔ لکھنا صرف اس قدر ہے کہ میں ان کا آئیڈیل شاعر ہو گیا۔ جس کی زبان سے وہ غزل کی زبان میں بولتے تھے۔ خطابت کی زبان میں تو وہ اپنی بات خوب کہتے تھے لیکن میری غزلوں کی زبان میں ان کو اپنا ترجمان مل گیا۔ اور ان کی خواہش بھی ہوتی اور کوشش بھی ہوتی کہ اردو کے ہر اہم پلیٹ فارم پر وہ مجھے ضرور لے جائیں اور وہ اس کوشش میں اکثر کامیاب ہوئے۔ اردو کے ان جلسوں میں جہاں میری شرکت بھی ہوئی۔ جو مسٹر ایوب، مرحوم کی صدارت اور غلام سرور صاحب کے سکریٹری شپ کا شاندار اور سنہرا دور ہے ان جلسوں میں کلیم عاجز کی آواز خوب خوب گونجی۔ اور ایسی گونجی کہ عرصہ تک اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی۔ آخری گونج مسٹر ایوب صاحب کے رخصت ہونے کے بعد غالباً ۱۹۷۲ء آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس تھی' جو پٹنہ سمنری اسکول گراؤنڈ کے پنڈال میں سنی گئی۔ اردو ادب اور صحافت کے ساتھ غلام سرور صاحب کے نہایت والہانہ مخلصانہ اور جرأت مندانہ تعلق کی وہ کانفرنس آخری کڑی تھی پھر غلام سرور صاحب سست پڑ گئے اور انہیں گرمانے کی میں نے چند بار کوششیں کیں۔ یہ چند کوششیں ۱۹۷۷ء میں کامیاب ہوئیں جب وہ پھر میدان میں اترے۔ خیر یہ دوسری داستان ہے تو میری نسبت اور تعلق سے ۱۹۷۲ء کا آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس میرے فن اور اس فن کے فنکار سے غلام سرور صاحب کے والہانہ تعلق کی

www.taemeernews.com

وہ آخری کڑی تھی، جب مسٹر ڈی۔ کے برڈا کانگریسی گورنر بہار کانفرنس کی صدارت نوشاہی قالین پر نوشاہی گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے کر رہے تھے اور فراق صاحب کی میرے متعلق مشفقانہ اور مخلصانہ تمہید کے بعد غزل پڑھنے لگا تو پورے مشاعرے میں صرف دو چیز نمایاں تھی۔ غزل پڑھتا ہوا کلیم عاجز۔ اور غزل کی داد دیتا ہوا غلام سرور۔

بلاتے کیوں ہو عاجز کو بلانا کیا مزا دے ہے
غزل کمبخت کچھ ایسی پڑھے ہے دل ہلا دے ہے
محبت کیا بلا ہے چین لینا ہی بھلا دے ہے
ذرا بھی آنکھ چھپکے ہے تو بیتابی جگا دے ہے
ترے ہاتھوں کی سُرخی خود ثبوت اس بات کا دے ہے
کہ جو کہدے ہے دیوانہ وہ کر کے بھی دکھا دے ہے
غضب کی فتنہ سازی آئے ہے اس آفتِ جاں کو
شرارت خود کرے ہے اور ہمیں تہمت لگا دے ہے
مری بربادیوں کا ڈال کر الزام اوروں پر
وہ کافر اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرا دے ہے

مشرقی پاکستان کا حادثہ ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔ ابھی تک شعلے دلوں میں لپک رہے تھے اور چنگاریاں آنکھوں میں تیر رہی تھیں۔ ہر شعر شعلوں کی لپک کو دلوں میں بڑھا رہا تھا چنگاریوں کی چمک تیز کر رہا تھا۔ اور ہر شعر پر غلام سرور صاحب تمام سامعین کے درمیان نیم دراز ہو کر تعریف میں اپنی نثری غزل مختلف اسلوب سے ارشاد کر رہے تھے۔ اور جب میں نے غزل کا یہ شعر پڑھا:

اب انسانوں کی بستی کا وہ عالم ہے کہ مت پوچھو
لگے ہے آگ اک گھر میں تو ہمسایہ ہوا دے ہے

تو غلام سرور صاحب سے نیم دراز ہونے تک قابو نہ رہا۔ وہ بالکل سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

www.taemeernews.com

اور تمام تعریفی جملے خیرباد کر کے مستقل پانچ منٹ تک یہ جملہ دہراتے رہے :
"کلیم صاحب پھر پڑھئے۔ کلیم صاحب پھر پڑھئے' دوبارہ پڑھئے سہ بارہ پڑھئے دس بار پڑھئے بیس مرتبہ پڑھئے کلیم صاحب پچاس مرتبہ پڑھئے سو مرتبہ پڑھئے دو سو مرتبہ پڑھئے۔ وہ ہر بار ہاتھ اٹھاتے اور زور سے ہاتھ پٹکتے ہوئے کہتے پانچ سو مرتبہ پڑھئے ہزار مرتبہ پڑھئے پانچ ہزار مرتبہ پڑھئے۔ وہ مشاعرہ "میری غزل اور غلام سرور صاحب کی داد تینوں تاریخی ہو گئیں اور برسوں تک جب میری غزل کا تذکرہ ہوتا تو اسی سطح پر غلام سرور صاحب کی والہانہ اور بے ساختہ داد کا تذکرہ ہوتا رہا۔

نطفہ کا ایک قطرہ جو اسی زمین ہوا پانی سورج چاند وغیرہ کی باہم تخلیقی طاقتوں کے استعمال سے پیدا ہونے والی غذا کھانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ خدا جانے کتنی۔ ٹری کائنات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور اس ننھے سے قطرے کے فطری نقل و حرکت اور نشو و نما سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے ننھے سے دھڑکتے ہوئے دل میں زمین و آسمان اور زمین کے نیچے اور آسمان سے اوپر کے کتنے امکانات پوشیدہ رہتے ہیں۔ خدا جانے یہ بچہ کیا بنے گا؟ پاپوش بنے گا سرتاج بنے گا' مزدور بنے گا' سرمایہ دار بنے گا غلام بنے گا آقا بنے گا خاک بسر بنے گا تخت نشیں بنے گا فرعون بنے گا موسیٰ بنے گا۔ انسان کی پناہ گاہیں اس کے قدموں میں پامال ہوں گی یا اس کے قدموں کی خاک بے پناہوں کے لئے سایہ بنے گی۔ یہ گفتار کا غازی بنے گا یا کردار کا مرد جازی۔ اس کی رفتار سے منزلیں گرم ہو جائیں گی یا اسی کی گرد قدم اس کا مرقد بن جائے گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ہم یہی کہتے ہیں کہ جو اس کا مقدر ہوگا رونما ہوگا۔ کیا واقعی مقدر ایسی جامد شے ہے؟ ہم عام طور سے یہی کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا نے اپنی بہترین تخلیق کو ایسا بے دست و پا اور معذور نہیں بنایا ہے۔ باتیں تاریخی شہادتیں اقوال اور اشعار سب کچھ آپ کے سامنے ہیں پھر عام طور سے ایسا کیوں ہوتا ہے یا ہم ایسا کیوں کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

خدا نے سب کچھ بنا کر انسان کو اس کائنات کا والی و مختار بنا دیا ہے۔ اور اس کے والی و مختار بن جانے کے جو قوانین ہیں جو ضابطے ہیں وہ بھی سامنے رکھ دیئے ہیں۔ انسان کا اپنا فیصلہ اپنا ارادہ اپنی نیت ہر قدم پر اس کی تقدیر بناتی ہے۔ ارادوں کے لئے نیتوں کے لئے عزائم کے لئے لامحدود امکانات سامنے رکھ دئے ہیں۔ انسان خود اسے محدود کرے یا اس کا رُخ موڑے یا اس کے امکانات متعین کرے۔ یہ اختیار بھی دیا متعین کرنے، موڑنے وسیع یا محدود کرنے کے عوامل اور نتائج بھی بتا دئے ہیں یا سمجھا دئے ہیں یا اشارے کر دئے ہیں۔ راستے بھی دکھائے ہیں طرز رفتار سکھائے ہیں رُخ کدھر رہے کان کدھر رہیں نگاہیں کس طرف رہیں دل کس رُخ رہے سب بتا دئے ہیں۔ ارادے کیا رہیں، عزائم کیا ہوں نیتیں کیسی رہیں۔ کوئی چیز چھپائی نہیں گئی۔

اب انسان سفر کرتا ہے۔ اپنی تقدیر بنانے کے لئے۔ اپنا مقدر حاصل کرنے کے لئے اپنے امکانات پر قابو پانے کے لئے۔ اس سفر کے لئے اسے دو توشے دئے گئے۔ گلے میں ترازو کے دو پلڑوں کی طرح یہ توشے کی دو گٹھریاں لٹکا دی گئیں۔ ایک توشہ عشق دوسرا توشہ عقل اور ان دونوں کا رشتہ فیضان سماوی سے جوڑ دیا۔ عشق اور عقل دراصل دو جُدا چیزیں نہیں ہیں جس طرح زمین سورج ہی کا ایک حصہ ہے عقل بھی عشق کا ہی ایک جزو ہے۔ زمین سورج سے الگ ہو کر بھی وابستہ اور مربوط ہے، عقل بھی یہ ربط رکھتی ہے تو یہ دونوں توشے، کھانا اور پانی تقدیر سازی کے سفر میں انسان کی صحیح توانائی، اور فطری صحت مندی قائم رکھتے ہیں اور انسان اپنی تقدیر بناتا ہوا آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہی تقدیر ساز شخصیتیں ہیں جو تخلیق میں قدرت کی ہم رکاب ہم دوش اور ہم دست رہتی ہیں انہیں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ خدا ان کا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ تھامے۔ پاؤں بن جاتا ہے جس سے وہ چلے آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھے کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنے۔

غلام سرور صاحب کو میں تقریباً چالیس سال سے دیکھ رہا ہوں ان کی رفتار کا کسی حد تک دور ہی سے سہی مشاہدہ کر رہا ہوں۔ ان کی اٹھان ایسی تھی جس کا یہ جہانِ رنگ و بُو منتظر

www.taemeernews.com

رہتا ہے۔ ایسی اٹھان تھی جو انسان کے مقدر ساز ہونے کی طرف رمز و ایما میں اشارے کرتی ہے۔ اتفاق سے چند گھنٹوں کے لئے ان کا تعلق ایک ایسی ہی تقدیر ساز دوسری شخصیت سے ہوگیا تھا۔ احسن الظفر جن کا واقعہ میں نے قبل لکھا۔ بڑی سخت، فطری اور غیر فطری رکاوٹوں کے درمیان احسن الظفر صاحب نے پٹنہ میونسپل کارپوریشن کا پہلا انتخاب جیتا اور غلام سرور صاحب نے اپنے امکانات اور عزائم کی ایک جھلک اُن میں دیکھی اور نعرۂ مسرت بلند کیا۔ احسن الظفر صاحب نے جلد ہی اپنے عزائم کا رُخ موڑ دیا۔ میونسپل کارپوریشن یا اسمبلی یہی ان کا مطمح نظر بن گئے۔ دوسرا اور تیسرا انتخاب بھی جیتا اور ڈپٹی میئر اور میئر بن کر گویا انہوں نے اپنی تقدیر سازی کا کام مکمل کر لیا قلم قلمدان میں رکھا، پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے اور لیٹے لیٹے مر گئے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی تھا

غلام سرور صاحب نے ابتدا میں کام جاری رکھا۔ مسلمانوں کے جذبات میں پھر روح پھونکی۔ گرجتے رہے، اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ شیرِ بہار بن کر کرشن لبھ سہائے کی سخت اور درشت حکومت سے ٹکرا گئے۔ Bullet کا جواب Ballot سے دیا Bullet کا منہ پھیر کر Ballot کو آگے بڑھا دیا۔ حکومت اُلٹ دی اور نئی حکومت مہا مایا پرشاد اور جسٹس خلیل صاحب وغیرہ کو سپرد کر کے خود داماں بچا کر آگے بڑھ گئے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور چند سال بعد ستاروں سے آگے جو نئی حکومت بدلی اور کرپوری ٹھاکر کو گدی نشیں کر کے پھر آگے سفر کو روانہ ہو گئے :

ایک چُلّو بھی نہ اپنے لئے باقی رکھا
اوروں کو بانٹ دے ساغر و مینا بھر کے

اب ذرا عشق کے امتحان شروع ہو گئے۔ ذرا ٹھونک بجا شروع ہو گئی۔ آخر تو شب آفریدی

www.taemeernews.com

چراغ آفریدم" کا مقام ہے۔ انٹرنس تو پاس کرنا ہی ہوگا۔ اس ٹھونک بجا میں کچھ قید و بند کے مقامات بھی آئے۔ ایک دن میں شاید گیا کی ٹرین پر بیٹھا تھا۔ گاڑی روانہ ہونے میں دیر تھی۔ یک بیک دیکھا کہ سامنے چند پولس افسران کے درمیان غلام سرور صاحب پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ میں حالات سن چکا تھا انہیں گرفتار کر کے مختلف مقامات پر نظر بند کیا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی میں شوق اور محبت سے بے قابو ہو گیا اور بے اختیار ٹرین سے اتر کر جوش میں اپنا یہ پرانا شعر پڑھتا ہوا تیزی سے ان کی طرف لپکا کہ بغلگیر ہو جاؤں :

گذر کے منزلِ دار و رسن سے دیکھ لیا
یہ کام سہل ہے ہمت اگر کیا چاہے

اُن کے قریب آتے ہوئے دوسرا مصرع شاید مکمل بھی نہ کر سکا تھا کہ پولس افسر نے ہاتھ سے مجھے روک دیا۔ اور غلام سرور صاحب جو بالکل خاموش تھے زور سے ہنس پڑے۔ صرف ہنس پڑے کچھ بولے نہیں کیوں کہ مقام زباں بندی تھا۔ مگر ہنستا ہوا چہرہ گویا یہ کہہ گیا کہ کلیم عاجز صاحب، کہاں شعر پڑھ رہے ہو؟ بھینس کے آگے بین بجا رہے ہو؟ پھر جے پرکاش نرائن کے نمایاں ہونے کا دور آیا۔ یہ دور اندرا گاندھی کے بعض اعمال و اقوال اور احوال کے خلاف ردعمل تھا۔ گرچہ یہ خالص سیاست تھی جو ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ کچھ گریں گے، کچھ اُٹھیں گے۔ کچھ سنبھلیں گے کچھ سنبھالے جائیں گے۔ ہندوستانی سیاست میں آزادی کے بعد کوئی اجتماعی منزل مقصود نہ رہی۔ آزادی سے پہلے ایک نہایت اہم اور نہایت اعلیٰ اور ارفع مقصد تھا جس نے پورے ہندوستان کو ایک لڑی میں گوندھے ہوئے دانے بنا دیا تھا۔ وہ گنتی میں الگ تھے مگر رشتے میں ایک تھے۔ وہ مقصد کے ہاتھ کی تسبیح تھے، سارے دانے ایک ہی جیب میں رہتے تھے۔ اور ایک ہی ہاتھ کی انگلیاں انہیں شمار کرتی تھیں۔ اس ہم آہنگی اور مقصد کے ساتھ سب کی وابستگی نے وہ کارنمایاں کیا جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ مگر آزادی کے بعد معاً وہ مقصد پس پشت کیا اور آہستہ آہستہ وہ معدوم ہی ہو گیا۔ اس وقت کوئی جماعت کیا کسی جماعت میں کوئی ایک فرد بھی شاید مقصد کی وہ گرمی نہیں

www.taemeernews.com

رکھتا جو آزادی سے پہلے فرد فرد میں تھی اس کی ایک نہایت نمایاں مثال میں نے اسی کتاب میں کہیں لکھی ہے کہ ۱۹۴۲ء میں بی۔ ان کالج کے لڑکے "ہندوستان چھوڑو" کے نعرے کے ساتھ بار بار کلاس سے باہر چلے آتے تھے اور مسٹر معین الحق مرحوم پرنسپل بی۔ ان۔ کالج کو اپنی وابستگی اور اثرات استعمال کرنے پڑتے تھے کہ لڑکے قابو میں رہیں بے مہار نہ ہونے پائیں اور معین الحق صاحب کی شخصیت اِس میں نمایاں ہی نہیں حیرت انگیز کامیابی حاصل کرلیتی تھی۔ جو کام طاقت نہیں کرتی پولس کی پوری فورس نہیں کرپاتی وہ معین الحق صاحب مرحوم کا ایک اشارہ کرجاتا تھا۔ تو اسی ایجی ٹیشن کے دوران انگریزی عہد کا ایک نہایت جابر انسپکٹر پولس جو سڑک سے گذر جاتا تو شہر والے مرعوب ہوجاتے۔ ایک دن بی۔ ان کالج کے گیٹ پر چند نعرہ بلند کرتے ہوئے طالب العلموں کو خاموش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ غصہ سے تیز سانسوں کے ساتھ اقتدار کی علامت اپنے ہاتھ کے چھوٹے سے ڈنڈے کو بار بار اٹھا کر لڑکوں کو خاموش کرنے کی کوشش کررہا تھا اور اسی گروہ کا ایک لڑکا انسپکٹر صاحب کے بالکل منہ سے منہ ملائے آنکھوں سے آنکھیں لڑائے سانسوں سے سانسیں ٹکراتا ہوا کہہ رہا تھا کہ "ہندوستان چھوڑدو انقلاب زندہ باد! ڈنڈا پھینک دو انقلاب زندہ باد! نوکری چھوڑدو انقلاب زندہ باد۔ وردی اُتاردو انقلاب زندہ باد!" وہ لڑکا غالباً عبدالقدوس تھا۔ اور دو تین منٹ بعد دیکھا کہ واقعی انسپکٹر صاحب کا ڈنڈے والا ہاتھ نیچے آگیا، سر جھک گیا۔ اور کچھ دنوں بعد واقعی انہوں نے نوکری چھوڑدی وردی اُتاردی۔ یہ ہے مقصد کے ساتھ تعلق اور ہم آہنگی کی مثال۔ اُس طرح کے کتنے افیسر اور اہل اقتدار واقعی وردی اُتار کر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ پورا ملک آزاد ہوگیا پورا ہندوستان اپنا ہوگیا۔ اور آج مقصد کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ایک گھر بھی اپنا نہیں۔ جوش نے بہت خوب کہا:

دشمن گئے تو دوست بنے دشمنِ وطن
خلعت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن
کھدر پہن پہن کے بداطوار آگئے ؛ یعنی سفید پوش سیہ کار آگئے

www.taemeernews.com

یہ بات پہلی جشن آزادی کے دو تین ہی سال بعد کہی گئی تھی۔ اب پینتالیس سال بعد بات کہاں سے کہاں پہونچی ہوگی ؟ تو جے پرکاش نرائن نے رنگ بدل کر دوسری بساط سیاست بچھائی۔ یہ بساط کھیل کو صحیح رُخ اور رنگ دینے کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ صرف کھلاڑیوں کو اپنے قریب کرنے کے لئے تھا۔ سو وہ ہو گئے۔ ایمرجنسی آئی۔ کھلاڑیوں سے مکرائی پرانی بساط اُلٹ گئی نئی بساط بچھی لیکن کھلاڑی کھیل بھول چکے تھے، مقصد بھول چکے تھے صرف اپنی گوٹی بٹھانا سیکھ گئے تھے۔ گوٹی بھی ٹھیک نہیں بیٹھی پھر یہ بساط بھی اُلٹ گئی۔ اب یہی ہے کہ ہر کچھ کچھ دن بعد نئی بساط بچھتی ہے۔ بنا نغمہ آتا ہے لیکن

دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

دل ہندوستان کو کہاں چاہتا ہے۔ دل تو بس اپنی کرسی چاہتا ہے۔ اس لئے نہ نغموں میں اثر ہے نہ باتوں میں۔

تو ایمرجنسی کے دوران غلام سرور صاحب پر ایسی مایوسی ایسی مردنی تھی کہ وہ گھر سے بھی کم نکلتے تھے اور مجھے بے حد افسوس تھا اللہ اس شخص کو یہ کیا ہو گیا۔ میں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا انہیں بشارتیں دیتا، پُر اُمید بناتا۔

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

مجھے ملنے کی فرصت بھی کم۔ درد دل مہلت دے تو درد سر میں گرفتار۔ رونے سے فرصت ملے تو آوارہ گردی پر تیار اسی میں برس چھ ماہ بعد غلام سرور صاحب سے مل لیتا تھا۔ اور انہیں تازہ کرنے کی کوشش کرتا۔ کہ ایمرجنسی دور ہوئی۔ جنتا پارٹی اٹھی، اسی کے ساتھ غلام سرور صاحب بھی اُٹھے۔ لیکن شیر شکار کی وہ صفت فراموش کر چکا تھا گرچہ دم خم باقی تھا۔ گاما نے لنگوٹ کھول دیا تھا مگر کشتی کا فن نہیں چھوڑا تھا۔ جنتا پارٹی کی حکومت بنی اور غلام سرور صاحب بھی وزیر تعلیم بن گئے۔ دیوانہ صحرا سے لوٹ کر گھر آگیا۔ شاہین نے چٹان سے اڑ کر قصر سلطانی کے گنبد پر بسیرا کر لیا۔

www.taemeernews.com

وہ سونی جو تھا خدمتِ خلق میں مرد
مروت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

مقامات نے اس مردِ سالک کو گم کر دیا۔ میں ایک بار جمشید پور گیا ہوا تھا۔ وہاں غلام سرور صاحب کسی نیم سرکاری دعوت پر گئے۔ جن کے یہاں مدعو تھے وہ میرے بھی دوست تھے۔ وزیرِ تعلیم بننے کے بعد یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اتنا جھک کر سلام کیا جیسے میرے مرید ہوں۔ ہم دونوں نے معانقہ کیا۔ ان کے دل میں میری محبت اور قدر تو اب بھی ہے لیکن وہ دھوپ تو آفتاب کے ساتھ گئی۔ اب شیخ کی داڑھی سن کی سی ہو گئی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ شاید اسی وجہ سے وہ گرم جوشی نہیں۔ بہر کیف دعوت میں ملاقات رہی بات رہی۔ میں نے غلام سرور کو آزمانا چاہا۔ میرا ایک کام تھا۔ اور وہ کام بھی سن لیجئے۔ بات دراز ہو رہی ہو تو ہو۔

میرے کھونے پانے کی داستان تو بہت کچھ آپ کو معلوم ہے۔ میں نے اس سرزمین کو کیا نہیں دیا۔ کیا کیا نہیں دیا بلکہ یہ کہو اور یہ پوچھو کیا کیا رکھا۔ حضرت ابوبکرؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ تبوک کے موقع پر یہ نہیں پوچھا کہ تم کیا لائے۔ اس لئے کہ یہ حضرت صدیق کی توہین تھی وہ جانتے تھے کہ کیا نہ لائے ہوں گے۔ حضورؐ تو دنیا کو حضرت صدیقؓ کا وہ معیارِ شرافت دکھانا چاہتے تھے جو خدا کی طرف سے انہیں عطا ہوا تھا۔ وہ راز کی بات جو خدا جانتا تھا اور خدا کا رسول سمجھتا تھا۔ اس لئے آپ نے سوال کیا کہ صدیقؓ تم گھر میں کیا چھوڑ آئے؟ اور جواب میں تفصیل سے قطع نظر کر کے اقبال کا صرف یہ شعر سن لیجئے:

پروانے کو چراغ تو بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے خدا اور رسول بس

اس لئے مجھ سے بھی یہ نہ پوچھو کہ اس سرزمین کو تم نے کیا کیا دیا۔ بلکہ یہ پوچھو کہ کیا بچا رکھا۔

www.taemeernews.com

سو بس ایک جانِ ناتواں!

کوئی مجھ سے کاہے خلاف ہے کہ حساب اپنا تو صاف ہے
جو ہم اس گلی میں کمائے تھے سب اسی گلی میں لٹا گئے

سب کچھ جلنے کے بعد سب کچھ لٹنے پٹنے کے بعد، چند دیواریں و دروازے بچ گئے تھے۔ اس مقام مقدس کے جہاں آٹھ سو پاک و مقدس روحیں اللہ سے انصاف طلب ہیں انتظار میں ہیں اس دن کے جب وہ سروں سے گرد آنکھوں سے آنسو، سینوں سے لہو پونچھتے ہوئے آئیں گے:

دل کو تھامے ہوئے فریاد بلب ہے کوئی
دادِ حشر سے انصاف طلب ہے کوئی

تو اس مقام مقدس کے متعلق یعنی تیلہاڑہ کے متعلق میں نے آج سے پینتیس ۳۵ سال قبل ایک نظم لکھی تھی۔ میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ وہ نظم خدا نے مجھ سے لکھوائی تھی۔ کوئی نہیں لکھ سکتا ہے۔ اس کے آخری اشعار یہ ہیں:

وہ بساط گل و لالہ وہ بیاضِ گلشن
اب جسے دفترِ اوراقِ پریشاں کہیئے
رنگ، بو کا وہ مکاں و در و دیوار چمن
مدتوں سے جنہیں محرومِ چراغاں کہیئے
آہ وہ سیر گہہ سرو قدانِ گلشن
اب جسے خواب گہہ خار مغیلاں کہیئے
وہ شجر ہائے خمیدہ لب جو و سرِ چاہ
اب جنہیں ماتمی گنج شہیداں کہیئے

انہیں پڑھیئے۔ انہیں کوئی سمجھا نہیں سکتا۔ میں سمجھا سکتا ہوں لیکن مجھ میں دم نہیں سمجھاؤنگا تو لکھنا محال ہو جائے گا۔ آپ بہت تو الفاظ کے معانی سمجھ جائیں گے۔ لیکن الفاظ کے

www.taemeernews.com

چلمن میں جو حقیقتیں ہیں جو مناظر ہیں وہ صرف میں جانتا ہوں میں ہی دکھا سکتا ہوں لاکھوں خرچ کردگے تب بھی کوئی نہیں دکھا سکتا۔

مجھ سے پوچھو میں اسی موسم میں دیوانہ بنا

تو اس بیاض گلشن میں ایک کنج میرا جھونپڑا بھی تھا۔ جس کے آنگن میں برسات آتی تھی اور دس دس دن کی مسلسل جھڑی لگتی تھی تو بچیاں بچے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر ہاتھ پاؤں بناتے تھے اس پر کپڑا لپیٹ کر سر پر پگڑی باندھ دیتے تھے۔ پیٹھ سے چھوٹی سی گٹھری لٹکا دیتے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہوتی۔ "بچارے مسافر سفر کر رہے ہیں۔ اللہ میاں جھڑی بند کردو ان کی لاٹھی ٹوٹ جائے گی۔ پیٹھ پر گٹھری میں دال چاول بھیگ جائیں گے آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اللہ میاں مسافر کھچڑی کیسے پکائیں گے لاٹھی سڑ جائے گی، اللہ میاں سہارا کس پر لیں گے۔ اللہ میاں جھڑی بند کردو۔" یہ نثر اور یہ وضاحت نہیں بس سارے ٹکڑے پُر معانی دیہاتی جملے ہوتے جنہیں ملکے دھن میں نرم ترنم سے بچے بچیاں گاتیں۔ اور جب گرمی کے موسم آتے تو لڑکے چکوا چکیا کھیلتے۔ برسات کو بلاتے اور شادیاں ہوتیں تو معصوم بچیاں آنگن میں جھومر گاتیں۔ محرم آتا تو سبز کپڑے، سبز باجے۔ گلے میں کلابتو لگے ہوئے بڑے لٹکاتے جس میں دھنیا اخروٹ مغز چنار بن کشمش کا مجموعہ "بُن دھنیا" ہوتا۔ مرثیے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے گاتے اور بُن دھنیا کھاتے۔ اور سائبان میں چٹائی بچھا کر قرآن شریف تلاوت کرتے اور امام صاحب کو بخشتے۔ جس کے سائبان میں کھانے سے فارغ ہو کر بچے بچیاں بوڑھی جواں چٹائی پر کپڑے پھیلا کر سوزنیاں تیار کرتیں۔ یہ سوزنیاں آج کل کی بہترین اور قیمتی دریوں سے زیادہ قیمتی حسین دیرپا اور عافیت دہ ہوتی ہیں شام کو کمروں کے دروازوں پر سائبان کی اولتیوں پر صاف اور منجھی ہوئی لالٹینوں کی روشنیوں سے چراغاں ہو جاتا۔ لفظ اولتی پر یاد آیا۔ 'زبان و ادب' کی کسی پچھلی اشاعت میں میرا مضمون قرۃ العین حیدر کے فن پر 'دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ' شائع ہوا۔ کسی اہل محبت نے مضمون پسند کرتے ہوئے دو ایک فرد گذاشتوں کی نشان دہی کی۔ ایک کتابت کی غلطی،

www.taemeernews.com

ایک فارسی کے شعر کے مصرع میں تبدیلی کی نشان دہی کی۔ یہ ذرا لمبی بات ہے اسے نہ چھیڑوں گا۔ تیسری نشان دہی یہ تھی کہ لغت میں لفظ "ہرسنگار" ہے۔ تم نے "سنگرہار" لکھا ہے۔ انہوں نے نہ اپنا نام لکھا نہ پتہ لکھا جواب کیا دوں۔ اگر رسالے میں یہ خط چھپا تو جواب دے دوں گا۔ وہ ایک لفظ کی لغت لئے بیٹھے ہیں یہاں میری نثر و نظم میں کتنے الفاظ خلاف لغت ہیں۔ میں نے جن کے حوالے سے یا جن کی باتیں کی ہیں ان کی زبان خود میرے لئے لغت سے زیادہ اہم ہے۔ اُس سند کے آگے ہر لغت گرد و غبار ہے۔

وہ گاؤں کی بولی کہ جس پر فدا
ترنم تغزل کی رعنائیاں

جس زمانے کی بات، یا جن کی بات، میں نے بطور حوالہ اس مضمون میں لکھی ہے وہاں سنگرہار ہی بولا جاتا تھا اِس لفظ کے حسن اس کی معنویت اور اس کی موسیقیت کو لغت کا لفظ "ہرسنگار" قیامت تک نہ پا سکے گا۔

تو میرے گھر کا حصہ جل لٹ کر جو بچا اس حصہ میں پولس چوکی قائم ہو گئی۔ اور میں ہر سال اُن در و دیوار سائبان اور صحن کوٹھری اور دالان کو دیکھنے جاتا ہوں جن کی دیواروں میں ان کی پیاری بولیاں، اُن کے گیت اُن کے جھومر، اُن کی تلاوت کے کلمے، ان کی آوازیں سمائی ہوئی ہیں۔ میں ہر سال جا کر ان آوازوں کو، سرگوشیوں کو گیتوں کو تلاوت کی آوازوں کو اپنے دل کے کانوں سے سنتا ہوں اُن کے صحن اور سائبان میں اُن کی روحانی قبریں ہیں جن پر اپنی آہوں کی ہواؤں سے جاروب کشی کرتا ہوں، آنسوؤں کی چادر چڑھاتا ہوں۔ ان در و دیوار اور بچے ہوئے صحن و بام کے پس پردہ میری وہ دنیا چھپی ہوئی ہے جو آج سے پچاس سال قبل ہری بھری پھولی پھلی آباد تھی" بعض اہل شہر ستمگراں" نے پوری بستی کے شہیدوں کے مکانوں کو مفت اور سستے داموں خرید کر کھیت بنا لیا۔ لہو سے سینچی ہوئی زمین سے خون آلودہ فصل کھا کھا کر وہ موٹے تازے ہو گئے۔ میرے مکان پر بھی نگاہ تھی۔ وہ اب اس بات کے کوشاں تھے، پولس چوکی اس مکان سے منتقل ہو جائے تو مکان پر قبضہ ہو۔ کچھ قیمت ادا کر کے

www.taemeernews.com

ایک بیگہ زمین پر بہترین فصل اگائی جائے۔ میں اس کوشش میں بے قرار کہ یہ دروازہ باقی رہے تاکہ میں سال میں دو ایک بار اس کے اندر کے "فردوس بر روئے زمین" کی طرف جھانک لوں۔ جھولے پر جھولنے والیوں سے کچھ باتیں کروں کچھ سرگوشیاں ہو جائیں کچھ شکوہ شکایت ہو جائے کچھ وعدے ہو جائیں کچھ عہد و پیماں کچھ سلام کلام کر کے چلا آؤں اور پھر شروع کر دوں

نہ پوچھو دوستو احوال دل کے
تمہارا دل بھی رہ جائے گا ہل کے
طبیعت اپنی۔ قابو میں نہیں ہے
ابھی ہم آئے ہیں عاجز سے مل کے
کچھ ایسا ریزہ ریزہ ہو گیا ہے
قبا جیسے اُدھڑ جاتی ہے سِل کے
وہ عالم اس کا دیکھا ہے کہ اب تک
ٹھکانے میں نہیں ہیں ہوش دل کے

وہ اس کوشش میں کہ اس کا سر چشمۂ حیات کاٹ دو میں اس دیوانگی میں کہ جان لے لو سرمایۂ جان چھوڑ دو۔ قریب بیس سال اس میں گذرے۔ کبھی علی عباس صاحب مرحوم ڈی آئی جی پولس سپر بن گئے کبھی قمر الزماں صاحب رضوی سابق آئی جی پولس سینہ سپر ہو گئے۔ کبھی مسٹر فہیم الدین ایڈیشنل چیف سکریٹری بچاؤ کو آ گئے۔ یہ سب معاونت عارضی اور ہنگامی تھی۔ میں چاہتا تھا سرکار اس زمین کو مفت مجھ سے لے لے یا برائے نام روپئے دو روپئے ماہوار کرائے پر ہی رہ جائے۔ مری حیات گذر جائے پھر شہدا اپنی حفاظت آپ کر لیں گے۔ مگر ایسی کوئی صورت نہ نکلی۔ عبد الغفور صاحب وزیر اعلیٰ ہوئے میں اُن سے دو بار ملا۔ وہ بولے میں ابھی آڈر دیتا ہوں۔ مگر وہ آڈر نہ دے سکے اور خود ان کے استعفا کا آرڈر آ گیا۔ جگن ناتھ مصرا نے جھوٹ وعدہ کیا اور وہ بھی نکال دیے گئے کہ جمشید پور میں غلام سرور صاحب وزیر تعلیم بہار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دسترخوان پر کہا کہ بحیثیت وزیر بہار میں آپ کو ایک زحمت دینا چاہتا

www.taemeernews.com

ہوں۔ بولے کل پٹنہ واپس ہو رہا ہوں پرسوں گاڑی بھیجدیتا ہوں آجاؤ وہیں باتیں کرلیں گے۔ گاڑی آئی میں گیا باتیں کہیں اسی وقت فائل منگوانے کا حکم دیا کہا میں کرپوری جی سے یہ کام بہ آسانی کروادوں گا۔ کچھ دنوں بعد گاڑی آئی کہ آجاؤ کرپوری ٹھاکر جی بھی آرہے ہیں، کھانے پر بات ہوجائے گی کام ہوجائے گا۔ کھانا بھی ہوا کچھ غزل خوانی بھی ہوئی باتیں بھی ہوئیں۔ "بھلا آپ کا کام اور نہو۔ تو کس کا کام ہوگا نشچنت بیٹھئے"۔ وقت گذرتا گیا۔ ایک دن راستے میں خورشید عارفی سے ملاقات ہوئی بولے "ابھی غلام سرور صاحب کے یہاں سے آرہا ہوں ٹھاکر جی کہہ رہے تھے کہ ان کا یہ کام تو کوئی کام ہی نہیں ہے میں تو اس فکر میں ہوں کہ کلیم عاجز صاحب کے لئے میں اور کیا کروں"۔ اور چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ مکان خالی کردینے ہی کا آڈر ہوگیا اور پولس چوکی اس مکان سے ہٹ گئی۔ مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کے لئے اسکیم بناکر دس کروڑ روپے اچھال کر واہ واہ سبحان اللہ حاصل کرنے والا غلام سرور ایک دھیمی آواز سے دھڑکتے ہوئے دل کی حفاظت پر قابو نہ پاسکا۔ سینکڑوں مدرسے اور درس گاہیں کھلوادینے والا چند شکستہ در و دیوار کو محفوظ رکھنے سے معذور ہوگیا۔ یہ اس لئے کہ دس کروڑ مسلمانوں کی جیب میں جائے گا اور ارب ہا ارب اور کھرب ہا کھرب کا ایمان سرکاری خزانے میں جمع ہوگا لیکن چند شکستہ در و دیوار کو باقی رکھا گیا تو ہزار ہا دلوں میں محبت اور انسانیت کا پیغام پہونچ جائے گا۔ ہمیں انسان کی ضرورت نہیں ہے ہم تو حیوان چاہتے ہیں جن پر زین کس کر ہم سوار ہوسکیں اور جدھر چاہیں ان کی نکیل گھماتے چلیں۔

حکومت معذور ہوگی۔ شیطان کی اسکیم چل گئی۔ لیکن خدا معذور نہیں اور اس کی اسکیم بے آواز بنتی ہے۔ اِدھر مکان خالی ہوا۔ اور اُدھر مری بستی کے جو اسکا ایک خوش پوش آگیا اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

سرکار ہمیں آپ کے مکان چاہیں۔ ہم اسی مکان میں رہیں وہ مکان تہرے رہنے سرکار جب چاہیں آئیں۔ رہیں ہم ہوں رہیں سرکار اور تو ں ہوں"۔

(سرکار ہمیں آپ کا مکان چاہئے۔ ہم اسی مکان میں رہیں گے اس کی شکل نہیں بدلیں گے

www.taemeernews.com

آپ جب چاہیں آئیں رہیں بیٹھیں ہم بھی رہیں گے آپ بھی رہیے گا)

اور میں جس مکان کو محفوظ رکھنے کے لئے بیس بائیس سال سرکار کی خوشامد کرتا رہا اور مفت دینے پر احسان مندی کے ساتھ آمادہ تھا وہ ٹوٹا پھوٹا مکان ساڑھے بتیس ہزار =/32500 روپے میں ایک شخص نے خرید لیا اور اسی حال میں اب تک قائم رکھا ہے۔ میں جاتا ہوں تو میرے لئے چوکی نکالتا ہے' دری بچھالتا ہے' گاؤ تکیہ لاتا ہے' کرسی لاتا ہے کوئیں کا ٹھنڈا پانی' بتاشے کا شربت پیش کرتا ہے۔ عیدگاہ کی سرزمین کی حفاظت کرتا ہے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اس کا نام بدری نارائن گپتا ہے۔ میرا مکان خالی ہوا اور کریوپی ٹھاکر کی کرسی خالی ہوگئی۔ بڑے جھونکے اور بڑے زور شور سے آندھی طوفان کی طرح آنے والا انقلاب دو سال کے اندر ہی تلا بازی کھا گیا۔ طوفان والے تنکے والے بن گئے' اور تنکے والے پھر طوفان والے بن گئے دھرتی پھر الٹی اور دیکھا کہ تخت بچھا ہے اور قسالۂ عالم پھر جھوستی تقریر کی بل کھاتی تشریف لا رہی ہیں:

پھر آ رہے ہیں وہ فضا گرمائی جائے گی — پھر زلف کھولی جائے گی لہرائی جائے گی
ہو گی ہر اک طرف لب و عارض کی گفتگو — پھر اُن کے عاشقوں میں غزل گائی جائے گی
دیوانے لائے جائیں گے زنداں میں دھوم سے — زنجیر اہتمام سے پہنائی جائے گی
کیا کیا شراب خونِ جگر کا چلے گا دور — پی جائے گی کہیں کہیں چھلکائی جائے گی
ہر روز ایک زخم لگایا بھی جائے گا — روز اِک غزل بھی ہم سے کہلوائی جائے گی
اے شمع میرا درد سمجھ میں تب آئے گا — جب تو بھی انجمن سے نکلوائی جائے گی

جب دوست سن کے میری غزل جائیں گے کلیم
بجتی ہوئی خیالوں میں شہنائی جائے گی

غلام سرور صاحب پھر خلوت نشیں ہو گئے اور میں محفل محفل غزل گاتا رہا کسی نے پہچانا' کسی نے نہیں پہچانا۔ اب جو غلام سرور صاحب پھر باہر آئے ہیں تو کچھ اور ہی نظر آتے ہیں بال سفید ہو گئے ہیں۔ لاوا اگلتا ہوا آتش فشاں اب برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی بن گیا ہے۔

www.taemeernews.com

ایورسٹ کی، کنچن چنگا کی تصویر لیجئے، ڈرائنگ روم میں سجائیے۔

غلام سرور صاحب شیر بہار تھے کیونکہ وہ چھوٹے قد کے شیر اسلام تھے۔ اِس کی دہاڑ دُور دُور پہونچی تھی۔ اس کی ہیبت دوست دشمنوں دونوں کے دلوں میں تھی۔ وہ کسی مجمع میں چھوٹے یا بڑے، اپنوں کے یا پرائے کے گرجتے تھے اور ان کے دل کا درد اِن کی زبان سے نکل کر تیر و نشتر بن کر دلوں میں اُتر جاتا تھا۔ دوست تالیاں بجاتے تھے اور دشمن پیچ و تاب کھا جاتے تھے۔ شیر دلیر ہوتا ہے اور واقعی وہ دلیر تھے۔ اس لئے کہ وہ ایک نظریئے کے حامی اور داعی تھے۔ وہ نظریہ سچا پکا کھرا پاک صاف اور بے داغ تھا۔ اس نظریئے نے انہیں دیر اور دور تک چلایا اور پہونچایا اور پھر ان کے راستے میں ایک موڑ آیا۔ منزلِ عشق کے جو رہ رو ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ صراطِ مستقیم ہے۔ اس میں کوئی موڑ نہیں، موڑ دھوکا ہے اور شیطان کی دکان ہے صراطِ مستقیم کا رہ رو دائیں بائیں اور پیچھے نہیں دیکھتا وہ صرف آگے ہی دیکھتا ہے۔ غلام سرور صاحب سے بڑی سخت چوک ہوئی انہوں نے اس موڑ کی طرف دیکھ لیا اور پھر رُک گئے۔ اور بہت دنوں تک رُک گئے۔ بس رُکنا غضب ہو گیا۔ شیطان کی دکان پر نظر پڑ گئی اور پھر عظیم آباد پریس کھل گیا۔ اِن کے ذہن اور فکر کی جو اُڑان تھی اس کے پر پرواز تراش گئے۔ اور دھم سے گر کر ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ یہ مسجد جایا کرتے تھے اور ان کے چہرے پر وہی شادابی اور بھولا پن تھا جس سے انہوں نے سفر کی ابتدا کی تھی۔ میں ان سے ملتا رہا مگر یہ بھولا پن ان کے چہرے پر نظر نہ آیا۔ وہ عزائم کی بلندی اور یقین کی پختگی کا فیض ہوتا ہے۔ عزم اور یقین دونوں جاتا رہا تو وہ فیضان ختم ہو گیا میں انہیں سمجھاتا رہا۔ حوصلہ دلاتا رہا۔ تاریخ کی روشنی میں ان کے سمت اور رُخ کو متعین کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر مجھے زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ پھر جنتا راج آیا۔ یہ وزیر بن گئے۔ مگر نہ آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہوئی نہ بھولا پن لوٹ کر آیا نہ گفتگو میں بے ساختہ پن، گرم جوشی اور پہلی حرارت واپس آئی۔ پھر وہ دور بھی ختم ہوا۔ اور پھر ان کا چھریرا پن بھاری بھرکم پن کی طرف مراجعت کرنے لگا۔ بالوں میں جھوم جھوم کر پیشانی چوم چوم کر انہیں متحرک، مضطرب اور بے باک کرنے کی صفت ختم ہو گئی اور بال سر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، جسم کی طرح بال بھی بھاری بھرکم پن

www.taemeernews.com

کی طرف متوجہ ہوگئے اور اب شہر بہار شہرِ انسانیت بن گیا اور اس دور میں انسانیت کا مرکز اولیں اور معیار آخریں پیٹ ہے۔ انسانیت کی بہترین اور بلند ترین علامت پیٹ ہے۔ خدا نے دو جنت بنائی ہے ایک آسمان پر، ایک زمین پر۔ آسمان پر والی کا نام ہے جنت اور زمین والی جنت کا نام ہے انسان کا دل۔ جس طرح آسمان کی جنت کی خوشبوئیں رنگینیاں لذتیں فرحتیں راحتیں اور ان کی فراوانیاں نہ انسان کی سمجھ میں آسکتی ہیں نہ سمجھائی جاسکتی ہیں اسی طرح دو انگلی کے اس دل میں اچھائیوں خوبیوں خوبصورتیوں خوشبوؤں کے جو بے کنار سمندر بھرے ہیں اس کا ایک چلّو بھی کسی کو اب تک بھر پور نہیں مل سکا ہے۔ جس طرح جنت میں انسان جو چاہے گا مل جائے گا اسی طرح اس دل سے جو چاہا جائے اور جتنا چاہا جائے اور جتنے مل کر چاہیں ملتا رہے گا اور اس میں ایک بوند کی ایک ذرّے کی کمی نہیں ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح خدا نے دو جہنم بنائی ہے۔ ایک آسمان پر ایک زمین پر۔ زمین پر کے جہنم کا نام ہے پیٹ۔ اس دور میں انسانیت کے ہر دعویدار کا پیٹ اس کی حیثیت کے مطابق ہے۔ ایک مزدور کا پیٹ آپ روزانہ دیکھ سکتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر وہ نہاتی ہیں ایک پاؤ ستو ایک پیاز چند مرچ اور ذرا سا نمک اور ایک لوٹا پانی سے سیراب اور آسودہ ہوکر، گاندھی میدان کے گھاس پر گمچھا بچھا کر خراٹے مار کے جو سوئے گا تو آفتاب کی کرن اسے چھیڑتی رہے گی اور یہ کروٹ لے کر سوئے گا۔ اون! مت چھیڑ ابھی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ اور اٹھے گا تو سامنے نلکے میں جاکر فارغ ہوکر نل پر منہ ہاتھ دھوکر چنا اور پھڑی کھاکر رکشہ یا اپنا کدال یا اوزار اٹھائے گا اور بے نیازانہ چل پڑے گا۔ اس کا پیٹ اس کی ہوس نہ کرے گا کہ وہ رکشہ کیوں چلا رہا ہے پھاوڑا کیوں چلا رہا ہے۔ کرنی بسولا کیوں چلا رہا ہے موٹر پر سیر کیوں نہیں کر رہا ہے ہوٹل میں مرغ کیوں نہیں اڑا رہا ہے، صوفے پر بیٹھ کر شراب کیوں نہیں پی رہا ہے۔ وہ اس کی ہوس کبھی نہیں کرے گا کہ مری لنگی اس سے بڑھیا کیوں نہیں گھٹیا کیوں ہے۔ اس کی بنیائن صاف کیوں ہے میری میلی کیوں ہے۔ اس کی چپل چمڑے کی کیوں ہے میری پلاسٹک کی کیوں ہے یا میں ننگے پاؤں کیوں ہوں وہ چپل کیوں پہنے ہے۔ وہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر دو بول

www.taemeernews.com

گالی کے بولے گا اور اس کے ہونٹوں سے بیڑی چھین کر دو کش لگائے گا پھر اس کے ہونٹوں میں کھونس دے گا۔ لیکن انسانیت کا سب سے بڑا دعویدار جارج بش جس کا ملک اتنا بڑا ہے کہ ہندوستان جیسا چار پانچ ملک اس کے پیٹ میں سما جائے اور اتنا مال ہے کہ اس ملک کا معمولی دیوار جوڑنے والا مزدور بھی موٹر پر چلتا ہے اور دو چار سو ڈالر کا سوٹ بنا کر سال دو سال پہن کر دوسرے ملکوں میں پہننے کے لئے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ انسانیت کا علمبردار اپنے یہاں سے ہزار ہزار میل دور رہنے والے کو بھی یہ اطمینان دلانے کا متحمل نہیں ہے کہ وہ اس کی زد سے محفوظ ہے۔ کسی کی خوش حالی سے وہ مطمئن نہیں اور کسی کی طاقت سے وہ خوش گماں نہیں وہ دنیا کی تمام خوشحالیاں اپنے لئے چاہتا ہے۔ وہ اپنا پیٹ کبھی محفوظ نہیں سمجھتا اور سب کا پیٹ کاٹ کر اپنا پیٹ بھرنے کو تمام عمر منصوبے بناتا ہے اور چھیننے کی تمام اسکیمیں تیار کرتا ہے۔ چاہے وہ رُلا کر چھینے یا ہنسا کر چھینے تکلیف سے چھینے یا بے تکلفی سے دوست بنا کر چھینے یا دشمن بنا کر اندھیرے میں چھین لے یا دن دہاڑے چھین لے بے وقوف بنا کر چھین لے احسان جتا کر چھین لے۔ چھیننے کی اسکیمیں اس کے پاس ہزارہا ہیں۔ جتنے بڑے لوگ ہیں اتنا ہی ان کا بڑا پیٹ ہے۔ اس پیٹ میں علاقے کا علاقہ چلا جائے ملک کا ملک چلا جائے۔ یہ پیٹ نہیں بھر سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس کا مفہوم ہے کہ آدمی کا پیٹ جہنم کی مٹی اور آگ ہی بھر سکتی ہے اور کوئی نہیں بھر سکتا۔ تو اسی انسانیت کا نعرہ اب غلام سرور لگاتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ خود ان کا نعرہ ہے بلکہ اس لئے کہ یہی نعرہ لگانے والوں کے ساتھ وہ اپنا بچاؤ سمجھتے ہیں۔

وہ صوفی جو تھا خدمت حق میں مرد
مروت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

www.taemeernews.com

خیر تو جناب ام۔ اے کا دور بہت اچھا گذرا۔ امتحان کی تیاریاں خوب زور شور سے ساتھیوں نے کرنی شروع کی۔ میرے ساتھیوں میں مظفر اقبال اور مرتاض الدین بہت اچھے ذہین اور محنتی طالب العلم تھے۔ بالخصوص مظفر اقبال صاحب کے پاس کتابوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے رہتے نصاب کی کتابوں کے ساتھ حوالوں کی ضخیم کتابیں ہر وقت موجود رہتیں۔ میں ذہین تو تھا مگر محنتی بالکل نہ تھا اور اب تک نہیں ہوں۔ میں نصاب کی کتابوں پر بھی کم ہی دھیان دیتا تھا۔ لکھنے کا شوق تھا ایک سوال لیتا اور اس پر لکھ ڈالتا اور حافظہ اتنا اچھا تھا کہ ایک بار پڑھ کر یا لکھ کر دوبارہ پڑھنے یا لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی اور میٹرک سے بی۔ اے آنرس تک یہی نظر آیا کہ امتحان کے ٹیبل پر سوال کا پرچہ آیا اٹھایا پہلا سوال دیکھا اور لکھنا شروع کیا۔ اسے لکھا پھر دوسرا سوال دیکھا اور لکھنا شروع کیا۔ پانچ یا چھ جتنے سوالات کے جوابات لکھنے کی ضرورت ہوئی لکھ کر چلا آیا۔ دیر میں گھنٹی بجتی اور امتحان ختم ہوتا۔ ام۔ اے اردو کا پہلا پرچہ اردوئے قدیم کا ہوتا تھا یعنی دبستان دکن۔ اس میں سب رس۔ قطب مشتری۔ ملا دکنی فائز دہلوی' اردو کی نشو و نما میں صوفیا کا حصہ' امیر خسرو وغیرہ اور کتابیں تھیں۔ اس پرچے میں۔ سب رس اور قطب مشتری دونوں کتابوں سے کم از کم چار اقتباسات ضرور ہوتے تھے جنہیں حل کرنا لازمی ہوتا تھا۔ بقیہ سوالات میں گنجائش تھی یہ نہ لکھ کر وہ لکھ سکتے ہو اور یہ وہ میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں تھیں۔ دکن میں اردو اور گجرات میں اردو اور پنجاب میں اردو اور اردو شہ پارے اور دوسری بڑی بڑی کتابیں کہ مجھے دیکھ کر ہی لرزہ آتا تھا۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ سب رس اور قطب مشتری کو ایسا بالاستیعاب پڑھ ڈالو کہ وہ چار اقتباسات جو آجاتے ہیں وہ کہیں سے کسی صفحے سے آجائیں ان کی شرح کر دو' باقی دو ایک سوالات اور کوئی لکھ دے جائیں گے۔ میں نے یہی کیا اور دونوں کتابیں ایسی پڑھ ڈالیں کہ اہم اقتباس کی شرح اور معانی میرے

www.taemeernews.com

حافظے میں آگئے۔ بقیہ دو چار کتابیں سرسری پڑھ لیں۔

امتحان کے پہلے دن میرا ٹیبل سب سے آگے تھا اس کے بعد دوسرا رول نمبر خالد رشید صبا کا تھا۔ اور اسی طرح دوسرے ساتھیوں کا۔ گھنٹی بجی اور سوال کا پرچہ ٹیبل پر رکھ دیا گیا۔ میں نے فوراً اُٹھایا اور قلم ہاتھ میں لیا۔ کاپی سامنے تھی کہ پہلا سوال پڑھ کر لکھنا شروع کروں۔ اب جو پہلا سوال پڑھتا ہوں دوسرا سوال پڑھتا ہوں تیسرا چوتھا پانچواں دسواں سوال پڑھ گیا۔ کوئی سوال پڑھا ہوا نہیں۔ سب رس اور قطب مشتری کا نام تک نہیں نہ کوئی اقتباس نہ کوئی عبارت۔ تمام سوالات عام کتابوں میں سے تھے جنہیں میں نے پڑھا ہی نہ تھا۔ وہ طالب العلمی کے دور کا پہلا دن تھا کہ مجھے ہاتھ میں سوالات کا پرچہ لئے بیس پچیس منٹ گذر گئے۔ میں تو پرچہ لیتے ہی جواب لکھنے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے گذر گیا۔ اور میں بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر میں نے پرچہ رکھا الگ۔ اور اپنے اعتماد اور اپنی اب تک کی صلاحیتوں کے خزانے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا اور میں اندر داخل ہوگیا اور چننا شروع کیا۔ ولی کے فائز کے خسرو کے جو جو اشعار یاد تھے بس اشعار لکھنا شروع کیا اور اس سلسلہ میں باتیں اور مضمون آرائی۔ دکن کی خصوصیات کا سوال آیا جو دل نے بتایا لکھ دیا۔ پرچہ حسب دستور ختم کیا۔ اور ہال سے گھنٹی بجنے سے پہلے ہی نکل کر سیدھا اختر اورینوی صاحب کے بنگلے پر آیا اور سوال کا پرچہ پٹک کر کہا سر یہ کیا تماشہ ہے یہ کیا سوالات ہیں؟

انہوں نے دیکھا کہا کیا تم نے یہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں؟ میں نے کہا سر کیا میرا دماغ اتنا خالی ہے کہ یہ سب ڈھیر اُس میں داخل کروں وہ مسکرائے اور بولے مجھے بھی اُمید نہیں تھی کہ ایسے سوالات آئیں گے۔ یہ پرچہ رشید احمد صدیقی صاحب کا ہے ان کا حال ہی یہی ہے وہ ایسے ہی سوالات کرتے ہیں اور صلاحیت کا امتحان لیتے ہیں مطالعہ کا نہیں۔ اب کیا کیا جائے۔ اس میں استعداد اور ذوق کا امتحان ہوگا۔ کتابوں کے مطالعے کا نہیں۔ چنانچہ جناب اور پرچے گذرے امتحان ختم ہوا اور نتیجہ نکلا تو اول پرچے میں صرف مجھے فرسٹ کلاس آیا اور تمام ساتھیوں کو سکنڈ کلاس اور حسب سابق ایم اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ اور طلائی تمغہ۔

مجھے انٹر کرنے کے لئے سرکاری وظیفہ ملا۔ پڑھائی موخر ہوگئی، وظیفہ نہیں لے سکا۔

www.taemeernews.com

بارہ سال وقفہ کے بعد انٹر کیا تو بی۔اے میں وظیفہ ملا۔ ام اے میں یونیورسٹی اسکالرشپ ملی۔ ام اے سے فارغ ہوا تو ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب چند سال قبل ڈی لٹ کر چکے تھے اور ان کا موضوع تھا "بہار میں اردو ادب کا ارتقا، ۱۸۵۷ء تک"۔ میں نے کامیابی سے ام اے کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ تم بہار میں اردو ادب اور اردو شاعری ۱۹۵۷ء کے بعد پر پی ایچ ڈی کر ڈالو۔ اور تم کو مرکزی حکومت ہند کی وزارت تعلیم سے سرکاری وظیفہ مل جائے گا مگر مقابلہ کل ہند ہے اس لئے سخت ہے۔ میں نے کہا میں مقابلہ کروں گا چنانچہ انہوں نے کاغذات تیار کروائے اور مرکزی وزارت تعلیم کو دہلی بھیج دی۔ چند ماہ کے بعد وہاں سے انٹرویو میں طلبی آگئی۔ میرے چند سینیر ساتھیوں نے اس قدر خوف زدہ کرنا شروع کیا گویا وہ زندگی موت کا سوال ہوتا ہے۔ بولے اکثر طلبا پر نیم بیہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ کچھ سوال سے اُلجھ کر بھاگ آتے ہیں۔ بعض کے ہونٹوں پر پپڑیاں پڑنے لگتی ہیں۔ وہاں ہر چند منٹ پر چپراسی برف کا پانی لاتا ہے وہ خوب پینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

میرے پاس بکس رہتا تھا۔ اس زمانے میں بریف کیس اتنا عام نہیں تھا۔ میں نے استادی جمیل مظہری کے ہاتھ میں ایک بہت اچھا بادامی سرخ رنگ کا بریف کیس دیکھا۔ اسی رنگ سے ملتی جلتی میں نے ایک نہایت معمولی گرم کپڑے کی شیروانی سلوائی تھی۔ ایک ہندو دوست پارچہ فروش کے یہاں سے میں نے سولہ روپے میں ایک بچا ہوا ٹکڑا خریدا تھا اور اپنے قدیم خیاط حسینی میاں سے استر اور سلائی کے بیس روپے دیکر شیروانی سلوائی تھی۔ گویا کُل چھتیس روپے۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔

میں نے جمیل مظہری صاحب سے کہا حضور آپ کا بریف کیس میری شیروانی کے رنگ سے بہت مشابہت رکھتا ہے میں اسے انٹرویو میں لے جاؤں گا۔ چنانچہ اس بریف کیس میں جو زمین پر سیدھا رہتا ہے، تمام کاغذات اور جانماز لے کر مرکزی سکریٹریٹ نئی دہلی پہونچ گیا۔ وہاں پہونچا تو میری شیروانی، ٹوپی اور سفید پاجامہ پورے مجمع میں منفرد تھا۔ پورے ہندوستان سے سترہ امیدوار طلبا آئے تھے۔ چونکہ سردیوں کا زمانہ تھا لڑکے تمام سوٹ میں ملبوس تھے دو یا تین

www.taemeernews.com

لڑکیاں شلوار ڈوپٹہ سوٹر میں تھیں۔ اس سردی میں بھی تھوڑی دیر پر باوردی چپراسی ٹھنڈے پانی کے سفید شیشے کے گلاس طشت میں رکھے گردش کرتا تھا اور لوگ پی رہے تھے۔ میں ویسے بھی سردیوں میں پانی کم پیتا ہوں دوسرے یہ کہ جب تک تحقیق نہ کرلوں میں کسی دوسرے کے گلاس استعمال نہیں کرتا۔ میں بیٹھا رہا۔ یاد نہیں میرا نام کب پکارا گیا۔ پکار کے ساتھ ہی میں بریف کیس ہاتھ میں اٹھا کر ہلکی مسکراہٹ آمیز تیزی کے ساتھ ہال میں پہونچ گیا۔ کمرہ بڑا تھا اور نیم دائرے میں تقریباً نو صاحبان بیٹھے تھے بہت خوش پوش خوش وضع بارعب اور سجے سجائے لوگ۔ چند لوگوں کو میں پہچانتا تھا۔ ان میں بورڈ کے چیرمین سر راما سوامی مُدالیار تھے۔ ان کی تصویر کئی بار اخباروں میں دیکھی تھی۔ ان کی بغل میں ایک صاحب تھے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ یہ مسٹر مینن (Menon) تھے۔ جو میرے یونیورسٹی میں داخلہ سے پہلے پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہ چکے تھے ان کی تصویر بھی اخبار میں دیکھی تھی۔ تیسرے شخص خواجہ غلام السیدین تھے جن کا نام بھی سنا تھا اور تصویر بھی دیکھی تھی۔ چوتھے صاحب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی تھے جنہیں میں نے دو سال قبل کلکتہ کے ایک اردو کانفرنس میں دیکھا تھا۔ بقیہ پانچ صاحبان کو میں پہچانتا نہ تھا مگر پھر سنا کہ وہ فائنانس کمشنر تھے۔ ڈپٹی سکریٹری ایجوکیشن تھے اور ایک اور اردو اکسپرٹ مسٹر بیگ تھے جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ میں دائرے کے بائیں کنارے جدھر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور خواجہ غلام السیدین صاحبان بیٹھے تھے کھڑے ہو کر اپنا بریف کیس زمین پر رکھا اور گرچہ وہاں کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے ایک اسٹول کھینچ کر اپنے نزدیک کیا اور اس پر بیٹھ گیا تاکہ سیدھا بیٹھا رہوں نہ کرسی کے دستوں پر ہاتھ رہے نہ کرسی کی پشت سے میری پیٹھ ملے۔ میں بیدار اور چوکنا رہوں۔ اطمینان سے بیٹھ گیا۔ میں نے دور سے سلام سب کو کیا اور خواجہ فاروقی صاحب اور غلام السیدین صاحب کو بیٹھنے سے پہلے اسلامی طریقے پر سلام کیا۔ خواجہ غلام السیدین صاحب نے ہلکی مسکراہٹ سے اور خواجہ احمد فاروقی نے سنجیدگی سے سلام کا جواب دیا۔ سب کے سامنے سامنے فائل کھلا ہوا تھا تعلیمی تفصیلات کے سوالات ہوتے رہے میں جواب دیتا رہا وہ اپنے فائل پر ٹِک کرتے رہے۔ پہلا سوال اس کے بعد یہ ہوا کہ آپ کے مقالے کا موضوع اور عنوان کیا ہے؟ میں نے فوراً جواب دیا۔ 'بہار میں اردو

www.taemeernews.com

شاعری کا ارتقا ۱۸۵۷ء کے بعد'۔ عنوان بتاتے ہی برجستہ سوال ہوا اور سوال کرنے والے کی پیشانی پر شکنیں اور ابرو پر بل نمایاں ہو گئے تھے۔

"یہ بہار میں اُردو شاعری کا ارتقا کیا؟ آپ نے اپنے موضوع کو اتنا محدود کیوں کر دیا یہ تو علاقائیت ہے۔ آپ نے بہار ہی کو کیوں لیا؟"

میرا ارادہ بالکل وہ جواب دینے کا نہ تھا جو میں نے دیا اور نہ میں اس سوال کی توقع رکھتا تھا۔

میں اپنے اسٹول پر اور سیدھا ہو گیا اور بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"بہار کو میں نے اس لئے لیا کہ آپ لوگوں نے اسے چھوڑ دیا۔"

ایک مکمل منٹ تک سناٹا رہا۔ مسٹر سین مسکرا رہے تھے۔ کیوں کہ سوالات اس وقت تک انگریزی میں ہو رہے تھے۔ اس کے بعد موضوع کے متعلق مزید سوالات نہیں ہوئے۔

اور تیسرا سوال تھا "آپ کے تحقیق کے ذرائع کیا ہیں"۔ یہ سوال پہلے انگریزی میں ہوا پھر اردو میں۔ تو میں نے اردو میں ذرا طویل جواب دیا۔ یہ سوال مرے مزاج کے عین مطابق تھا۔ میں نے اس کا جواب دل سے دیا پوری قوت اور اعتماد سے دیا۔ سچائی سے دیا سوز و گداز سے دیا۔

"میرے کوئی تحقیقی ذرائع نہیں ہیں۔ میرا کام لائبریریوں سے متعلق نہیں، اداروں سے مطالعے سے اکادمی سے متعلق نہیں۔ میرے ذرائع قبرستان ہیں، کھنڈرات ہیں، تنگ کوٹھریاں ہیں جہاں بہار کے فنکار دفن ہیں۔ اُن کا کلام ان کی زندگی کے ساتھ دفن ہو گیا۔ ان کے یہاں کوئی نہ پہونچا اور وہ اپنی کوٹھریاں اور کھنڈرات چھوڑ کر کہیں نہیں گئے۔ مجھے قبریں کھودنی ہیں، کھنڈرات صاف کرنے ہیں اور دفن شدہ افکار و خیالات، جذبات و احساسات کے نمونوں کو ڈھونڈنا ہے۔ مجھے مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔"

ایک مختصر سی تقریر ہو گئی۔ بہار کے ساتھ جو ظلم ہوا۔ اس ظلم میں خود بہار والے بھی شریک ہیں۔ وہ گمنامی اور تاریکی میں رہے اور گمنامی میں تاریکی میں رہنا پسند کیا۔ ان کے بعد ان کی طرف سے گذرنے والوں نے انہیں دیدہ دانستہ اور دو چار مٹھی خاک ڈال کر ان کی گمنامی پر مزید فراموشی

www.taemeernews.com

کا پردہ ڈال دیا۔ مجھے یہ پردہ چاک کرنا اور مٹھی مٹھی جمع شدہ ہزاروں من خاک ہٹا کر اُن گنجینوں کو دھوپ اور چاندنی کی روشنی میں لانا ہے۔ بات بہت موثر ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ایک بہت چبھتا ہوا سوال ایک صاحب نے فرمایا۔

"کیا بہار میں نظیر اکبر آبادی کا ہم رنگ شاعر کوئی گذرا ہے؟"

میں نے کہا "ایک نہیں دو گذرے ہیں پروفیسر عبدالغفور شہباز اور حافظ فضل حق آزاد۔"

"آزاد کا کوئی شعر اس نوعیت کا سنائیے۔"

اب میری پالکی رکھا گئی۔ اتفاق سے نہ آزاد کا کوئی شعر اس رنگ کا مجھے یاد تھا نہ شہباز کا۔ میں مقابلے کے اس شطرنج پر کوئی جوابی چال نہیں چل سکا لیکن چند سیکنڈ کی تاخیر کے بعد میں ایک دوسری چال چل گیا۔ اور وہ چال کامیاب ہوگئی۔ میں نے نواب امداد امام اثر کا ایک بہت مشہور شعر پڑھ دیا ؎

جنگل جنگل صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
آہو وحشی جان کے ہم کو ساتھ ہمارے پھرتے ہیں

شعر تسلیم کرلیا گیا اور اس پر کوئی چیلنج نہیں ہوا۔ شعر پڑھنے کے بعد میری سانس اوپر کی اوپر رہ گئی تھی اور نیچے کی نیچے۔ مگر جب سر ہل گئے اور نظریں جھک گئیں تو یہ دونوں نیچے اوپر ہوئے۔ اور میری پیشانی پر آتا ہوا پسینہ واپس لوٹ گیا۔

اس کے بعد دو منٹ خاموشی رہی اور اچانک غلام السیدین صاحب نے ایک ایسا سوال انگریزی میں کردیا کہ میں چونک گیا اور فوراً سمجھ نہ سکا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ چونکنا اور نہ سمجھنا بالکل بجا تھا، سوال تھا۔

May we hear something of Mr. Kalim Ajiz?

میں چونک کر بول اُٹھا۔

Beg your pardon, sir.

خواجہ صاحب نے مسکرا کر اردو میں کہا۔

www.taemeernews.com

کیا ہم جناب کلیم عاجز صاحب کا کچھ کلام سن سکتے ہیں۔
اور میں نے دل میں کہا چلو بازی مار لی۔ مگر میں ذرا شرمایا اور گردن جھکالی۔ مگر خواجہ غلام السیدین صاحب نے پھر کہا اپنے چند اشعار سنائیے۔ اور میں شروع ہو گیا۔

آرزو دامن ہی پھیلاتی رہی　　فصلِ گُل آتی رہی جاتی رہی
ہوشیاری کا تقاضہ تھا کچھ اور　　بے خودی کچھ اور سمجھاتی رہی
لوگ میرے حال پر روتے رہے　　مجھ کو لوگوں پر ہنسی آتی رہی
شمع و پروانہ کا جو انجام ہو　　آپ کی محفل تو گرماتی رہی

سننے والوں کا جو حال ہوا میں نے کچھ دیکھا کچھ نہیں دیکھ سکا۔ اور خواجہ غلام السیدین صاحب نے کھڑے ہو کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اُٹھ کر مصافحہ کیا۔ بریف کیس اُٹھایا۔ سلام کیا اور باہر چلا آیا۔ پٹنہ آیا۔ استاد اختر اورینوی صاحب سے پوری روداد سنائی۔ وہ کچھ خفگی کے لہجہ میں بول اُٹھے تم جہاں جاتے ہو بس لڑ پڑتے ہو۔ وہاں بھی لڑ کر آئے اسکالرشپ کیسے ملے گی۔ میں نے کہا نہیں اسکالرشپ انشاء اللہ ضرور ملے گی۔ لڑائی ہوئی لیکن پھر مصالحت بھی ہوئی۔ اور مصالحت کا پلہ گراں نظر آتا ہے۔ میں نے بعد کی تفصیل سنائی۔ اپنی مختصر تقریر۔ غزل کی فرمائش اور پھر غزل خوانی اور اس کا تاثر اور غلام السیدین صاحب کا مصافحہ۔ تو اختر صاحب نے کہا یہ خواجہ صاحب کا اخلاقی رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ نہیں معاف کریں گے۔ مگر میرا حسنِ ظن صحیح ثابت ہوا۔ اور تین ماہ بعد دہلی وزارت تعلیم سے خط آیا کہ اسکالرشپ تمہارے لئے منظور ہو گئی۔

سنہ ۱۹۶۰ء میں اُردو کی تحریک بہار میں بڑی قوی اور توانا تھی پھر اس میں ایسی توانائی کبھی نہیں آئی۔ یہ تحریک غالباً سنہ ۱۹۵۱ء میں خلوت سے نکل کر انجمن میں آئی۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے سب سے بڑے حادثے کی چوٹ کو سہلا سہلا کر کچھ کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چار سال تو ۔ کچھ ایسی چوٹ تھی کہ ہم سنبھالتے ہی رہ گئے ۔ بس یوں سمجھئے کہ میدان جنگ میں کسی کو زخم کاری لگے اور وہ گرتے گرتے اُٹھنے کی کوشش کرے اور کوشش کرتے کرتے پھر گرے اور گرتے گرتے پھر اُٹھنے کی کوشش کرے۔ کبھی آگے گرے کبھی پیچھے۔ کبھی دائیں کبھی بائیں نہ کچھ آنکھ کھول کر دیکھ سکے

www.taemeernews.com

نہ کان کھول کر کچھ سن سکے نہ ہوش سنبھال کر کچھ سوچ سکے۔ بس ۔ کچھ ایسی چوٹ تھی کہ ہم سنبھالتے ہی رہ گئے ۔ تو ۱۹۵۱ء میں زخم سہلاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آنکھیں کھول کر کچھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کچھ سُن رہا تھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اور دیکھنے اور سننے اور سوچنے کے نتیجے میں کچھ بول رہا تھا اور ان بولوں کو لوگ غزل سمجھنے لگے تھے۔

دوست ہیں آشفتہ گوئی کو غزل جانے ہوئے
شاعروں میں ہو گئے ہم جب سے دیوانے ہوئے

تو ۱۹۵۱ء کے شاید اواخر میں انجمن اسلامیہ ہال میں ایک بہت بڑی اردو کانفرنس ہوئی۔ میں ایک دو روز تماش بین اور سامعین کی حیثیت سے شریک رہا تھا۔ ڈاکٹر اختر اورینوی، سید محمد ایوب ایڈوکیٹ مسٹر عبدالقیوم انصاری، مسٹر جعفر امام مسٹر غلام سرور وغیرہ اس کے دست و پا اعضا و جوارح تھے۔ عبدالقیوم انصاری صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ عبدالقیوم انصاری صاحب کو میں چار پانچ سال قبل سے جان رہا تھا۔ سیدھے سادے بے تکلف اور بے ضرر قسم کے آدمی تھے جیسے کسی دیہات کے جوان مولوی صاحب شیروانی پاجامہ ٹوپی چپل بول چال سادہ وضع سادہ انداز سادہ رکھ رکھاؤ سادہ۔ میں سمجھتا تھا کہ بے چارے دیہاتی لیڈر ہیں مزے میں بول لیتے ہیں۔ واجبی اردو جانتے ہیں جیسے بہت سے ٹیچر بہت سے پروفیسر بہت سے وکیل اور بیرسٹر جانتے ہیں۔ لیکن کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جو ہال سے باہر بہت سی چوکیوں آپس میں جوڑ کر بنایا گیا تھا جو بہت بڑا ہونے کے باوجود مہمانوں کی تعداد کے اعتبار سے اتنا چھوٹا تھا کہ اولین فہرست کے جو مخصوص نمائندگان اور ڈیلی گیٹس تھے ان کے لئے بھی ناکافی تھا وہیں نے دیکھا کہ آنند نرائن ملا اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی قسم کے بزرگوں کو بھی کنارے جگہ ملی تھی اور وہ چوکی سے پاؤں لٹکائے کنارے بیٹھے تھے اور عبدالقیوم انصاری صاحب اُس اردو میں خطبہ دے رہے تھے جو اب بہت سے اُردو کے اچھے طالب العلم سمجھ بھی نہیں سکیں گے۔ اور آخر کا حصہ ختم کر کے یہ مصرع پڑھتے ہوئے بیٹھے۔

بات اور بڑھتی ہے مختصر نہیں ہوتی

www.taemeernews.com

تو میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ یہ دیہات کے کوئی جوان مولوی صاحب نہیں ہیں شہر کے پختہ مشق ادیب ہیں اور لیڈر اور مقرر تو خیر ہیں ہی پھر اُن سے ملاقاتیں رہیں اور باتیں رہیں تو ان کے دل کی خوبیاں بہت آزادی سے جھانکتی ہوئی مجھ سے قریب آگئیں ۔ اور پھر مجھ سے مانوس ہوگئیں ۔ پھر وہ وزیر بھی ہوئے اور شاید کئی بار وزیر ہوئے ہیں تو ایک بار اُن سے اُن کے گھر پر جب وہ اپنی وزارت کے بنگلے میں تھے ملا تھا ۔ اور اپنے اسی اسکالرشپ کی دو سال کے بعد مزید ایک سال کی توسیع کے لئے کہا تھا ۔ تو کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ شاید وہ کرنا نہیں چاہتے یا کرنا ان کے بس کے باہر ہے ۔ پھر میں اُٹھ کر چلا آیا ۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب دہلی سے توسیع کی اطلاع مجھے ملی تو بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ وہ دہلی کسی میٹنگ میں گئے ۔ اور پھر سکریٹریٹ میں خواجہ غلام السیدین سے مل کر ان سے توسیع کے لئے کہا ۔ اِس دور میں ایک بار میں نے ایک وزیر صاحب کو ٹیلیفون کیا جو شاید میرے شاگرد بھی ہیں ۔ انہوں نے کہا کیا ہے سر کیا حکم ہے ؟ کہئے تو میں خود آجاؤں ۔ میں نے کہا تشریف لانے کی ضرورت ایک نہایت معمولی سا کام ہے ۔ میں ایک صاحب کو خط لے کر بھیج رہا ہوں چنانچہ بھیجا ۔ انہوں نے خط پڑھا اور اپنے سکریٹری سے کہا کہ جب میں واپس آؤں تو مجھے دے دینا ۔ اس طرح تین بار ہوا اور وہ خط کبھی سکریٹری کے پاس گیا کبھی ان کی جیب میں ۔ اس کے آگے کا راستہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا ۔ عبدالقیوم انصاری صاحب سے غالباً دو بار ریل کی ہم سفری رہی اور فرسٹ کلاس کیبن میں جب میں صبح کی نماز کے لئے اُٹھا تو وہ شاید اُٹھ کر تہجد بھی پڑھ چکے تھے اور ہم دونوں نے گاڑی میں نماز صبح جماعت سے ادا کی اور آخر باریوں ہوا کہ وہ کار سے کہیں سفر کر رہے تھے ' راہ میں عصر کی نماز کا وقت آیا ۔ گاڑی رکوائی مسجد سے باہر وضو کیا اور مسجد میں نماز کے لئے جا رہے تھے کہ انتقال ہوا ۔

تو یہ اردو کی تحریک کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ اس کا ایک شاندار جلسہ مظفرپور میں ہوا اس کے صدر سید محمد ایوب ایڈوکیٹ منتخب ہوئے تھے ـــــ ٹھہریئے ایوب صاحب کے متعلق کچھ کہنا چاہیئے کچھ لکھنا چاہیئے ۔ گرچہ کچھ کہنا اور کچھ لکھنا ان کی شان ان کے مقام ان کے وقار سے بہت گری ہوئی بات ہے اور اس تعلق سے بھی گری ہوئی بات ہے جو تعلق مجھے ان سے

www.taemeernews.com

یا اُن کو مجھ سے تھا ۔ بہر حال کچھ کہنا کچھ نہ لکھنا بھی اس لئے بہت ضروری ہے کہ نہ کہوں گا نہ لکھوں گا تو خائن ہوں، بد دیانت ہوں درد فراموش ہوں فرض ناشناس ہوں، خود کو امین سمجھتا ہوں ۔ اب کوئی نظر نہیں آتا کہ اس بار امانت کا متحمل ہو سکے ۔

یہاں اے عشق سب ٹھہرے ہوس کے خیر خواہوں میں
نہ بولے گا کوئی تیری طرف سے ہم ہی بولیں گے

درد فراموش اس لئے کہ وہ کاروان اہل درد جو گذر چکا جس کے ایک فرد ایوب صاحب بھی تھے میں اس کارواں کی گرد کارواں ہوں ۔ مجھ میں کوئی نہ کوئی ذرہ گرد پا ان کی بھی ہے پھر میں یہ تعلق کیسے فراموش کروں اور فرض ناشناس اس لئے کہ اس دور بے دردی میں درد کا نعرہ لگانا درد کی پکار پکارنا درد کی آواز بلند کرنا درد والوں کی بات کرتے رہنا مذہب کے پانچ فرائض کے بعد سب سے بڑا فرض ہے ۔

ایوب صاحب کو میں نے پہلی بار شاید میں نے ۱۹۴۲ء میں دیکھا ۔ میں اسکول سے فارغ ہوا تھا ۔ تیلہاڑہ میں ایک چھوٹی سی فوج داری ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کسی جائداد کے سلسلہ میں ہو گئی تھی جس میں تین مسلم جو میرے عزیز تھے ماخوذ کئے گئے تھے ۔ اور وہ تینوں میرے ہی مکان میں پوشیدہ پناہ گزیں تھے ۔ ان پر وارنٹ تھا ۔ ضمانت بہار شریف ایس ۔ ڈی ۔ او کورٹ سے مسترد ہو چکی تھی ۔ پٹنہ جج کورٹ میں ضمانت کی درخواست پیش کرنی تھی ۔ میرے بہنوئی سید اکرام الحق اس سلسلہ میں مشورہ کے لئے پٹنہ آئے ہوئے تھے ۔ میں ان کے ساتھ پٹنہ جج کورٹ کے وکالت خانے کے سامنے کسی انتظار میں کھڑا ہوا تھا ۔ ایک صاحب سڑک کی طرف سے کورٹ کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے ۔ سیاہ شو سفید پاجامہ سیاہ شیروانی سانولہ رنگ اور سیاہ ٹوپی ۔ وہ صاحب اپنے ہاتھ کے دونوں انگوٹھے شیروانی کی دونوں اوپر والی جیب میں ڈالے بڑی ستھری چال اور ستھرے انداز سے آرہے تھے ۔ انہیں دیکھتے ہی اکرام بھائی آگے بڑھے اور آواز دی ۔ "ایوب بھائی !" وہ صاحب ٹھہرے ۔ دونوں قریب ہوئے، مصافحہ ہوا اور بڑے اشتیاق اور بڑی چاہ کے انداز میں باتیں کرنے لگے ۔ اکرام بھائی نے ان سے مشورہ لیا کہ سیشن جج کورٹ میں ضمانت کی درخواست

www.taemeernews.com

کامیابی کی ضمانت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے کس قانون داں کی مدد لی جائے ؟ ایوب صاحب نے کہا۔ مسٹر جعفر امام بار ایٹ لا کو لے آئیے چند منٹ کا کام ہے۔ اتنا بے ساختہ مشورہ ہوا کہ واقعی بے ساختہ کام ہوا۔ دوسرے یا تیسرے ہی دن جج کورٹ میں مسٹر جعفر امام بیرسٹر آئے۔ نہایت خوش رُو اور خوش پوش جوان، بہار کے مایۂ ناز سپوت، سر علی امام بیرسٹر کے صاحب زادے۔ جج کے سامنے واقعی تین منٹ جعفر امام صاحب نے بات کی اور ضمانت کا کیا سوال ہے۔ مثل دیکھ کر ایک ہی بات جعفر امام صاحب نے کہی کہ بیان کے مطابق مقدمہ ہی ثابت نہیں ہوتا وارنٹ کیسا گرفتاری کیسی اور ضمانت کی درخواست کیا۔ بات انگریز جج کی سمجھ میں بھی آگئی اور مقدمہ ہی خارج ہوگیا۔ یوں ہوتے تھے ذہین قانون داں اور یوں ہوتے تھے سمجھدار جج۔ تو شام کو ہم لوگ ایوب صاحب کے یہاں گئے۔ روداد بیان ہوئی اس کے بعد چائے چلی اور اس کے بعد میرا تعارف ہوا۔ پھر ایوب صاحب سے میری ملاقات برسوں نہیں ہوئی۔ مری ملاقاتوں کا رُخ مڑ گیا۔ سیلابِ بلا دروازے میں داخل ہوا سائبان میں آیا اور پھر سارے گھر کو ڈبو گیا۔ والد کا انتقال ہوا۔ بھائی داغ مفارقت دے گئے۔ اور پھر سارا خاندان ڈوب کر رہ گیا۔

۱۹۵۱ء کے اسی انجمن اسلامیہ ہال کے جلسے سے ہم دونوں کی ملاقاتوں کی تجدید ہوتی ہے۔ انجمن کا ایک جلسہ اور مشاعرہ شعرا بہار کے عنوان سے ہوا۔ جس میں مری غزل گوئی کا ایک آہنگ قرار پایا۔ صدارت ایوب صاحب ہی کی تھی۔ اس کی روداد میری کتاب میں آچکی ہے جب ایوب صاحب پر کسی وقت غلبۂ حزن ہوتا وہ افسردہ اور نڈھال ہوتے تو مجھے بلاتے میں کالج اور یونیورسٹی کا طالب العلم ہو چکا تھا۔ خود آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتے ایک آدھ شعر خود کہتے پھر مجھ سے سنانے کی فرمایش کرتے اور میں اپنی مخصوص لَے میں ایک دو غزل سناتا۔ ان کے آنسو میری آنکھوں سے ٹپک جاتے۔ وہ تازہ دم اور شگفتہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ گویا میرا غم ان کی توانائی بن جاتا۔ اور وہ نئے حوصلے، نئے عزائم اور نئے اعتماد سے کام میں لگ جاتے۔ دو ایک بار کوئی قانونی مسئلہ میرے درپیش آجاتا تو وہ مجھے ساتھ لیتے۔ اپنی گاڑی پر بٹھا کر متعلقہ افسر کے پاس جاتے۔ کام کر کے پھر واپس آجاتے۔ ان کی صدارت کے دور میں کوئی جلسہ صوبے کے

www.taemeernews.com

کسی مقام پر ہو وہ مجھے نہیں چھوڑتے اور جلسہ میں اعلان کرتے کہ میں ایک ہی کام کر کے آیا ہوں کہ کلیم عاجز کو لیتا آیا ہوں اور جلسہ تالیوں سے گونج جاتا۔

ایوب صاحب نے شادی نہیں کی اپنی بہن کی دلجوئی میں عمر گذار دی شادی کیوں نہ کی میری تحقیق اس باب میں صفر ہے۔ میں نے ان کے انتقال پر ایک چھوٹا سا مضمون لکھا اور اس میں کہا۔ میں نہیں جانتا ایوب صاحب نے شادی کیوں نہیں کی مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اگر وہ شادی کر لیتے تو وہ ایوب نہیں رہتے جو ایوب زمانے کو قدرت نے دیا۔ اگر وہ شادی کر لیتے تو ان کا بہترین گھر ہوتا اور وہ بہترین اور نہایت روشن چراغ خانہ ہوتے۔ لیکن وہ چراغ خانہ ہی رہ جاتے قدرت انہیں شمع انجمن بنانا چاہتی تھی۔ وہ شمع انجمن بنا دیے گئے اور یہ شمع ان کی زندگی کو اور ان کے ساتھ کتنی زندگیوں کو روشن کرتی رہی اور اب ایک غیر فانی روشنی کی امین بن کر پورے بہار کو روشن کر رہی ہے۔ ان کا گھر صرف ان کا ایک کمرہ اور ایک سائبان تھا۔ کمرے میں ایک پلنگ اور سائبان میں ایک آرام کرسی۔ وہ تمام دن اسی بید کی آرام کرسی پر نیم دراز رہتے۔ اسی پر چائے پیتے۔ اسی پر شعر پڑھتے اور سنتے اسی پر مشورے دیتے اسی پر شہری اور صوبائی سیاست پر گفتگو کرتے ہدایات دیتے اسی پر تمام منصوبے بنتے اور پروگرام طے ہوتے اور اسی پر مقدمے کی مسل دیکھی جاتی بیان تحریری لکھوائی جاتی۔ ان کی مشقت، ان کی ذہانت، ان کی دردمندی، ان کی معاملہ فہمی اور ان کی تمام اجتماعی زندگی کا ڈرامہ اسی آرام کرسی پر ہوتا اسی سائبان میں ہوتا۔ اس کے بعد رات کے گیارہ بجے وہ سائبان سے متصل چارپائی پر جاتے۔ شاید وہ رات کا کھانا اسی وقت کھاتے اور سو جاتے یا کیا کرتے میں نہیں جانتا۔ میں صبح جس وقت پہونچتا وہ آرام کرسی پر ہی نیم دراز ہوتے اور تمام کاموں سے فراغت کے بعد وہ کورٹ جانے کی تیاری کرتے اور تیاری میں پانچ منٹ صرف ہوتے وہ یوں کہ کمرے میں جاکر وہ کرتہ پاجامہ اُتار کے پینٹ شرٹ پہن کر کوٹ کی آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے وہ کمرے سے برآمد ہو جاتے اور باہر نکل کر رکشہ یا کار پر سوار ہو جاتے۔ کس وقت وہ ناشتہ کرتے اور کس وقت دن کا کھانا کھاتے میں نے نہیں دیکھا نہ میرے علم میں ہے۔ کتنی محفلیں ان کے ذریعہ آراستہ ہوئیں کتنے ادارے آباد ہوئے اور کتنے مخلصین ان کے دائیں بائیں پہلے

www.taemeernews.com

جمع ہوئے پھر منتشر ہو کر اس لمبی چوڑی غرض مند دنیا میں بے لوث خدمت کا افسانہ لکھ گئے مرتب کر گئے سنا گئے اور یاد کرا گئے۔ فسادات جمشید پور راوڑکیلا وغیرہ کے بعد اپنی صحت کے تقاضوں اور رعایتوں کو بالکل پس پشت ڈال کر گدر کی تھوڑی بہت راحت کو ترک کر کے پردیس کی مسافرت میں پڑے رہتے۔ جمشید پور میں بے وطنی کی زندگی گذارتے بیمار ہوتے تو اسپتال داخل کر دئے جاتے۔ بیڈ پر پڑے رہتے۔ بغل میں تیمم کی مٹی رکھے رہتے لیٹے لیٹے تیمم کر کے اسی طرح نماز ادا کرتے اور کچھ اچھے ہوتے تو پھر اپنے آفس میں مسل کی تیاری کرتے کمیٹن کے اجلاس میں بحث کرتے اور رات ڈھلے تھکے ماندے نڈھال پلنگ پر پڑ رہتے۔ صبح ہوتی اور پھر اسی درمندی کی مشقت میں خود کو ڈال کر گھلتے رہتے پستے رہتے اور جھڑتے رہتے۔ بہت گھلے بہت پسے تو پٹنہ آکر سائبان کی اسی کوٹھری میں آکر پڑے رہے۔ گردہ خراب ہو گیا دل کمزور ہو گیا۔ دل گردہ سب کچھ وطن کے لئے لگا دیا، ملت کے لئے لگا دیا انسانیت کے لئے لگا دیا۔ صرف کمزور خیف و ناتواں جسم اور دھیمے چلتی ہوئی سانسوں کو بغل میں لئے اپنی آخری رفیق موت کا بشاشت سے انتظار کرنے لگے۔ باہر کے کمرے میں شیر بہار کلاں جعفر امام صاحب اور شیر بہار خورد غلام سرور مظہر امام سابق سکریٹری صوبائی مسلم لیگ، مسٹر عبدالقیوم انصاری، مولانا بیتاب صدیقی، بلدیو سہائے ایڈوکیٹ، سید اجتبیٰ حسین رضوی اور بہت سے مخلصین ہندو مسلم بیٹھے ہوئے ایوب صاحب کی علالت اور علاج اور تزکیب اور تیمارداری پر مذاکرہ کرتے رہتے اور ان کی صحت یابی کی فکر میں اور کوشش میں مستغرق رہتے۔ لیکن وہ مجاہد وقت ان کی فکروں اور کوششوں سے بے نیاز اور بے پروا اپنے چھوٹے کمرے میں اپنی آخری سفر کی تیاری میں مصروف رہتا۔ ہر طرح کی طبی امداد ان کے گھر پر آرہی تھی۔ ڈاکٹرز، نرس، دوائیں جانچ پڑتال سب کچھ وہیں ہو رہا تھا۔ بار بار E.C.G ہو رہا ہے بلڈ پریشر دیکھا جا رہا ہے۔ وہ لیٹے لیٹے مسکرا رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں۔ میرے والد صاحب کا اسی عمر میں انتقال ہوا تھا اور اسی مرض میں انتقال ہوا تھا۔ وہ مرض بھی مجھے دے گئے اور شاید باطنی طور پر یہ وصیت بھی کر گئے ہوں کہ اسی عمر میں تمہیں بھی آجانا ہے ممکن ہے اور اغلب قرینہ ہے کہ وہ وقت شاید آگیا ہے۔ دوست انہیں اور ان کے خیالات

www.taemeernews.com

کو دوسری طرف منتقل کر رہے ہیں۔ باتیں کم ہو رہی ہیں اشارے زیادہ ہو رہے ہیں۔ خاموش التجا ہو رہی ہے۔ خاموش رہیے ڈاکٹر کی ہدایات کے خلاف نہ ہو۔ لوگ کوشش کر رہے ہیں ایوب صاحب خاموش رہیں۔ علاج کو نرسنگ کو اپنے پروگرام اپنے منصب کے مطابق کام کرنے دیں۔ تنفس کبھی زیادہ ہو جاتا ہے انجکشن دیا جاتا ہے کم ہوتا ہے۔ پھر معمولاً دوائیں چل رہی ہیں پیشاب کم ہو رہا ہے۔ اس کی ترکیب ہوتی ہے۔ پیشاب کچھ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ دوست تیماردار خوش ہوتے ہیں۔ اب صحت ہو رہی ہے۔ علاج کا Response بڑھ رہا ہے۔ دوست اندر جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں باہر آتے ہیں مجمع میں مشورے ہو رہے ہیں۔ کبھی مایوسی کبھی امید بشاشت ڈاکٹر ہر وقت موجود نرس ہر کام پر تیار دوست خدمت پر موجود۔ باہر احباب اور پرسان حال فکر میں منہمک دعاؤں میں مشغول نیک خواہشات اور حسن ظن میں اور حسن خیال میں اور اظہار حسنِ خیال میں مصروف۔ ایک شام پھر کچھ تنفس زیادہ ہوا پھر کوئی ترکیب ہوئی تنفس دھیما ہوا۔ دو ایک دوست اغل بغل بیٹھے ہیں ڈاکٹر سرہانے نرس پائیں بیٹھی ہے۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر جانچنے کو بازو پر بینڈ باندھا آلہ لگایا اور گھڑی میں خون کا دباؤ دیکھنے لگے کہ پھر تنفس زیادہ ہوا پھر بڑھا اور ایوب صاحب نے بائیں بازو پر بندھا ہوا خون کا دباؤ جانچنے والا بینڈ اپنے دوسرے ہاتھ سے نوچتے ہوئے کہا۔ آپ لوگ بیکار کوشش کر رہے ہیں۔ اور پھر "اچھا رخصت سلام علیکم" اور ایوب صاحب نے منہ پھیر کر آنکھیں بند کر لیں۔

رخصت ہوا بیمارِ غم بالیں سے اُٹھے ہم نفس
تدبیر تو کرتے ہیں سب تقدیر پر کس کا ہے بس

باہر دوستوں میں خبر گئی۔ اور سب بیک وقت اُٹھے۔ اور اجتبیٰ حسین رضوی زور سے پکارے۔

"ایوب! ایوب!! کہاں جا رہے ہو ایوب!!! ٹھہرو ایوب ٹھہرو ایوب"

اے اہل دیار دار و رسن کا ہے کو پکارو ہو ہم کو
ہم دور کے جانے والوں کا رستے میں ٹھہرنا مشکل ہے

ہاں تو مظفر پور میں ریاستی انجمن ترقی اردو بہار کا جلسہ تھا۔ ایوب صاحب صدر انجمن منتخب ہوئے تھے اور مظفر پور میں اُن کا صدارتی جلوس نکلا اور خوب دھوم سے نکلا۔ ایوب صاحب اور

www.taemeernews.com

غلام سرور صاحب اپنی بے ریا اور بے لوث خدمت کے لئے عوام و خواص میں مشہور بھی تھے اور مقبول بھی اور اردو والے دل و جان سے ان کی آواز میں آواز ملانے قدم بقدم چلنے اور شانہ بشانہ بڑھتے رہنے کو آمادہ ہی نہیں ہر وقت تیار تھے۔ اردو کو سیاست کے لئے کبھی نہیں استعمال کیا گیا۔ یہ خصوصیت ایوب صاحب اور غلام سرور صاحب تک رہی۔ ورنہ رُخ موڑ دیا جاتا تو عوام اسے سیاسی نعرہ بنا لیتی اور اسی وقت اسی دور میں یہ دونوں سیاست کی کسی نہ کسی کرسیٔ اقتدار کو حاصل کر سکتے تھے۔ مگر ایوب صاحب کو اس سیاست سے نفرت تھی جو آج عزت کا سب سے بڑا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں یہ خالص تہذیبی تحریک تھی۔ اردو کا بچاؤ ایک نہایت ہی اہم اور شاندار لطیف اور حسین تہذیب کا بچاؤ تھا اور ہے۔ اِسے اُردو والے اس وقت خوب سمجھتے تھے۔ اب تو اردو کو اس لئے بچانا چاہتے ہیں کہ یہ روٹی کا ذریعہ بنے گی۔ جنہیں کچھ نہیں آتا وہ اردو کے ذریعہ اپنی کمی پوری کرنی چاہتے ہیں۔ اُس زمانے میں سب کام والے تھے اور بڑے بڑے کام والے تھے۔ بڑی بڑی صلاحیت والے تھے انہیں روٹی کی فکر نہیں تھی۔ روٹی میں جو آٹا لگتا ہے گھی لگتا ہے، آگ اور پانی استعمال ہوتا ہے اس کی فکر نہیں تھی کیونکہ آٹا گھی آگ پانی ان کے اختیار میں بہت فراوانی اور افراط سے تھا۔ وہ اس کے لئے لڑ رہے تھے کہ روٹی سلیقے سے کیسے پکائی جاتی ہے، روٹی کس طرح لذت دار بنتی ہے وہ اس لئے اردو کی لڑائی لڑ رہے تھے کہ روٹی انگلیوں سے توڑی کیسے جاتی ہے، منہ میں رکھی کیسے جاتی ہے چبائی کیسے جاتی ہے کھائی کیسے جاتی ہے اور ہضم کیسے کی جاتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی بات اونچائی کی تھی بہت گہرائی کی تھی۔ اب آہستہ آہستہ یہ فرق مٹتا جاتا ہے دوری ختم ہوتی جاتی ہے اونچائی کم ہوتی جاتی ہے۔ گہرائی بھرتی جاتی ہے۔ سرِ راہ ہوٹلوں میں دیکھ لو بس اسٹینڈ اور اسٹیشنوں پر دیکھ لو گے معلوم ہو جائے گا کہ روٹی اب کیسے کھائی جا رہی ہے۔ اُس وقت اُردو بچاؤ تحریک میں جو لوگ شامل تھے ان کا نام اب مجھے یاد نہیں اور دیکھا بھی کم لیکن کچھ نام جو یاد ہیں وہ میں نے کچھ بتایا کچھ اور سن لو ایوب صاحب کا نام سنا، غلام سرور صاحب کا نام سنا، جعفر امام صاحب، عبدالقیوم انصاری صاحب وغیرہ کا نام سنا کچھ لوگوں کا تفصیل سے ذکر آیا۔ اندازہ ہوا کہ اردو بچاؤ تحریک والے لوگ پہلے کیسے تھے۔

www.taemeernews.com

ہم نے جنہیں دیکھا یا جنہیں دیکھنا یاد رہا۔ اودھیش نندن سہائے ایڈوکیٹ، نول کشور پرشاد ایڈوکیٹ، بجرنگ سہائے ایڈوکیٹ، مسٹر گونوارہ سابق میئر پٹنہ کارپوریشن، شیام نندن سہائے ایڈوکیٹ سابق وائس چانسلر بہار یونیورسٹی، جسٹس براج کشور پرشاد، جسٹس بھونیشور پرشاد سنہا وغیرہ وغیرہ یہ لوگ پٹنہ کے تھے اور اُردو دنیا کے پنڈت سندر لال، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، آنند نرائن ملّا، گوپی ناتھ امن، بالمکند عرش ملسیانی وغیرہ وغیرہ جنہوں نے ان کو دیکھا ہوگا وہ جانتے ہیں کہ اُردو کی لڑائی لڑنے والے کون تھے اور اردو کی لڑائی کیوں لڑتے تھے۔ مجھے ذرا سا یاد ہے کہ کسی مجلس میں عبدالقیوم انصاری صاحب بھی تھے، جعفر امام صاحب بھی غلام سرور صاحب بھی اور بہت سے لوگ تھے نہ جانے کیا بات نکلی تھی۔ اسی روز میں نے ایوب صاحب کو غصہ میں دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ کسی نے اگر اس تحریک کو سیاسی رنگ دینا چاہا تو میں استعفا دے دوں گا اور اس کے خلاف لڑوں گا۔ تو اس وقت یہ تحریک خالص تہذیبی تحریک تھی اور خالص انسانی اور عوامی تحریک تھی۔ اب یہ تحریک سرکاری اور سیاسی ہے اور اس کا مقصد بالکل معاندانہ اور برعکس ہے یعنی خود کو بچاؤ۔ تو دیکھو کہ اردو والوں اور اردو تحریک والوں کا کیا حال ہے۔ میں نے اردو والوں اور اردو تحریک والوں کو دیکھا۔ کچھ دور سے بھی اور کچھ نزدیک سے بھی۔ اُن کا چہرہ دیکھا اُن کی آنکھیں دیکھیں، اُن کا لباس دیکھا، ان کی زبان دیکھی، ان کی باتیں سنیں، ان کا لہجہ دیکھا۔ ان کی چال، ان کی نشست و برخاست، ان کے ملنے جلنے کا انداز، ان کا دل ان کا خیال، ان کا نظریہ تھوڑی ہی بہت سہی مگر ان کی پوری زندگی دیکھی۔ کچھ لکھا ہے اس کتاب میں اور پہلے بھی لکھتا رہا ہوں۔ آپ جا کر دیکھ لو پڑھنے والوں، پڑھانے والوں کو دیکھ لو۔ کیا ہمارے آپ کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس اُبھرتا ہے کہ یہ اردو والے ہیں؟ اردو زبان اردو سماج اردو تہذیب کا کون سا حصہ کون سا پہلو، کون سا گوشہ، کون سا عکس، کون سا پرتو کون سا آہنگ کون سی خوشبو کون سی آواز ان کی زندگیوں کے ظاہر اور باطن سے نمایاں ہوتی ہے؟

www.taemeernews.com

خیر جناب تو ایوب صاحب مرحوم کی صدارت میں اور غلام سرور صاحب کی نظامت میں پہلے جلسہ کا اور پھر مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے اکثر مشاہیر زبان دادب وشعر موجود تھے۔ جلسہ کے چند روز قبل محمد نثار احمد خاں صاحب ایڈوکیٹ، جو میرے بڑے مہربان اور غالباً انجمن ترقی اُردو کے نائب صدر یا کوئی عہدہ دار تھے۔ یا نہوں بہر حال اردو تحریک کے خاص آدمی اور ایوب صاحب کے مشیر خاص تھے میرے پاس تشریف لائے کہ ایوب صاحب کے ساتھ تمہیں مظفر پور کے جلسہ میں چلنا ہے۔ وہ تو مجھے لے ہی جاتے تھے مگر اسی روز اتفاق سے کمرشیل ٹیکس کمشنر کے اجلاس میں میرا ایک اہم مقدمہ تھا۔ میں نے کہا میری تو اس روز ایک اہم پیشی ہے میں تو جا نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا چلنا ہی ہے ایوب صاحب تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ تم درخواست دے کر تاریخ بدلوالو۔ میں نے کہا یہ تو میں نے کبھی نہیں کیا اور کبھی نہیں کروں گا۔ یہ میرے مقدمے کو اور میرے کردار کو مجروح کر دے گا۔ وہ بولے تو یہ کام میں کروں گا۔ نثار خاں صاحب سرکاری وکیل تھے۔ وہ مقدمہ کی ٹھیک پیشی کے وقت جب میں کمشنر کے سامنے ٹیبل پر بیٹھا تھا، تشریف لائے اور باتیں کرنے لگے اور میری شعری اور ادبی حیثیت پیش کرنے لگے اور کہا کہ آج مظفر پور میں ادبی جلسہ ہے اور ان کو ہر حال میں شرکت کرنا ہی ہے، آپ خود مقدمہ ملتوی کر دیجئے۔ بیچارے کمشنر صاحب بھی مرعوب ہو گئے اور انہوں نے case adjourn کر دیا۔ اور میں اسی وقت ان کے ساتھ مظفر پور روانہ ہو گیا۔

بہت بڑا جلسہ تھا۔ اس زمانے کے جلسوں میں بڑا جلسہ، اس معنی میں نہیں کہ بیس ہزار کا مجمع تھا۔ ٹھٹ دھر جمع تھے اور نوجوان کا ایک سمندر چاروں طرف تھا۔ بڑا جلسہ اور بڑا مشاعرہ اس معنی میں کہ شہر کے ضلع کے صوبے کے ملنے ہوئے اہل علم اہل ذوق اور اہل فن بھی موجود تھے۔ اور عوام کا بھی مجمع اژدھام عام کی شکل میں تھا۔ طلبا بھی اور عام شہری بھی۔ مگر اس زمانے کے طلبا اور عام شہریوں بلکہ رکشہ والوں اور یکہ بانوں کا نمونہ بھی میں نے اسی کتاب میں کہیں پیش کیا ہے۔ تو بہر حال میں پہونچا، مشاعرہ شروع ہو چکا تھا۔ صوبے کے شعرا پڑھ چکے اور صرف باہر کے چند بزرگ اور مشاہیر شعرا باقی رہ گئے تو غلام سرور صاحب نے اعلان کیا کہ شہنشاہ غزل

www.taemeernews.com

نہیں تو بادشاہِ غزل کلیم عاجز کو میں تشریف لانے کی زحمت دیتا ہوں۔ میرے دانت میں سخت درد شروع ہو چکا تھا۔ مگر منہ رومال سے دبائے میں اُٹھا۔ مائک پر آیا دل کا درد اور دانت کا درد دونوں مل گئے۔ باطن کے درد نے ظاہر کے درد کو کھینچ کر اپنی بغل میں کیا اور ظاہر کے درد نے دل کے درد کو آواز دے کر اپنے ساتھ لیا اور پھر دونوں نے ہم آہنگ ہو کر غزل چھیڑی

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا
سینکڑوں میخانے اُجڑے ایک میخانہ بنا

شاخِ گل کی چھاؤں میں گلچیں ہے اب آرام سے
دشمنِ خانہ ہی آخر صاحبِ خانہ بنا

ہوشیاروں کو نہیں معلوم رازِ فصلِ گل
مجھ سے پوچھو میں اُسی موسم میں دیوانہ بنا

کچھ مزاریں بیچ میں اہلِ محبت کی بنیں
اِک طرف کعبہ بنا اِک سمت بتخانہ بنا

بے تحاشہ کود پڑتے ہیں وفا کی آگ میں
ہم ہیں اس مٹی سے جس مٹی سے پروانہ بنا

میکشوں کی قدر کر ساقی کہ ان کے واسطے
سنگ سے شیشہ بنا شیشے سے پیمانہ بنا

ہم تو شاعر ہیں ہمارا درد چھپ سکتا نہیں
جو غزل میں کہہ دیا ہم نے وہ افسانہ بنا

اب کیا بتاؤں کہ مجمع کا کیا رنگ تھا۔ یہ اشارے کس طرح ذبح کر گئے' اور لوگ کس حال سے کس حال کو پہونچ گئے۔ شاعری اور زندگی۔ افسانہ اور حقیقت' حال اور ماضی' ماحول اور تاریخ کس طرح اکٹھا ہو کر ایک جاندار' متحرک' پُرسوز اور پُراثر تصویر بن گئے۔ کیسے لوگ تھے اس دور کے یعنی ابھی تیس سال پہلے۔ یہ مشاعرہ شاید ۱۹۶۰ء میں ہوا تھا۔ زیادہ نہیں بس یوں سمجھئے کہ پلک جھپکنے سے پہلے شاعر کا ایک دور صد سالہ دورِ چرخ بن گیا۔ اور دو تین ماہ پہلے خدا بخش لائبریری میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا۔ میں نے تو شرکت مشاعرہ ترک کر دی ہے مگر مجھ سے سابق گورنر یونس سلیم صاحب نے کہا تھا کہ میں طرحی مشاعرہ کروں گا تو ضرور آؤ گے۔ وہ تو چلے گئے مگر شاید اُن کی تحریک سے بیدار صاحب نے طرحی مشاعرہ کیا۔ اور میں گیا۔ کچھ دیر سے پہونچا تھا۔ اُس وقت واقف صاحب طرحی غزل پڑھ رہے تھے۔ دس بیس یا پچیس شہر کے بزرگ حضرات تھے اور قریب دو تین سو نوجوان طلبا اور غیر طلبا ہوں گے۔ اور واقف صاحب کے ایک ایک مصرعہ پر چھت پھٹ رہی تھی اور وہ اس قسم

www.taemeernews.com

کے اشعار بہت مزے لے لے کر سنا رہے تھے :

میری دعا ہے تجھکو لچکتی کمر ملے

اور نوجوانوں کا ایک ساتھ اُچھل اُچھل کر داد دینا پورے ماحول کو ایک ہنگامے میں تبدیل کر رہا تھا۔ میرے جی میں آیا کہ میں اُٹھ کر اپنے پڑھنے کے وقت یہ بات مجمع کو مخاطب ہو کر کہدوں کہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے علامہ اقبال نے بھی دعا مانگی تھی اور وہ دعا بہت حد تک قبول بھی ہوئی تھی۔ اب دعا والا چلا گیا۔ اور دعا کی تاثیر بھی قلوب سے نکلنے لگی۔ اقبال کی دعائیں یہ تھیں وہ ساقی کو مخاطب کر کے ساقی نامہ میں کہتے ہیں۔ حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ غلط ہو تو تصحیح کر لیں :

خرد کی غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا درد میری نظر بخش دے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مصطفیٰ سوزِ صدیق دے
مری خلوت و انجمن کا گداز — مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
امیدیں مری آرزوئیں مری — اُمنگیں مری جستجوئیں مری
یہی سب ہے ساقی متاعِ فقیر — انہیں سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے کارواں میں لٹا دے اِسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اِسے

اب دیکھو دعا کیا ہوتی ہے ؟ — میری دعا ہے تجھکو لچکتی کمر ملے۔

دیکھو آسمان کہاں سے کہاں گرا ہے۔ زمین کو کہاں سے کہاں ٹھوکر لگی ہے۔ انسان کس بلندی سے کس پستی تک پہونچا ہے اور اردو کو روٹی روزی کا ذریعہ بنانے والے کا چہرہ کتنا مسخ ہو گیا ہے۔

میں یہ بات اُٹھ کر کہنا چاہتا تھا۔ مگر سوچا کہ مجمع پر گھڑوں پانی پڑ جائے گا اور شاید اس Exposure کا مجمع متحمل نہ ہو۔ میں نے طرح پر ایک برجستہ نظم لکھی تھی۔ لیکن میری غیرت نے گوارہ نہیں کیا اور میں ایک چھوٹی سی غزل طرح پر پڑھ کر فوراً اُٹھ کر چلا آیا۔

www.taemeernews.com

اب اگر میں مظفر پور والی غزل انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ کے ایک ہزار اردو داں حضرات کے سامنے پڑھوں تو چند ہوں گے جو اِن اشاروں کی اہمیت آفاقیت، نشتریت اور شعریت کو سمجھیں گے ورنہ عام مجمع کے کانوں میں شاید جوں رینگ جائے اس سے زیادہ کی اُمید نہیں۔

جی ہاں تو میں نے غزل پڑھی اور اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا تو پنڈت بالمکند عرش ملسیانی جو "آج کل" کے اڈیٹر تھے اور دو ایک بار پٹنہ کے مشاعروں میں ملاقات ہو چکی تھی اور ایک بار بی۔ ان کالج بزم اُردو کے سالانہ مشاعرہ میں ترنم سے میں نے یہ غزل پڑھی :

کالے بادل جب لہرائے — آنکھوں میں آنسو بھر آئے
پھول کِھلے کِھل کر مرجھائے — رہ گئے ہم دامن پھیلائے
میرا لہو اُن کے کام آئے — کس کی دولت کون لٹائے

وغیرہ وغیرہ

اور اس کے بعد کئی اچھا پڑھنے والے شاعروں کو داد نہیں ملی اور عرش ملسیانی صاحب غزل پڑھنے کو آئے تو انہوں نے غزل پڑھی جس کا ایک بہت اچھا شعر اور مقطع مجھے یاد ہے۔ شعر بہت اچھا تھا اور مقطع حسب موقع تھا۔

دیکھ کر تجھکو اور کو دیکھوں — اب یہ معیار کم نہیں ہوتا
عرش دادِ سخن نہ ملنے سے — لطفِ اشعار کم نہیں ہوتا

مقطع پر کھڑے ہو کر میں نے داد دی۔ گویا میں نے تائید کی اور ان شعرا کی جنہیں میرے بعد داد نہیں ملی تھی تالیف قلوب کی۔ تو عرش صاحب میرے قریب تشریف لائے۔ مصافحہ کیا تعریف کی اور یوم جمہوریہ کے موقع پر ۲۶ جنوری کے لال قلعہ کے مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی اور شاید میں پہلی مرتبہ اسی سال یعنی ۱۹۶۱ء جنوری میں لال قلعہ کے جشن جمہوریہ میں شریک ہوا۔ اور جیسے ہی میرا نام پکارا گیا اور میں مائک کے قریب آیا کہ عرش صاحب نے للکارا۔ ہاں کلیم صاحب:

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا

اور میں نے گویا ان کا عندیہ اور منشا سمجھ کر یہی غزل لہک کر پڑھی اور کئی سال تک یہ غزل

www.taemeernews.com

"لال قلعہ" کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اور ہر مشاعرہ میں یہ فرمائش تقریباً عرش ملسیانی کے انداز میں ہوتی رہی کہ ہاں عاجز صاحب "لال قلعہ" سنائیے :

آنسوؤں کی مے بنی زخموں کا پیمانہ بنا

اُس کے بعد عرش ملسیانی صاحب میرے ایسے دوست بنے ایسے ہم خیال، ہم مزاج اور ہم آہنگ ہوئے کہ لال قلعہ اور دہلی ریڈیو کے بعض مشاعروں میں اپنے دہلوی ساتھیوں کے تیور سے بے نیاز اور بے پروا میرے ایک ایک شعر کی تعریف کے علاوہ اس کی اشاریت کو دلیری سے بے نقاب کر دیتے۔ وقت اور اقتدار کے خلاف جو طنز اور تیلیج ہوتا اُسے کھول دیتے۔

یہی حال مرحوم سلام مچھلی شہری کا میں نے دیکھا۔ بعض مشاعروں میں وہ اپنی مخصوص کیفیت میں جھومتے ہوئے آتے اور اسی انداز میں اپنے ساتھیوں کے اشعار پر سرِ مشاعرہ بے جھینپ تبصرہ کرتے۔ لیکن جب میں پڑھنے لگتا تو بے حد سنجیدہ ہو جاتے۔ اور ۱۹۶۲ء میں جب میں پہلی بار علی گڑھ یونیورسٹی طلبا کی یونین کے مشاعرے میں شریک ہوا۔ اس سال بہاری اور غیر بہاری طلبا میں چپقلش بڑی شدت کی تھی۔ اسی سال پہلی مرتبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخاب میں خواجہ کمال الدین کشن گنج کے ایک طالب العلم کو صدر منتخب کیا گیا۔ اس لیے یہ چپقلش اور بھی شدت اختیار کر گئی تھی۔ بصیر احمد خاں سکریٹری یونین جو شاید میرٹھ یا اترپردیش کے کسی شہر کے تھے مجھ سے بہت متاثر تھے اور لال قلعہ کے مشاعرہ میں ۲۶ جنوری کو آکر وہیں مجھ سے وعدہ لیا کہ واپسی میں علی گڑھ ہوتا ہوا پٹنہ جاؤں اور یونین کے مشاعرے میں شریک ہوں۔ میں علی گڑھ گیا، مشاعرے میں شریک ہوا۔ بصیر احمد خاں مشاعرہ کی نظامت کر رہے تھے۔ کرنل بشیر حسن زیدی صدر مشاعرہ تھے اور ہندوستان کے تقریباً تمام مشاعرہ باز شعرا موجود تھے۔ صدر کی بغل میں راہی معصوم رضا بیٹھے ہوئے تھے۔ راہی معصوم رضا صاحب پٹنہ میں میرے ایک کرم فرما سید امتیاز حسین ایڈوکیٹ کے بھانجے تھے۔ دو بار راہی صاحب بی۔ ان۔ کالج کے سالانہ مشاعروں میں تشریف لائے۔ میں تو جب تک میں مشاعرے میں شریک ہوتا رہا کسی بڑے یا مشاعرہ باز شاعر کا چراغ جل ہی نہیں سکا۔ اتنا محض اشارۃً کہہ دوں کہ الحمدللہ یہ حال پٹنہ میں ہو یا نہو اب بھی

www.taemeernews.com

یہ بات عالم عالم ہے۔ بہر حال تو راہی صاحب دوبار پٹنہ میں اور ایک بار کلکتہ کی اردو کانفرنس میں میری بے مثال کامیابی پر شاید ناراض تھے۔ چنانچہ علی گڑھ یونین کے مشاعرہ میں بصیر احمد خاں نے جب اعلان کیا۔ اب میں جناب کلیم عاجز صاحب سے درخواست کر رہا ہوں کہ تشریف لائیں۔ علی گڑھ والے دو سال لال قلعہ کے مشاعروں میں مجھ سے سن چکے تھے جانتے تھے، استقبالیہ تالیاں بجائیں لیکن میں مائکروفون کے قریب آکر اپنی چیز شروع کرنے والا تھا کہ راہی معصوم رضا صاحب بہ عجلت اپنے مقام سے اُٹھے اور مجھے سلام کرتے ہوئے مائک پر بظاہر معصومیت سے اعلان کیا "جناب کلیم عاجز صاحب بہار کے مشہور شہر عظیم آباد سے تشریف لائے ہیں"۔ جناب بس ایسا معلوم ہوا کہ بارود کے تودے میں دیا سلائی لگا دی گئی۔ بہاری غیر بہاری تناؤ طلبا میں شدت اختیار کر چکا تھا۔ لڑکے اُچھل اُچھل کر ہوٹ کرنے لگے۔ آوازے اور فقرے اور تالیاں اور ہوٹنگ۔ پھر تو بہاری طلبا بھی لپک اُٹھے۔ اور بہاری طلبا کے اس زمانے میں سرخیل ارشد علی ولد ریاست علی ندوی پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ تو کود کر اسٹیج کے قریب آگیا۔ بعض بہاری لڑکوں نے کہیں سے کچھ لکڑی کھینچ لی اور بہت مشتعل ہو کر قریب تھا کہ پٹائی شروع ہو جائے میں ہکا بکا ویسے ہی مائک کے قریب کھڑا تھا۔ کرنل بشیر حسن صاحب اُٹھے اور دو چار مقرر اساتذہ یونیورسٹی سامنے آگئے۔ مجمع کو پیار سے اور قاعدے سے سمجھانے لگے۔ مشتعل بہاری طلبا کو بٹھایا عام مجمع کو سنجیدگی اور شرافت برقرار رکھنے کی ترغیب دی۔ جب ماحول کچھ قابو میں آیا تو نشۂ مے میں بے قابو سلام مچھلی شہری اُٹھے مائک کے سامنے آئے اور میری بغل میں کھڑے ہو کر جس شستگی سے اور جس عقیدتمندی سے میرا تعارف کرایا ہے اُسے معجزۂ عشق ہی کہنا چاہیے۔ جو شرابیوں سے اکثر رونما ہو جاتا ہے اور جسے میں کرامت مے و مینا کہہ سکتا ہوں کہ کبھی کبھی ایسی کرامت بہترین توبہ کی توفیق بن جاتی ہے اور شاید اسی روز سے یا اس کے بعد ہی سے سلام صاحب نے ترک مے کر لی تسبیح و سجادہ سنبھال لیا۔ تو ان کا اس وقت مائک پر بالکل حمایتی اور عقیدتمندانہ انداز میں میرا تعارف واقعی معجزہ ہو گیا اور میں نے غزل پڑھنے کا ارادہ طے کر دیا۔ اور ایک غیر معروف قطعہ کے کچھ اشعار میری زبان سے نکل گئے۔ نہ میں نے یہ اشعار

www.taemeernews.com

پہلے کہیں پڑھے تھے نہ پڑھنے کا ارادہ تھا اور نہ یہ یاد ہے کہ یہ اشعار میں نے کس موقع سے کس کیفیت میں لکھے تھے۔

تم تو بے درد ہو بے تابیٔ غم کیا جانو　　اہل دل پر جو گذرتے ہیں ستم کیا جانو
شمع کیوں جلتی ہے سر تا بہ قدم کیا جانو　　ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ غم کیا جانو
تم سے ناحق ہے مجھے چشم وفا کی امید　　تم بھلا شیوۂ ارباب کرم کیا جانو

رسن و دار کو خاکِ کفِ پا بھی نہ ملا
کس جگہ اہلِ جنوں کا ہے قدم کیا جانو

وغیرہ وغیرہ

ان اشعار نے گویا مشتعل ماحول پر شبنم کی بارش کردی۔ سناٹا چھا گیا۔ میرے اشعار کے ساتھ ساتھ سلام مچھلی شہری کی دریا دلی، دردمندی، بے لوثی، بے ریا اور بے ساختہ محبت بھی کام کر گئی کہ اس کے بعد علی گڑھ یونین کی فضا بھی سازگار ہو گئی اور دوسرے دن جو مہمانوں کے اعزاز میں ڈنر تھا۔ خواجہ کمال الدین صدر یونین اور بصیر احمد خاں سکریٹری یونین کے علاوہ یونین کے اکثر غیر بہاری عہدہ دار اور ممبران محبت سے میرے آگے پیچھے تھے اور ٹیبل پر بیٹھنے کو جاتے ہوئے روش صدیقی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر میرا یہ شعر پڑھتے ہوئے جو میں نے چند ہی دن قبل لال قلعہ کے مشاعرہ میں سنایا تھا اور بہت لوگوں نے سنا تھا:

ہم تو مزدورِ محبت ہیں غزل کہتے ہیں
ایک فنکار کے ماتھے کا پسینہ ہے یہی

مجھے اپنے ساتھ کھانے کے ٹیبل پر گھسیٹا تو پورے مجمع نے تالیاں بجائیں اور داد دی۔

تو اس کے بعد مرحوم سلام مچھلی شہری بالکل تائب ہو گئے۔ اور جہاں کہیں میرا ان کا مشاعرہ میں ساتھ ہو گیا۔ میں گویا ان کا مرشد بن جاتا تھا۔ وہ توبہ ندامت مغفرت اور دعا ہی کی بات کرتے۔

www.taemeernews.com

ہومینٹی اسکالرشپ برائے اُردو کے کُل ہند مقابلے میں مجھے اسکالرشپ مل گئی۔ آج ۱۹۹۱ء کے دور میں شاید طلبا کو یہ سُن کر حیرت ہو کہ تیس سال قبل یہ آل انڈیا مقابلہ میں حاصل ہونے والا اسکالرشپ کتنا ہوتا تھا۔ آج تو غالباً گھر بیٹھے شعبے کی سفارش پر U.G.C. اسکالرشپ مستحق طلبار کو شاید دو دو ہزار روپے ماہانہ ملتی ہے۔ ہمارے زمانے میں پٹنہ سے دہلی جاکر آل انڈیا مقابلے میں شریک ہوکر ٹھنڈے پانی کا گلاس بار بار پی کر جل تُو جلال تُو وغیرہ قسم کا وظیفہ پڑھتے ہوئے مقابلے میں انٹرویو دے کر بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے سوالات کے جواب دے کر کوئی کامیاب ہوا تو یہ معرکہ جیتنے کے بعد کامیاب ہونے والے کو اسکالرشپ کتنی ملتی تھی؟ "دو سو روپے ماہانہ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ شاید ۴۴ روپیہ تھرڈ کلاس کا کرایہ تھا۔ کوئی عزیز مناسب مزاج مل گیا تو وہاں ٹھہریئے ورنہ ہوٹل میں کم از کم دس روپیہ روزانہ پر کمرہ کرایہ میں لیجئے۔ رکشہ کرکے دہلی سکریٹریٹ جایئے۔ چاروں طرف سے تیر جیسے سوالات کی بوچھار سہہ کر زندہ بچے تو لائے کتنے؟ صرف دو سو روپیہ ماہانہ۔ اور اس دو سو روپیہ ماہانہ سوارت کرنے کے لئے کیجئے کیا؟ تو کیجئے یہ پٹنہ سے جہان آباد جایئے ٹرین سے۔ پھر جہان آباد سے دیہاتی بس پر سوار ہوجئے۔ دائیں بائیں ہچکولے کھاتے ہوئے۔ بس کے مسافروں سے دائیں بائیں آگے پیچھے ٹکراتے ہوئے راستے کی گرد و دھول پھانکتے ہوئے۔ بال اور کپڑے، ٹوپی، شیروانی پاجامہ موزہ اور جوتے کو ریت اور گرد کی موٹی تہہ سے آراستہ کرتے ہوئے المتھوا پہونچئے وہاں شاہ طہٰ صاحب کی خانقاہ میں پہونچکر کپڑے اُتارئیے۔ منہ ہاتھ دھوئیے برش لے کر شیروانی ٹوپی سے گرد صاف کیجئے پھر شاہ صاحب کی ضیافت ناشتہ چائے سے کچھ تازہ دم ہوکر ایک رہبر لے کر المتھوا سے کچی سڑک پر یاد نہیں کے میل کا تھکا دینے والا سفر کرکے شاہ بیگہہ پہونچئے وہاں حافظ فضل حق آزاد مرحوم کے مکان میں ان کے بچے کھچے میلے زنگ آلود بکسوں کا جائزہ لیجئے دھجی پرزے نکالئے صاف کیجئے۔ انہیں قاعدے سے ترتیب دیجئے۔ پھر لالٹین کی مدھم

www.taemeernews.com

روشنی میں پڑھیے اور پکار اُٹھیے :

بے مشقت کبھی آرام نہیں ملتا ہے
گُل بھی ملتے ہیں تو کانٹوں میں نہاں ملتے ہیں

سنگ ریزوں میں گہر تھا مجھے معلوم نہ تھا
دل میں پتھر کے شرر تھا مجھے معلوم نہ تھا

اِن خاک نشینوں نے خانہ ویراں سازوں نے قناعت پسندوں نے گوشہ گیروں نے کیا کیا چراغ جلائے، کیا کیا قمقمے روشن کیے، کیا کیا فانوس آراستہ کیے، گدڑیوں میں کیا کیا گہر آبدار لپیٹ کر ڈال دیے خاکستروں میں کیا کیا چنگاریاں چھپا دیں ان کی زیارت سے آنکھوں میں چمک دل میں لہک روح میں چہک پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہار سے استھانواں جائیے، استھانواں سے ساتھی لیجیے۔ آریوں پر چلیے النگ پھلانگیے چھوٹے چھوٹے آبجوؤں کو چھلانگتے ہوئے، گوبر گوٹھے اور نواریوں کے ڈھیر سے گذرتے ہوئے دیسنا پہونچیے پھر وہاں سے نکلیے تو کھیتوں اور کھلیانوں سے کودتے، لپکتے اور نالوں سے دامن بچاتے ہوئے پاجامہ کھونٹتے ہوئے بلکھی معافی پہونچیے اور شعیب صاحب آنریری مجسٹریٹ کے مکان میں دھجی پرزے نکالیے اور پڑھیے :

پوچھا جو کسی نے احقرؔ سے کیوں طرز سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گُل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا
اب اور کسی کو کیا دیکھیں نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں
آنکھوں پہ تیری صدقہ کر کے جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا

یہ حُسن کی ہے سرکار احقرؔ غصہ بھی یہاں ہے پیار بھی ہے
ہر زخم جگر کے پھاہے میں کافور بھی ہے زنگار بھی ہے

www.taemeernews.com

کیا مے میں ملایا ہے تو نے کیا بات ہے اس میں اے ساقی
جو رند ہے اِس میخانے کا بیہوش بھی ہے ہشیار بھی ہے

تو در در گھر گھر کھنڈر کھنڈر دو سال خاک اُڑائی ایسے ایسے گاؤں گیا جن کا نام بھی سُنا تھا اور خس و خاشاک میں ردّیوں کے انبار میں کبھی کبھی ایسے دفینے مل گئے جن کی پہلے توقع بھی نہ تھی۔ دو سال ان کے اکٹھا کرنے اور ترتیب دینے میں لگ گئے۔ اور پھر جو انہیں سامنے رکھ کر لکھنے بیٹھا تو مسودہ بھی نہیں بنایا بس یونیورسٹی سے پیپر لایا اور لکھنا شروع کیا تو لکھنے میں وہ انہماک اور انہماک میں وہ لطف ملا کہ کبھی کبھی غزل یا نظم کی تخلیق میں بھی نہ ملا۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے اِن گمنام بوریہ نشیں دنیا بیزار اہل کمال کی تخلیقات کو برسہابرس کی بے توجہی ناقدری اور بے نیازی کی قبروں سے نکال کر ہم سے زیادہ توانا زندوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کی خوشی تخلیق کی خوشی سے زیادہ تھی۔ لکھنے کے دوران استاذی جمیل مظہری کبھی کبھی میرے مقالے کا کچھ حصہ پڑھتے پڑھتے آبدیدہ ہو جاتے اور شاہ عبدالعزیز عزیز عظیم آبادی خلف فضل آزاد عظیم آبادی تو ایک دن دیر تک گریہ اور ہچکیوں میں مبتلا رہے اور سکون ہونے کے بعد بہت دعائیں دیں اور کہا تم نے انہیں صرف زندہ نہیں کیا ہے بلکہ اپنے انداز بیان سے انہیں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

تو جناب پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار ہو گیا۔ میں نے تین ہی نسخے کاربن پر لکھے تھے وہ تینوں اکزامنرس کے یہاں چلے گئے۔ اسی دوران ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار کی کوششوں سے شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں ایک جگہ لکچرر کی اضافہ ہوئی۔ میرے دوست مصطفےٰ سیماب قادری جواب ایک کالج میں ریڈر ہیں اور زین الدین ایڈوکیٹ جو اب قبر میں محو خواب شیریں ہیں بے حد مُصر ہوئے کہ تم اس جگہ کے لئے درخواست دو تمہارا انتخاب ضرور ہو جائے گا کیونکہ تمہارا تعلیمی کردار اس وقت بے مثال ہے اور پی۔ ایچ ڈی بھی مکمل ہو ہی چکی ہے۔ مگر میں نے انکار کیا اس لئے کہ میرے علم میں یہ بات تھی کہ ذاکر حسین صاحب نے یہ جگہ اپنی کوشش سے اس لئے اضافہ کی ہے کہ وہ اختر اورینوی صاحب کی یوسف خورشیدی صاحب کے لئے مستقل سفارشی

www.taemeernews.com

دباؤ سے مجبور ہو گئے۔ میرے لئے یہ مناسب نہیں کہ یوسف خورشیدی صاحب جو مجھ سے سینئر طالب العلم ہیں اور اختر صاحب کے منظور نظر ہیں کی راہ میں کسی حد تک بھی رکاوٹ بنوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ درخواست نہیں دی مگر یہ دونوں احباب محبت میں اتنے دیوانے تھے کہ درخواست لکھی میری طرف سے جعلی دستخط بنایا۔ تمام متعلقہ کاغذات فراہم کئے اور یونیورسٹی میں داخل کر دیا۔ انٹرویو کارڈ اپنے پتہ پر منگوایا اور جب آگیا تو مسکین صورت بنائے تشریف لائے کہ غلطی ہو چکی اب اگر انٹرویو میں نہ جاؤ گے تو تمہارے لئے بھی آئندہ کے پیش نظر مفید نہیں ہے۔ مگر میں انٹرویو میں نہیں گیا۔ معلوم ہوا کہ واقعی بورڈ کے ممبر ڈاکٹر سید احمد صدر شعبۂ عربی پٹنہ یونیورسٹی اور چیرمین مسٹر جیکب وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی بار بار مجھے تلاش کر رہے تھے۔ اور میں حاضر نہ ہوا تو وہ دونوں اظہار افسوس کر رہے تھے۔

شاید ایک ہی سال بعد استاذی جمیل مظہری کی یونیورسٹی سے خدمات ختم ہوئیں وہ ریٹائر ہوئے اور اسی دن شعبہ میں تمام اساتذۂ اردو اور صدر شعبہ ڈاکٹر اختر اورینوی اور تمام طلبا و طالبات کے سامنے اعلان کیا کہ جو موضوع میں خاص طور سے پڑھاتا ہوں یعنی اردو شعر و ادب کا دور متوسط اس موضوع کو یونیورسٹی میں پڑھانے والا کلیم عاجز کے سوا دوسرا کوئی نہیں۔ اور اساتذہ نے تو نہیں اختر صاحب نے پرزور تائید کی۔ اور شاید چند ہی دن بعد میں اپنی معمولی دکان میں چوکی کے فرش پر بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر اختر اورینوی صاحب تشریف لائے۔ اور کھڑے ہی کھڑے شاید کوئی فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "کلیم صاحب اس کی خانہ پری کر کے فوراً مجھے دیجئے"۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے اور میں نے دیکھا کہ وہ لکچرر شپ کی درخواست کا فارم تھا۔ میں نے حیرت سے اختر صاحب کی طرف دیکھا وہ بولے "باتیں پھر کبھی درخواست فوراً مکمل کیجئے"۔ میں نے خانہ پری کر کے دستخط کیا اور ان کے حوالہ درخواست کی وہ چلتے ہوئے بولے "کل یونیورسٹی آجائیے گا"۔ میں دوسرے دن گیا تو دیکھا جمیل مظہری صاحب اور اختر صاحب شعبہ کے سائبان میں کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھے اور جیسا کہ ان کا معمول تھا۔ میری گردن میں ہاتھ ڈالے اور مسکراتے ہوئے مولانا روم کا یہ شعر پڑھا :

www.taemeernews.com

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما
کارساز ما بہ فکرِ کارِ ما

کلیم تم خود آنے سے انکار کرتے تھے مگر جب خدا کا حکم ہوا تو تم کو چھوڑا نہیں گیا۔ شاید دوسرے یا تیسرے دن بورڈ میں میرا انٹرویو تھا۔ اختر صاحب نے کہا۔ پی ایچ۔ ڈی کے امتحان کا نتیجہ نکلنے میں تو دفتری نزاکتوں کی وجہ سے دیر ہوگی۔ آپ جاکر متعلقہ کلرک سے مل کر اکزامنرس کے رپورٹوں کی نقل حاصل کر لیجئے۔ میں یونیورسٹی آفس گیا۔ میرے ساتھ مصطفےٰ سیماب قادری بھی تھے۔ فائل دیکھی گئی تو اس میں سے رپورٹیں غائب تھیں۔ پتہ لگا غائب کردی گئی ہیں۔ بہار سرکار کے بہت ذمہ دار وزیر کے صاحب زادے بھی اس جگہ کے لئے پرزور مدعی تھے۔ اختر صاحب کو خبر پہونچائی گئی۔ اختر صاحب بہت گھبرا گئے۔ اسی وقت میرے ساتھ یونیورسٹی آفس آئے۔ فائل نکلوایا رجسٹرار سے کہا میں اپنی رپورٹ نئی لکھ دیتا ہوں اور دوسرے اکزامنرس کے یہاں سے بھی رپورٹ منگوادوں گا۔ یہ ذمہ داری میری ہے۔

دوسرے دن انٹرویو ہوا۔ وائس چانسلر کے۔ کے دتا، ڈین فکلٹی آف آرٹس ڈاکٹر دیال، کلیم الدین احمد ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور رجسٹرار ڈاکٹر سیتارام اور ایک صاحب اکسپرٹ اور بھی تھے۔ وزیر کے صاحب زادے بھی انٹرویو میں تھے اور چار پانچ اور بھی تھے کچھ نام یاد ہیں کچھ نہیں ہیں۔ میں لکھوں گا نہیں۔ تو انٹرویو ہوا۔ اور واپس ہوتے ہوئے رجسٹرار ڈاکٹر سیتارام اور اختر صاحب نے مجھ سے مصافحہ کیا جس سے اندازہ ہوا کہ میرا انتخاب ہوگیا۔ باہر آیا تو مصطفےٰ سیماب قادری مرجھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ اندازہ سے وہ بھی سمجھ گئے کہ میرا انتخاب ہوگیا ہے۔ وہ خاموش میرے ساتھ آئے نماز ظہر کا وقت ہو رہا تھا سامنے داتا پیر بہوڑی مسجد تھی۔ ہم دونوں مسجد آئے وضو کیا نماز میں شامل ہوئے۔ پھر سنت پڑھ کر میں نے اٹھنا چاہا تو میرے پیچھے صف میں مصطفےٰ سیماب صاحب تھے۔ میں نے منہ پھیرا تو وہ سجدے میں ہچکیاں لے کر رو رہے تھے اور سجدے میں ہچکیوں سے ان کا بدن کانپ رہا تھا۔ انہیں میرے انتخاب کی بڑی خوشی تھی۔ یہ رونا غائت مسرت اور شدت جذبات خوشی سے بے قابو ہونے کے نتیجے میں تھا۔

www.taemeernews.com

یہ انتخاب عارضی تھا۔ کمیشن میں مجھے انٹرویو دینا تھا۔ ایک دو ماہ کے بعد ہی مجھے سفر حج میں ایک رشتے کے نانا کے ساتھ جانا ضروری ہوگیا۔ اختر صاحب نے کہا مسئلہ بہت نازک بھی ہے اور مشکل بھی۔ اوّل تو چھٹی ملنی مشکل ہے۔ تمہاری تقرری عارضی ہے اور پھر یہ دو ماہ کی تقرری تمہارے سروس ریکارڈ میں شمار نہیں ہوگی۔ پھر تم آؤ گے اور جوائن کرنے کی اجازت ملے گی تو اسی روز سے تمہاری تقرری شمار ہوگی۔ اور پھر یہ کہ کمیشن اگر تمہارے پیچھے میں ہوگیا تو سوال ہی نہیں تم حاضر ہوگے تو تقرری منسوخ اور مسترد ہو جائے گی۔ میں نے کہا جو ہو اب تو ارادہ حج ہوگیا ہے۔ مجھے تو ہر حال میں جانا ہے چھٹی ملے یا نہ ملے کمیشن ہو جائے میری تقرری مسترد ہو جائے لیکن سفر حج کیسے منسوخ ہو سکتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ضعیف اور ایک ضعیفہ ہیں۔ اختر صاحب نے معذوری ظاہر کی اور غمگین ہوئے۔ بہر حال میری درخواست سفارش کے ساتھ آگے بڑھا دی گئی۔ مجھے چھٹی مل گئی۔ میں فروری کی آخر تاریخوں میں حج مبارک کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ تقریباً ڈھائی ماہ مجھے وہاں لگ گئے۔ کمیشن کی نشست بھی نہیں ہوئی مئی کے وسط میں واپس آیا۔ جوائن کر لیا کلاس لینے لگا۔ ایک ہفتہ بعد ہی کمیشن کے انٹرویو کی نوٹس ملی۔ اور پورے ماحول کو اطلاع ملی کہ بہار سرکار کی پوری مشینری میرے خلاف ہے۔ اس زمانے میں کرشن ولبھ سہائے وزیر اعلیٰ تھے۔ اُن کے ایک نہایت محبوب دوست وزیر کے صاحب زادے کا مسئلہ تھا۔ تمام کیبنٹ اُن کی حمایت پر کمر بستہ تھی۔ مجھے اختر صاحب نے کہا۔ اب تو خدا ہی پر بھروسہ ہے میں سرکاری سطح پر تو کچھ کر نہیں سکتا۔ کمیشن کے ممبروں میں بیشک ایسے لوگ بھی ہیں جو صاحبِ کردار ہیں مگر ان کی اقلیت ہے۔ اکثریت ان کی ہے جو حکومت کے چشم و ابرو کے رہینِ منت ہیں۔ میں نے کہا میں تو اس کی توقع بھی نہیں کرتا تھا کہ مجھے یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے کبھی شامل ہونا ہے۔ میری عمر بھی اس کی حد سے کافی تجاوز کر چکی ہے۔ اس لئے میرا انتخاب نہ ہوا تو مجھے اس کا غم بھی نہیں۔ اختر صاحب بولے۔ مگر مجھے تو غم ہوگا۔

یہ بات شہر میں پھیل چکی تھی۔ یونیورسٹی بورڈ میں میرے انتخاب کی خبر لوگوں کو مل چکی تھی۔ اس دور میں تو اردو داں طبقہ خواص اور عوام مجھے بہت محبوب رکھتا تھا۔ ہر طرف اس کی چہ میگوئیاں

www.taemeernews.com

تھیں۔ایک دن میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے۔میں انہیں پہچانتا نہ تھا۔ پاجامہ کرتہ جواہر صدری اور گاندھی ٹوپی۔بولے میں وصی الدین ام ال اے ہوں۔میرا مکان محلہ میر داد بہار شریف ہے۔میں انہیں جانتا تھا۔ان سے ملنے کھڑا ہوگیا۔وہ بیٹھے اور پھر بات شروع ہوئی۔ کمیشن کی بات آئی۔بولے میں جانتا ہوں حالات سنے ہیں۔سرکاری حلقے میں آپ کی مخالفت کی فضا گرم ہے۔میں آپ کو ایک صاحب سے ملانا چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔وہ مجھے اپنے ساتھ رکشہ پر لے چلے یاد نہیں کون سی جگہ تھی۔سکریٹریٹ کے قریب کوئی جگہ تھی۔ایک مکان میں داخل ہوئے۔بہت لوگوں کا مجمع اِدھر اُدھر تھا۔سب کے درمیان سے گذرتے ہوئے وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئے کئی لوگ تھے۔ایک صاحب صوفے پر بیٹھے تھے میں جلدی میں انہیں پہچان نہ سکا۔دروازے سے داخل ہوتے ہی وہ صاحب کھڑے ہوگئے۔میرا استقبال کیا۔میں جب قریب آیا تو یاد آیا کہ یہ صاحب مدرسہ شمس الہدیٰ ہال کے ایک مشاعرے میں صدارت کررہے تھے۔اور بھی دو ایک مشاعروں میں انہیں دیکھا تھا۔وہ بہار کے وزیر مالیات ہیرچند پٹیل تھے۔کھڑے ہوکر مصافحہ کیا اپنی بغل میں بٹھایا خیریت مزاج پوچھی سدن صاحب نے مختصر بات کی۔یہ پٹنہ یونیورسٹی میں لکچرشپ کے لئے کمیشن میں انٹرویو دینے والے ہیں اور فلاں وزیر صاحب کے لڑکے بھی اس جگہ کے پرزور خواہش مند ہیں اور ان کی حمایت میں وزیر اعلیٰ اور بہت سے دوسرے وزرا ہیں۔پٹیل صاحب کی بول چال کی آواز عموماً بہت مدھم اور شیریں تھی۔لیکن یہ سنتے ہی وہ زور سے دھاڑے اور مجھے ان کا جملہ ہو بہو یاد ہے:

"ایں! کلیم عاجز کو لکچرشپ کے لئے پبلک سروس کمیشن میں جانا پڑ رہا ہے۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے اپنے سکریٹری کو بلایا اور کہا مسٹر رہنگی کو ٹیلیفون لگاؤ۔سکریٹری نے ٹیلیفون لگایا۔انہوں نے ریسیور کان میں لگا کر پوچھا کون بول رہا ہے۔مسٹر رہنگی کو بلاؤ۔ معلوم ہوا رہنگی صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔انہوں نے افسوس کے ساتھ ٹیلیفون رکھ دیا۔ اور کہا میں پھر ٹیلیفون کروں گا، بھلا کلیم عاجز کو کمیشن میں جانا پڑ رہا ہے۔یہ مسٹر رہنگی اُس زمانے میں پبلک سروس کمیشن کے چیرمین تھے۔

www.taemeernews.com

خیر جناب تو دوسرے ہی تیسرے دن انٹرویو تھا۔ میرا نام پکارا گیا۔ اندر گیا تو میں نے چار شخصوں کو پہچانا۔ ایک تو مسٹر جمنا پرشاد جو میرے تعلیمی دور میں پٹنہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ وہ اس وقت کمیشن کے فی الوقتی چیرمین تھے۔ رنگی صاحب موجود نہیں تھے۔ چار پانچ ممبر اور بھی تھے جنہیں میں پہچان نہیں رہا تھا۔ دوسرے شخص مسٹر بہار الدین سابق ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے یہ بھی کمیشن کے ممبر تھے۔ تیسرے شخص مسٹر کلیم الدین احمد تھے اور چوتھے شخص ڈاکٹر اختر اورینوی تھے۔ سوالات سب سے زیادہ مسٹر بہار الدین نے کئے۔ وہ مجھے خوب پسند کرتے تھے۔ وہ مجھے اس وقت سے جانتے تھے جب بیس پچیس سال پہلے میرے گاؤں تیلہاڑہ کے پڑوسی گاؤں نیانواں ان کا گھر تھا۔ وہ نیانواں سے تیلہاڑہ آتے جاتے تھے۔ بعد میں میری شاعری سے بہت متاثر بھی ہوئے اور اس تاثر کا اظہار محفل اور خلوت ہر جگہ کرتے رہے۔ مگر شاید یہ تاثر حد درجہ بڑھنے لگا تو تعریف میں ذرا محتاط ہو گئے۔ کبھی بے لطف تنقید بھی کر بیٹھتے باایں ہمہ بہت کھرے اور صاف گو انسان تھے معاملات میں بے لوث اور انصاف پسند تھے۔ میری صلاحیتوں اور استعداد سے بھی واقف تھے۔ اس لئے سوالات بہت جچ کر اور ناپ تول کر کر رہے تھے اور جوابات سے مطمئن بھی نظر آ رہے تھے۔ ان سے کم سوالات چیرمین مسٹر کر رہے تھے۔ وہ اچھے اردو دان تھے اور مزیدار گفتگو کرتے تھے۔ ہلکی چاشنی مزاح کی بھی ہوتی۔ دو ایک سوالات اختر صاحب نے ایسے کئے جن کے متعلق انہیں یقین تھا کہ بہت تشفی بخش جواب دوں گا۔ کلیم الدین احمد صاحب اس سے پہلے وائس چانسلر بورڈ میں بھی خاموش ہی تھے اور کمیشن میں وہ صرف مسکرا رہے تھے۔ دراصل ان کی رائے کی وقعت زیادہ تھی اس لئے فیصلوں میں ان کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ لیکن ایک بہت ٹیڑھا سوال مسکراتے ہوئے انہوں نے کر ہی دیا اور وہ سوال یہ تھا :

"کیا آپ کچھ اشعار اپنے سنائیں گے ؟"

اور اس سوال پر تقریباً سب لوگ ہنس دیئے یہ گویا کلیم الدین احمد صاحب کا فیصلہ ہو گیا۔ مجھے دہلی اسکالرشپ کا انٹرویو یاد تھا جب اسی قسم کا سوال آخر میں خواجہ غلام السیدین صاحب

www.taemeernews.com

نے کر دیا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ میرا انٹرویو کامیاب رہا اور کلیم الدین احمد صاحب کے اس سوال سے میں نے اور سب لوگوں نے سمجھ لیا کہ قرعۂ فال دیوانے کے نام پڑ گیا۔ کچھ دنوں معلوم ہوا کہ کمیشن میرے خلاف کمر بستہ تھی۔ اور مسٹر رتنگی رہتے تو مسئلہ ذرا مشکل ہو جاتا۔ وزارتی سطح سے پورا دباؤ کمیشن پر میرے خلاف تھا۔ مگر بہار الدین صاحب اور وقتی چیرمین صاحب اور کلیم الدین احمد پر سرکاری اثرات نہیں پڑ سکے اور ان کی مضبوط شخصیتوں نے کمیشن کے دوسرے ممبروں کو ابھرنے نہیں دیا۔ اور سب مرعوب ہو کر رہ گئے۔ مسٹر بہار الدین صاحب کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کے سمدھی نے جن کے داماد بھی اس تقرری کے زبردست اُمیدوار تھے۔ مسٹر بہار الدین پر رشتے کا بہت دباؤ ڈالا مگر انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میں حمایت کسی کی نہیں کروں گا استعداد اور استحقاق پر فیصلہ دوں گا۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ بہار الدین صاحب مجھ سے بہت متاثر تھے۔ اور اس تاثر کا تحسین آمیز اظہار خلوت و انجمن میں کیا کرتے تھے لیکن یہ تاثر حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو وہ اپنے تاثر کے اظہار میں بہت محتاط ہو گئے اور کبھی کبھی بے لطف تنقید ان کی زبان سے نکل جاتی۔ یہ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ بہار الدین صاحب کے انتقال کو کئی سال گذر گئے اس سے پہلے کئی سال وہ ذی فراش رہے اور اس سے کئی سال پہلے سے وہ گوشہ نشیں ہو چکے تھے۔ تقریباً بیس سال پہلے سے ان میں یہ انداز ناگواری نمایاں ہونے لگا تھا۔ جب کسی مجلس میں اپنے منظوم یا منثور اظہار خیال کے لئے مجھے پکارا جاتا تو وہ کسی بہانے سے اُٹھتے مجلس سے باہر چلے جاتے اور پھر واپس نہ آتے۔ تقریباً بارہ سال ابتدا شاعری سے سن ساٹھ باسٹھ تک وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھتے آہستہ آہستہ ان کی شگفتگی افسردگی کے لئے جگہ خالی کرنے لگی اور آہستہ آہستہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ جب وہ بالکل معذور ہونے لگے اور بلنگ پر دراز رہنے لگے تو میں عیادت کے لئے حاضر ہوتا تو ناگواری چہرے سے ظاہر ہونے لگتی اور باتوں میں خشکی پیدا ہو جاتی۔ اس طرح کا ردعمل میں نے اپنے بزرگوں میں ساتھیوں میں رفقائے کار میں ہم عصروں میں دوستوں میں یہاں تک کہ استادوں میں شاگردوں میں ہم عصر شعراء میں ادیبوں میں اس وقت

www.taemeernews.com

محسوس کیا جب ۱۹۷۶ء میں میرا پہلا مجموعۂ غزل "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" آب و تاب سے شائع ہوا اور اس کی تقریب اجرا، دہلی کے "وگیان بھون" جیسے اونچی سطح کے ہال میں صدر جمہوریہ مسٹر فخرالدین علی احمد کے ہاتھ سے مرکز کے کئی وزرا اور عمائدین شہر اور دینی اور ادبی اور سماجی شخصیتوں کی موجودگی میں منعقد ہوئی۔ اور وہ کتاب آناً فاناً ملکی سطح سے نکل کر بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوگئی۔ امریکہ کے محکمۂ اطلاعات اور برطانیہ کی لائبریریوں کے لئے بڑی تعداد میں کتاب خریدی گئی اور چند برسوں میں اس کی قیمت ۱۱۰/- روپے فی جلد سے بڑھ کر تین چار سو روپے فی جلد تک پہونچ گئی۔ اب میں یہ بات آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ یہ مجھ سے بھول ہوئی مگر اتنی بھول بھی ضروری ہے۔ میں کہ درد کا مارا دکھوں کا ستایا دشمنوں کا مٹایا اب دوستوں کا بھی کھویا کھپایا ہوگیا۔ میں کہ اپنوں پرایوں کے عشق میں رنجور ہوا درد محبت سے چور چور ہوا۔ انہیں سے دو ہوا۔ نہ شاعری ادب میرا خاندانی ہوردی پیشہ نہ روزگار نہ شعر پڑھنے کا سنانے کا خواستگار نہ چھپنے چھپانے کا خواہش مند نہ شہرت و ناموری کا آرزومند نہ نمود و نمائش کا امیدوار نہ تعریف و تحسین و توصیف کا تمنائی نہ آداب و تسلیم سلام و مصافحہ کا شیدائی، میں نے کہ گوشہ نشینی کم آمیزی بزرگوں سے سیکھی کم سخنی کم خوردنی کم خفتنی کی تربیت پائی مجلسوں سے دور رکھا گیا۔ صف اول کی بجائے صف آخر میں بٹھایا گیا۔ عاجزی اور فروتنی کا سبق سکھایا گیا۔ سر جھکا کر باہیں سننا نیچی نگاہیں کر کے دھیمے بول بولنا۔ بزرگوں کے پاؤں دبانا چلم چڑھانا حقے بھرنا قصور کا اعتراف کر لینا، معافی مانگنا عذر کے بول نہ سوچنا نہ بولنا اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی۔ اور یہ تعلیم اور یہ تربیت اور یہ سبق ایسا یاد ہوا کہ زندگی کے چھیاسٹھ سال گذر گئے، گاؤں کا، محلہ کا شہر کا دور کا نزدیک کا اپنوں میں پرایوں میں دوستوں میں دشمنوں میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان سب باتوں میں سے کوئی بات بھی جھوٹ ہے :

اس سے کینہ کیا پرخاش کیا جلن کیا رقابت کیا؟

میں ایک ٹھٹھ دھر شمشیر باز کا پوتا، ایک صوفی مولوی کا نانی ایک کم علم کم سخن کم آمیز لیکن جری سخی باپ کا پوت، ایک نحیف ناتواں لیکن دلیر، دریا دل دیندار شہیداں کا بیٹا۔ ٹھٹھ دھر شمشیر باز

www.taemeernews.com

دادا کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہ گیا۔ صوفی مولوی نانا اپنی بستی اپنا سجارہ چھوڑ کر نہ نکلا۔ باپ نے تیلہاڑہ اور کلکتہ کے علاوہ کسی دوسری منزل پر قدم نہ رکھا۔ ماں نے ایک عمر چادروں میں لپٹی سمٹی گذاری۔ اپنے بیمار شوہر کو لانے کے لئے تن تنہا برقعہ اوڑھ کر ایک ملازم کو ساتھ لے کر کلکتہ کا دور دراز سفر فرشتوں کے سہارے کر لیا اور پھر گھر میں آکر بیٹھی تو شہید ہی ہونے کے لئے اپنے اور کمسن بیٹی کے سر سے کفن باندھ کر ہی سکی اور پھر کبھی دنیا کی طرف منہ پھیر کر نہ دیکھا اور شہید ہونے کے بعد اپنے بیٹے کو ایسا گھر سے نکلوا دیا کہ سارے خاندان کی گوشہ نشینی کا پردہ چاک ہوگیا۔ اور وہ خانہ بدوش بیٹا ملکوں ملکوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اور ان گوشہ گیروں کم سخنوں دلیروں سخیوں کی فرشتہ نما شخصیتوں کے گیت گاتا پھرا محبت کے فسانے دہراتا پھرا درد کے نغمے بکھیرتا پھرا۔ ان کے نام پر ان کے کام پر آنسوؤں کے موتی نچھاور کرتا پھرا۔ اور کوئی کام نہ جانا، کوئی دھندا نہ جانا کوئی روزگار نہ جانا اسی کے لئے پڑھا اسی کے لئے پڑھایا اور یہی پڑھایا۔ اسی کی آواز بلند کی۔ اسی کی پکار لگائی اسی کی تصویریں تیار کیں اسی کی پرچھائیاں دکھائیں اسی کے نقشے بنائے اسی کے پیکر تراشے اسی کے مجسمے سجائے۔ ان تصویروں کو پرچھائیوں کو پیکروں کو مجسموں کو دیکھنے والوں نے پہلے حیرت سے دیکھا پھر قربت سے دیکھا پھر محبت سے دیکھا پھر پیار سے دیکھا۔ آگے بڑھے چھاتی سے سٹا گلے سے لگایا دل میں اتارا۔ جس کی جھولی میں جو تھا جتنی قدر شناسی میسر تھی جتنی فن شناسی تھی جتنی درد آشنائی تھی۔ وقت کے اس راجہ بھرتھری کی راہ میں لیکر کھڑے ہو گئے۔ اس آوارۂ صحرائے درد کو لیلا سب لیلا سب پیارے، اس بادیہ پیمائے محبت کو پیار بھی قبول دھتکار بھی قبول اسے پھول بھی قبول اور ببول بھی قبول۔ گل ہائے لالہ رنگ بھی قبول سنگ بھی قبول خار نگ بھی قبول اس نے نہ کبھی طرّہ لگایا نہ تمغہ لٹکایا نہ جھنڈا اڑوایا نہ نعرہ لگوایا۔ جو کچھ پایا سب کچھ اسی کاروانِ رفتگان کی یاد میں لٹایا۔ اسی قافلۂ شکستہ دلاں کے نام بھجوایا:

www.taemeernews.com

کوئی ہم سے کاہے خلاف ہے کہ حساب اپنا تو صاف ہے
جو ہم اسی گلی میں کمائے تھے سب اسی گلی میں لٹا گئے

اب ہم سے کوئی جل کر ہمارا کیا جلائے گا کون سی ایسی چیز رہ گئی ہے جو نہیں جلی ہوئی ہے گھر کب کا جل چکا بستی کب کی جل چکی دل کب سے جل رہا ہے۔ عزت شہرت سروری نام وری، رعب داب وقار سنگار پٹار نام ناموس نشان زبان رکھ رکھاؤ طرح داری وضع داری عہدہ منصب مقام کون سی چیز رہ گئی ہے جو لٹنے جلنے خاک ہونے برباد ہونے کے لئے باقی رہ گئی؟ دوسروں کا چہرہ دوسروں کے خیالات دوسروں کے افکار دوسروں کی معاشرت دوسروں کا لباس پہن کر کہتے ہو ہم ہیں میاں تم کہاں؟ تم تو کب کے جل کھُپ چکے اپنی خاک اپنی ارتھی اپنا جنازہ اُٹھائے پھرتے ہو اور کہتے ہو ہم ہیں۔ ہاں بس یہی ادارہ روزگار ہے کہ جل بھن کر بھی وضع داری دکھا رہا ہے۔ کج کلاہی نباہ رہا ہے

دامن کی جو بدھی ہے گریباں کا سہرا
نوشاہ بنا پھرتا ہے دیوانہ کسی کا

جو پوری توانائی کے ساتھ پورے وثوق کے ساتھ پورے اعتماد کے ساتھ فخر اور ناز کے ساتھ طنطنے امنگ اور مستی کے ساتھ یہ نعرہ لگا سکتا ہے۔

بچی ہوئی ہے محبت کی آبرو ہم سے
ہم اِس زمانے میں آگ زمانے والے ہیں

اور دائیں بائیں اردگرد پورب پچھم اتر دکھن دور اور نزدیک دیس اور بدیس کسی میں ہمت نہیں کہ سامنے آئے اور کہے کہ ہم بھی تو ہیں کوئی نہیں ہے۔ اقبالؔ کہہ گئے اور حق تو یہ ہے اور سچ تو یہ ہے اقبالؔ کے بعد یہ خارِ سینۂ اہلِ وطن یہ غبارِ خاطرِ انجمن ہی ہے جو پوری سرمستی اور سرشاری کے ساتھ کلاہ کج کر سکتا ہے اور اقبالؔ کی زبان میں یہ کہہ سکتا ہے۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

www.taemeernews.com

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

اقبال اسلامی شعار کا ماتم کرتے ہیں۔ میں تو صرف اسلامی شعار کا ہی نہیں انسانی شعار کا بھی ماتم گذار ہوں۔ میں صرف یہ نہیں کہتا کہ ہائے کیا ہوا مسلمانوں کو۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ۔ ہائے کیا ہوگیا زمانے کو۔ رونا شیروانی ٹوپی ہی کا نہیں ہے دھوتی لنگوٹی کا بھی ہے۔ متاع کارواں ہی نہیں جاتا رہا متاعِ شہر ہی لُٹ گئی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم تو حصارِ شہر تھے، ہم تو محافظ فصیل قلعہ تھے فصیل گری تو قلعہ بھی گرا اور شہر بھی لُٹا۔

یہ شہر عظیم آباد جسے میں نے پہلے پہلے شعور کی آنکھوں سے اس وقت دیکھا جب ۱۹۳۸ء کے وسط میں مسلم اسکول میں داخل ہوا۔ اور پھر درد بھری غمگین آنکھوں سے اس وقت دیکھا جب آٹھ نو سال بعد ایک غریب الوطن کا یہ شہر وطن بنا۔ اس شہر عظیم آباد کی جھلکیاں اپنی پچھلی کتاب میں دکھا چکا ہوں اور اس کتاب میں بھی پرچھائیاں آگئی ہیں۔ ہائے کیا ہوگیا زمانے کو۔ کچھ تو لوگ ہی نہیں رہے۔ خود چلے گئے مگر اپنی پہچان چھوڑ گئے۔ اور جو اس وقت کے لوگ رہ گئے وہ اپنی پہچان ایسی کھو بیٹھے جیسے سانپ کینچلی چھوڑ دے یا کوئی خاتون اپنا برقعہ اتار دے یا کوئی بہروپیہ اپنے اصلی روپ میں آجائے یا یہ کہ بہروپیہ ہی کوئی دوسرا روپ بدل لے۔ کاش ایسا ہی ہو۔ گرچہ ایسا ہے نہیں۔ نہ سانپ نے کینچلی چھوڑی ہے نہ خاتون نے برقعہ اُتارا ہے نہ بہروپیہ نے روپ بدلا ہے بلکہ یوں کہئے کہ سیلاب آیا اور سب غازہ پوڈر طرّہ بدھی سہرا مکنہ پگڑی عمامہ چپکن اچکن ازار شلوار دری چاندنی خیمہ قنات فرش کرسی بہالے گیا۔ اب کسی کو یاد نہیں کون نوشہ تھا کون شہ بالا کون سمدھی تھا کون گویا کون وکیل کون گواہ کون سراتی کون براتی کون میاں جی کون بجنیا کون باورچی کون نان بائی۔ سیلاب ختم ہوا تو سب دکانوں سے ریڈی میڈ کپڑا لے آئے ریڈی میڈ کھانا لے آئے۔ ریڈی میڈ نام ریڈی میڈ کام ریڈی میڈ رشتہ ریڈی میڈ محبت، ریڈی میڈ تعلق ریڈی میڈ مذہب ریڈی میڈ فلسفہ ریڈی میڈ فن، ریڈی میڈ تہذیب۔ سب ریڈی میڈ۔ سب کچھ سپلائی والے کا۔ اپنا کچھ نہیں۔ جو سپلائی آرہا ہے

www.taemeernews.com

وہی پہن رہے ہیں وہی کھا رہے ہیں وہی سن رہے وہی بول رہے ہیں وہی سوچ رہے ہیں وہی لکھ رہے ہیں وہی پڑھ رہے ہیں وہی پڑھا رہے ہیں۔ بات سچی کہتا ہوں۔ سب کچھ ریڈی میڈ ہے۔ حکمراں کے پاس بھی محکوم کے پاس بھی۔ آقا کے پاس بھی نوکر کے پاس بھی۔ کارخانہ دار کے پاس بھی مزدور کے پاس بھی۔ استاد کے پاس بھی شاگرد کے پاس بھی۔ پروفیسر کے پاس بھی اور اسٹوڈنٹ کے پاس بھی۔ کسی کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے سب مستعار ہے اور ایک ہی برانڈ ہے۔ باپ کا سب کچھ ریڈی میڈ ہے اور بیٹے کا بھی اور بیوی کا بھی اور شوہر کا بھی۔ یہ تمام ریڈی میڈ برانڈ ان دنوں ٹی وی پر سپلائی ہوتا ہے اور ریڈیو سے اور اخبارات سے اور رسالوں سے اور کتابوں سے۔ یہ امرتا پریتم برانڈ ہے۔ یا عصمت چغتائی برانڈ یا قرۃ العین برانڈ یا منٹو برانڈ اور سینکڑوں انگلش برانڈ۔ یہی برانڈ ایوان حکومت سے بھی نکلتا ہے۔ چاہے وہ کانگریس برانڈ ہو یا جنتا برانڈ یا مسلم لیگ برانڈ۔ یہی برانڈ ایوان حکومت سے چل کر کتابوں کے شوکیس میں اور اخبارات و رسائل کے شوروم میں آتا ہے اور یہی ریڈی میڈ برانڈ گھروں میں بھی چلتا ہے اور محفلوں میں مجلسوں میں تعلیم گاہوں میں یونیورسیٹیوں میں مدرسوں میں خانقاہوں میں۔ سب کا اپنا اپنا برانڈ ختم ہو چکا ہے۔ اب تو دو چار نئے شاعروں کے مجموعے خرید لیجئے۔ دس پانچ غزلیں پڑھئے اور ان کی مدد سے ایک غزل تیار کر لیجئے۔ اب میر کو کون پڑھے۔ غالب کو، اقبال کو مصحفی کو آتش کو ناسخ کو امیر کو داغ کو عزیز کو صفی کو شاد کو حسرت کو جگر کو اصغر کو کون پڑھے۔ یہ دل بھی چاہتے ہیں اور دماغ بھی۔ اور یہاں ریڈی میڈ کا چسکا آگیا ہے۔ بیکاری کی وجہ سے دل و دماغ دونوں معطل ہو چکے۔ دو چار مضامین پڑھ لیجئے اور ایک عدد مضمون لکھ لیجئے۔ دو چار دس کتابیں سرسری پڑھ جائیے۔ ان کے کچھ اقتباسات لکھ لیجئے اور کتاب تیار۔ بازار سے نوٹس لائیے وہی پڑھو وہی پڑھاؤ اور اب تو ہر موضوع پر مشترک مواد تیار ہے تھوڑے سے جزوی مواد مہیا کر کے جس موضوع پر ہو ایک عدد تھیسس تیار کر کے شاگرد کر کے حوالے کیجئے۔ دس پانچ ہزار فیس لے لیجئے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کرا دیجئے۔ روپیہ کا روپیہ آگیا اور کوالیفیکیشن الگ بڑھ گیا۔ یونیورسٹی میں پروموشن کا چانس بھی قریب ہو گیا۔ اب نہ

www.taemeernews.com

ادیب میں انفرادیت ہے نہ شاعر میں نہ نقاد میں نہ محقق میں نہ افسانہ نگار میں نہ ناول نویس میں کیونکہ سارا کام تو ریڈی میڈ مواد سے چل رہا ہے۔ انفرادیت گھر میں داخل ہو تو کیسے سب دروازے بند ہیں۔ ایسے میں کوئی انفرادیت بیٹے لپیٹے کسی محفل میں آگیا تو شمشیر کمینچ گئی کمان تن گئی۔ یہ Common Brand میں Special Brand کیسے آگیا؟

غزل کس کی ہے؟ یہ انداز بے باکانہ کس کا ہے؟
اسے محفل میں لایا کون یہ دیوانہ کس کا ہے؟
یہ کس کو مل گئی بوتل شرابِ میر و آتش کی
خرد کے دور میں یہ نغمۂ مستانہ کس کا ہے؟

تو اس شہر عظیم آباد میں مشرق سے مال سلامی کی سرحد عبور کر کے عظیم آباد میں داخل ہو جئے تو پہلے جہاں یہ عالم تھا کہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اب یہ حال ہے کہ بھاگو ورنہ دامنِ دل میں ایک تار بھی باقی نہ رہے گا:

کھڑے ہیں ناخنوں کو تیز کر کے ہر طرف کانٹے
گلستاں میں ہمارے پیرہن کی آزمائش ہے

نہ کوئی منظر ملے گا نہ کوئی صورت ایسی ملے گی جو آنکھوں کو سہائے نہ کوئی آواز ایسی ملے گی جو کانوں کو بھائے نہ کوئی ایسی بات ملے گی جو دل میں سمائے، نہ اخباروں میں کوئی ایسی خبر نہ رسالوں کوئی ایسا مضمون نہ کتابوں میں کوئی ایسا موضوع ملے گا جو ہمیں اپنے مقام سے اٹھائے کچھ سہارا دے، ایک قدم بڑھائے۔ بس جہاں ہیں وہیں رہیے۔ دوسروں کے جیب بھرے دیجئے اپنا دامن و جیب خالی لے جائیے۔ نہ باتوں میں خلوص نہ گفتگو میں مزا نہ لہجہ میں گرم جوشی۔ ہر وقت بناوٹ ہر جگہ صناعی۔

تو کیا بتاؤں کیا کیا جی چاہے ہے۔ آپ نہیں چاہتے۔ مگر ہم چاہتے کہ جو آپ نہیں

www.taemeernews.com

چاہتے ہم وہی چاہتے جائیں یہاں تک کہ آپ بھی وہی چاہنے لگیں۔ یا آپ کے دل میں بھی اسی بات کا ارمان جاگ جائے۔

ہم تو کچھ چاہے ہیں تم چاہو سو کچھ
وقت کیا چاہے ہے دیکھا چاہیے

رات گذر رہی ہے اور شمع داغِ فراق صحبت شب کی داستان ادھوری بھی نہیں کہہ سکی ہے۔ چار سو صفحات تک بات پہنچنے والی ہے مگر لگتا ہے ابھی بات شروع کی ہے۔ ابھی تو مئے آئی ہے پھر صراحی آئے گی تب جام آئے گا اور پھر پینے والے آئیں گے۔ لیکن نہ ہمیں تاب نہ آپ کو دماغ۔ جتنی بات کہہ گیا ہوں۔ مئے تو موجود ہے صراحی بھی آجاسکتی ہے جام بھی آجاسکتا ہے۔ پینے والے بھی آجاسکتے ہیں، مگر پینے کا سلیقہ کہاں سے آئے گا۔ بس ایک کے نہ ہونے سے سب کا ہونا اکارت یا ہونا نہ ہونا برابر۔ بس زندگی میں اسی سلیقے کی کمی ہی نہیں اس کی پہچان ہی ختم ہوگئی سلیقہ بھی کوئی چیز ہے "دھنگ بھی کوئی چیز ہے کسی کو یاد ہی نہیں۔

ہر ایک بات اُس بُتِ کافر ادا میں ہے
لیکن وہ بات ہی نہیں جو بات چاہیے

وہ عظیم آباد جب جام تھا جم نہیں تھا۔ ساقی کی نظر میں سم نہیں تھا۔ اندیشۂ بیش و کم نہیں تھا۔ ہم اسی عظیم آباد کو چاہتے ہیں۔

جو ہم تلاش کرتے ہیں جو چاہتے ہیں ہم
جانِ عزیز بیچ کے لے لیں اگر ملے

اِس عظیم آباد کو رخصت ہوئے بہت دن نہیں ہوئے ہیں۔ بس مل جل کر پکارو تو جاتا ہوا عظیم آباد گھوم کر دیکھ لے گا اس نیت سے کہ پھر کوئی بلائے۔ ہائے بقول رحمت

کوچۂ جاناں سے نکلے تو نکل کر رحمت
منتظر ہیں کہ ہمیں پھر بھی بلائے کوئی

عظیم آباد خود جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُسے دھکے دے کر نکالا گیا۔ سامان باندھتے، اُٹھتے نکلتے

www.taemeernews.com

دیر ہوتی ہے ۔ مگر یہ تو ایسا لگتا ہے کہ عظیم آباد کو لنگوٹی میں نکال دیا گیا ۔ ابھی تو اختر صاحب تھے ۔ جمیل مظہری صاحب تھے ابھی تو سہیل تھے ۔ ابھی تو زار تھے ثاقب تھے ۔ اور دور کیوں جاؤ ابھی تو عطا ہیں ۔ لیکن عطا کے صاحبزادگان سے پوچھو ۔ پوچھو پوچھو بھئی ذرا پوچھو سہیل صاحب زار صاحب، ثاقب صاحب کے گھرانوں میں آواز دو بھئی یہ کس کا مکان ہے ؟ بھئی آپ کس کے صاحب زادے ہیں ۔ جواب ملے گا تو آپ کو یقین نہ آئے گا ۔

میں ایک روز اپنی دکان میں بیٹھا تھا ۔ مشاعروں میں شریک ہوا کرتا تھا ۔ کئی ماہ سے حلق میں تکلیف تھی ۔ لحن سے پڑھنا ذرا مشکل ہو رہا تھا ۔ سینک سا نک کر رہا تھا ۔ کلی غرارہ کر رہا تھا ۔ مگر ٹونسل دب نہیں رہا تھا ۔ تو میں دکان میں بیٹھا ہوا تھا ۔ گلے میں گلوبند لپیٹے ہوئے تھا ۔ دیکھا سامنے سے زار صاحب ایک بڑی سی پوٹلی لئے چلے آرہے ہیں ۔ میں کھڑا ہو گیا ۔ آداب عرض زار صاحب ۔ ارے میاں سلام علیکم کہو ۔ سلام علیکم کہو میاں ۔ سلام علیکم زار صاحب وعلیکم السلام ۔ مصافحہ ۔ معانقہ ۔ اور قبل اس کے کہ میں مزاج پوچھوں ۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا ۔

"سنو پہلے یہ کام ہوگا ۔ پھر آگے کی بات ۔"

انہوں نے پوٹلی کھولی ۔ تو سبز توت کا ڈھیر تھا ۔

"لو پہلے خوب پیٹ بھر کر یہ توت کھاؤ ۔"

"زار صاحب یہ تو کچے توت ہیں بہت ترش ہوں گے ۔"

"ارے میاں یہ کچے بالکل نہیں پکے ہوئے ہیں ۔ یہ بازاری نہیں بالکل خانہ ساز ہیں ۔ یعنی میرے آنگن کے ہیں ۔ اور یہ ترش ہیں ؟ میاں کھاؤ گے تو تمام مٹھاس بھول جاؤ گے ۔ لو کھاؤ ۔ تمہارے گلے میں بہت دنوں سے تکلیف سن رہا ہوں ۔ انشاء اللہ اس سے وہ تکلیف رفع ہو جائے گی ۔ میاں تمہارے ترنم میں فرق آگیا ہے ۔ اور ہم جب تک تم سے غزل تمہارے مخصوص لحن میں نہیں سن لیتے ہمیں تو بیتابی رہتی ہے ۔"

چنانچہ میں نے توت زبان پر رکھے تو بالکل سبز اور بظاہر بالکل کچے توت اتنے شیریں

www.taemeernews.com

تھے کہ واقعی مجھے مٹھاس کا ایک بالکل ہی نیا تجربہ ہوا۔ زار صاحب بہت دیر بیٹھے اور ایسا بیٹھے کہ جیسے میں ان کا ہم جلیس ہوں، بے تکلف دوست ہوں۔ حالانکہ کیا بہ لحاظ عمر کیا بہ اعتبار بزرگی، فن اور شاعری وہ ہم سے بہت بڑے تھے۔ مگر یہ عظیم آباد والے باہر جتنے دکھائی دیتے تھے اس سے بہت زیادہ اندر ہوتے تھے۔ بات کم تھی لیکن بات کی تاثیر بہت تھی۔ مروت محبت دکھانے کا موقع کم تھا مگر خزانہ بہت بڑا تھا۔ اب تو کوئی چیز حلق سے نیچے ملتی ہی نہیں۔ جو کچھ ہے زبان پر ہے۔ جو کچھ ہے سوٹ بوٹ میں ہے، جو کچھ ہے ٹائی رومال میں ہے۔ ان سے بچتا ہی نہیں کہ سینے کے اندر جیب کے اندر، دل کے اندر انسان کچھ رکھے۔ سب کچھ ظاہر پہ لگا کر اندر سے انسان کنگال ہو جاتا ہے۔

زار صاحب بیمار ہوئے تو اندرا گاندھی کارڈیولوجی میں میری شام گذرتی تھی۔ اور زار صاحب یوں نظر کرتے تھے کہ بس اب غزل شروع کرنے والے ہیں۔ اب ترنم بلند ہوگا اور اب تیور کھنچینگے اور اب بدن جھومے گا اور اب واہ واہ ہوگی۔ اور اسی ٹھاٹ اور اسی تیور اور اسی مسکراہٹ سے جان دے دی:

کل مجھے لے کر وہ قبرستان میں — تربتیں لوگوں کی دکھلاتے رہے
یہ سکندر رہے یہ دارا ہے یہ قیس — عاشقانِ ناز تھے جلتے رہے
ایک تربت پر مگر مل مل کے ہاتھ — دیر تک افسوس فرماتے رہے
میں نے جب پوچھا یہ کس کی قبر ہے — آپ جو رہ رہ کے پچھتاتے رہے

ہنس کے بولے یہ سخی کا ہے مزار
جان دیدی لاکھ سمجھاتے رہے (سخی عظیم آبادی)

ہائے عظیم آباد۔ ہائے زار عظیم آبادی!

دکان میں بیٹھا ہوں کہ سامنے سے سہیل صاحب داخل ہوئے۔ علیگڈھ پاجامہ شیروانی باٹا کا ناگرہ جوتا بال بکھرے ہوئے اور انگلیوں سے بالوں میں گرہ دیتے ہوئے نیم مسکراہٹ نیم سنجیدگی۔

www.taemeernews.com

"میاں کلیم تم ابھی پٹنہ میں موجود ہو نا۔"

"ہاں سہیل صاحب ابھی تو قیام ہے۔"

"تو دیکھو میں آج ہی کنٹراکٹ بھجوا رہا ہوں۔ ریڈیو پر تمہیں غزل پڑھنی ہے۔"

دوسرے دن صبح کو ڈاک سے کنٹراکٹ موجود۔ اور اسی شام کو دیکھتا ہوں کہ سہیل صاحب پھر تشریف لا رہے ہیں۔

"کنٹراکٹ مل گیا کلیم؟"

"ہاں سہیل صاحب مل گیا۔"

"تو اس کی اردھ کٹی دستخط کر کے آج ہی بھیجدو یا کل بھیجدینا۔"

دو روز بعد دیکھا پھر سہیل صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

"ارے میاں تم تو نہایت نالائق ہو۔ تم نے ابھی تک کنٹراکٹ واپس نہیں کیا؟"

"بھول گیا سہیل صاحب آج یا کل بھیجدوں گا۔"

دو روز بعد دیکھتا ہوں پھر سہیل صاحب بالوں میں انگلیوں سے گرہ دیتے ہوئے موجود اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"تم میاں نرے شاعر ہو۔ نکالو کہاں ہے کنٹراکٹ؟"

میں نے ندامت اور عجلت کے ساتھ کنٹراکٹ نکالا۔

"اس پر دستخط کرو تاریخ دو اور وہاں Initial کر دو۔"

اور دو تین روز بعد پروگرام ریکارڈ کرانے پہونچا تو اس زمانے میں شاید Live Broadcast ہوتا تھا۔ جہاں میں پڑھ رہا ہوں وہیں سہیل صاحب بیٹھے ہوئے ہیں مگر خاموش ہیں کچھ بول نہیں سکتے اور میں غزل پڑھ رہا ہوں۔

اس غریبی میں بھی چاہتے ہیں سر اونچا کر کے
ہم بھی اے دوست کلہدار ہیں اپنے گھر کے

دن بسر کر کے مشقت کی کڑی دھوپ میں ہم
شب کو سو رہتے ہیں ہاتھ اپنا سرہانے دھر کے

ایک چلو بھی نہ اپنے لئے باقی رکھا
اوروں کو بانٹ دیئے ساغر و مینا بھر کے

www.taemeernews.com

ہم کو با ایں ہمہ پہچان رہی ہے دنیا
تاج گو اوروں کے سر پر ہیں ہمارے سر کے

تم نے دیکھی نہیں ہمتِ اربابِ وفا
زندگی ہے تو دکھا دیں گے کسی دن مر کے

تم تو مصروفِ چراغاں تھے تمہیں کیا معلوم
اِس دوالی میں دئے بجھ گئے کتنے گھر کے

غمِ جاں بھی، غمِ جاناں بھی غمِ دوراں بھی
ایک دل کے لئے سامان ہیں دنیا بھر کے

میں غزل جوش میں پڑھے جا رہا ہوں اور سہیل صاحب منہ سے آواز نہیں نکال رہے ہیں مگر بیٹھے بیٹھے اِس پہلو گھوم رہے ہیں اُس پہلو گھوم رہے ہیں ہاتھ چمکا رہے ہیں اور جیسے ہی غزل ختم ہوئی اور مشین بند ہوئی سہیل صاحب تڑپ کر بول اُٹھے۔

"ہائے مار ڈالا۔ عزیز مار ڈالا بس مار ڈالا۔"

اب ریڈیو میں تقریباً اکثر میرے شاگرد ہی ہیں۔ بس چھ ماہ پر ڈاک سے کوئی کنٹراکٹ آجاتا ہے۔ میں تو جاتا ہی نہیں مگر کوئی پوچھنے بھی نہیں آتا۔ کنٹراکٹ کیوں نہیں بھیجا۔ پروگرام میں کیوں نہیں آئے۔

ہائے عظیم آباد۔ ہائے سہیل عظیم آبادی!

چالیس سال پہلے میں نے شاعری شروع کی۔ نیم جان عظیم آباد بھی کتنا جاندار تھا۔ لوگ گذر گئے تھے پھر بھی بہت لوگ تھے۔ میں نے جب شاعری شروع کی تو نہ باقر تھے۔ شاد نہ آزاد تھے نہ بیتاب نہ موج تھے نہ آباد۔ لیکن اُن کی اولاد یا ان کے جانشیں تھے اور انہیں دیکھ کر باقر یاد آجاتے تھے۔ شاد یاد آجاتے تھے۔ آزاد یاد آجاتے تھے موج یاد آجاتے تھے۔ سید محمد ثاقب "ثاقب عظیم آبادی" اس وقت ساٹھ سال کے ہوں گے۔ میں پچیس ۲۵ چھبیس ۲۶ سال کا۔ لیکن حمید عظیم آبادی کی انجمن نو بہار ادب میں طرح کی غزلیں میں نے پڑھی۔ گرچہ ثاقب صاحب مشاعرے میں موجود نہ تھے لیکن دوسری شام کو دکان میں تشریف لے آئے۔ سن کے اتنے فرق کے باوجود وہ مجھے کلیم صاحب کہتے۔ بھئی کلیم صاحب آپ نے خوب غزل پڑھ دی (مجھے غزل یاد نہیں نہ وہ مجموعہ میں ہے)

www.taemeernews.com

"کل بھی زنجیر میں تھا آج بھی زنجیر میں ہے"

سچ کہتے ہیں آپ کلیم صاحب آزادی ملی مگر ہمارے لئے کیا۔ کل بھی زنجیر میں تھے۔ آج بھی زنجیر میں ہیں۔

ادھر سے محمود علی خاں صبا آرہے ہیں، اُدھر سے عزیز الحق عزیز عظیم آبادی خلف فضل حق آزاد عظیم آبادی۔ ادھر سے زار صاحب آرہے ہیں۔ اُدھر سے حسین احمد رعنا ادھر سے شاہ جھبو صاحب بسمل ادھر سے بدرالدین بدر عظیم آبادی۔ ادھر سے ماسٹر سفیع حیدر ادھر سے ہوش عظیم آبادی، ادھر سے غضنفر نواب دانش عظیم آبادی۔ شاد مرنے پر بھی زندہ تھے۔ آزاد مرچکے تھے، باقر مرچکے تھے، بیتاب، موج سب کو مرے ہوئے جگ بیت چکے تھے۔ لیکن میرے سامنے بھی وہ زندہ تھے۔ شاد کی روایت، آزاد کا آہنگ، باقر کا لب سب موجود تھا۔ اثر میں نے دیکھا اور برسوں دیکھا رہا یک بیک گذشتہ بیس پچیس سال میں سب مرگئے۔ شاد، آزاد، باقر، مبارک، اثر، داغ، امیر سب پہلے مرچکے تھے۔ مگر میرے عہد میں سب دفن ہوگئے۔ اُن کی اولاد ہے ان کے سلسلہ ہیں مگر دیکھو تو سب کسی اور ہی دنیا کے اور ہی قبیلے کے اور ہی ملک کے اور ہی زبان اور ہی تہذیب کے لوگ معلوم ہوں گے۔ واقعی شاد کے مرنے کے پچاسوں برس بعد شاد کا شعر اتنا بیقرار کرتا ہے کہ بیس پچیس سال پہلے ایسی بیقراری کسی کو نہیں ہوئی ہوگی۔ شعر سنو گے تو ایسا لگے گا کہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔

ڈھونڈھو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

اس حسرت و غم اور اس خواب کو اُن کے عہد میں اور ان کے جانشینوں اور شاگردوں کے عہد میں کسی نے محسوس نہ کیا ہوگا۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اپنی ہی چھری سے اپنا گلا کاٹ لیجئے۔

اِن باتوں کو گذشتہ پندرہ بیس سال کے دوران ہم دو آدمی بے حد محسوس کرتے بے اختیار محسوس کرتے اور بے اختیار یہ باتیں بولتے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور خاموش ہوجاتے۔ وہ

www.taemeernews.com

وہ دوسرا شخص بھی گذر گیا۔ اب تو محسوس کرنے کو یاد کرنے کو بولنے کو اور لکھنے کو ہم ہی تنہا رہ گئے ہیں۔ اب بولنے کو بھی کوئی نہیں ملتا اس لئے لکھ دینا بھی بول لینا ہے۔ وہ دوسرا شخص کون تھا۔ سنئے۔

شاید ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میری ایک دور کے رشتے کی بہن کا کم سن لڑکا مجھ سے ملنے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) سے پٹنہ آیا۔ ایک ماہ رہا۔ ویزا ختم ہو رہا تھا مگر اس کا جی اور رہنے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے کہا میرا ویزا بڑھوا دیجئے۔ معلوم ہوا سینئر اس پی صاحب سے ملنا ہوگا۔ میں نے اپنے بھانجے کو ساتھ لیا پولس لائن آیا دریافت کیا' معلوم ہوا سینئر اِس پی صاحب ادھر کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ کئی پولس پہرے پر تھے۔ بہت سے لوگ ملنے والے تھے۔ میں نے بھی ایک پرزے پر اپنا نام لکھ کر دیا۔ دیکھا تو تھوڑی دیر بعد اردلی نے مجھ سے کہا جائیے صاحب بلا رہے ہیں۔ حالانکہ مجھ سے پہلے کے چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کوئی خیال نہیں کیا اپنے بھانجے کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ دیکھا ایک خوبصورت گداز بدن ادھیڑ عمر کے آدمی بڑے چوکور ٹیبل پر فائل کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ مجھے ایسا لگا کہ انہوں نے کنکھیوں سے ہمیں کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا مگر بظاہر یوں ہی فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے انہوں نے ہمیں بیٹھنے کہا۔

ہم لوگ سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے ایک منٹ بعد انہوں نے فائل کنارے گئے اور اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملا کر ٹیبل پر کہنیاں جماتے ہوئے انہوں نے ہم سے پوچھا۔

"کہئے کیا کام ہے؟"

میں نے اُنہیں غیر مسلم سمجھتے ہوئے حسب قاعدہ آداب عرض داغ کر عرض کیا کہ یہ میرا بھانجہ ڈھاکہ سے مجھے دیکھنے مجھ سے ملنے آیا ہے۔ ویزا اس کا ختم ہو رہا ہے اور طبیعت اس کی ٹھیک نہیں ہے۔ میری درخواست ہے کہ کم از کم دو ہفتہ کی توسیع ان کے ویزے میں کر دی جائے۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ فصیح اردو میں بولے۔

"مجھے تو یہ صاحب زادے بالکل تندرست نظر آتے ہیں۔ اور آپ کہتے ہیں کہ

www.taemeernews.com

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ؟"

میں نے کہا بات دراصل یہ ہے کہ اِسے دو تین دن بخار آگیا تھا ۔ اب اچھا ہے سفر طویل ہے ۔ دو ہفتہ کے بعد اس کی صحت صعوبتِ سفر برداشت کرنے کے قابل ہو جائے گی ۔

"میڈیکل سرٹیفکیٹ ہے ؟"

"سرٹیفکیٹ تو میں نے نہیں لی ہے ۔"

"تو پھر میں کیسے توسیع کر سکتا ہوں ۔"

"آپ مہربانی فرما دیں ۔"

"اور اگر میں مہربانی نہ فرماؤں تو ؟"

"تو میں کیا عرض کروں ۔ جیسی آپ کی مرضی ۔"

"اچھا ۔ تو آپ فیس دیں گے ؟"

"جی ہاں ویزا توسیع کی فیس تو میں لے کر آیا ہوں ۔"

"نہیں ۔ اس کے علاوہ بھی فیس ہے ۔"

"میں سمجھا نہیں ۔"

"تو اب سمجھ لیجئے ۔ آپ کو ایک غزل سنانی ہوگی ۔"

میں بالکل سٹ پٹا گیا ۔ اور بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کھڑے ہو گئے ۔ اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا ۔

"میرا نام علی عباس ہے ۔ میں نے ابھی چند ہی دن پہلے انجمن اسلامیہ ہال میں شعرائے بہار کے مشاعرے میں آپ کو سنا ہے اور سن کر حیرت زدہ ہوا ہوں ۔"

یہ ہم دونوں کی پہلی بالمشافہ ملاقات تھی ۔ کھجوا کے رئیس زادے تہذیب زادے تعلیم زادے انسان زادے ادب زادے شعر زادے محبت زادے خلوص زادے اور خدا جانے کیا کیا جس کا تجربہ تقریباً چالیس سال مجھے ہوتا رہا اور تجربہ پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ تشریف لے گئے ۔ اور عظیم آباد کی میری پسندیدہ مرغوب محبوب مقدس اور محترم تہذیب

www.taemeernews.com

کا آخری چراغ بجھا گئے۔

اس چالیس رفتہ اور گذشتہ برسوں کی روداد ایک کتاب کا ایک داستان کا ایک طلسم ہوش رُبا کا تقاضہ کرتی ہے۔ ایک سرمستی اور سرشاری استخلاص اور انہماک اور ایک خاص ذوق شوق کی کیفیت میں ڈوب جانے کا تقاضہ کرتی ہے۔ تقاضہ کرتی ہے کہ مہینوں سب کچھ چھوڑ کر اکیلے بیٹھے رہیے سوچتے رہیے آنکھوں میں ذہنوں میں محفوظ تصویروں کو فلموں کو اہتمام سے سلسلہ سے باہر نکالتے جایئے۔ جو اب ممکن ہی نہیں ہے۔ نہ وہ فرصت کے دن ہیں اور نہ دل و دماغ میں انہماک کی استعداد ہے۔ اب تو بس سرسری طور پر، سرسری زبان میں سرسری خیالات کو سرسری الفاظ میں بیان کرتے جایئے جیسے سوچا، جیسے دیکھا۔ بس بے تکلفی سے بغیر کسی ادبی اہتمام کے بغیر کسی شعری آراستگی کے لکھتے جایئے۔ یہ بھی بہت کافی ہے۔ دلوں کو ہلا دینے کے لئے ذہنوں کو جھنجھوڑ دینے کے لئے اور سوئی ہوئی غافل پڑی ہوئی بے نیاز بے حس بے پروا زندگی کو ٹھوکریں لگا کر متوجہ کر دینے کے لئے۔

تو پھر اس کے بعد علی عباس صاحب ہیں اور ہم ہیں۔ میری دکان اور میرا مکان تو چالیس برسوں سے وہی ہے۔ عباس صاحب کی رہائش بدلتی رہی۔ مقام قیام بدلتا رہا جگہ بدلتی رہی شہر بدلتا رہا۔ منصب اور درجہ بدلتا رہا۔ مگر عباس صاحب وہی رہے کلیم عاجز وہی رہا۔

سامنے کار کھڑی ہوتی۔ اگر میں سامنے دکان میں نہ رہا تو ڈرائیور کو بھیج کر پوچھوایا کہ میں ہوں۔ گھر میں اوپر رہا تو میں نیچے آگیا اور عباس صاحب گاڑی سے اترے جھومتے ہوئے مسکراتے ہوئے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے دکان میں آئے۔ اوپر کمرے میں نہیں گئے۔ بس دکان ہی میں چوکی کے فرش پر یا لکڑی کی سیدھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ جیب سے گولڈ فلیک سگریٹ کا ڈبہ اور ماچس نکال کر چوکی پر یا دوسری کرسی پر رکھا اور پھر عباس صاحب شروع ہو گئے۔ مجھے تو زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ اور عباس صاحب بھی زیادہ بولنے کے عادی نہیں۔ بس دھیمے لہجے میں جس طرح کوئی سرگوشیاں کرتا ہے۔ راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یا خود کلامی کرتا ہے۔ میری موجودگی میں وہ سامنے کی باتیں سامنے کی چیزیں فراموش کر جاتے تھے

www.taemeernews.com

ان کا منصب اور اس کی ذمہ داریاں ۔ ذمہ داریوں کی ادائیگی کی مشکلات یا آسانیاں تجربات' یہ سب عباس صاحب کا موضوع کبھی نہیں رہا ۔ وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ محکمۂ پولس کے وہ اتنے اعلیٰ افیسر ہیں اور وہ بھی اس وقت جب افیسروں کی سہیڑ اتنی بھیڑ نہیں تھی ۔ اور وہ اپنے دور کے نہایت باعزت نہایت معزز اور پُر وقار اعلیٰ افسر تھے ۔ لیکن یہ چیز عباس صاحب کی گفتگو کا کبھی حصہ نہیں بنتی ۔ ہاں اس سے متعلق کوئی محبت کا دوستی کا مروت کا اور محبت اور دوستی کی نمایاں کارکردگی کا تجربہ ہوتا تو بیان میں شامل ہو جاتا ۔ مگر بنیادی طور پر ان کا موضوع گفتگو صرف میرے سامنے جب وہ ہوتے اور میں ہوتا اور کوئی تیسرا نہ ہوتا تو وہ اپنی محبت کے اور ان کے اہل محبت احباب کے قصے ۔ محبت کی ناکامیاں یا کامیابیاں' حسرتیں آرزوئیں ۔ اگلے مجالس کے احباب ۔ وضع داریاں طرح داریاں وضع داریاں ۔ دوستی کی نوک جھونک چھیڑ چھاڑ بزرگوں کی صحبتیں اگلے لوگوں کے کردار ان کی خوبصورت زندگیاں ۔ خوبصورت زندگیوں کے خوبصورت اعمال ۔ بس یہ عباس صاحب کی خود کلامی اور آہستہ گفتاری کا موضوع ہوتا ۔ ٹھہر ٹھہر کر لطف لیتے ہوئے ۔ ایک سگریٹ ختم ہوتا تو پھر فوراً سلگاتے ہوئے اور اکثر سگریٹ انگلیوں ہی میں ختم ہو جاتا ۔ باتوں کے لطف اور لطیف بیان کی کیفیت میں کھوئے ہوئے وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں باتیں کئے جاتے اور انگلیوں میں سگریٹ سلگتا رہتا اور سگریٹ کے باریک دھوئیں کی لکیر پیچ و خم کھاتی ہوئی ۔ عباس صاحب کے جوش سے تمتماتے ہوئے چہرے کی بلائیں لیتی ہوئی محو سماعت فرشتوں کے پوشیدہ ہجوم میں گم ہوتی رہتی ۔ تو عباس صاحب وہی گفتگو کرتے جو میری زندگی میرے نظریۂ زندگی ' تجربۂ زندگی آداب زندگی اور ادائے زندگی سے بھرپور ہم آہنگ تھی ۔ میں صرف ہوں ہاں جی ہاں وغیرہ کہتا ہوا ان کی باتوں کی سماعت میں محو رہتا ۔ کبھی کبھی وہ اپنی گفتگو کے میلان سے گریز کرتے تو پھر مری شاعری کی طرف آ جاتے ۔ میری شاعری کے مزاج میلان اور روح کو جتنا عباس صاحب نے سمجھا تھا ۔ شاید آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا ۔ جس طرح شعر گوئی کا ایک فطری میلان اور موضوع مجھے قدرت نے عطا کیا تھا ۔ شاید صرف میرے

www.taemeernews.com

ہی لئے عباس صاحب کو شعر فہمی کا فطری مزاج بھی خدا نے عطا کیا تھا۔ وہ میرے شعر کے ایک ایک اشارے کو سمجھتے۔ اس کے منظر اور پس منظر کو سمیٹ لیتے اور ایک ایک اشارے اور کنائے کی بھرپور اشاریت اُن میں منتقل ہو جاتی۔ وہ ایک شعر پڑھتے اور مجھے چھیڑتے۔ شاید ۱۹۶۷ء یا اسی کے لگ بھگ انتخابات ہوئے تھے اور اندرا گاندھی بڑی شان سے تخت حکمرانی پر براجمان ہو کر اپنی مخصوص طرز حکومت کا جوہر دکھانے کو آرہی تھیں۔ شاید اسی زمانے میں میں نے یہ غزل کہی تھی اور کہیں مجمع میں پڑھی تھی۔

بڑی طلب تھی بڑا انتظار۔ دیکھو تو
بہار لائی ہے کیسی بہار۔ دیکھو تو
نہ کوئی شانہ بچا ہے نہ کوئی آئینہ
دراز دستیٔ گیسوے یار۔ دیکھو تو
یہاں ہر اِک رسن و دار ہی دکھاتا ہے
عجیب شہر عجب شہریار۔ دیکھو تو
کسی سے پیار نہیں پھر بھی پیار ہے سب سے
وہ مستِ حسن ہے کیا ہوشیار۔ دیکھو تو
وہ چپ بھی بیٹھے ہے تو ایسا بن کے بیٹھے ہے
ہر اِک ادا یہ کہے ہے پکار۔ دیکھو تو
ادا ہمیں نے سکھائی نظر ہمیں نے دی
ہمیں سے آنکھ چرائے ہے یار۔ دیکھو تو

اس غزل کے اشعار عباس صاحب پڑھتے جاتے تھے۔ اور ایک ایک شعر کا ایسا منظر اور ایسا پس منظر کھینچتے جاتے تھے کہ میری نگاہ بھی اُدھر نہیں گئی تھی کہ آمد شعر کی بھرپور کیفیت میں کیا کیا باتیں ہیں کہہ گیا جس کا حقیقی اور تاریخی پس منظر خود کہتے وقت میرے پیش نظر نہ تھا۔ بہرحال تو واقعی عباس صاحب، کی زندگی میں تین عاشقوں کی روح سمائی ہوئی تھی۔

www.taemeernews.com

اپنے ابتدائے عہد اور اس سے پہلے کی تہذیبی، تمدنی، معاشرتی ادبی اور شعری روایتوں کا عاشق۔ میرا عاشق اور میری شاعری کا عاشق بات دراصل ایک ہی نظر آتی ہے یعنی میرے عاشق اور میری شاعری کے عاشق۔ لیکن درحقیقت یہ دو الگ الگ چیزیں بھی نہیں۔ مری دکھ بھری زندگی کی خاکستر سے اُبھرنے والی ایک خوددار وضع دار مردانہ دار کلہدار زندگی بھی ایک انفرادیت ہے اور مخصوص چیز ہے۔ اور پھر اس زندگی سے ابلنے والی شاعری بھی ایک مخصوص اور منفرد فرد ہے تو عباس صاحب اِن تینوں کے عاشق تھے۔ اس طرح میں اور عباس صاحب ایک ہی زندگی ہو گئے تھے۔ جب وہ پٹنہ میں ہوتے نہ ملنے کا وقفہ کا تعین نہیں ہے یہ تو نہیں کہ روزانہ ملتے تھے۔ مگر بہرحال وقفہ کم ہی ہوتا۔ یا تو وہ میرے یہاں آجاتے یا پھر وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے بھاگتے۔ کبھی شام کے سناٹے میں گاندھی میدان کے کسی گوشے میں۔ اپنے بنگلے کے ایک کنڈے کمرے میں۔ پھر وہاں بھی وہی منظر ہوتا۔

وہ ریلوے ڈی آئی جی بن کر حکومت بنگال کی پولیس میں کلکتہ چلے گئے تو ہر ماہ وہ کوئی Tour بناتے اور پٹنہ آکر وہ میرے یہاں آدھمکتے۔ ٹھہرتے نہیں مجھے لے کر پٹنہ جنکشن اسٹیشن کے کسی کنارے کھڑے ہوئے سیلون میں (ریلوے کا ایک الگ ڈبہ جو سفید رنگ کا ہوتا اس میں ریلوے کے اعلیٰ افسر سفر کرتے۔ بالکل گھر جیسا ماحول ہوتا۔ ڈرائنگ روم، سیٹنگ روم، ڈائننگ روم وغیرہ وغیرہ) اُس سیلون میں کبھی کبھی دو افراد اور ہوتے۔ علی حارث خاں راہی اور مسٹر زوار حسین وزیر مالیات بہار۔ یہ دونوں بھی درد دل کے مارے تھے۔ پھر یہ چوکڑی بیٹھتی اور وہی باتیں شروع ہوتیں۔ جس طرح شطرنج کے کھلاڑیوں میں شطرنج اور میخواروں کی ٹولی میں شراب دنیا کے انہماک سے الگ کر کے اپنا بنا لیتی ہے یہ عاشقانِ ایام رفتہ اور وارفتگان تہذیب گذشتہ۔ میری شاعری میں برسوں کی تشنگی کی سیرابی حاصل کر لیتے۔

عباس صاحب کو میری شاعری سے جتنا پیار تھا وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ چند چنگاریاں اس تحریر میں نظر آئیں گی جو میرے پہلے مجموعۂ غزل "وہ جو شاعری کا سبب ہوا"

www.taemeernews.com

کے مختصر "تعارف" میں عباس صاحب نے رقم کی ہے ۔ میری شاعری ان کے دل کی آواز تھی ۔جب میں مشاعرے میں پڑھنے کو بیٹھتا تو وہ میرے پاس نہیں بیٹھتے دور جاکر سامعین کی قطار میں بیٹھتے ۔ وہ مجھے پڑھتے ہوئے سنتے بھی اور مجھے دیکھتے بھی ۔ وہ مجھ کو میری شاعری کا جزو سمجھتے تھے ۔میں اور میری شاعری مل کر ایک وجود بنتے ۔ صرف شاعری سن کر مثلاً ٹیپ پر یا ریڈیو پر وہ شاعری کا اُدھا لطف لیتے ۔ اس لئے وہ دور بیٹھ کر مکمل شاعری کا مزا لینا چاہتے تھے ۔اور شعر سن کر وہ داد نہیں دیتے تھے ۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی انہوں نے واہ واہ کیا ہو۔ وہ صرف سنتے اور ان کا چہرہ اپنا پورا ردعمل ظاہر کرتا ۔میری شاعری ان پر وہی اثر کرتی جو شرابی پر شراب کی گھونٹ یا بیمار پر دوا اثر کرتی ہے ۔نہ شرابی واہ کہتا ہے نہ مریض ۔مگر دونوں شراب اور دوا کا بھرپور اثر لیتے ہیں ۔تو عباس صاحب دور سے سنتے ۔ اور جو مجھے داد ملتی عباس صاحب وہ داد اپنے لئے سمجھتے اور جتنی خوشی اپنی تعریف سے مجھے نہیں ہوتی اتنی اور اس سے بھی زیادہ خوشی عباس صاحب کو ہوتی اور وہ میری غزل سننے کے بعد پھر جھومتے جھامتے مسرتوں سے اُبلتے اور خوشیوں سے چھلکتے پھر میرے پاس آکر اسٹیج پر بیٹھ جاتے ۔

۱۹۷۵ء میں جب میرا پہلا مجموعہ علی عباس صاحب اور میرے نہایت ہی فدائی دوست فخرالدین ونک کی مشترکہ محبت تعلق اور محنت کا نتیجہ بن کر شائع ہونے والا تھا۔اسی دوران ٹیگور سوسائیٹی کلکتہ سے مشاعرہ کا دعوت نامہ میرے پاس آیا ۔ یہ سوسائیٹی شہر کلکتہ کے بلا قید مذہب و ملت ارباب ذوق کی مجلس تھی ۔ جس میں شہر کے منتخب اعلیٰ تعلیم یافتہ خوش مقدر شہری تھے جس میں اکثر غیر مسلم پنجابیوں ، دہلویوں اور لکھنویوں کی تھی ۔ اس سال بڑے پیمانے پر دو روزہ مشاعرہ کر رہی تھی جس میں دس شعرا مدعو تھے ۔ مجھے سب نام یاد نہیں ہیں ۔ فراق صاحب ، علی سردار جعفری صاحب ، غلام ربانی تاباں صاحب شاید نشور واحدی اور بمبئی کی دو ملکۂ ترنم شاعرات تھیں ۔

میں جانے لگا تو بزم کاف کی ایک میٹنگ ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ اس مشاعرے میں پورا بزم کاف کا عملہ جائے گا ۔اور وہاں کتاب کی پبلسٹی کے سلسلہ میں کچھ کام ہوگا ۔ چنانچہ میرے ساتھ

www.taemeernews.com

عباس صاحب، فخرالدین ونک صاحب اور مسٹر گوربوس فوٹو گرافر چار آدمیوں کا قافلہ کلکتہ گیا۔ فراق صاحب اور دوسرے تمام شعرا ہوٹلوں میں ٹھہرے اور ہم لوگ ایک وسیع ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے کہ اس کے ہال میں ایک دو پریس کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ تھا۔ بہر حال وہ پریس کانفرنس ہوئی اور اس میں زیر طبع کتاب کی تفصیلات پریس والوں کو بتائی گئیں اور دوسرے روز اکثر اخبارات اردو اور انگریزی میں پریس کانفرنس کی اور کتاب کی تفصیلات آئیں۔ فراق صاحب کو معلوم ہوا کہ میں بھی آیا ہوا ہوں اور الگ ٹھہرا ہوں تو انہوں نے اپنے ہوٹل کے بڑے کمرے میں کلکتہ کے چند دوستوں کو بلوایا اور مجھے بھی پیغام بھیجا۔ فراق صاحب کو مجھ سے گہرا تعلق تھا۔ وہ مجھے مانتے تھے۔ اور دو ایک بار بھری مجلس میں اپنے تاثر کا ایسا اظہار کر گئے کہ ان کے قریب کے ملنے والوں اور دوستوں کو حیرت ہو گئی کہ ایسا اظہار خیال تو فراق صاحب نے اپنے بڑے بڑے ہمعصروں کے متعلق بھی کبھی نہیں کہا۔ مثلاً ایک سال دہلی روٹری کلب میں مشاعرہ ہوا جس میں دس شعرا کو دعوت نامہ تھا۔ فراق صاحب، آنند نرائن ملا، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، عرش ملسیانی، بسمل انصاری، جگن ناتھ آزاد اور میں۔ ایک اور کوئی صاحب تھے نام یاد نہیں۔ پہلے اندر کمار گجرال صاحب کی تقریر ہوئی اور مشاعرہ شروع ہوا۔ تقریباً سب پڑھ چکے تھے۔ آنند نرائن ملا صاحب اور فراق صاحب باقی تھے۔ مجھے کچھ احتیاج ہوئی۔ میں رفع احتیاج کے لئے اٹھا تو فراق صاحب نے یہ سمجھ کر کہ میں جا رہا ہوں، پکار کر کہا۔

"کہاں جا رہے ہو کلیم ٹھہر جاؤ مجھے سن کر جاؤ میں تم سے بہت متاثر ہوں۔"

فراق صاحب تو بھرپور سرور میں رہتے تھے۔ میری بغل میں جگن ناتھ آزاد تھے اور ان کی بغل میں فراق صاحب۔ جگن ناتھ آزاد نے حیرت اور سنجیدگی سے کہا: "کلیم عاجز صاحب! یہ بہت بڑی بات ہے۔ فراق نے آج تک کسی کے متعلق ایسا نہیں کہا۔"

تو خیر فراق صاحب نے اپنے ہوٹل میں مجھے بھی بلایا۔ چونکہ وہ بیمار رہا کرتے تھے۔ کہیں جاتے نہیں تھے۔ میں اور عباس صاحب وغیرہ وہاں پہونچے تو انہوں نے کہا "یہ کوئی نشست نہیں ہے۔ میں نے چند ساتھیوں کو جمع کیا ہے کہ تمہیں سنوں اور تمہیں سناؤں۔"

www.taemeernews.com

میں کچھ جھینپ گیا۔ بہرحال تو میں نے شاید تین غزلیں پڑھیں۔ پہلی غزل

ہمیں یہ دیکھ کے کہتے ہیں آج کل والے
وہ آ گئے روشِ میرؔ کی غزل والے

اور دوسری غزل :

شانے کا بہت خونِ جگر جائے ہے پیارے
تب زلف کہیں تا بہ کمر جائے ہے پیارے

تیسری غزل یاد نہیں ۔ فراقؔ صاحب خاموش سنتے رہے اور کبھی کبھی دوستوں پر آوازے کستے رہے۔ داد تو وہ دیتے ہی نہیں۔ ہاں آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتے رہتے تھے۔ یہ اکثر مشاعروں میں ہوا۔ تو کہنا یہ بات تھی کہ عباس صاحب کو مجھ سے کتنا پیار اور میری شاعری سے کتنی محبت اور مجھے جو داد ملتی تو اس سے ان کو کتنی خوشی ہوتی۔ ٹیگور سوسائیٹی کے مشاعرے کی دو راتوں میں دو نشستیں ہوئیں۔ دوسری نشست کے بعد جب مشاعرہ ختم ہوا۔ تو فخرالدین ونک صاحب ہاتھ پھیلا پھیلا کر انگریزی میں کہہ رہے تھے :

It was a walk over, It was a walk over

اور عباس صاحب جھومتے ہوئے بولے "نہیں فخر بھائی یہ صرف walk over نہیں تھا۔ یہ تو کلیم کی چھلانگ تھی یہ ایسی ہی چھلانگ لگاتے ہیں۔"

اور دوسرے دن شام کو عباس صاحب دیر تک غائب رہنے کے بعد واپس ہوئے تو چہک رہے تھے اور فخرالدین صاحب کو ایک لفافہ دیتے ہوئے بولے "دیکھو فخر بھائی کیا لکھوا لایا ہوں۔"

تو وہ فراقؔ صاحب کا مختصر تاثر تھا جو میرے مجموعے کے جلد پر لکھا ہوا ہے۔ عباس صاحب نے بیان کیا کہ میں نے جب فراقؔ صاحب کا میلان کلیم عاجز کی طرف اتنا مخلصانہ اور والہانہ دیکھا تو میں ان کے ہوٹل چلا گیا۔ وہ بیماری کے ضعف میں اپنی مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ میں جا کر قریب کرسی پر بیٹھا۔ صاحب سلامت ہوئی اس کے بعد عباس صاحب نے کہا : "کلیم عاجز کا

www.taemeernews.com

مجموعۂ غزل چھپ رہا ہے کیا آپ اپنے کچھ خیالات کا اظہار فرمائیں گے ؟"
عباس صاحب بولے کہ اتنا سنتے ہی فراق صاحب مسہری پر یہ کہتے ہوئے اُٹھ بیٹھے۔
"کلیم عاجز کا مجموعۂ غزل چھپ رہا ہے ؟ ہاں میں لکھاؤں گا اپنے خیالات کا اظہار کردوں گا۔ لکھو"
عباس صاحب گھبرا گئے۔ وہ سمجھے وعدہ کریں گے۔ کچھ لکھوا کر بھیج دیں گے مگر وہ تو لکھوانے پر وہیں تیار ہو گئے۔ ان کے پاس کاغذ کاپی کچھ نہیں تھا۔ فراق صاحب نے کاغذ کا شیٹ اپنی مسہری کی بغل میں ٹیبل سے کھینچا اور عباس صاحب کے حوالے کیا۔ یہ شیٹ فراق صاحب کا لیٹر پیڈ تھا۔ عباس صاحب لکھنے لگے :

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
راشٹریہ کوی گیان پیٹھ اوارڈ یافتہ
بنک روڈ الہٰ آباد
کلکتہ ۔ ۶ نومبر ۱۹۷۵ء

اے اہل ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

میں اپنی زندگی کی اہم خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے جناب کلیم عاجز صاحب کا کلام خود ان کے منہ سے سننے کے موقعے ملے۔ اب تک کچھ لوگوں کی شاعری پڑھ کر یا سن کر پسندیدگی اور کبھی کبھی قدرشناسی کے جذبات میرے اندر پیدا ہوتے رہے لیکن میں نے جب کلیم عاجز صاحب کا کلام سُنا تو شاعر اور اس کے کلام پر مجھے ٹوٹ کر پیار آیا۔ اور ہم آہنگی، محبت اور ناقابل برداشت خوشی کے جذبات میرے اندر پیدا ہو گئے۔ اُن کا کلام مجھے اتنا پسند آیا کہ مجھے تکلیف سی ہونے لگی اور کلیم عاجز صاحب پر غصہ آنے لگا کہ یہ کیوں اتنا اچھا کہتے ہیں۔ ان کے اس جرم اور قصور کے لئے

www.taemeernews.com

میں انہیں کبھی معاف نہیں کرسکتا۔ اتنی ڈھلی ہوئی زبان، یہ گھلاوٹ، لب و لہجہ کا یہ جادو جو صرف انتہائی خلوص سے پیدا ہوسکتا ہے، اس سے پہلے مجھے کبھی اِس موجودہ صدی میں دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا تھا۔ میں ان کا کلام سن کر خود اپنا کلام بھول گیا۔

کلیم عاجز صاحب اپنی شاعری اور اپنی آواز سے ہزاروں لاکھوں سننے والوں کا من موہ لیتے ہیں یہ ایک خطرناک خوبی ہے۔ رام سے راون نے جب لڑائی ٹھان لی تو یہی دعا مانگی کہ مجھے رام کو دیکھ کر محبت نہ پیدا ہوجائے اس لئے کہ پھر میں اُن سے کیسے لڑوں گا؟ کچھ ایسا ہی "بسی کرن" کلیم عاجز صاحب کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کلیم عاجز صاحب کی شاعری میں ہمیں مولانا رومی یا اقبال، عرفی یا مرزا بیدل کے دقائق نہیں ڈھونڈھنا چاہئے۔ لیکن صبح کے سہانے پن میں، بھیروی کی راگنی میں، چاندنی کے ناقابل بیان جادو میں ایک بچے میں۔ کرشن کی ربوبیت کی جھلک میں ہم دقائق نہیں ڈھونڈھتے، گیتا کا فلسفہ نہیں ڈھونڈھتے اور اس سے کوئی بڑی چیز پالیتے ہیں۔ وہی بے نام جادو ہمیں کلیم عاجز کی شاعری میں ملتا ہے۔ ٹھیٹ آدمیت یا آدمی کے ٹھیٹ پن کی بلاغت کلیم عاجز کے شاعرانہ کردار میں نغمہ بن کر جھلک جایا کرتی ہے۔

یہ سطور سخت بیماری کی حالت میں بول کر لکھوا رہا ہوں۔ میں کلیم عاجز کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

اس کے بعد فراق صاحب نے عباس صاحب سے کاغذ لے لیا پڑھا اور اپنے مخصوص انداز میں دستخط کردیا۔

کتاب چھپ گئی تو عباس صاحب نے مجھ سے تو کوئی مشورہ نہیں کیا۔ سنا کہ وہ دہلی چلے گئے ہیں۔ اور وہ گئے یوں کہ فخرالدین صاحب کو ساتھ لیا۔ پوری مطبوعہ کتاب کی فوٹو کاپی بنوائی۔

www.taemeernews.com

دہلی گئے۔ صدر جمہوریۂ ہند مرحوم فخرالدین علی احمد صاحب سے ملاقات کا پروانہ حاصل کیا دونوں جاکر ملے اور کتاب کی فوٹو کاپی پیش کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ آپ اس کا اجراء فرمائیں۔ صدر جمہوریہ نے چند اصولی سوالات کئے اس کے بعد کہا ایک ماہ کے بعد اپنے منشاء کا اظہار کروں گا اس وقت تک یہ کتاب میرے پاس رہے گی۔ ایک ماہ بعد پھر دونوں دہلی گئے صدر جمہوریہ سے ملے۔ اور اپنی خواہش کا پھر اظہار کیا۔ صدر جمہوریہ یوں مسکرائے جیسے وہ صدر جمہوریۂ ہند نہیں، بزم کاف ہی کے ایک فرد ہیں اور مسکراتے ہوئے بولے "میں اس کتاب کا اجراء کروں گا اور اہتمام سے کروں گا۔ اس کے لئے ۱۹ر فروری ۱۹۷۶ء تاریخ مقرر ہوئی۔ صدر جمہوریۂ ہند کی تجویز اور حکم سے وگیان بھون کا ہال اس تقریب کے لئے متعین ہوا۔ جس میں ہندوستان کی چودہوں زبانوں میں بیک وقت ترجمہ کرنے کی مشین لگی ہوئی ہے۔ ۱۹ر فروری ۱۹۷۶ء کی شام کو ہم لوگ ہال میں پہونچے۔ جو دنیا کے تمام دوست ممالک کے جھنڈوں سے آراستہ تھا۔ تقریباً چار سو شہر کے سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی عمائدین موجود تھے ٹھیک وقت پر صدر جمہوریۂ ہند اور بیگم عابد علی احمد تشریف لائیں اور ساتھ آنے والوں میں اندر کمار گجرال وزیر اطلاعات، ہند، محمد نبی بار الرحمٰن انصاری وزیر ہند، جنرل شاہنواز خاں وزیر ہند، اور دو بہار کی سرزمین سے نسبت وطنی رکھنے والے مرکزی وزیر تھے جن میں ایک صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ بی۔ این کالج میں میرے ہمعصر رہ چکے تھے اور اسی تعلق سے بڑے شوق اور محبت سے اس تقریب اجرا میں شریک ہوئے مگر مجھ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ صدر جمہوریہ ہند کو اس سے پہلے میں نے دو بار کسی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک بار دہلی کلاتھ مل کے انڈو پاکستان مشاعرہ کا۔ دوسری مرتبہ اشوکا ہوٹل کے دربار ہال میں یوم اقبال کا افتتاح۔ دونوں بار میں نے دیکھا کہ ٹھیک وقت پر نہایت شاندار تزک و احتشام کے ساتھ صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد صاحب اپنے تمام وردی پوش مصاحبین اور غیر وردی پوش اہل دربار کے ساتھ کیمروں اور ٹی وی کے پورے گروہ کے حلقے میں تشریف لائے۔ تمام اہل مجلس کھڑے ہوگئے اور تمام مجلس کیمروں اور ٹی وی کی روشنیوں کے فوکس میں آگئی۔

www.taemeernews.com

صدر جمہوریہ نے اپنی لکھی ہوئی مختصر افتتاحی تقریر کھڑے کھڑے پڑھی اور پھر دو چار سلام اور مصافحوں کے ساتھ صدر جمہوریۂ ہند کے دربار کا پورا عملہ مع کیمروں اور ٹی وی سٹ کے رخصت ہو گیا۔ اور ایسا لگا کہ راجہ اندر بادلوں سے چاند سورج کی روشنی میں اترے اور پھر بادلوں میں جا کر گم ہو گئے اور دنیا جیسی معمولاً سنسان اپنے اپنے طے شدہ مشغلوں میں تھی رہ گئی۔ لیکن اُس دن وگیان بھون میں دیکھا کہ صدر جمہوریہ ہند یک بیک صدر دروازے سے نہیں بلکہ کسی اور دروازے سے اپنی بیگم اور مذکورہ بالا وزرائے ہند کے ساتھ یوں ہال میں داخل ہو گئے۔ جیسے گھر کی مجلس میں صاحب خانہ آجائے۔ آتے ہی صدر جمہوریہ اسٹیج پر ٹیبل کے سامنے اپنی کرسی پر اپنی بیگم کے ساتھ اور ارد گرد وزرائے ہند بیٹھ گئے اور ہمارے علی عباس صاحب اور عزیزہ نقی امام جو اس وقت ممبر پارلیامنٹ تھیں، بزم کاف کی نمائندگی کرنے لگیں۔ علی عباس صاحب نے مختصر تقریب کی نوعیت بیان کر دی۔ عزیزہ نقی امام صاحبہ نے صدر جمہوریہ کا مختصر استقبال کیا۔ مطبوعہ کتاب" وہ جو شاعری کا سبب ہوا" سنہرے پیکٹ میں سامنے رکھ دی گئی۔ اور صدر جمہوریہ نے بغیر کسی تکلف کے پیکٹ کھولا۔ دو چار اوراق اِدھر اُدھر سے دیکھے اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ملائیں۔ کہنیوں کو ٹیبل پر ٹیک کر سامنے اور اغل بغل کے سامعین کو دیکھا اور یوں گفتگو شروع کی جیسے کہ جو کتاب ان کے سامنے کھلی ہوئی پڑی ہے وہ ان کی سینکڑوں بار کی پڑھی ہوئی ہے اور جو اس کتاب کا مصنف ہے وہ ان کا عزیز ہے یا ان کا شاگرد ہے اور اس میں جو بات لکھی ہوئی ہے وہ وہی باتیں ہیں جو گھر میں تربیت کے دوران انہوں نے اپنے عزیز کو بتائی تھیں یا کلاس میں اپنے شاگرد کو پڑھائی تھیں۔ اس کتاب کی شاعری پر نثر میں دیباچے میں جو تیر و نشتر ہیں وہ انہوں نے ہی چلانے کو کہی ہیں اور جو کہی نہیں ان کو عزیز نے یا فرمانبردار شاگرد نے پوری سعادتمندی سے ہو بہو انجام دیا ہے۔ پوری سنجیدگی اور پوری ذمہ داری سے ان کو سراہتے ہوئے، ان کی تائید کرتے ہوئے اور فن کار اور فن کی سچائی کو اصل الاصول قرار دیتے ہوئے دس پندرہ منٹ کی ایسی صاف، سنجیدہ بے تکلف پر اعتماد اور ایسی موثر گفتگو کی کہ میں حیران رہ گیا اور ان کی پہلی

www.taemeernews.com

تقریبات، کی تحریر شدہ تقریروں کی روشنی میں میرے لئے انھیں پہچاننا مشکل ہوگیا۔ میں کہ ان سے کبھی ملا نہیں کبھی کی شناسائی تعارف نہیں بجز اس کے کہ کئی سال پہلے پتہ نہیں وہ مرکز میں کوئی وزیر تھے یا کیا تھے۔ ایک بار خدا بخش اورینٹل لائبریری میں وہ تشریف لائے تھے، کوئی لکچر تھا یا کوئی تقریب تھی۔ قاضی عبدالودود صاحب بھی ان کے برابر بیٹھے تھے۔ تقریب کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ وہ کلیم عاجز سے کچھ اشعار سننا چاہتے ہیں۔ مگر میں اس اعلان سے چند منٹ پہلے ہال سے باہر چلا آیا تھا کہ اب مجلس ختم ہوگئی۔

اور یہ سب سید علی عباس صاحب اور فخرالدین وٹک صاحب کی نہایت مخلصانہ، نہایت والہانہ اور نہایت سرفروشانہ اور دلیرانہ محبت اور محنت کے نتیجہ میں ہوا۔ حالانکہ ایسا ہونا کوئی ظاہری اسباب نہیں رکھتا۔ میں نہ شہر کا کوئی باشندۂ ممتاز و پروقار، نہ کوئی جاگیردار نہ رئیس نہ تعلقدار نہ کوئی اتنا بڑا فنکار روشناس شہر و دیار۔ میں ایک خانماں برباد بے وطن بے دیار، جس کا نہ کوئی گھر نہ کوئی ڈیوڑھی، دوسرے کے مکان میں کرائے دار کم سخن کم آمیز کم گفتار بیمار و نحیف و نزار۔ آخر محبت کی تعلق کی کون سی ایسی کشش مجھ میں تھی۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ بجز اس کے کہ یہ فیض ہے ان شہدائے معصوم کا تصرف ہے ان کی سچی پاک محترم زندگی کا جو محبت کے لئے زندہ رہ کر محبت کی ایک مثالی داستان مرتب کر گئے اور مر کر جان سپاری جاں نثاری کا ایک بے نظیر افسانہ لکھ گئے۔

اس کے بعد میں عباس صاحب کے خاندان کا ان کے بھائی برادری بیوی بچوں کا پیارا فرد بن گیا۔ عباس صاحب زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر وہ سب کر گذرتے جو ان کے امکان میں تھا۔ میں نے کہا تیلہاڑہ جانے کو جی چاہتا ہے شہدا کے دفن گاہ پر فاتحہ پڑھ دوں کنوؤں میں دو چار قطرے آنسوؤں کے ٹپکا دوں مگر علاقہ بالکل کفرستان ہے اور دور ہے۔ پولس ہو گاڑی ہو تب ہی کام ہو سکتا ہے۔ بولے سرکاری کام کے لئے تو یہ انتظام ہو سکتا ہے مگر غیر سرکاری نجی ضروریات کے لئے تو ان کا استعمال غیر قانونی ہے۔ مگر دوسرے روز دیکھا کہ یہ غیر قانونی کام انجام دینے کے لئے ایک بہت بڑی جیپ مع پولس ڈرائیور اور رائفل بردار پولس کا ڈ

www.taemeernews.com

کے موجود۔ اور پھر ہر سال یہ معمول ہو گیا کہ میں نے کسی خاص موقع پر ایسی خواہش کا اظہار کیا، اور ضروری سامان علی عباس صاحب کے حکم سے موجود۔

تیلہاڑہ میں میرے مکان کا کچھ حصہ پولس کے کرائے میں تھا۔ اور میری خواہش تھی کہ جب تک میں زندہ ہوں اس مکان کا باقی ماندہ حصہ سلامت رہے تاکہ میں کبھی کبھی اُن دروازوں میں جاکر اُن کوٹھریوں میں کمروں میں داخل ہو کر معصوم، مظلوم رہنے والوں کی سانسوں کی ہوا محسوس کروں۔ ان کے قدموں کے خیالی نشان دیکھ لوں اُن گمشدہ آوازوں کو دل کے کانوں سے سن لوں جو وہاں گونجا کرتے تھے جس پر ترنم اور تکلم کی تمام سادگیاں اور رعنائیاں فدا ہوا کرتی تھیں۔ اس گھر کو بستی کے لوگ قبضہ کرنا چاہتے تھے اور قبضہ کے لئے اس مکان سے پولس کی چوکی ہٹانا چاہتے تھے۔ کئی بار ایسی کوشش ہوئی۔ اور کئی بار مقامی پولس ذمہ داروں کو ملا کر اسے دبانے کی کوشش کی گئی۔ آخر ایک نہایت متعصب تھانیدار وہاں آیا۔ اسے بستی والوں نے اپنا اور ہم خیال بنالیا۔ اور اس نے ایسی تحریر افسران بالا کو پیش کی کہ تھانے کا وہاں سے ہٹ کر کسی کشادہ اور شاہ راہ آمد و رفت کے قریب والے مکان میں منتقل کیا جانا ضروری سمجھا گیا۔ مجھے بہت تاخیر سے خبر ملی۔ بستی کے ایک ہمدرد ہندو نے ایک پوشیدہ خط کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع دی۔ میں نے اسی وقت وہ خط عباس صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے ہندی خط پڑھکر کہا یہ تو سرکاری سطح پر بات آگے بڑھ چکی ہے اس کا روکنا تو اب ممکن نظر نہیں آتا۔ مجھ سے تو یہ کہا اور چند روز بعد معلوم ہوا کہ اُسی وقت اس علاقے کے اِس پی (جو کوئی مسٹر رام تھے) بلا کر کہا کہ اس تھانیدار کا فوراً ٹرانسفر کر دیجئے اور اس کی جگہ جسے بھیجئے اُسے فوری ہدایت دیجئے کہ اس کاروائی کے برعکس کاروائی کر کے اور مقامی چند باشندوں سے دستخط کروا کے اوپر روانہ کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور یہ کاروائی ایسی سخت تھی کہ بہت دنوں تک پولس لائن کے بعض افیسر اور دفتری کبھی کبھی مجھ پر آوازہ کس دیتے جس کا پوشیدہ مفہوم یہ ہوتا کہ آپ نے اتنا بڑا کام کرا دیا تھانیدار کا ٹرانسفر کرا دیا؟

علی عباس صاحب کے یہاں کوئی تقریب ہوتی۔ بچیوں کا بیاہ بچے کی شادی۔ وہ آتے

www.taemeernews.com

اور کہتے کرن کی شادی ہے جانتے ہو کہ وہ تمہاری شاعری کی عاشق بسرال جائے گی کچھ تاثرات لکھ دو وہ یاد کرے گی اور یاد رکھے گی ۔ میں واقعی دل سے کچھ اشعار لکھ دیتا ۔ وہ ان اشعار کو کبھی مجلس میں نہ لے جاتے نہ مجھ سے پڑھواتے ۔ لیکن شادی جب ختم ہو جاتی ۔ تمام کاموں سے نکل کر فراغت ہو جاتی تو وہ اپنے خاندان بھر کو اکٹھا کرتے بھائی بہو بیوی بیٹے داماد بیٹیاں پورا کنبہ بیس پچیس تیس افراد کا جمع ہوتا ۔ ہم سب مل کر کھانا کھاتے ۔ پھر بیٹھتے باتیں نکلتیں پیار کی تعلق کی میری شاعری کی ان میں پوشیدہ اشاروں کی اور ان کی بچی جو دلہن ہوتی بالخصوص " کرن " جو چھوٹی بچی تھی ۔ وہ تو جیسے خود ہی اشعار کی خالق ہے ۔ اشعار میرے نہیں اسی کے ہیں اور وہ اتنی بے تکلفی اور سادگی سے ان اشاروں کو آشکارا کر دیتی اور آشکارا کر کے زور سے ہنس پڑتی کہ واہ چچا جان میرا شعر آپ اپنے نام سے پڑھتے ہیں اور عباس صاحب پیار سے اسے ڈانٹتے اور پھر اس نظم کی بات آجاتی جو میں نے اس تقریب کے لئے لکھی ہوتی ۔ اور گھر بار بول اٹھتا ہاں اپنی زبان سے سنا دیجئے ۔ اور میں شروع کر دیتا اور پورا گھر خاموش ہو جاتا ۔ گم سم سب کی ٹکٹکی میری طرف بندھی ہوتی ۔ زبان خاموش اور بدن ساکت جیسے کوئی فرشتہ بادلوں سے ان اشعار کو کسی نامعلوم ہونٹوں سے ادا کر رہا ہے ۔ جب نظم ختم ہو جاتی تب علی عباس صاحب کھنکھارتے گویا سب کو جادو کے اثرات سے جگاتے اور پھر مجلس معمول پر آجاتی اور بچوں بچیوں کی چہل شروع ہو جاتی کیسی تعریف کیسی داد کیسی تحسین وہ تو گھر کا ایک معمول تھا کوئی دوسرا تھوڑا ہی شعر پڑھ رہا تھا ۔

کیا کیا لکھوں ایک داستان ہے ۔ چالیس سال کی مدت میں پھیلی ہوئی ایک کہانی ہے جسے بیان کرنے کے لئے مہینوں درکار ہیں ۔ گھنٹے دو گھنٹے میں تو صرف ایسے اشارے کئے جا سکتے ہیں جو کسی اچھی غزل کے شعر میں ہوتے ہیں کہ اس شعر کو سن کر ایک کہانی بنا لیجئے ۔ اور چھوٹے سے گلستان کو دیکھ کر پوری آمد فصل بہار اور رخصت بہار کی فلم تیار کر لیجئے ۔

فخرالدین ونک صاحب جن کا ذکر علی عباس صاحب کے ساتھ آرہا ہے ۔ یہ بوہرہ فرقے کے ایک نہایت تعلیم یافتہ کاروباری خاندان کے فرد ہیں ۔ مادری زبان گجراتی اور کاروباری زبان

www.taemeernews.com

نہایت اعلیٰ سطح کی انگلش۔ انہیں اوسان کے بڑے بھائی کو انگریزی زبان کا ہندوستان میں ادیب کہا جا سکتا ہے۔ کلکتہ سے کاروبار اُٹھا کر چالیس سال پہلے پٹنہ آئے۔ اور اب ان کا روزگار کارخانہ اور شوروم پٹنہ۔ مدراس۔ بنگلور تین چار شہروں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے جس وقت مجھ سے شناسائی ہوئی۔ ان کا تجارتی سلسلہ صرف پٹنہ ہی میں تھا۔ پچیس سال پہلے اکثر ریڈیو کے مشاعرہ میں بالخصوص اور اور عمومی مشاعروں میں بالعموم کبھی کبھی سامعین کی صف اول میں ایک جوڑے پر میری نظر پڑ جاتی ایک بہت چھریرے بدن کا بلند و بالا جوان موزوں خدوخال موسم کے اعتبار سے کبھی شرٹ پینٹ میں کبھی نفیس سوٹ میں اور ان کی بغل میں ایک خاتون بغیر برقعہ مگر پردے کے دوسرے اہتمام کے ساتھ۔ مشاعروں میں پڑھتے ہوئے کبھی میری نظر ان پر پڑ جاتی تو مجھے سنتے ہوئے ایک خاص قسم کا استغراق، شوق سماعت اور اس کے نتیجے میں ایک خاص قسم کی کیفیت اظہار تحسین و تعریف۔ سنجیدگی اور تبسم، الم اور طرب کا امتزاج ان دونوں کے چہروں سے ہویدا نظر آتا۔ میں تو مستی میں پڑھتا ہوں۔ اس مستی میں بعض چہروں پر اسی نوع کی مستی سامعین میں نظر آجاتی۔ مگر یہ دونوں چہرے اکثر مشاعروں میں بالکل سامنے نظر آتے۔ اس لئے ذہن پر ان کی تصویریں مرتسم رہیں۔ ایک دن میں پٹنہ جنکشن کے قریب کسی سواری کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک سیلون کار میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شام ہو چکی تھی کسی صاحب نے کہا تشریف لے آئیے ہم آپ کو پہونچا دیں گے۔ میں اندھیرے میں سمجھ نہ سکا میں نے انکار کر دیا۔ انکار کیا تو پھر انکار پر جم گیا یہ میرا مزاج ہے۔ بہرحال تو گاڑی روانہ ہو گئی۔

چند دن بعد علی عباس صاحب، جب وہ تجمل حسین صاحب، کے مکان پٹنہ سیٹی میں مقیم تھے۔ مجھے اپنے مکان میں لے گئے وہاں ڈرائنگ روم میں بہت سے خوش پوش ممتاز مرد و خواتین حضرات موجود تھے۔ مسٹر شرن سنگھ چیف سکریٹری بہار اور مسٹر جیوند سنگھ جیلھ سکریٹری۔ مسٹر پریم سنگھ کولی سکریٹری آب پاشی اور پٹنہ سیٹی کے بچے کھچے باذوق رؤسا اور وہ جوڑا جو مجھے ریڈیو کے مشاعروں میں اکثر سامنے کی صف میں نظر آتا تھا۔ حاضرین میں اکثر سے میرا تعارف پہلے ہی سے تھا۔ وہ سب جانے پہچانے اور مانے ہوئے

www.taemeernews.com

موزوں نہیں پڑھ سکتے ۔ سبب یہ ہے کہ ایسے دوستوں کا تعلق اردو سے یا اردو ادب سے یا اردو شاعری سے فیشن کا ہے یا شہرت و ناموری کا ہے یا دنیا سازی کا ہے یا حصول تقرب کا ہے یہ ایک تمغہ ہے جو سُرخ روئی کے لئے یا فخر و امتیاز کے لئے یا حکام رسی کے لئے یا مجلس آرائی کے لئے سینے پر ٹکایا جاتا ہے ۔

بہرحال تو ایک گجراتی جسے اردو سے کسی سطح پر آشنائی نہیں ہو یک بیک اس کا ذوق اتنا قریب کر دیتا ہے ۔ تو پانچ چھ سال بعد جب وہ مجھے اچھی طرح پہچان گئے جان گئے اور سمجھ گئے اور ان کی فہم اور ادراک کا دروازہ کھل گیا اور اس دروازے سے ان کا اشتیاق ان کی بے لوث تمنا جھانکنے لگی تو مجھ سے نہیں انہوں نے علی عباس صاحب سے کہا کہ میں کلیم عاجز کی غزلوں کا مجموعہ اپنی پسند اور اپنے ذوق کے اعتبار سے بہ اہتمام شائع کرنا چاہتا ہوں ۔ اس سلسلہ میں آپ میری مدد کیجئے ۔ علی عباس صاحب تو خود اِس ارمان اس خیال اِس آرزو میں گرفتار تھے مگر کسی فعال اور اہل ہمت معاون کے منتظر تھے ۔ جب انہوں نے فخرالدین صاحب کے اصرار کو دو ایک سال تک پرکھ لیا، ان کے ارادے کی مضبوطی کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئے ۔ تو ایک بار عباس صاحب نے بر سبیل تذکرہ یوں ہی چھیڑا کہ کلیم عاجز صاحب آپ کے کلام کو چھپنا چاہیئے ۔ وہ جانتے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ میں اشاعتِ کلام کے حق میں نہیں تھا ۔ کیونکہ میرا کلام میری شاعری میری غزل میری نہیں تھی یہ میری ماں اور تمام شہدائے تیلہاڑہ سے منسوب تھی وہ ہو چکی تھی ۔ ان کی روح تک یہ آواز پہونچ چکی تھی ۔ میرا ایمان ہے کہ وہ سُن رہے ہیں ۔ پھر اس سے زیادہ تعلق میری شاعری کا مجھ سے نہیں تھا ۔ اس لئے برسہا برس سے کسی رسالے کو کسی پرچے کو کسی مجموعے کو استدعا کے باوجود میں نے کوئی غزل اشاعت کے لئے نہیں دی تھی ۔ اور نہ کسی خواہش مند کو میں نے اپنی شاعری کے متعلق کچھ لکھنے کی اجازت دی تھی ۔ بلکہ منع کیا تھا ۔ اس لئے میں نے نارضامندی کا اظہار کیا پہلے مجھے علم نہ تھا کہ فخرالدین صاحب اور عباس صاحب یہ منصوبہ بنا چکے ہیں ۔ لیکن عباس صاحب کا اصرار مستقل طور پر سلسلہ وار جاری رہا ۔ اور آخر میں یہ بھی کہا کہ ہم دونوں کا منصوبہ بن چکا ہے ۔ جب میں نے ان کے ارادے ان کی نیتوں

www.taemeernews.com

سخن فہم، سخن شناس اور سخن سنج تھے۔ لیکن اس نئے جوڑے سے میرا تعارف نہیں تھا اور یہ نیا جوڑا میاں بیوی کا اس نشست میں اس لئے زیادہ نمایاں تھا کہ میرا کلام پورا کا پورا ٹیپ کر رہے تھے۔ اس لئے بار بار اُٹھ کر کیسٹ درست کرنے کو یہ میرے قریب آرہے تھے۔ اسی دوران میں نے اِن دونوں کا تعارف چاہا تو علی عباس صاحب نے فرمایا کہ یہ دونوں مسٹر فخرالدین دنک اور ان کی بیوی محفوظہ آپ کے تازہ بتازہ عاشقوں میں داخل ہوئے ہیں۔ اسی کے بعد فخرالدین صاحب نے کہا کہ میں آپ کو فلاں روز اسٹیشن کے قریب اپنی گاڑی پر آپ کے گھر پہنچانا چاہتا تھا مگر آپ نے ایک دَم سرد مہری سے صاف صاف انکار ہی فرما دیا۔ میں نے کہا میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ یہ ہمارا پہلا تعارف تھا۔ پھر ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی وہ میرے گھر بھی آجاتے۔ ایک دو بار ہم لوگوں کی بزم مجلسِ ادب کی نشست فخرالدین صاحب نے اصرار کر کے اپنے یہاں رکھوائیں اس طرح ہمارا آنا جانا بھی ان کے گھر میں ہوا۔ پہلی ملاقات میں گجراتی اور انگریزی ملی ہوئی اُردو بولتے آہستہ آہستہ اردو زبان صاف ہوتی نظر آئی اور کبھی کبھی نہایت بے ساختگی سے میرے اشعار بھی بالکل موزوں اور معانی و مفہوم کی پوری آگاہی سے برمحل پڑھ جاتے جو کچھ لوگوں کو ایک عمر گذر جانے کے بعد بھی نصیب نہ ہو سکی مثلاً آج ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء۔ پرسوں ۱۶ دسمبر کو میں ایک تقریب میں شریک تھا۔ پٹنہ کے ایک نہایت اونچی سطح کے تعلیم یافتہ صاحب جو بہار سرکار کے ایک محکمہ میں ڈائرکٹر ہیں اردو کے مانے ہوئے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں کالج میں اور یونیورسٹی میں مجھ سے ایک سال سینئر طالب العلم تھے اور اسی دوران اردو ادیبوں کی صف میں ممتاز تھے۔ اس تقریب کی نظامت کر رہے تھے انہوں نے ایک موقع پر اپنی نظامت کے دوران ایک شعر پڑھا جو خود میں نے انہیں ایک سلسلہ کے خط میں لکھا تھا۔ میں بالکل آخری صف میں تھا۔ آواز آرہی تھی چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ شعر انہوں نے پڑھا اور میں پیچھے کی صف سے بول اٹھا کہ یہ کون صاحب ہیں شعر غلط اور ناموزوں پڑھ رہے ہیں؟ پھر سر اُٹھا کر دیکھا۔ چہرہ نظر آیا تو افسوس ہوا تو یہ حال ہے آج کے دور میں اردو کے ممتاز اسکالر افسانہ نویس اور مضمون نگاروں کا کہ سیدھا سادا صاف شعر بھی

www.taemeernews.com

اور اِن کے خلوص کو اچھی طرح جانچ پرکھ لیا تو پھر میں اپنے منتشر اوراق اکٹھا کئے۔ منتشر ڈائریاں اور نوٹ بکس جو مہیا ہو سکیں انہیں سمیٹا اور جلدی میں جو ہو سکا تقریباً دو سو غزلوں کا ایک مسودہ بنا کر ان حضرات کے حوالہ کر دیا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ لگن کسے کہتے ہیں تعلق کسے کہتے ہیں شوق اور ذوق کسے کہتے ہیں اور کام کرنے والے کیسے کام کرتے ہیں خلوص کسے کہتے ہیں اور اس طرح کے خلوص اور اس طرح کی لگن کا نتیجہ کیا برآمد ہوتا ہے۔ فخرالدین صاحب عمومی طور پر ایک سال تک خصوصی طور پر تقریباً پانچ چھ ماہ تک یہ بھول گئے کہ وہ وانکوس کمپنی کے مالک ہیں، ایک بڑی تجارت کے مالک ہیں اور اس کے اہم ذمہ دار اور کارندے ہیں۔ جسے ہر وقت ان کی ضرورت ہے۔ وہ یہ سب بھول گئے۔ صرف سمجھتے رہے کہ وہ بزم "کعف" کے رکن ہیں، ایک مقدس کام کی انجام دہی کے اہم ذمہ دار ہیں۔ جس بزم کے نام میں ان کا نام سب سے پیچھے آتا ہے۔ کعف (ک۔ع۔ف، کلیم۔ عباس۔ فخرالدین) کام کرنے میں وہی سب سے آگے ہے یعنی "ک" یعنی کلیم وہ نام میں سب سے آگے ہے۔ سال چھ ماہ تک فخرالدین صاحب سب کچھ فراموش کر کے کتاب کے ڈیزائن، اُس کے ناپ اس کے کاغذ اس کے پمفلٹ، اس کے فولڈر اور اس کے پورے منصوبے کو اوڑھنا بچھونا بنا کر اسی میں پڑے رہے۔ کتابت کس سے کرانی ہے تو کئی روز کی میٹنگ اور جانچ پڑتال کے بعد عبدالرحمٰن صوفی صاحب کا انتخاب ہوا۔ مسودہ ان کے حوالہ کیا گیا۔ ہر ہفتہ مشورہ کی نشست اور کبھی کبھی مجھے بھی ان مشوروں میں شرکت کرنی پڑی اس طرح ان کا گھر میرے لئے ایک خاص قسم کی خوشبوؤں کا سرچشمہ بن گیا۔ ان مشوروں میں علی عباس صاحب، فخرالدین صاحب ان کے بڑے بھائی شبیر صاحب اور طاہر صاحب اور ان سب کے والد بدرالدین صاحب اور ان کے کارخانے اور کاروبار کا تمام اعلیٰ آفیسر اور ان کے آرٹ سیکشن کے انچارج مسٹر گوربوس۔ اور پھر ان کے گھر کی تمام سمجھدار مستورات اور فخرالدین صاحب کی اہلیہ محفوظہ وغیرہ ان مشوروں میں یوں شریک ہوتیں جیسے ان کے گھر کے کسی نہایت پیارے فرد کی تقریب ہے اور گھر کے شایان شان اس تقریب کی تیاری کے مشورے ہیں۔ میں کیا بتاؤں وہ سال چھ ماہ کیوں کر گذرے بوہرہ طبقے کے

www.taemeernews.com

اکثر علما اور عمال آتے رہے اور وہ بھی اسے مقدس سمجھ کر اپنے مشوروں کو پیش کرتے رہے۔ کتاب تیار بھی نہیں ہوئی تھی کتابت ہو کر پریس میں جانے والی تھی کہ اس کی ایک نہایت شاندار مجلس تعارف منعقد ہوئی۔ بھارتیہ کلا مندر میں ایک اعزاز دیا گیا۔ شہر کے اعلیٰ افسران اور معززین، یونیورسیٹی کے وائس چانسلر اور پروفیسران اور شہر کے شعرا۔ کتاب کا تعارف بھی ہوا پمفلٹس تقسیم کئے گئے تعارفی تقریریں ہوئیں جن میں شمولیت مسٹر دیوندر شرما وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی، مسٹر سرکار جنرل منیجر اسٹیٹ بینک آف انڈیا اور بعض دوسرے پروفیسران اور پھر علی عباس صاحب نے اپنے مختصر تاثرات اپنے مخصوص ادبی انداز میں پیش کئے اور آخر میں فخرالدین وٹک صاحب نے انگریزی زبان میں ایک اردو شاعر کے کلام اور مزاج اور مفہوم کو ادب کی بہترین چاشنی کے ساتھ اس حسن اور اس اسلوب سے پیش کیا کہ میری بغل میں بیٹھے ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج اور ریٹائرڈ ممبر پبلک سروس کمیشن مسٹر بہاءالدین احمد نے کہا یہ شخص تو انگریزی زبان کا معرکتہ الآرا ادیب معلوم ہوتا ہے۔

تو جناب میں لکھتا جاؤں گا اور آپ شوق سے پڑھتے جائیں گے نہ میں تھکوں گا نہ آپ تھکیں گے بلکہ تقاضہ کریں گے کہ کچھ اور کچھ اور مگر کہیں جیب تھک جائے گی پیسہ چلتے چلتے تھک جائے گا اور اس کا تھکنا ہم سب کو تھکا دے گا۔ زمانہ بڑا بے درد ہے۔ یہ انسان کی اچھی خواہشوں کے راستہ میں ہمیشہ سد راہ ہے۔ اچھی خواہشوں کو یہ پنپنے دینا نہیں چاہتا۔ یہ پردہ پوشی پسند نہیں کرتا۔ پردہ دری اسے خوب محبوب ہے انسانوں کے عیوب انسانوں کی برائیاں چالو اور بازاری الفاظ میں لکھتے جاؤ یہ لکھنے والوں کو بے حد چھوڑ دے گا۔ ایک ایک ٹکڑے کو جمع کرے گا اور بھاری بھاری جلدوں میں بھاری بھاری رقموں میں فروخت کرے گا۔ دیکھ لو خشونت سنگھ کی تحریروں کو رشدی کی تحریروں کو امرتا پریتم اور عصمت چغتائی کی تحریروں کو اور سینکڑوں ایسی تحریروں کو جنہیں میں اپنے قلم سے لکھ کر لوگوں کو متوجہ کرنا نہیں چاہتا جنہیں میں خود پڑھنا نہیں چاہتا لیکن دو چار صفحوں کے بعد خط کا مضمون لفافہ پڑھ کر جان لیتا ہوں اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کر کے اعلان کر دیتا ہوں الحمدللہ وہ اعلان کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ تو اس لئے

www.taemeernews.com

قلم کو روکنا پڑتا ہے دل کو دبانا پڑتا ہے تقاضوں کو لگام دینا پڑتا ہے۔ اس لئے نہیں لکھ سکتا مختصر یہ کہ کتاب چھپی اس کے ٹائٹل کے لئے درجنوں نقشے بنوائے گئے لیکن جب میں نے اپنا سرسری اور بے ساختہ دیباچہ لکھا اور اس دیباچے میں تیلہاڑہ کی سنگی مسجد کی زبان سے تیلہاڑہ بستی کے معصوم مظلوم مردوں عورتوں کنواروں اور کنواریوں بچوں اور بچیوں کی زندگی اور موت کے سہ روزہ ڈرامے کی تفصیل بے ساختگی میں پیش ہوگئی تو سب لوگ دنگ ہو کر بیٹھ گئے اور سارے ٹائٹل پینسل دئے گئے۔ اور ایک روز دو موٹر کاروں پر میں اور علی عباس صاحب اور فخرالدین دنگ صاحب گوربوس صاحب اور کچھ اور لوگ اس تاریخی گاؤں جہاں ستائیس اٹھائیس سال پہلے یہ تاریخی المیہ ڈرامہ کھیلا گیا تھا شام کو پہنچے جب چودھویں شب کا چاند طلوع ہونے والا تھا مسجد سے قریب ایک مقام پر تین کیمرے فٹ ہوئے۔ ایک علی عباس صاحب کا ایک فخرالدین صاحب کا اور ایک ان کے آرٹسٹ گوربوس کا۔ یہ تینوں کیمرے طلوع ہونے والے چودھویں کے چاند کی پھیلتی ہوئی روشنی میں مسجد کی مختلف زاویوں سے تصویریں لے کر تین چار میل دور یکنگر سرائے تھانے میں ایک مسلمان تھانے دار کوارٹر میں چند گھنٹے بسر کرنے کچھ چائے ناشتہ کے لئے گئے اور جب آدھی رات ہونے لگی تو مہ کامل کی روشنی میں پھر مسجد کی بھرپور تصویر کے لئے بارہ بجے شب کو تیلہاڑہ گئے اور پھر تینوں کیمروں نے مختلف زاویوں سے مسجد کی تصویریں لیں۔ اور پھر واپس ہوئے اور شب کو تھوڑی دیر آرام کر کے طلوع آفتاب سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے ڈوبتے ہوئے چاند کی سمٹتی ہوئی روشنی میں مسجد کو اور مسجد والے کو الوداع کہنے کے لئے پھر تیلہاڑہ گئے اور بدستور تینوں کیمروں نے مسجد کی الوداعی تصویریں لیں۔ اور پٹنہ واپس ہوئے اور تمام پہلے ٹائٹل کے نقشوں کو خیرباد کہہ کر انہیں سینکڑوں تصویروں سے ایک تصویر مسجد کی منتخب کی گئی جس میں لہو برس رہا ہے اور مسجد کے ماحول میں درختوں کی شاخیں اس لہو کو جذب کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ

ہم ہیں اگر تو خونِ جگر کی کمی نہیں
جتنے چراغ بزم میں چاہو جلائے جاؤ

www.taemeernews.com

"وہ جو شاعری کا سبب ہوا" چھپنے کی بڑی لمبی کہانی ہے۔ دلچسپ بھی الم انگیز بھی اور عبرت خیز بھی اس میں فخر و ناز کے پہلو بھی آجائیں گے، شرم و افسوس کے مقامات بھی آجائیں گے کچھ پردہ داری بھی ہو جائے گی کچھ چاک دامنی اور چاک گریبانی کا منظر بھی آجائے گا کچھ دوست بہت اُٹھتے اور کچھ بہت نیچے گرتے نظر آئیں گے کچھ بشارتیں، کچھ وعیدیں، کچھ انعامات کچھ الزامات۔ اس لئے درگذر کیجئے ان باتوں کو :

جب اس کو پیار کیا ہے جب اس کو چاہا ہے
وہ بے وفا سہی کیا اس کو بے وفا کہئے

مگر ایک بشارت تو سن ہی لیجئے۔ اسے کرشمہ کہہ لیجئے معجزہ کہہ لیجئے محبت کی کارفرمائی تعلق، شوق اور وابستگی کی حسن آرائی کہئے کہ فخر الدین صاحب جن کی بولی گجراتی زبان انگریزی وہ کتاب کے مسودے کی تیاری کرتے کرتے اور کتاب چھپتے چھپتے فصیح اردو زبان بولنے لگے اور لکھنے لگے اور اچھے اچھے معروف سخن فہموں سے زیادہ شعر سمجھنے لگے اشاروں تک پہونچنے لگے استعاروں کو پہچاننے لگے اور ان سب کو بہترین انگریزی زبان میں نہایت شاعرانہ انداز میں ترجمہ کرنے لگے۔ اور اب وہ مجھے انگریزی میں خط نہیں لکھتے۔ بغیر کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کئے اردو رسم الخط میں مجھے خط لکھتے ہیں اور ذرا سی ہجے کی غلطیوں سے چشم پوشی کرلی جائے تو کبھی کبھی دھوکا ہو جاتا ہے کہ فخر الدین ونک کی زبان سے کلیم عاجز بول رہا ہے وہی لہجہ کی صفائی زبان کی سادگی اور روانی اور تو اور اصل معجزہ "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کا یہ بھی ہے کہ فخر الدین ونک صاحب کے بھائی شبیر حسن صاحب جو فخر الدین صاحب سے بھی زیادہ انگریزی ادب اور شاعری پر عبور رکھتے ہیں اور 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی طباعت، اور اشاعت کے دوران محض اپنے چھوٹے بھائی فخر الدین ونک کی رعایت سے پورے نظام اشاعت و طباعت میں معاون و مددگار تھے لیکن نہ اردو سمجھتے تھے نہ اردو بولتے تھے بھلا شاعری کیا سمجھتے اور دس سال گذرنے کے بعد بھی اردو شاعری سے ان کو دور کا سروکار اور رسمی و رواجی بھی آشنائی نہ تھی اور نہ میری کتاب ان کے سامنے کبھی رہی۔ وہ ابھی

www.taemeernews.com

ایک دو سال پہلے کسی سماجی حادثے میں دل پر چوٹ کھا گئے۔ ہائے غضب ہو گیا۔ معلوم ہوا انہوں نے اپنے کارخانے میں تمام ڈھونڈھوا کر اپنے بنگالی فوٹو گرافر گوربوس بابو کے ذریعہ کہیں رکھی رکھائی ایک جلد پائی وہ منگوائی۔ کچھ پڑھوا کر کچھ سن کر کچھ ٹوٹا کر کے پڑھ کے اب تو "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کے گویا پورے حافظ بن گئے ہیں اور درد کے مارے اشعار باتوں میں، عبارتوں میں مضامین میں خطوط میں بے ساختہ اور اتنا بامحل اور برجستہ استعمال کرتے ہیں کہ میں بھی دنگ رہ گیا۔ یہ تو کچھ ایسی ہی بات نظر آتی ہے کہ حافظ شیرازی کسی بزرگ سے ایک جام شراب یا شراب معرفت پی کر صبح اُٹھے تو شعر بے اختیار کہنے لگے۔ شبیر بھائی بھی درد کی ایک چوٹ کھا کر گرے اور اُٹھے تو "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" کے حافظ بن کر اُٹھے۔

علی عباس صاحب کی بات رہ گئی۔ شعر کی مستی اور محبت کی سرشاری میں جھومنے والے علی عباس۔ بے شک اور بلا شبہ عظیم آباد کی آخری تہذیبی وراثت کے امین اردو شاعری اردو ادب کے قابل رشک مرتبہ شناس۔ سخن فہمی اور سخن شناسی کے مسفرد یادگار۔ کلیم عاجز کی شخصیت اور فن کے بہترین صاحب شناخت کو آخری بار دکھا دوں اور یہ کتاب جو طویل ہو رہی ہے ختم کروں۔

میں امریکہ کے چار ماہ قیام کے بعد واپس آیا تو گذشتہ سال کے کسی ابتدائی مہینے میں ایک بزرگ کے یہاں خبر ملی کہ عباس گھر میں گر گئے ہیں اور ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں دوڑا ہوا ان کے گھر گیا۔ وہاں معلوم ہوا اسپتال میں ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا۔ یہ حادثہ اس عمر میں اکثر لوگوں کو پیش آتا ہے۔ خود میرے ساڑھو ڈپٹی ولی الحق صاحب جو عباس صاحب سے عمر میں زیادہ ہیں چار سال پہلے گرے کولھا ٹوٹا۔ اسپتال گئے آپریشن ہوا کیا کیا کھونٹا کھونٹی لگی۔ اور دو تین ماہ بعد گاندھی میدان کا چکر لگانے لگے۔ کالج اسپتال پہنچا تو دیکھا عباس صاحب خاموش لیٹے ہوئے ہیں۔ میں نے کہا عباس صاحب۔ چالیس برس سے آپ کو دیکھ رہا ہوں (یہ گفتگو میں نے سلام کرنے کے بعد ہی فوراً بغیر تمہید اور مزاج پرسی کے شروع کر دی)

www.taemeernews.com

آپ کو کسی حد تک، جوانوں ایسا کبھی دیکھا نہ نکلا ہوا پھرتیلی چال سے چلتے ہوئے طاقت اور توانائی کے آپ نمونہ رہے۔ اُس وقت آپ کو اچھل کود کی نہیں سوجھی۔ اس عمر میں آکر بچوں کی طرح چھلانگ لگا کر ٹانگ توڑ کر جوانی کی یاد لیٹے لیٹے منانے کی کیا سوجھی؟ ۔ وہ مسکرا اٹھے اور میرا شعر پڑھا:

آدمی دانا ہے نہ دیوانہ
وقت جو چاہے سو بناتا ہے

میں نے کہا آپ کو تو وقت نے کبھی نہیں بنایا آپ ہی وقت کو جو چاہا بناتے رہے۔ وقت تو کمزوروں کو جو چاہتا ہے بناتا ہے اور جو چاہ رہا ہے ہمیں بنا رہا ہے۔ آپ اس کی گرفت میں کیسے آسکتے ہیں۔ اتنے میں ان کے داماد اور لڑکی آگئی۔ میں نے تنہائی میں اُن کی کیفیت پوچھی بولے گھڑی میں پلنگ سے اُٹھتے ہوئے گر گئے تھے۔ اور کچھ پرانے امراض کی طرف اشارے کئے اور کہا آپریشن ممکن نہیں ہے۔ اور کچھ ایسی بات کہی جو میں پوری طرح سمجھ نہیں سکا مگر سننے میں خطرناک لگی۔ سوچنے میں وحشتناک اور محسوس کرنے میں نہایت غمناک لگی اور میں ان کے پلنگ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور اپنے سفر امریکہ کی بعض دلچسپ روداد سنانے لگا۔ عباس صاحب مسکرا کر بولے۔ آج کل آپ کی محبوبہ سے روحانی تعلقات کس سطح پر ہیں۔ میں نے کچھ رونی صورت بنا کر کہا کیا کہوں عباس صاحب:

خدا جانے اب اس کی زلف و رخ کا حال کیسا ہے
وہ کافر اب غزل مجھ سے کہلانے نہیں آتا

عباس صاحب کی مسکراہٹ ذرا تیز ہوگئی اور بولے۔ نہیں جناب آپ چھپاتے ہیں وہ کافر اب بھی خوب آتا ہے اور آپ تو خود بھی اسے بلاتے ہیں۔ اور انہوں نے میرے چند اشعار پڑھے:

زخموں کے نئے پھول کھلانے کے لئے آ
پھر موسمِ گُل یاد دلانے کے لئے آ

www.taemeernews.com

ہاں رکھ دہنِ زخم پہ پھر انگلیاں اپنی
دل۔ بانسری تیری ہے بجانے کے لئے آ
کچھ روز سے ہم شہر میں رسوا نہ ہوئے ہیں
آ پھر کوئی الزام لگانے کے لئے آ
اب لطف اسی میں ہے مزا ہے تو اسی میں
آ اے میرے محبوب ستانے کے لئے آ

بھلا آپ محبوب کو اس طرح بلائیے اور وہ نہ آئے۔ وہ تو اسی طرح آتا ہوگا جس طرح آپ نے بلایا :

بل ابروں پر ڈالے بکھیرے ہوئے گیسو
آ پھر مجھے دیوانہ بنانے کے لئے آ

مجھے معلوم ہوا تھا کچھ اس قسم سے کہ ان کی ٹانگ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی ان کے گردے کی طرف ذرہ ذرہ بڑھتی جارہی ہے اور یہ بہت سخت تکلیف کا سبب ہوتا ہے۔ اسی جانکاہ تکلیف میں عباس صاحب اتنی بیدار مغزی سے گفتگو کر رہے تھے۔ شعر پڑھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ میں تقریباً روزانہ صبح شام ان کے پاس بیٹھتا گرچہ میں نے بہت پہلے انہیں سگریٹ نوشی کم کرنے کی تاکید کی تھی اور تاکید کرتا تھا۔ مگر اب ترک و اختیار میں کوئی فرق نہیں ہونے والا تھا میں ان کے خیالات بدلنے کے لئے خود ان کے لبوں سے سگریٹ لگا دیتا اور ماچس جلا کر سلگا بھی دیتا اور وہ ہلکے ہلکے دو چار کش لیتے کچھ باتیں کرتے کبھی دھیمے مسکراتے اور پھر شدت تکلیف میں خاموش ہو جاتے۔ ہڈی کی تکلیف کو کم کرنے کے لئے معالجوں نے مشورہ دیا تھا کہ یہ اپنے پاؤں کی انگلیاں متحرک رکھیں انگلیوں کو نیچے اوپر کرتے رہیں مگر عباس صاحب کو اس کی پروا نہیں تھی اور انگلیوں کو حرکت دینے سے وقتی طور پر کچھ تکلیف بڑھ جاتی تھی۔ میں انہیں بار بار اس کی تاکید کرتا وہ دو تین بار حرکت دیتے اور پھر چھوڑ دیتے۔ ایک روز شاید انتقال کے دو ایک دن ہی پہلے میں خود ان کے پائنتی بیٹھ گیا اور اُن کے پاؤں کی انگلیاں پکڑ کر آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔

www.taemeernews.com

دو ایک حرکت کے بعد عباس صاحب مسکرائے اور مسکراتے ہوئے بولے :

"ہاں ستایئے۔ خوب ستایئے۔ جاتے جاتے بھی ستایئے۔"

میرا جی چاہا میں زور سے چیخ ماردوں۔ وہ تو ضبط کیا مگر میں ان کی انگلیوں کو پھر حرکت دینے کی جرأت نہ کر سکا۔

دوسرے تیسرے روز عباس صاحب رخصت ہو گئے اور عظیم آباد کی بزم سخن شناسی کا آخری چراغ بجھ گیا۔

پچھلے پچاس صفحات میں جو میں نے چند شخصیتوں کے متعلق اور ان شخصیتوں کے پس منظر میں کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک آخری بات کہنے کا تقاضہ ہو رہا ہے۔ میرا ذاتی غم تو بہت بڑا ہے اتنا بڑا ہے کہ تمام غم اس غم میں سما کر ختم اور ناپید ہو گئے۔

ترا درد اتنا بڑا حادثہ ہے
کہ ہر حادثہ بھول جانا پڑے ہے

یہ میرا غم جان اور میرا غم دل جسے میں نے سارے عالم میں پہلے پھیلا دیا اور اس جال میں تمام عالم کا غم سمیٹ کر ایک ہمالیہ پہاڑ بنا کر اپنے دل پر رکھ لیا اس میں تو اضافہ کی اب برداشت نہیں ہے۔

یوں اٹھائے ہوئے ہیں دل پہ ترے غم کا پہاڑ
کہ اب ایک پھول بھی رکھدو تو اٹھائے نہ بنے

لیکن چھوٹے چھوٹے تہذیبی، سماجی تعلقاتی غم بھی میری زندگی کو بدمزہ کر دیتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے سلسلے میں مجھے عباس صاحب کا مرکر دور ہو جانا بہت قلق پہونچا گیا کہ میری شاعری کی بزم سونی ہو گئی۔ میں نے بیس پچیس سال پہلے کہا تھا کہ

میں تو جلتا ہوں تم بھی جلو دوستو
شمع کے واسطے انجمن چاہئے

www.taemeernews.com

تو میری پکار پر جلنے والے بہت سے پیدا ہو گئے تھے اور خوب جلے اور ان کی معیت اور صحبت میں مجھے جلنے کا خوب خوب مزا آیا۔ اُس جلنے والوں کی انجمن کے آخری چراغ عباس صاحب تھے وہ بجھ گئے اور مر کر مجھ سے دور چلے گئے۔ اس انجمن کے ایک اور چراغ جن چراغوں کو دیکھ کر مجھے تقویت ہوتی تھی اور کہتا تھا کہ

اکیلی نہیں ہے تو اے شمع محفل
ترے چند ہم داستاں اور بھی ہیں

وہ ایک اور چراغ فخر الدین دنک صاحب تھے جو زندہ رہ کر مجھ سے دور ہو گئے۔ مدراس چلے گئے دو چار چھ ماہ پر وہ چھوٹی موٹی تحریروں سے کبھی کبھی میرے جلتے ہوئے دل کے چراغ میں کچھ روغن کا اضافہ کر دیتے ہیں اور بس۔ اور تیسرا چراغ۔ غلام سرور صاحب تھے جو میرے پاس رہ کر مجھ سے دور ہو گئے۔ اب جو سرور صاحب ہیں وہ سرور وہ نہیں ہیں جو میرے ساتھ جلنے والوں میں بہت نمایاں تھے۔ وہ خیالات اور جذبات سے لہکتا ہوا محسوسات کی ضرب سے دھڑکتا ہوا اور الفاظ میں کڑکتا ہوا غلام سرور اب کہاں۔ وہ چھریرا پتلا دبلا غلام سرور علی گڈھ چست اوٹنگ پاجامہ چست اور بھر ہری شیروانی میلی چپل پیشانی پر گستاخ بالوں کے بار بار حملے جو انگلیوں کا بھرپور مقابلہ کرتے اور کبھی شکست نہ کھاتے۔ اور ہونٹوں پر کبھی فنا نہ ہونے والی روح کی توانائی سے بھرپور صحت مند اور جاندار مسکراہٹ اب کہاں۔ وہ تصویر تو ایک چوکھٹے میں یادگار رکھی ہوئی ہے۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ بہار کی سیاسی مذہبی اور ادبی مجلسیں استاد اور شاگرد یعنی ڈاکٹر اختر اور ینوی مرحوم اور غلام سرور صاحب معرکتہ الآرا خطابت سے گونجا کرتی تھیں۔ اختر صاحب کی خطابت میں علمیت اور شعریت کی چاشنی رہتی غلام سرور صاحب کی خطابت منطقیت اور معقولیت کا ایسا پھریرا اڑاتی کہ ان کے مخالف کو سرنگوں ہونا پڑتا۔ اب تو میں نے عرصہ سے غلام سرور صاحب کو سنا ہی نہیں ہے۔ انداز ایسا لگتا ہے کہ استاد کے انتقال کے بعد شاید غلام سرور نے بھی موسم گل جانے کے بعد طرز سخن کو چھوڑ دیا۔

اختر صاحب کی بات آ گئی۔ وہ اُن کے بھی استاد اور میرے بھی۔ غلام سرور صاحب

www.taemeernews.com

خطابت میں ان کے جانشیں تھے ۔ وہ مقام ہی اور ہے ۔ میری شاعری کے بے شک وہ دل دادہ تھے ۔ پہلے ہی دن آج سے تقریباً چالیس سال پہلے میری دو ایک ابتدائی غزل سن کر منظر اور پس منظر سے واقف ہو کر مری اٹھان کی پیشین گوئیاں کرنے لگے تھے ۔ اس کے بعد تو یہ حال ہوا کہ عام مشاعروں میں وہ چپکے بیٹھے رہتے مگر ان کی آنکھیں میری طرف ٹکٹکی باندھے رہتیں اور ان آنکھوں سے حیرت و استعجاب، محبت اور مسرت کا خاموش چشمہ اُبلتا رہتا ۔ وہ ہر شاعر کی تعریف کرتے سر مشاعرہ کرتے اور پوری قوت سے کرتے ۔ مگر میرے اشعار پر ان کی داد زبان سے آنکھوں میں منتقل ہو جاتی ۔ اختر صاحب کی شخصیت کا حُسن تدریس سے زیادہ ان کے حُسن خطابت میں تھا ۔ وہ معمولی موضوع کو زور بیان سے آسمان پر پہونچا دیتے مگر وہ کوئی راستہ نہیں بتاتے اور اُن کے پیچھا کرنے والے درمیان ہی میں گم ہو کر رہ جاتے لیکن کوئی مجلس ہو ۔ ادب کی ہو، شاعری کی ہو، مذہب کی ہو، سیاست کی ہو اختر صاحب کی شخصیت ان کا بلند و بالا قد ان کے زور بیان سے مل کر بڑے بڑے ماہرین موضوع کو مرعوب اور معقول کر دیتا ۔ وہ ایک دردمند انسان تھے اور مسلم مسائل میں بڑی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ۔ وہ بڑے دانشمند اور مصلحت شناس معاملہ فہم اور موقع شناس انسان تھے ۔ یونیورسٹی میں صدر شعبہ وہ تھے اور کالج میں صدر شعبہ ڈاکٹر صدرالدین فضا تھے ۔ دونوں شعبوں میں چشمک اور رقابت گہری تھی مگر دونوں بڑے صاحب ظرف تھے اور لڑکوں پر اس رقابت اور چشمک کا پردہ نہیں کھلتا ۔ اب دونوں کی یہ رقابتیں گندگیوں کی سرحد پر پہونچ چکی ہیں ۔

دونوں ملنے میں بہت کشادہ چشم اور کشادہ دل تھے ۔ اپنے اپنے داؤں پیچ پوشیدہ رکھتے کسی پر اظہار نہیں ہوتا ۔ لیکن دل سے دونوں ایک دوسرے کی استعداد اور صلاحیتوں کے قدرداں تھے وہ دشمنی جو سو سال پہلے باظرف لوگوں میں ہوتی تھی اس کا آخری نمونہ دونوں کی شخصیتوں میں نظر آیا ۔ پھر یہ نمونے تو ناپید ہو گئے ۔ دونوں بڑی وضعداری سے اپنے اپنے شعبوں کے وقار کو نباہ گئے ۔ دوستی اور دشمنی کا حسن نمایاں کر گئے ۔ اور آخری وضعداری یوں نباہی کہ کئی سال بیمار رہ کر اختر صاحب کا انتقال ہوا تو میں بھی ان کے غسل میت اور کفن پوشی

www.taemeernews.com

میں موجود تھا اور صدرالدین صاحب بھی مستقل بے آب و دانہ صبح سے شام تک بلکہ رات دیر تک موجود رہے۔ ان کی لاش قادیان روانہ ہوئی تو یہ واپس گھر آئے۔ اور صبح میں بعد نماز فجر کسی ضرورت سے سڑک سے گذر رہا تھا تو ایک شخص نے راستے ہی میں اطلاع دی کہ رات صدرالدین صاحب کا انتقال ہوگیا۔ میں نے کہا تمہیں معلوم نہیں کل دن میں ڈاکٹر اختر اور یزدی صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بولے دن کو اختر صاحب کا انتقال ہوا اور رات ایک بجے صدرالدین صاحب چل بسے۔ میں کانپتا کانپتا ان کے کوارٹر پہونچا تو صدرالدین صاحب پرسکون ابدی نیند میں تھے اور مجھے میر تقی میر کا شعر یاد آیا کہ

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

اور مجھے حیرت ہوئی کہ میر صاحب نے کیا انہیں کے لئے یہ شعر کہا تھا۔ اور پھر سوچا کہ شاعر مرجاتا ہے مگر شعر زندہ رہتا ہے اور صرف زندہ نہیں رہتا بلکہ ہر زمانے میں ہزاروں مردہ انسان کو زندہ کرتا رہتا ہے۔ اور ۱۲½ بجے دن کو ریڈیو پٹنہ سے خبر نشر ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر اختر اور یزدی سابق صدر شعبۂ اردو کا کل انتقال ہوا اور موجودہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صدرالدین فضا اس وقت اختر صاحب پر اپنا تعزیتی نظم ریڈیو پر پڑھنے والے تھے مگر ابھی ان کی نماز جنازہ پڑھی جارہی ہے۔

www.taemeernews.com

اردو اور اردو کی لڑائی لڑنے والوں کی بات کچھ آگئی لیکن جی چاہتا ہے کہ یہ بات ذرا کچھ بڑھا دی جائے۔ اس بات کا حق مجھ پر ہے۔ کچھ گذرے ہوئے لوگ اپنی یادوں سے میرے دل کو ٹھوکریں لگاتے ہیں گرچہ وہ ذکر کے محتاج نہیں نہ وہ زندگی میں ذکر نام اور شہرت کے محتاج رہے اور نہ اب وہ محتاج ہیں۔ بے نیاز رہے، بے نیاز گئے اور مر کر بھی بے نیاز ہیں۔ ان کا ذکر نہ کروں تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مگر میری دیانت، میری امانت داری کا بہت کچھ بگڑ جائے گا۔ میرے دل کا میری محبت کا بگڑ جائے گا۔ محبت مجھے طعنہ دے گی۔ دل درد کی چٹکیاں لے گا دیانت طنز کرے گی امانت داری روح پر بوجھ بن جائے گی اور میں انہیں کی معیت میں انہیں کی ہم نشینی میں جیتا ہوں۔ جب یہ اعمال بغل ہی مجھے طعنہ دیں گے، طنز کریں گے چٹکیاں لیں گے تو پھر کیسے زندہ رہوں گا۔ میری زندگی کا اور کیا سہارا ہے۔ تو میں تقریباً پندرہ سولہ سال کی عمر سے پٹنہ میں رہ رہا ہوں اس کو پچاس سال ہو رہے ہیں اور رہ رہا ہوں وہاں جو شہر کا قلب ہے اور اس راستے پر رہتا ہوں جو مرکزی شاہ راہ ہے۔ اسی راہ سے سارے قافلے گذرے ہیں۔ یہی گذرگاہِ ہر کارواں ہے یہی پورے بہار کا اسٹیج ہے اور اسی پر سارے تماشے ہوئے ہیں۔ کیا معمولی بات ہے؟ پٹنہ میں کون کھڑے ہو کر مجھے چیلنج کر سکتا ہے کون متوازی دعویٰ کر سکتا ہے؟ جس کے پاؤں کو اللہ نے ایسا جمایا کہ کتنے طوفان آئے کتنے سیلاب آئے بہت سے اڑ گئے۔ بہت سی جڑ اکھڑ گئی اللہ نے مجھے رکھا۔ اس لئے رکھا کہ مجھے بولنا ہے، دہرانا ہے" وہ جو شاعری کا سبب ہوا" لکھوانا تھا" جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" لکھوانا تھا۔" جب فصل بہاراں آئی تھی" لکھوانا تھا۔" ابھی سن لو مجھ سے" لکھوانا ہے اور ابھی کیا کیا لکھوانا ہے۔ گرچہ یہ کام بہت بڑا کام ہے اور اکیلے کے بس کا نہیں تھا اور نہیں ہے۔ اس کے لئے وسائل چاہئیں، معاونین چاہئیں، مشورہ دینے والے، مواد مہیا کرنے والے، ہاتھ بٹانے والے چاہئیں۔ مگر کوئی ہاتھ بٹانے کو تیار نہیں کیونکہ لوگ نہیں چاہتے کہ میں لکھوں۔ کیوں نہیں چاہتے؟ اس لئے کہ لوگ خالی ہو گئے میں بھرا ہوا ہوں۔ خالی جام

www.taemeernews.com

کو بھرے جام کے پاس آنا چاہیئے۔ لیکن اب لوگ اس میں توہین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ عین اسی میں عزت ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ چلتے پھرتے کہیں آتے جاتے ملتے جلتے کوئی کام کی بات سن لیا تو اس کے ساتھ لٹک جاتا ہوں۔ اور جتنا کچھ اس کے پاس ہے اس سے مانگتا ہوں۔ وہ جو بھی دے دیتا ہے میں اس کے لئے شکر گذار ہوتا ہوں۔ مولانا محمد لاڈلے صاحب کا نام اپنے ساتھی سعید رضا گیہر سے سنا اور میں ان کے پیچھے لٹک گیا۔ حالانکہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں مگر میں ایک شاگرد کی طرح ان کے پیچھے رہا۔ ان کا شکریہ ادا کیا ان کا ذکر کیا۔ ابھی بہار شریف گیا ہوا تھا ایک صاحب سے ملا ان سے کابلی شاہ صاحب کا نام سنا سنتے ہی ان کے سر ہو گیا۔ وہ کہہ رہے ہیں کچھ ناشتہ کر لیجئے چائے پی لیجئے۔ میں کہہ رہا ہوں نہیں میرے بھائی پہلے مجھکو بتا دو جو انہیں معلوم تھا لے لیا تب ان کی بات مانی۔ اب انشاء اللہ کابلی شاہ صاحب کے بارے میں لکھوں گا میرے دل میں ان کی یاد ہے ان کی تصویر ہے ان کا کردار ہے لیکن بعض تفصیل معلوم نہیں تھی تو لوگ اب کاریگر کے پاس نہیں جاتے بھاڑ جھونکنے والوں کے پاس جائیں گے۔ ارے بھائی آپ نہیں کر سکتے میری مدد کرو میں کروں گا۔ مجھ سے خدمت لو۔ میں مزدوری نہیں چاہتا۔ کہو تو نام بھی تمہارا ہی دے دوں کتنی نظمیں دیدیں کتنی غزلیں بانٹ دیں۔ کتنے مضامین بانٹ دیئے۔

تو خیر پٹنہ پورے صوبے کا مرکز ہے اور ہر انقلاب کا مرکز ہے ہر تحریک کا مرکز ہے روکٹ یہیں سے اڑتا ہے، فائرنگ یہیں سے شروع ہوتی ہے کارخانہ یہیں ہے سپلائی یہیں سے ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کی تحریک کہو آزادی کی تحریک کہو زبان کی تحریک کہو ادب کی تحریک کہو خوشہ چیں سب یہیں کے ہیں۔ پیر علی یہیں کے تھے۔ عبدالقادر ملا تحقیق یہیں کے تھے۔ میر کے استاد جعفر علی خاں یہیں کے تھے شاد یہیں کے تھے خیال یہیں کے تھے۔ جمیل یہیں کے تھے۔ کیا شاد کی جدید غزل گوئی کی تحریک کو بھلا دو گے جس نے حسرت عزیز صفی محوی ثاقب وغیرہ وغیرہ کو نئی صحت مند غزل گوئی کا امیر بنا بنا کر راستوں پر روانہ کر دیا۔ جمیل کی حکیمانہ فلسفیانہ غزل گوئی کو اردو دنیا بھلا سکے گی۔ جس طرح عبدالقادر بیدل کے سامنے غالب نے سپر ڈال دی۔

www.taemeernews.com

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

جمیل مظہری کے رنگِ سخن کی اعلیٰ ظرفی کے سامنے ترقی پسندی نے گھٹنے ٹیک دیئے کہ بابا استعفےٰ میرا باحسرت دیاس ۔ پرویز کے سامنے سردار جعفری وغیرہ کو بھیگی بلی بنتے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔ شاد کی طرف سے لوگ اندھے بن جائیں تو بن جائیں ۔ جمیل کی طرف سے بہرے بن جائیں پرویز کی طرف سے گونگے بن جائیں ۔ شاد، جمیل، پرویز، آزاد تو جواہرات بکھیر گئے تم خالی دامن رہو کوملوں سے منہ کالا کرو تو بگڑے گا کس کا ؟ شاد جمیل کو آج نہیں لوگ کل یاد کریں گے تمہیں کون لفٹ دے گا ۔

تو پٹنہ مسلم تحریک کا بھی مرکز آزادی کی تحریک کا بھی مرکز اردو کی تحریک کا بھی مرکز ۔ پچاس برس پہلے سے سب تحریکیں دیکھیں دور سے تماش بین کی ہی حیثیت سے سہی لیکن وہ تماش بین نہیں جو اسے تماشہ ہی سمجھ کر بھلا گئے، بلکہ وہ تماش بین جس نے آنکھوں سے کانوں سے دل سے دماغ سے تولا بھی پرکھا بھی درپ کھانٹی سونا خالص ملا تو جیب میں حفاظت سے رکھ لیا۔ تھیٹر دیکھا وہاں بھی تماش بین میں رہا، سنیما دیکھا وہاں بھی تماش بین رہا ۔ تھیٹر کی تماش بینی کے ذریعہ سمیٹا ہوا مال اس کتاب اور اگلی کتاب کے صفحات پر مختصر ہی بکھیر دیئے ہیں ۔ پڑھ دیکھو کیسی کام کی بات ہے ۔ جی چاہتا ہے فلم کے بارے میں میں بھی کچھ کہہ دوں مگر یہ بات بہت لمبی ہوگی اور فلم کے تمام اونچے اونچے نقاد اور اونچے اونچے فلمی رسائل دنگ رہ جائیں گے کہ ایں یہ گوشہ نشیں وہ جانتا ہے جو ہمارے علم میں بھی نہیں ۔ چند باتیں تو سن ہی لو ۔ میں نے ۱۹۳۱ء میں پہلی بولتی فلم دیکھی جب میں سات سال کا تھا اور پٹنہ اعظم نانا کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحی مرحوم سے اپنے علاج کے لئے آیا تھا ۔ پوسٹر دیکھ کر مچل گیا کہ یہ کیا ہے ؟ اعظم نانا بولے فلم کا اشتہار ہے ۔ نانا دکھا دیجئے اور نانا نے دکھا دیا اور پھر سلسلہ چلا وہ دور اولین ہندوستانی فلموں کا جب مس سلوچنا، بے بی گاریو، ماسٹر وٹھل، جال مرچنٹ اور ڈی بلیمور یا وغیرہ دلوں پر چھائے ہوئے تھے اور ان کے بعد مسٹر خلیل، ماسٹر اشرف خاں، بھائی دیسا اور بھائی چھیلا

www.taemeernews.com

مس سردار اختر وغیرہ کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد وی شانتارام، چندر موہن اور گجانن جاگیردار کا زمانہ ہے جنہوں نے آدمی اور چلتی نشانی ایسی فلمیں بنائیں جو اپنے محدود وسائل کے اندر انگریزی کی سب سے اونچی معیاری فلمیں بنانے والے سی سی ڈی مائل (C.C. Demile) کی فلمیں Ben Hur اور 10 Commandments وغیرہ کو بھی چیلنج کریں۔ تب زمانہ آتا ہے سہراب مودی کا اور ان کی فلمیں پکار اور جیلر (Jailor) وغیرہ کا۔ اور اس کے بعد دور آتا ہے بمبئی ٹاکیز کا بندھن اور کنگن وغیرہ جس کی ہیروئن لیلا چٹنس سے ابھی دو سال پہلے نیویارک میں ملاقات ہوئی۔ بے چاری مشاعرہ کا نام سن کر چلی آئی۔ اردو کی رسیا شرافت کا پیکر سنجیدگی کا نمونہ پرانی تہذیب رکھ رکھاؤ کی پابند اب تو بڑھیا ایکٹریسیں وہ بناؤ سنگار کرتی ہیں کہ جوان شرما جائیں۔ جنہوں نے لیلا چٹنس کو دیکھا ہوگا ان کو اس کے فلمی کردار کی سنجیدگی یاد ہوگی۔ میں نے جن ایکٹروں کا نام لیا اور جن ایکٹریسوں کے نام لئے یہ بہترین انسان تھے اور اور بہترین انسانیت کے پیغام سے بھرپور فلمیں بناتے تھے۔ اور جن کی بے مثل اداکاری کے سامنے یہ کروڑوں روپئے کمانے والے بڑے نام والے آج کل کے ایکٹر ایرے غیرے نتھو خیرے معلوم ہوتے ہیں۔ فلموں کا معیار ۱۹۵۰ء تک قائم رہا۔ جب سنجیدگی اور شرافت کے علمبردار ہمانسو رائے اور دیوی کا رانی کا آخری دور تھا۔ جن مختصر لوگوں کے میں نے نام لئے یہ انسان پہلے تھے اس کے بعد بہروپئے تھے اور بہروپ وہی بدلتے تھے جو ان کی اصلی شخصیت یعنی انسانیت کا عکس اور پرتو بن سکے۔ یہ بمبئی اور مدراس کی فلمی دنیا تھی۔ اور کلکتہ کی فلمی دنیا میں آر سی بورال R.C. Boral ، K.C. Dey پنکاج ملک، اشیت ہرن، سہگل، کانن بالا تو اور بھی اونچا معیار اپنی شخصیت اور کردار نگاری کا رکھتے تھے۔

ان زمانوں میں لوگ اپنے بچوں کو فلم بینی کے لئے ساتھ لے جاتے تھے۔ جو باتیں وہ خود اپنے بچوں کو کچھ دنوں کی مشقت کے باوجود نہیں سکھا پاتے تھے فلم کے ذریعہ وہ تربیت مکمل ہو جاتی تھی۔ بہت سی باتیں تاریخ کی معاشرت کی شخصیت سازی کی۔ مروت کی ہمدردی کی جاں نثاری کی قربانی کی دوستی کی صالح دشمنی کی لوگ نہ جانتے تھے وہ فلموں سے سیکھ کر آتے تھے۔

www.taemeernews.com

تاریخ کا یہ سبق کہ فلسطین کی جنگ میں صلیبی لشکروں کے سپہ سالار اعلیٰ رچرڈ شیر دل دوران جنگ بیمار ہوا اور جنگ ملتوی ہوئی تو اسلامی لشکر کے امیر لشکر غازی صلاح الدین نے ایک یہودی طبیب کا بہروپ بنایا اور بڑی کوشش اور دانش مندی سے صلیبی لشکر میں داخل ہوکر رچرڈ کے علاج کی اجازت حاصل کی۔ تقریباً ایک ماہ اس کے خیمے میں رہے علاج کرتے رہے تیمارداری کرتے رہے اور اسے صحت مند کرکے رخصت ہوئے اور خاموشی سے اپنی شخصیت کا راز افشا کئے بغیر اپنے لشکر میں چلے گئے جنگ ہوئی غلبہ ہوا فتح ہوئی۔ ایسی باتیں کون بتاتا ہے، کون لکھتا ہے، کون کہتا ہے۔ پہلے ادیب کا شاعر کا فنکار کا ہر نوع کے انسانوں کا مقصد انسانوں کا رخ حقیقت کی طرف موڑ دینے کا سچائی کی طرف پھیر دینے کا محبت دیانت کی طرف کر دینے کا تھا۔ اب حقیقت سے انحراف سچائی سے انکار اچھائی سے فرار ہر نوع کے انسانوں کا بنیادی اور مرکزی موضوع ہے۔ خود انکار کرنا اور تمام انسانوں میں انحراف انکار اور فرار کے جذبات کو بیدار کرنا ہے۔ یہی حال سیاست کا یہی حال صحافت کا یہی حال ادب کا شاعری کا فن کا عمومی طور پر ہے۔

تو خیر بات اردو کی لڑائی کی تھی۔ تو بہار میں پٹنہ میں سیاست کی لڑائی میں اردو کی لڑائی بھی شامل ہی تھی۔ اور جو سیاست کے مرد میدان تھے وہی زبان اور تہذیب کے بھی سپاہی اور علم بردار تھے۔ یہ بڑی خوبی کی بات تھی۔ تنہا سیاست کبھی کبھی رعایت اور چشم پوشی کرتے کرتے گمراہ کر دیتی ہے۔ لڑنے والے کچھ ہتھیار چھوڑ دیتے ہیں کچھ لے لیتے ہیں وہی سپاہی ہے جو نیزہ باز بھی ہے تیر انداز بھی ہے شمشیر بھی رکھتا ہے خنجر اور کٹار بھی اور گرز بھی۔ سب کے طریق استعمال محل استعمال وقت استعمال اور مقصدِ استعمال سے واقف بھی ہوتا ہے اور استعمال کرتا بھی ہے۔ جو سیاسی پہلوان تھے۔ زبان ادب تہذیب دین اور معاشرت کے بھی سورما تھے اس لئے انہوں نے کبھی بازی ہاری نہیں جیتی یا کھیلتے کھیلتے مر گئے مگر کسی محاذ کو بدنام نہیں کر گئے۔ کیونکہ نہ سیاست ان کا پیشہ تھا۔ نہ صحافت، نہ شاعری نہ ادب اُن کا پیشہ انسانیت تھا۔ اور پیشوں میں انسان کچھ کماتا ہے مگر وہ لوگ کمانے والے نہیں تھے۔ کمایا ہوا لگانے والے تھے۔

www.taemeernews.com

وہ جانتے تھے اور اسی روایت کے پروردہ تھے کہ

بازاریان عشق کی ہے طرفہ رسم وراہ
وابستہ آہ سود ہے ان کا زیان پر

پٹنہ میں مسلم لیگ کے صدر نواب اسمٰعیل خاں عرف حجن صاحب ۔ سکریٹری کبھی جعفر امام صاحب کبھی مظہر امام صاحب کبھی سید بدرالدین احمد صاحب اور لوگ بھی تھے ۔ تو میں ان حضرات کو بخوبی جانتا رہا ۔ اور بہت قریب سے جانتا رہا دیکھتا رہا ملتا رہا اس لئے کہ ملنا مقدر تھا ۔ اور مقدر اس لئے کہ یہی ملک کے بھی رہنما اور یہی ملت کے بھی رہنما ۔ یہ ملک کے بھی بہی خواہ تھے اور ملت کے بھی ۔ اور ملک وملت دونوں کے بہی خواہ ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ انہوں نے سیاست سے ایک پیسہ نہیں کمایا ۔ بلکہ کمایا ہوا بچایا ہوا لٹایا ۔ یہ لوگ مخلصین تھے ۔ درد کے مارے تھے ۔ ان سب نے اپنے اسلاف کی کمائی سب تحریک میں لگادی ۔ قوم سے ملک سے ملت سے ایک پیسہ نہ کبھی پایا نہ منگایا نہ منگوایا ۔ حجن صاحب بہترین انگلش کار سے فٹن پر چلے آئے اور ان کی نسل فٹن سے رکشہ پر چلی آئی ۔ جعفر امام صاحب مظہر امام صاحب اپنے اپنے محل سے کرائے کے جھونپڑوں میں چلے آئے ۔ یہ اس لئے چلے آئے کہ ان کی زندگی میں بقدر پیمانۂ تخیل سرور خودی تھا ۔ ان کا پیمانہ کبھی نہیں ٹوٹا ۔ سرور کبھی نہیں اترا ان کی خودی ہمیشہ جاندار رہی قوی رہی توانا رہی ۔ اس لئے یہ ملک میں مسلم لیگ کی تحریک میں جو بات دلیری سے بے باکی سے اہل اقتدار کو کہا کرتے تھے ملک کی تاریخ بدل جانے کے بعد بھی اسی دلیری سے بے باکی سے اہل ملک کو بھی کہتے رہے ۔ یہ اپنی بساط جو بچھائے رہے وہ بساط کبھی نہیں اٹھائی ۔ جو چال اس وقت چل رہے تھے وہی چال زندگی بھر چلتے رہے ۔ شیروانی پاجامہ ٹوپی جیسے چلتی تھی ویسی ہی چلتی رہی ۔ زبان جو بولتی تھی وہی بولتی رہی جو لہجہ تھا وہی رہا ۔ اس لئے کہ انہیں کسی سے لینا نہیں تھا ۔ جو دینا تھا وہ دے چکے تھے ۔ پھر غم کاہے کا ڈر کاہے کا اس لئے ان کی عزت مسلم لیگ تحریک کے وقت جیسی وہی عزت تحریک کے ختم ہو جانے اور پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی رہی اور جب وقت نے بھی ان کی قدر کی تو قدردانی کے دور

www.taemeernews.com

بھی نہ حال بدلا نہ چال بدلی نہ ارادہ بدلا نہ نیت بدلی' نہ لہجہ بدلا نہ زبان بدلی۔ نہ چہرہ بدلا نہ لباس بدلا نہ اصول بدلا نہ قاعدہ بدلا۔ نہ رخ بدلا نہ تیور بدلا اس لئے کہ بقدر پیمانۂ تخیل سر در خودی کا موجود تھا۔ ام۔ پی بھی ہوئے وزیر بھی ہوئے مگر پہچان وہی رہی شناخت وہی رہی شخصیت وہی رہی۔ کردار رفتار گفتار سب کچھ وہی رہا۔ اپنے کو بنانا سیکھا ہی نہ تھا بگاڑنا سیکھا تھا۔ سو آخر تک اپنے کو بگاڑتے ہی رہے۔ لٹانا سیکھا تھا لٹاتے ہی رہے۔

جعفر امام صاحب کو پہلے پہلے نمٹم پر ململ کا کرتہ لٹھے کا پاجامہ سفید پلے کی ٹوپی میں شیر کی طرح بدن اور شیر کی طرح چہرے کے ساتھ مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے دیکھا تھا اور پھر برابر اسی طرح کبھی شیروانی کبھی کرتے پاجامے میں دیکھتا رہا۔ کیا جوش کیا اعتماد کیا صاف گوئی کیا بے لوثی کیا اخلاص کیا بشاشت کیا ہمت کیا دلیری۔ ریاکاری نہ اپنے میں نہ کسی کی ریاکاری گوارہ۔ جھوٹ اپنے میں نہ کسی کا جھوٹ گوارہ۔ ٹوکا تو سر مجلس ٹوکا اور کبھی سر مجلس اور سر راہ ٹوک بھی دیا۔ اب تو لوگ اخبار نکالتے ہیں جلوس نکالتے ہیں احتجاج کرتے ہیں اور وقت ٹالتے ہیں۔ بی۔ ان کالج میں کوئی ڈرامہ ہو رہا تھا یا جلسہ ہو رہا تھا یہ بھی تماشائی یا سامعین تھے کسی نے مسلمانوں پر یا مسلمانوں کے دین پر کچھ طنز کیا۔ جعفر امام صاحب کچھ نہ بولے خاموشی سے بولنے والے کے پاس گئے اور اسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اطمینان سے ہال کے باہر چلے آئے اور سارا مجمع ہکا بکا۔ طاقت بھی ویسی ہی ہمت اور حمیت بھی ویسی ہی۔ سوائے خدا کے نہ کسی کا خوف نہ کسی کا رعب۔ ۱۹۴۶ء کا فساد ہوا تو یہی ملت کے غمخوار بھی تھے۔ دانش مندانہ بھی تھے اور دیوانہ وار بھی تھے۔ انہیں رفیوجیوں کے ساتھ دیکھا، پناہ گزینوں کے ساتھ دیکھا ستم رسیدوں مصیبت زدوں کے ساتھ دیکھا۔ ان رفیوجیوں پناہ گزینوں ستم رسیدوں مصیبت زدوں اور ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ پھٹے حال تھے تو یہ بھی پھٹے حال تھے۔ نہ کپڑے بدلنے کا ہوش نہ کپڑے دھلوانے کا ہوش۔ وہ بھوکے تھے تو یہ بھی بھوکے تھے۔ چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی، لبوں پر پپڑیاں پڑتی ہوئی پریشان اِدھر جا رہے ہیں اُدھر جا رہے ہیں۔ کبھی ریلیف تقسیم کر رہے ہیں کبھی ریلیف بھیج رہے ہیں اِن کی بات سن رہے ہیں اُن کی فریاد سن رہے ہیں اُن کو

www.taemeernews.com

تسلی دے رہے ہیں ان کو بہلا رہے ہیں۔ آہ کیا لوگ تھے کیا انسان تھے کیا آدمی تھے جعفر امام صاحب، مظہر امام صاحب، قاضی سعید صاحب۔ اللہ تعالیٰ انہیں اونچے درجات عطا فرمائے یہ لوگ تھے جنہیں بقدر پیمانۂ تخیل سرور خودی والا کہئے۔ ماشاء اللہ جعفر امام صاحب، مظہر امام صاحب وغیرہ بہت دن جیے ام۔پی، وزیر ہوئے۔ لیکن تیور کبھی نہ بدلا۔ زمانے نے انھیں گھلا دیا پگھلا دیا کمزور نحیف ناتواں کر دیا۔ اسی کرائے کی چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتے رہے۔ چھڑی لے کر ہی سہی ہر آنے والے جانے والے کی مزاج پرسی دادرسی اسی بشاشت اسی تیور اسی حرارت اور ہمت سے کرتے رہے۔ میں جب انہیں دیکھتا تو میں بھی محسوس کرتا کہ میں بیس پچیس سال چھوٹا ہو گیا۔ جعفر امام صاحب کو دیکھ کر ان کی گفتگو سن کر اس وقت بھی جب وہ دبلے پتلے ہو گئے تھے اور مجھے دیکھتے ہی بشاشت اور خوشی سے گلے لگا لیتے تھے تو میں نوجوان ہو جاتا تھا ان کی نصف صدی کی خدمت اور قربانی بے لوثی اور بے نیازی استغنا مجھے اور جوان کر دیتی اگر تاریخ اب سچی رہ جاتی اور تاریخ نویس سچے رہ جاتے تو جعفر امام صاحب اور ایسے لوگ نسلوں کے لئے انسانیت ہمت حمیت اور خودداری کی مثال بن کر رہتے مگر وہ لوگ گئے اور ساری سچائیاں اپنے ساتھ لے گئے ہم بہروپیوں کو زمانہ سازوں کو چھوڑ گئے

وہ اہلِ درد جو ناقابلِ خیال گئے
وہی چھپائے ہوئے گدڑیوں میں لال گئے
جو تم پہ مر گئے اپنی بلا تو ٹال گئے
بچے ہوؤں کو بڑی کشمکش میں ڈال گئے

اردو کی لڑائی لڑنے والوں میں بھی یہی لوگ رہے ایوب صاحب، جعفر امام صاحب عبدالقیوم انصاری صاحب، غلام سرور صاحب، نظیر حیدر صاحب، بیتاب صدیقی صاحب یہ سب صحیح معنوں میں اردو کی آبرو رہے اردو کی لاج رہے، اردو کے رکھوالے رہے، اردو والے رہے تو اردو تہذیب کی وضع نباہتے رہے۔ ایوب صاحب کو جج کورٹ کے باہر کسی نے سوٹ میں نہیں دیکھا۔ نثار احمد خاں کو کسی نے سوٹ میں نہیں دیکھا۔ جعفر امام صاحب،

www.taemeernews.com

عبدالقیوم انصاری صاحب، غلام سرور صاحب، نظیر حیدر صاحب؛ بیتاب صدیقی صاحب کسی کو زمانے نے کبھی سوٹ بوٹ میں نہیں دیکھا۔ عبدالحق صاحب مرحوم، انند نرائن ملا، پنڈت سندر لال پنڈت کیفی اودھیش نندن سہائے نول کشور پرشاد، مولوی عبدالمالک ان سب کو کسی نے سوٹ بوٹ میں نہیں دیکھا۔ کیوں کہ ان کا قبیلہ اِن کا خاندان اردو کے گھرانے سے تھا۔

خزاں کے دور میں یہ گلستاں سے دور رہتے تھے
بہار آتے ہی سب پھولوں کے سوداگر چلے آئے

بیتاب صدیقی کو دیکھ لو۔ میں تو کم از کم چالیس سال سے دیکھ رہا ہوں پورے صوبے کی ریاستی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری۔ جہاں دیکھو اپنی شیروانی پاجامہ ٹوپی میں فائل در بغل موجود انجمن ترقی اردو ان کی ہم نشیں تھی اور وہ انجمن ترقی اردو کی پہچان اور شناخت بن گئے تھے۔ ہر مقام پر ہر جگہ اردو کا فائل بغل میں اور اردو کا درد دل میں لئے بیٹھے ہیں لڑ رہے ہیں پسینہ بہا رہے ہیں نہ وضع بدلی نہ چال بدلی۔ انہیں سواری پر شاید ہی کسی نے دیکھا ہو بس جب دیکھو پاجامہ شیروانی ٹوپی پہنے دیوانگی کی چال سے اپنی دھن میں اپنے منصوبے میں اپنے ارادے میں مگن چلے جا رہے ہیں۔ نہ ظاہری شخصیت میں کوئی کشش، نہ لباس پوشاک میں کشش نہ چہرے میں کشش۔ کیا کیجئے تمام کششیں اندر سمائی ہوئی تھیں شرمائی لجائی۔ اور اب تک شرمائی لجائی چھپی ہیں۔ کیسے نکلیں؟ پہلے تو کچھ محرم ادھر اُدھر تھے۔ اب تو سب نامحرم ہی نامحرم نظر آتے ہیں یہی حال اُردو کا ہے۔ اس وقت تمام ملک میں اردو زبان و ادب کی باگ ڈور نامحرموں کے ہاتھ میں ہے جو اردو کی عصمت سے واقف ہیں نہ عفت سے نہ عظمت سے نہ شرافت سے نہ اس کی حمیت سے نہ نزاکت سے۔ اس وقت اردو زبان و ادب جنس بازار ہے اس کا مول لگتا ہے اور ہر بول بولنے والا اسے خرید لیتا ہے اور خرید کر اسے بے عزت کرتا ہے۔ دیکھو میں نے اکاڈمی بنادی، دیکھو میں نے انجمن بنادی، دیکھو میں نے بورڈ بنا دیا، دیکھو میں نے لغت چھاپ دی دیکھو میں نے مشاعرہ کر دیا، دیکھو شاعروں کو منہ مانگی رقم دے دی شراب پلادی۔ دیکھو اتنے اخبار جاری کر دیئے، اتنا کوٹا دے دیا، اتنے اشتہار دے دیئے۔ کسی کو درجہ ملا کسی کو عہدہ

www.taemeernews.com

ملا کسی کو روپیہ ملا کسی کو شراب ملی کسی کو کوٹا ملا کسی کو اشتہار ملا۔ اردو کو کیا ملا؟ اب تو ماسٹر اور پی ایچ۔ڈی کر کے اردو والے محمد عیوب صاحب لکھتے ہیں اور بوالہوس کو بل ہوس لکھتے ہیں۔

ایک صاحب کو تقریباً تینتالیس سال پہلے دیکھا۔ میانہ قد گداز بدن سانولا رنگ چالیس پینتالیس سال کی عمر۔ بادامی شیروانی، سیاہ ایرانی اونچی ٹوپی۔ علی گڑھ تراش پاجامہ بہت موٹے تلے کا بوٹ جوتا۔ ہاتھ میں شاید بانس کی یا کسی لکڑی کی بہت بدخوارہ ٹیڑھی سی چھڑی۔ بہت باوقار چال سے چلتے ہوئے کم ازکم ہر جمعہ کو ہمارے قریب لان کی مسجد میں نماز پڑھنے کو جاتے۔ اسی زمانے میں شاید یہ خبر سنی کی شہسرام سے ایک صاحب حج کو پیدل روانہ ہوئے ہیں اور اس اہتمام سے کہ ہر تھوڑی دیر بعد اگر نماز کا وقت ہوتا ہے تو دو رکعت نماز پڑھتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں۔ کوئی تفصیل نہیں یاد ہے مگر مجملاً اتنی بات ذہن میں ہے۔ شاید یہی ذکر کوئی صاحب میرے مکان کے سامنے کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ صاحب اسی انداز میں شیروانی ایرانی ٹوپی سفید پاجامہ اور بھاری بوٹ کے ساتھ اپنا ڈنڈا لئے ہوئے سامنے سے گذرے۔ مجھ سے مخاطب صاحب نے اشارا کیا دیکھو دیکھو سبحان احمد صاحب انہیں کے بھائی ہیں۔ میں نے بے ساختہ کہا بھئی یہ کون صاحب ہیں؟ وہ بولے تم ان کو نہیں جانتے ہو ارے یہ سلطان احمد صاحب ہیں۔ اخبار اتحاد کے اڈیٹر۔

میں نے بہت پہلے سنا تھا کہ پٹنہ سے ایک باوقار اردو اخبار اتحاد نکلتا ہے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے کہا یہ صاحب کہاں رہتے ہیں۔ وہ بولے بس قریب ہی ایک گلی ہے اکثر اس کو اتحاد پریس کی گلی کہتے ہیں اسی میں آگے ایک مکان ہے اسی میں اتحاد پریس ہے وہیں سلطان صاحب بھی رہتے ہیں۔

ایک جمعہ میں ان سے ملا۔ یہ فسادات ۱۹۴۶ء کے بعد کا قصہ ہے۔ تو میں نے لان کی مسجد میں جمعہ کو دیکھا بلکہ پہلے بھی دیکھا تھا کہ وہ مسجد کی اول صف میں سب سے کنارے دائیں طرف دیوار سے لگ کر بیٹھے ہیں۔ یہ مخصوص جگہ لینے کے لئے انہیں بہت قبل آنا پڑتا تھا۔

www.taemeernews.com

مجھے یاد نہیں ہے کہ مسجد میں کسی اور جگہ بھی انہیں بیٹھے دیکھا ہو۔ اور اس کے بعد بھی وہ برسہابرس تک مسجد آتے رہے مگر جگہ ان کی وہی رہی۔ تو بہر حال نماز کے بعد بھی وہ دیر تک ٹھہرتے تھے۔ وہ اُٹھے تو میں نے ان کو سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ محبت تپاک اور نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ میں نے کہا میں آپ کو بہت دنوں سے اس مسجد میں آتے ہوئے اور ایک ہی مقام پر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا مگر واقفیت نہیں تھی۔ ابھی چند ہی دن پہلے آپ کا نام اور آپ کا کام معلوم ہوا تو اشتیاق اور بڑھ گیا۔

پھر دوسرے جمعہ کو وہ بھی مجھ سے ملنے کو مشتاق رہے۔ ملاقات ہوئی۔ باتیں ہوئیں پھر انہوں نے مجھ سے میرا مکمل تعارف پوچھا۔ تو میں نے اپنا مختصر حال بیان کیا۔ مختصر سرگذشت بیان کی۔ میری بات کچھ ایسے انداز ایسے لہجے میں اور ایسی دل سوز تھی کہ وہ گویا آبدیدہ ہو گئے۔ مجھے لے کر بیٹھ گئے اور پھر قربت اور ہم آہنگی شروع ہوئی۔ میں نے ان سے بھی ان کی قیام گاہ پوچھی۔ بولے بالکل قریب رہتا ہوں اتحاد پریس والی گلی میں آجاؤ۔ وہ چلے گئے اور میں کسی روز ان سے ملنے چلا۔ ذہن میں بات تھی کہ اتحاد پریس کے مکان میں رہتے ہیں بڑا مکان ہوگا۔ دفتر ہوگا رہائش گاہ ہوگی۔ پہونچا تو مکان تو واقعی بہت بڑا تھا۔ مگر اس میں پچاسوں کرائے دار رہتے تھے۔ اسی عمارت کے ایک گوشہ میں ایک صاحب نے اشارہ کیا کہ اسی کمرے میں رہتے ہیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانکا تو ایک چھوٹا ہی کمرہ کہئے۔ اس میں ایک ایک چوکی اور اس سے ملا ہوا زمین پر دری کا فرش۔ اور سلطان احمد صاحب بنیائن اور لنگی اور ٹوپی پہنے ہوئے اس فرش پر سامنے پھیلے کاغذات کو دیکھ رہے تھے اور کچھ لکھ رہے تھے۔ نہ ٹیبل نہ کرسی نہ صوفہ نہ اسٹاف نہ چپراسی۔ مشہور زمانہ اخبار "اتحاد پٹنہ" اس کا یہ دفتر اور اس کے یہ اڈیٹر:

بڑا سرمایہ ہے سب کچھ لٹا دینا محبت میں
فقیرانہ لباس آتے ہی دل شاہانہ بنتا ہے

جس وقت میری باضابطہ ملاقات کا آغاز ان سے ہوا غالباً اخبار "اتحاد" بند ہو چکا تھا۔

www.taemeernews.com

اس کی جگہ نئے اخبارات نے لے لی ہوگی۔ یا یہ کہ جو قارئین اخبار "اتحاد" کے ہوں گے جو اس کے مزاج شناس اور تیور آشنا ہوں گے وہ اپنے دل اپنی نگاہ اپنے ذہن اپنی فکر اپنے کرتے پاجامے کے ساتھ بغیر کفن بغیر دعا بغیر فاتحہ اس بے درد بے وفا بے چشم دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر زمین کی دنیا آباد کر چکے ہوں گے۔ اور اپنی یادگار سلطان صاحب کی بنیائن لنگی ٹوپی میلی دری جانماز اور تسبیح خاکساری خاک نشینی اور فقیری میں چھوڑ گئے ہوں گے اور سلطان صاحب اس امانت اور جانشینی کی ذمہ داری کو پورے اعتماد، خوش مزاجی بشاشت اور اطمینان سے نباہ رہے تھے۔ ایسی خانقاہ جس کی کوئی عمارت نہیں کوئی مہمان خانہ نہیں کوئی سماع خانہ نہیں مطبخ اور باورچی خانہ نہیں جس میں مریدوں کی بھیڑ نہیں عقیدت مندوں کا مجمع نہیں۔ دعا خواہوں اور حاجت مندوں کا جمگھٹا نہیں گنڈا تعویذ نہیں درگاہ نہیں عرس نہیں چادر نہیں۔ اِن سب نے مل کر سلطان صاحب کا پیکر اختیار کر لیا تھا۔ یہی خود درگاہ تھے مجاور تھے مریدوں کی بھیڑ عقیدت مندوں کا مجمع اور حاجت مندوں کا جمگھٹا تھے باہر کچھ نظر نہ آتا تھا مگر اندر سب جمع تھا۔ یہ عرس بھی کرتے ہوں گے ان شہیدوں کا جن کی قیامت تک کوئی درگاہ ہوگی نہ عرس ہوگا نہ چادر چڑھے گی۔ یہ کام انسانوں سے چھین کر فرشتوں کو دے دیا ہوگا۔ انہیں فرشتوں کے درمیان سلطان صاحب تنہا رہتے تھے۔ باہر سڑکوں پر شیروانی پاجامہ ٹوپی بوٹ جوتا اور ٹیڑھی لکڑی ان کی شناخت تھی اور اندر کوٹھری میں چوکی، میلی دری، بنیائن لنگی ٹوپی تسبیح اور سجادہ سلطان صاحب کی پہچان تھی۔ یہ دو شناختیں بہت کم لوگوں کو ملتی ہیں۔

سلطان صاحب بہت کم گفتگو کرتے تھے۔ مگر جب گفتگو کرتے تو ان کی زبان کے ساتھ ان کا پورا وجود بولتا ہوا نظر آتا۔ ایسا اعتماد جو ان کی ظاہری اور باطنی زندگی کا نچوڑ ہوتا۔ بڑی گمبھیر اور جمی ہوئی بلند آواز سے بولتے کم بولتے بہت کم بولتے مگر جو بولتے دل میں اتار دیتے۔

رئیس مراد پور حیدر امام صاحب ممبر وائسرائے کانسل دہلی ان کی بڑی عزت کرتے اور سلطان ہی صاحب ان کے گویا تنہا مشیر اور صلاح کار تھے۔ اور سلطان صاحب کی

www.taemeernews.com

نشست اپنی کوٹھری اور مسجد کے بعد حیدر امام صاحب کا بنگلہ ہی تھی۔ وضع داری جو کردار کی بلندی کی بہت بڑی علامت ہے اور وہ پچھلے لوگ جو سماجی مذہبی اخلاقی اور ادبی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں اور کرتے رہے ہیں' ان کی شرافت اور شہرت عزت و احترام میں بہت زیادہ دخل وضع داری کا ہے اور میں نے بھی اب تک جو کچھ لکھا ہے اور جن جن لوگوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے اور میری تحریر میں جو کچھ بھی انفرادیت پیدا ہوتی ہے وہ اس لئے بھی ہے کہ وضع دار لوگوں نے خواہ وہ کوئی ہوں کسی قوم کسی فرقے سے کسی پیشہ اور شغل کے ہوں اور کسی درجے کے ہوں۔ میرے جذبات خیالات اور احساسات کی تہذیب اور تربیت میں بڑا حصہ لیا ہے انہیں دیکھ کر سن کر ان سے مل کر میں نے اپنے دل میں بڑی طاقت اور لطافت محسوس کی ہے اور وہ طاقت اور لطافت اندر ہی اندر تخلیق کی بھٹی کو خوب بھڑکاتی رہی ہے۔ مجھے دنیا کی کوئی چیز متاثر نہیں کرتی۔ نہ جاہ و حشم و خدم نہ مال دولت طاقت نہ اقتدار کسی درجہ میں مگر کسی معمولی سے معمولی شخص میں بھی کوئی کردار کی خوبی نظر آگئی تو میں بے اختیار متاثر ہو جاتا ہوں۔ سلطان صاحب کو نہ جان کر بھی صرف انہیں دور سے گذرتے دیکھ کر ان کی متانت ان کی رفتار اور پھر ان کی وضع دیکھ کر متاثر ہوا اور جب انہیں جانا سمجھا تو وہ ان لوگوں میں ہو گئے جنہیں یاد رکھنا اور جنہیں انسانیت کا آئیڈیل بنا کر ذہنوں میں محفوظ رکھنا میری فطرت رہی۔ اور جب موقع ہو اور موقع نہ ملے تو موقع نکال کر ان تاثرات کو دوسروں تک پہونچانے میں مجھے خوشی بھی ہوتی ہے اور امید بھی ہوتی ہے کہ یہ دنیا جو کچھ خوبصورتیاں اور خوبیاں رکھتی ہے وہ جاوداں اور لافانی ہیں وہ معدوم نہیں ہوتیں وقتی طور پر پوشیدہ ہو جاتی ہیں اور آج نہیں کل وہ قدریں پھر ممتاز ہو جاتی ہیں۔ کیا بعید ہے کہ مستقبل قریب یا بعید میں ایسے لوگ پھر پیدا ہونے لگیں اور سلسلۂ دراز عشق پھر نمایاں ہو جائے اور تمام گمشدہ کڑیاں پھر ظاہر ہو کر آپس میں ہم رشتہ ہو جائیں اور یہ دنیا پھر ایک بار ہن برسانے والی ٹھنڈک پہونچانے والی اور مسکرانا سکھانے والی دنیا بن جائے جو کبھی تھی۔

سلطان صاحب پھر گورنمنٹ اردو لائبریری کے لائبریرین بن گئے۔ اور دیکھنے والوں

www.taemeernews.com

لے دیکھا ہوگا کہ سلطان صاحب اپنے کمرے میں داخل ہوکر شیروانی اُتار کر کھونٹی میں لٹکا کر چھڑی کرسی سے ٹیک کر اور ٹوپی میز پر رکھ کر بالوں سے محروم اپنی چمکدار چندیا کے ساتھ صرف قمیض پاجامے میں دونوں ہاتھ پیچھے کئے ہوئے پوری لائبریری کا خود چکر لگاتے رہتے۔ ایک ایک پڑھنے والوں کو دور اور نزدیک سے دیکھتے کس کو کیا ضرورت ہے۔ کتاب صحیح کھلی ہے یا نہیں کون صاحب بے قاعدہ پڑھ رہے ہیں کون قاعدے سے پڑھ رہے ہیں۔ مطالعہ گاہ میں ہر صاحب مطالعہ کو خود غور سے دیکھتے بعض سے متوجہ بھی ہوتے۔ ہر مطالعہ کرنے والا ان کی شخصیت سے مرعوب ہوجاتا۔ وہ صاحب مطالعہ نوجوانوں کو احسن طریقے سے تہذیبی نصیحتیں بھی کرتے کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا تو پیار سے کہہ دیتے پہلے مطالعہ کو خوب پی جاؤ پھر سگریٹ پینا۔ لائبریری کے اصول و قواعد تھے خود بڑے انہماک سے پابند رہتے اور دوسروں کو بھی پابندی پر خوبی سے آمادہ کردیتے۔ وہ مجھے برسوں سے جانتے تھے۔ میری صلاحیت، استعداد، ذوق، سنجیدگی سے بخوبی واقف ہی نہیں قدرداں اور ستائش گر اور دعاگو تھے۔ مگر ایک بار میں نے ایک کتاب مطالعہ کے لئے گھر لے جانا چاہا تو بہت نرمی سے فرمادیا۔ "پہلے ممبر بن لو اور کتاب کی قیمت امانت، رکھ دو تب کتاب لے جاؤ۔" یہی اصول تھا اور مجھے اس کی یاد دہانی کردی اور میں نے مان لی سیکھ لی اور یاد رکھی۔

ایک جمعہ کی نماز میں حسب دستور وہ صف اول میں دائیں دیوار سے لگے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ قرأت ہو رہی تھی۔ دیکھا کہ سلطان صاحب کچھ ہل رہے ہیں اور پاؤں آہستہ آہستہ ڈگمگا رہے ہیں پھر وہ زور سے ڈگمگائے اور گھٹنوں کے بل گرے لیکن تحریمہ نہیں چھوڑا ہاتھ ویسے ہی بندھے رہے پھر اُٹھے اور پھر ڈگمگائے اور پھر زور سے دوسری بار بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور کوشش کرکے کھڑے ہوئے۔ میں بالکل اُن کے پیچھے ہی دوسری صف میں نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز ختم ہوئی میں ان کے قریب گیا سلام کیا، مصافحہ کیا اور مسکرا کر کہا قرأت پر آج آپ کو بہت وجد حال آرہا تھا؟ وہ ذرا افسردگی سے مسکرائے اور کہا "نہیں کلیم صاحب مجھ پر وجد طاری نہیں تھا شدت ضعف طاری تھی۔ میں کئی روز سے بیمار ہوں فاقہ ہے"۔

www.taemeernews.com

سلطان صاحب نے ایک عمر مشقتوں میں خدمتوں میں ریاضتوں میں گذاری ان مشقتوں نے خدمتوں نے ریاضتوں نے اُنہیں خوب گھسا خوب پیسا۔ ان کا کوئی نہ تھا وہ تنہا زندگی سے موت تک کی طویل مسافت طے کر رہے تھے۔ کانوں میں محبت کی سرگوشی کرنے آنکھوں میں پیار سے آنکھیں ڈال کر ہمت بڑھانے والا، مشقتوں میں سہارا دینے والا ان کا کوئی نہیں تھا۔ کیا کھایا کیا پیا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ تمام دن کی جسمانی روحانی قلبی دماغی مشقتوں سے تھک کر فرش پر یا چوکی پر گر جانے کے بعد ان کی پیشانی کو تھپک تھپک کر نیند بلانے والا کوئی نہیں تھا۔ تحسین و آفریں جزا اور انعام کی کوئی لذت ان کے قریب نہیں آئی۔ خاموشی سے لکھتے اور اسی کوٹھری میں پڑے رہتے۔ لوگ ان سے فائدہ اٹھاتے اور فائدہ اُٹھا کر دو چار پیسے جو اخبار کی قیمت ادا کرتے وہی ان کے لئے کافی تھا بیشک ان پر آنسو بہانے والے بہت لوگ ہوں گے وہی ان کا منافع کہہ لو اندوختہ کہہ لو، پسماندہ کہہ لو کمائی کہہ لو قدردانی کہہ لو ان کو بس یہی ملا۔

اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

www.taemeernews.com

غزل کے میرے دونوں مجموعوں میں ہر غزل ایک دنیا ہے اس دنیا میں بستیاں ہیں بستیوں میں آبادیاں ہیں آبادیوں میں مکانات ہیں لوگ ہیں لوگوں کے کردار ہیں واقعات ہیں موسم ہیں دھوپ چھاؤں ہیں دلگیریاں ہیں دل آزاریاں ہیں ایک مکمل زندگی ہے ڈرامہ ہے افسانہ ہے ہر غزل کا ایک الگ ماحول ہے ایک الگ رنگ ہے اس کی الگ خوشبو ہے، الگ آب وہوا ہے۔ گرچہ بہار وخزاں برسات اور سکھاڑ گرمی اور سردی ہر غزل میں مشترک ہے مگر یہ اشتراک اسی نوعیت کا ہے جس طرح ایک چمن میں رنگا رنگ پھولوں کا شاخوں کا پتوں کا خوشبوؤں کا اجتماع ہو۔ تو اسی طرح کی ایک غزل کا ایک شعر ہے۔

جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی جہاں نغمے ہی نغمے تھے
وہ گلشن اور وہ یارانِ غزلخواں یاد آتے ہیں

اور میں نے اپنی سوانح "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں وہ خوشبوئیں وہ نغمے بکھیر دیئے اور اس گلشن کو سرسبز وشاداب دکھایا اور پھر اس کی غارتگری اور یارانِ غزلخواں کی نغمہ ریزیاں، ان کی چہک مہک لہک، دکھائی ان کے تیور انداز ناز سوز وساز دکھائے ان کی طرح داریاں وضع داریاں، مجلس آرائیاں، جگر سوزیاں، دلفریبیاں دکھائیں، ان کی بے باکیاں جست خیزیاں دکھائیں اور پھر نوک شمشیر پر اُن کے رقص بسمل کا تماشا بھی دکھلا دیا۔ اور ان کا پورا ماحول دور ونزدیک کی فضا اور اس دنیا کا پورا نقشہ، اس کے امیر غریب بادشاہ اور فقیر، مزدور اور سرمایہ دار، وکیل اور مدعی، رنڈیاں اور گھر گرہستیاں، قلی اور مزدور، راجے مہاراجے رئیس نواب سب دکھا دیئے۔ ایسا نقشہ جو ایک صدی پیچھے تک کسی نے اُردو میں نہ دیکھا ہوگا اور آئندہ ایک صدی تک دیکھنے کی توقع نہیں ہوگی۔

اسی طرح ایک غزل کا ایک شعر تھا:

www.taemeernews.com

یہ مرا سلیقۂ گفتگو ہے مرا نچوڑا ہوا لہو
ابھی سن لو مجھ سے کہ پھر کبھو نہ سنو گے ایسی کہانیاں

اور میں نے "ابھی سن لو مجھ سے" کی آواز لگادی اور جہاں خوشبوئی خوشبو کا سلسلہ دراز کرنا چاہا۔ کتاب لکھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ ایک سلسلۂ مضامین لکھنے کی خواہش تھی۔ اور آج سے دس سال قبل "قومی آواز" جو ایک مقتدر روزنامہ پٹنہ کا تھا۔ اس کے اڈیٹر صاحب سے کہلوایا کہ میں ایک سلسلۂ مضامین لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام شاید کچھ شاہین تھا یاد نہیں۔ میری کوئی تحریر تحقیقی نہیں ہوتی تخلیقی ہوتی ہے' نام صحیح ہو یا غلط کام اور کام کا آغاز و انجام غلط نہیں ہوگا' سچا ہوگا پکا ہوگا۔ تو اڈیٹر صاحب نے اسی وقت اپنے معاون بھائی جن کا نام سکندر تھا اپنے فوٹو گرافر اور فوٹو گرافی کے پورے سامان کے ساتھ میرے یہاں بھیج دیا۔ وہ کئی زاویے سے فوٹو لے گئے اور دوسرے تیسرے روز تصویر کے ساتھ' ابھی سن لو مجھ سے" کی پہلی قسط شائع ہوئی ہزاروں نے پڑھا اور سینکڑوں نے اس کی قسطیں جمع کرنی شروع کیں۔ اور یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک چلا اور جہاں تک مجھے یاد ہے شاید چھتیس ۳۶ قسطیں اس دوران شائع ہوئیں۔ لیکن قومی آواز کے اڈیٹر صاحب نے شائع شدہ ایک قسط بھی مجھے نہیں بھیجی لیکن یہ پیغام ضرور آیا کہ دہلی سے صدر دفتر نے اس کی اشاعت میں خاص اہتمام کرنے کا حکم دیا ہے۔ بہرحال وہ اہتمام خاص نہیں ہوا۔ کسی دن وقت نکال کر گیا تو اپنا مسودہ لایا ورنہ مسودے بھی خدا جانے ردی کھاتے میں گئے یا کہیں گم کردئے گئے۔ دس سال بعد جب لوگوں کا اور خود میرے دل کا تقاضا ہوا کہ اسے اضافے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کردیا جائے تو میں نے قومی آواز کے دفتر میں چند بار اپنے کچھ شاگردوں کو بھیجا کہ شائع شدہ قسطیں اگر فراہم کرسکیں تو میں محنت تلاش کا پورا معاوضہ دینے کو تیار ہوں جواب تشفی بخش نہیں تھا لیکن میرا تقاضا بار بار ہوتا رہا۔ ایک دن میں بھی گیا تو منتظمین میں میرے دو ایک شاگرد بھی تھے مگر اڈیٹر صاحب بدل چکے تھے۔ میں پہونچا تو میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ سلام اور مصافحہ میں سبقت کرتا ہوں۔ ایک صاحب کرسی پر تھے۔ عمر میں مجھ سے نصف سے زیادہ نہیں تھے۔ سوٹ میں ملبوس تھے۔

www.taemeernews.com

میں نے حسب عادت سلام میں اور مصافحہ میں سبقت کی ۔ دونوں ہاتھ بڑھائے ۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے سلام کا جواب دیا اور ایک ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھایا ۔ میں نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے آغاز گفتگو کیا انہوں نے سرد مہری سے جواب دیا کہ فائل ڈھونڈھنا بڑا مشکل ہے ۔ فائل ترتیب سے نہیں ہے ۔ میں نے کہا میں اپنا آدمی دوں گا وہ سب کام کرے گا ، آپ صرف اجازت اور دفتری تعاون دیں ۔ بات ادھوری ہوئی اور میری درخواست جاری رہی ۔ میرے جو شاگرد تھے وہ بھی لفظی تعاون سے آگے نہ بڑھے اور آخر میں میرے قاصد کو جو یہ درخواست لے کر جایا کرتا تھا ۔ ایسی خشکی اور سرد مہری سے گویا ڈانٹ بتائی کہ میں نے امید منقطع کر لی اور اس دور کی اردو صحافت پر افسوس آیا کہ حکومت کے تمام دفاتر اور شعبوں کی طرح صحافت بھی اپنی خصوصیت ، اپنی شرافت ، اپنی دیانت ، اپنی صلاحیت ، اپنی ذمہ داریاں سب کچھ فراموش کر کے یا کھو کر یا خالی ہو کر سیاست کے ہاتھوں میں بے جان ڈھانچہ بن گئی ہے ۔ اب صحافت بھی تجارت اور بنیا پن کا ایک کاروبار ہے اور یہ اطلاق ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ تمام صحافتی اداروں پر ہے اور یہ محاکمہ اس شخص کا ہے جو کم از کم پچاس سال سے اردو اور انگریزی صحافت کا مطالعہ کر رہا ہے ۔ الہلال ، البلاغ ، ہمدرد ، زمیندار ، انقلاب وغیرہ کو تو چھوڑیئے کہ بہت دنوں کی بات ہے ۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم ، مولانا ابوالکلام آزاد ، سید سلیمان ندوی ، مولانا حسرت موہانی ، مولانا ظفر علی خاں ، مولانا مظہر الدین یہ حضرات تو ایک نہایت بلند اعلیٰ ارفع وسیع اور عالمگیر نظریۂ زندگی کے حامی مدعی ، وکیل اور مبلغ تھے ۔ چالیس ، پینتالیس سال پہلے کے صحافتی سرمایہ کا بھی اندازہ کیجئے ، تو جمہور ، عصر جدید ، مولانا عبدالرزاق کا اخبار "ہند" اور پھر پٹنہ کا "صدائے عام" وغیرہ بھی اپنا ایک مطمح نظر رکھتے تھے ۔ ایک روایت کے پابند اور وضع دار پابند تھے ۔ نظیر حیدر مرحوم اور غلام سرور صاحب کا بھی ایک آئیڈیل تھا اور اس پر استقامت سے ڈٹے ہوئے تھے اور لچک اور مصالحت برآمدہ نہیں تھے ۔ خودداری ان کی صفت تھی ، وضع داری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی ، دنیا طلبی نہیں تھی اور دنیا کے لئے اصول فروشی کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا صحافت سے ان کا مقصد تھا جو بہت حد تک ہمارے صحافیان سلف کے نقش قدم پر تھا ۔ اب یہ سب

www.taemeernews.com

باتیں خواب وخیال ہیں۔ ان کی جیسی دور اندیشی' معاملہ فہمی' استعداد' تجربہ' قوت مشاہدہ اور نتائج اخذ کرنے کی مہارت اور صفت بھی نہیں اور اب تو ان صفتوں کی ضرورت بھی نہیں۔ بس دکانداری ہے۔ دکانیں ایک کے بعد ایک دوسرے کے بعد تیسری بس کھلتی جاتی ہیں۔ مال جیسا ہو دکان ہونی چاہیئے سب چل جائے گا اور اب کون سا مال بازار میں کھرا ہے؟ کوئی ایک نام بھی لے دے تو میں اپنی پوری رائے واپس لے لوں۔ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے ایک اسکیم حکومت امریکہ نے تیار کی تھی کہ شراب نوشی کم کی جائے۔ یہ منصوبہ بڑے ماہرین کی نگرانی میں بنا اور اس پر کروڑہا روپے کا بجٹ بنا اور اسکیم جاری کر دی گئی۔ ایک سال تک پوری شدت اور ذمہ داری سے کام ہوتا رہا۔ ایک سال گذرنے کے بعد پورے ملکی سطح پر اس کے نتیجہ کا جائزہ شروع ہوا تو کئی ماہ بعد اعداد وشمار جمع ہوئے اور معلوم ہوا کہ ایک سال میں اسکیم کی کارکردگی کا نتیجہ یہ ہے کہ فلاں مقام پر ایک فلاں صاحب نے اس تحریک سے متاثر ہو کر شراب چھوڑ دی۔ یہ کارنامہ اخبار میں شائع ہوا۔ اور جب یہ اخبار ان صاحب تک پہونچا جنہوں نے ترک شراب کیا تھا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے کہ پورے امریکہ میں ایک میں ہی ایسا بیوقوف ثابت ہوا چنانچہ اسی دن انہوں نے اخبار میں اعلان کر دیا کہ میں نے شراب نوشی شروع کر دی ہے۔

تو بہت مشکلوں سے چودہ پندرہ قسطیں قومی آواز میں شائع شدہ "ابھی سن لو مجھ سے" کی مل سکیں۔ چنانچہ اپنے حافظہ سے پھر میں نے تحریر کا آغاز کیا۔ اور یہ آغاز تحریر کیسے ہوا اور کیسے ہوتا ہے؟ میرے پاس نہ کوئی روزنامچہ نہ کوئی کتاب میرا روزنامچہ میرا ذہن' میری کتاب میرا دل۔ ذہن کے روزنامچے میں سب کچھ ہے اور دل کی کتاب میں اس کا خلاصہ ہے۔ اس روزنامچہ اور اس کتاب میں واقعات وحادثات' واردات' ذات اور شخصیات' کردار واعمال وافعال خیال آئینہ اور پتھر زہر اور نوشینہ' تلخی اور شیرینی خیر وشر لڑائی اور ملاپ دشمنی دوستی قہر وجبر وصبر پھول کانٹے زخم مرہم خلوص اور ریا نیک نیتی بد دیانتی دغا جفا وفا آنسو ہنسی مسکراہٹ آہ واہ کراہ تیزی تندی نرمی گرمی۔ یعنی پوری کائنات ہے جو ہنگاموں کے سامنے گذری ہے۔ میں جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو ذہن کا روزنامہ بھی کھولتا ہوں اور دل کی کتاب کا خلاصہ بھی۔

www.taemeernews.com

پھر دل سے مشورہ لیتا ہوں ۔ یہ کائنات کا پورا اسٹور روم ہے اس میں سے میری شاعری اور میرے قلم کو کیا عنایت ہوتا ہے دل انتخاب کرتا ہے۔ یہ زہر کو چھانٹتا ہے تریاق کو لیتا ہے ۔ پتھر کو چھانٹتا ہے آئینہ لیتا ہے۔ دشمنی کو ترک کرتا ہے دوستی لیتا ہے غلطیوں کو چھانٹتا ہے اچھائیوں کو خوبیوں کو لیتا ہے اور یہ سب مجھے حوالہ کرتا ہے جاؤ گاؤ اور لکھو۔ میں لیتا ہوں اور چپ کھڑا ہوتا ہوں۔ دل پوچھتا ہے کیا بات ہے کچھ اور چاہئے ؟ میں کہتا ہوں ۔ یہ جو اتنا چھانٹ کر آپ نے رکھا ہے کیا اس کا کوئی مصرف نہیں ہے ؟ دل کہتا ہے کیوں نہیں اگر تم استعمال کر سکو۔ لو یہ زہر ہے لیجاؤ اگر اسے نوشینہ بنا سکو۔ یہ تلخی ہے لیجاؤ اگر اسے شیرینی میں تبدیل کر سکو۔ یہ کانٹے ہیں لے جاؤ اگر انہیں پھول بنا سکو۔ یہ برائیاں ہیں لے جاؤ اگر انہیں خوبیوں میں ڈھال سکو۔ میں خوشی سے اٹھا لیتا ہوں ۔ لے آتا ہوں قلم لیتا ہوں اور اپنے آرٹ کو اپنے فن کو آواز دیتا ہوں لاؤ سامان، لاؤ رنگ، لاؤ خوشبو، لاؤ محبت، لاؤ پیار، لاؤ درد، لاؤ سوز، لاؤ آنسو، لاؤ حسن ظن، لاؤ حسن نظر، لاؤ حسن خیال اور ان سب میں اس چھٹونتی کے مال کو ملا دو انہیں گوندھو انہیں پکاؤ پگھلاؤ اور میرے قلم میں ڈھال دو ۔ یہ سب ہو جاتا ہے اور پھر میں غزل کہنے بیٹھتا ہوں نثر لکھنے بیٹھتا ہوں اور سب ردی کھاتے کا مال سب چھٹونتی کا مال، حسن لے کر، خوشبو لے کر کشش لے کر تاثیر لے کر برآمد ہوتا ہے ۔

بازاروں سے مول منگا کر رنگ تو سب بھر لیتے ہیں
کم ہیں جن کو خونِ جگر سے پھول بنانا آئے ہے

پتھر سے پہاڑ بنانا، پھول سے ہار بنانا، پتھر کے ٹکڑے لے آئے جوڑ کر عمارت بنا دی ۔ باغ سے پھول چن کر لے آئے ہار بنا دیا، چوا کر عطر بنا دیا۔ تو سب کر سکتے ہیں ۔ پتھر لے آؤ اور اسے بھٹی میں دے کر آئینہ بنا دو کانٹے لے آؤ انہیں گداز دل کی آنچ پر پگھلا کر اپنے خونِ جگر میں ڈبو کر پھول بنا دو برائیاں دشمنیاں لے آؤ انہیں محبت کی آنچ دے کر خوبیاں اور دوستیاں بنا دو ۔ یہ کام مشکل ہے بہت مشکل ہے ۔ آج کل یہ کام آرٹ نہیں کر سکتا ۔ آرٹ وہی ہے ۔ فن وہی ہے لیکن آرٹسٹ کا ہاتھ وہ نہیں دل وہ نہیں نگاہ وہ نہیں ۔ اجزا وہی ہیں جو سینکڑوں ہزاروں سال پہلے تھے ۔

www.taemeernews.com

وہی گہ دُزبان، ملہٹی خطمی عناب، برگ گاؤزباں، پرساؤشاں خشخاش سونف، سب کچھ وہی ہے مگر طبیب میں وہ نگاہ ہے نہ اس کے فن میں وہ گرمی ہے نہ تخیل میں پرواز نہ خیال میں گہرائی ہے نہ فکر میں بلندی ہے۔ اس لئے جو سطح اجزا کی ہے وہی دوا کی ہے۔ حالانکہ فن کا کام خاصیتوں کو ہموار کرنا اور امتزاج اور تقاضے کے شیشے میں ڈھالنا ہے۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ میری کتابوں کو یا میری شاعری کو پڑھنے والا اپنی سطح کو بھول جاتا ہے اور ایک ایسی سطح پر جاتا ہے جو اس کی نگاہ میں ہے حافظے میں ہے دل میں ہے مگر عملی طور پر وہ اس سطح پر نہیں ہے۔ آرٹ اور فن کا یہی مقصد ہے، یہی موضوع ہے، خالق کا یہی کام ہے۔ اللہ نے مٹی سے ایسا خمیر بنایا کہ وہ انسان ہو گیا۔ اشرف المخلوقات ہو گیا۔ فرشتوں سے بلند ہو گیا اور یہی قوت تخلیق انسانوں کو عطا کی گئی ہے مگر اس قوت کا وجود خالق قوت سے تعلق اور استواری پر منحصر ہے علاحدگی پر نہیں۔

پٹنہ سے پورب اور دکھن تقریباً ۱۰۰ سو کیلو میٹر پر ایک جگہ ہے۔ ایک سلسلہ کوہ، چشموں اور جھرنوں کی آڑی ترچھی بناوٹ کے درمیان۔ خاموش اور سکون کا ایک گوشہ۔ آبادیوں سے دور خود رو جنگلوں کے درمیان۔ صدیوں سے اُسے بودھ مذہب کے بھکشوؤں نے گیان دھیان کی آماج گاہ بنایا۔ فقیروں اور خدا پرستوں کے لئے وہ جگہ نہایت پسندیدہ رہی ہوگی۔ آوازوں کی کراہیتوں سے دور سانسوں کی دنیا طلبوں سے بہت علاحدہ نہ آبادی نہ شور نہ ہنگامہ۔ شاخوں کی جھرمٹ میں پودوں اور پتوں کی ہم آغوشی میں، ہواؤں کی نرم سرسراہٹ سے شاخوں کی مدھم نغمگی میں اور چھوٹے بڑے چٹانوں کی خاموش گفتگو کے درمیان انسان اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ محو راز و نیاز رہتا تھا۔ اس کے راز و نیاز اس کے سوال و جواب اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کی آمد و رفت اس کے آنسوؤں کی ہلکی ہلکی پھواروں سے مل کر پورے ماحول اور فضا کو تر رکھتی تھی، خوشبودار رکھتی تھی اور کوئی بھولا بھٹکا اجنبی اتفاق سے یا اس ماحول اور فضا کی کشش سے وہاں پہونچ جاتا ہوگا تو اس کے پاؤں ہواؤں کے دوش پر جم جاتے

www.taemeernews.com

ہوں گے اور وہ اپنے فانی وجود کے ساتھ نہ سہی اپنے روحانی پیکر کے ساتھ پرواز کرتا ہوا خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچتا ہوگا۔

میں جب تیس پینتس سال پہلے نیا نیا اس علاقے میں پہونچا تو چھوٹی لائن مارٹن کمپنی کی ریل کا چھوٹا موٹا اسٹیشن ہمارے کانوں میں کچھ نئی گنگناہٹیں سمونے لگا۔ اور اسٹیشن سے نکل کر پتلی سی کچھ پختہ کچھ سرخ مٹی کی خام دھاریوں کے درمیان والی سڑک پر پہونچا۔ تو پٹنہ کی ہماہمی بھول گیا وہ سڑک اونچی نیچی سطح زمین سے گذرتی ہوئی آگے بڑھی تو ارد گرد بودھوں کی چھوٹی بڑی جھونپڑوں کی سرخ اینٹوں اور سبز چھائیوں سے بنی ہوئی خانقاہیں نہایت خاموشی سے سلام کرتیں اور خوش آمدید کہتیں اور عنبر نمایاں مسکراہٹوں سے استقبال کرتی ہوئی آگے کی طرف اشارہ کر دیتیں۔ میں کچھ فضا کی مستی سے نیم سرشار اور کچھ ہواؤں کی نہایت مدھم گنگناہٹ سے نیم مستی میں کہیں کہیں چٹانوں کے ابھرتے اور ڈوبتے کناروں کے درمیان گذرتا ہوا۔ بودھ مہاراج کے دھیان گیان کے مختلف مقامات سے پرانی تاریخ کے بکھرے صفحات پڑھتا ہوا ایک کھلے مقام پر پہونچا تو کچھ دور چھوٹے چھوٹے درختوں کے درمیان ایک بڑے پہاڑ کے دامن میں بہت چھوٹا سا سفید مکان نظر آیا۔ جیسے راستے میں کوئی مسافر خانہ جس میں ایک دروازہ ہو۔ اور قریب پہونچا تو کچھ چھوٹے چھوٹے جھونپڑے یا دوکانیں سی نظر آئیں اور قریب پہونچا تو کچھ انسان بھی حرکت کرتے نظر آئے اور پھر کچھ دور اور چل کر گھنے درختوں کی اوٹ سے نکل کر ایک جگہ پہونچا تو رگا جیسے طلسم ہوش ربا کے دروازے پر پہونچ گیا۔ دو ایک کار کھڑی ہے دو ایک جیپ کچھ رکشے کچھ ٹھیلے کچھ ٹمٹم اور ان گاڑیوں سے کاروں سے جیپوں سے رکشوں سے اترتے اور چڑھتے مرد عورتیں بچے بچیاں رنگ رنگ کے لباسوں میں ملبوس کسی کے ہاتھ میں مٹھائیوں کے دونے کسی کے ہاتھ میں آئس کریم اور اغل بغل چھوٹے چھوٹے دکان، ہوٹل، دکانوں میں مختلف سامان۔ ہوٹلوں میں کچھ چائے کے سامان کتلیاں، چائے دانیاں، پیالیاں، دگچیاں، رکابیاں ان میں حلوے مٹھائیاں، سبزیاں اور گوشت۔ ایک بالکل چھوٹا موٹا بہت آباد اور بہت خوش منظر پرکشش گاؤں۔ بالکل

www.taemeernews.com

جنگل میں منگل سامنے دو تین سیڑھیوں کے چبوترے کے بعد ایک بڑا بہت مضبوط پھاٹک اور پھاٹک کے اندر داخل ہوا تو دور سے بہت چھوٹا سا ایک دروازے کا مسافر خانہ قسم کا گھر، ایک بہت کشادہ مکان مل گیا۔ ایک بہت لمبا چوڑا کشادہ آنگن اور دو طرف اونچے سائبان اور سائبانوں میں دونوں طرف کمرے اور کمروں میں مرد اور عورتیں کچھ کھانا پکاتے ہوئے کچھ کھانا کھاتے ہوئے اور صحن میں بچوں اور بچیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کچھ کھیلتی ہوئی کچھ تماشا دیکھتی ہوئی۔ یہ تو بالکل طلسم ہوش ربا کا دروازہ کھل گیا اور سامنے پہاڑ کے سائے میں ایک چھوٹی سی سفید عمارت جس کی طرف جانے کے لئے ایک بہت اونچی لمبی چوڑی پختہ سیڑھی جس کے دونوں بازو سرخ اور سبز رنگوں سے رنگے ہوئے۔ اوپر پہونچے تو برقعہ پوش مسلمان عورتیں غیر برقعہ پوش غیر مسلم عورتیں چادروں میں لپٹی سمٹی بچوں بچیوں کا ہاتھ تھامے مسلمان اور ہندو محرموں کے ساتھ ساتھ ایک حجرے کے دروازے پر عقیدت احترام اور محبت سے کھڑی ہیں۔ مجاور صاحب فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ ریوڑیوں اور مٹھائیوں کے دونے رکھے جا رہے ہیں اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ میں اس چھوٹے سے حجرے میں داخل ہوا تو سر پتھر سے ٹکرایا دیکھا تو چھت نہیں ہے بلکہ نکلی ہوئی غیر مسطح چٹان ہے اور چٹان ہی دیوار بھی بن گئی ہے۔ جھک کر آگے بڑھا تو ایک بہت چھوٹا سا سوراخ جس میں انسان بیٹھ کر اور سکڑ کر داخل ہو سکتا ہے۔ میں داخل ہو گیا۔ آگے صرف گھسکنے کی جگہ تھی۔ بہت احتیاط سے گھسکتا ہوا بڑھتا رہا تو وہ سوراخ ایک چھوٹے سے پہاڑی کھوہ میں جا کر ختم ہوا جس میں اوسط قد کا ایک انسان کھڑے ہو کر اور ایک بلند و بالا آدمی نیم استادہ ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

یہ ایک خاکہ تھا، نہایت مختصر، نہایت مجمل ظاہری خاکہ بودھوں کی خانقاہوں کے درمیان اسلامی دنیا کے ایک نہایت فاضل متبحر عالم صوفی بزرگ کی عبادت گاہ کا جنہیں ہم حضرت مخدوم بہاریؒ کے نام سے جانتے ہیں۔ اُس پہاڑی عبادت گاہ میں جو ایک زمانہ میں چشم زمانہ سے مدتوں جھاڑیوں اور جنگلوں میں پوشیدہ تھی۔ نہ جانے کب ایک جھونپڑا بنا ہوگا وہ جھونپڑا بڑھتے بڑھتے ایک چھوٹا سا طلسم ہوش ربا اس وقت نظر آتا ہے۔ اس میں گرم پانی

www.taemeernews.com

کا چشمہ خدا جانے کتنی صدی سے جاری ہے وہ امراض روحانی اور جسمانی کا علاج آج بھی اتنا ہی شافی ہے جتنا صدیوں پہلے رہا ہوگا۔ حضرت مخدوم کی عبادت گاہ کی کشش انہیں لاتی ہے اور صحت جسمانی اور صفائی قلب کی دولت تحفہ میں دے کر واپس بھیجتی ہے۔ پہلی بار میں گیا تو یہ رونق تھی جو اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس رونق کو ہماری بے پروائی بے عنوانی اور کبھی کبھی بے ادبی ضائع کر دیتی تھی۔ کوئی ایسا مرکزی نظم نہیں تھا جو پورے ماحول کو اس کی ظاہری اور باطنی صفات کے ساتھ قائم اور نمایاں رکھے۔

دو تین سال کے وقفہ کے بعد تقریباً پچیس سال پہلے میں ایک بار راجگیر گیا تو پھاٹک کے باہر کا حصہ دوکانیں راستہ اور راستے پر کھڑی ہوئی گاڑیوں اور رکشوں میں کچھ ترتیب نظر آئی۔ دوکانیں زیادہ سجی ہوئی نظر آئیں۔ دوکان کے سامانوں ہوٹلوں کے برتنوں میں رکھی ہوئی چیزوں میں صفائی نظر آئی۔ گاڑیوں کو بے ترتیب نہیں بلکہ سیدھی قطار میں کھڑی ہوئی دیکھا۔ پھاٹک سے پہلے چبوترے کی سیڑھیوں پر بھی گرد و غبار نظر نہ آیا۔ پھاٹک میں قدم رکھا تو دائیں طرف مسجد بھی صاف ستھری اور خوشنما جانمازوں سے سجی نظر آئی۔ دیکھا کہ گرم پانی کا چشمہ جس حوض میں گرتا تھا۔ وہاں پردہ پڑا ہوا ہے اور لکھا ہوا ہے "زنانہ" مرد کہیں قریب نظر نہ آئے۔ مردوں کے عورتوں کے حوض کے اندر جانے کے اوقات متعین۔ صحن میں دیکھا تو ایک پتہ بھی نیچے گرا ہوا نہیں تھا۔ پتہ گرا اور اُٹھا لیا گیا۔ صحن آئینہ کی طرح صاف۔ بچے بچیاں تعین نگران کے کھیل تقریباً بے آواز یا ایسی آواز جو کھیل کی کیفیت کو ظاہر کر سکے۔ شور و غل نہیں۔ چاروں طرف کے کمرے بھی بہت صاف اور کمرے میں رہنے والے مرد عورتیں بہت مہذب اور سنجیدہ نظر آئے۔ ہر جگہ تہذیب اور سنجیدگی اور صفائی کا ماحول طاری۔ مجھے تعجب ہوا کہ ماحول اور مکان کے اندر عورت مرد بچے بچیاں یہ دو ایک برس میں کیسے اس صحت مند تبدیلی کا نمونہ بن گئے۔ تقدس پہلے بھی تھا لیکن اب تقدس میں کشش اور رعنائی اور دلفریبی کا اضافہ تھا بڑا صاف ستھرا دلوں کو بے ساختہ ٹھنڈک پہونچانے والا ماحول میں کچھ حیرت سے ہر طرف دیکھتا ہوا جنوبی سائبان سے گذر رہا تھا کہ آخری کمرے کے دروازے کے سامنے سائبان میں ایک شخص کو

www.taemeernews.com

چٹائی پر بیٹھے دیکھا معمولی کھردری تار کے پتوں کی چٹائی اس پر کوئی ہلکی زرد چادر سر سے اوڑھے ہوئے گھٹنوں کو چھپائے ہوئے یوں بیٹھا تھا کہ نہ پاؤں کا کوئی حصہ نمایاں تھا نہ ہاتھ کا۔ چادر سے لب اور پیشانی بھی چھپی ہوئی تھی صرف لمبی ناک اور چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں نمایاں تھیں۔ میری نظر آنکھوں پر پڑی تو اس سے کوئی چیز تیزی سے نکل کر میرے دل میں سما گئی۔ اُن چھوٹی چھوٹی شکن آلود گندمی چہرے کے اندر والی آنکھیں عجیب انسیت' پہچان' محبت اور پیار کے انداز میں مسکرا رہی تھیں اور یہ تمام کیفیتیں انسیت پہچان پیار محبت اور مسکراہٹ براہ راست دل میں داخل ہو جاتیں۔ میں لمحہ کھڑا ہوا تو چادر کا حصہ لبوں سے ہٹا کر اس شخص نے کہا السلام علیکم بابو۔ اور چٹائی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں بے ساختہ دو تین سیڑھیاں چڑھ کر سائبان میں اس شخص کے قریب بیٹھ گیا۔ انہوں نے چادر کا حصہ اپنے چہرے سے دور کیا تو دیکھا گندمی رنگ سفیدی مائل چہرہ مونچھیں منڈی ہوئی اور ٹھوڑی پر بہت ہلکی داڑھی۔ لمبا دہانہ' ستواں ناک' چوڑی اونچی پیشانی' آنکھیں نہایت چمکدار سیاہ اور سحر انگیز۔ چہرے کی جھریاں آنکھوں کے گوشوں سے ہوتی ہوئی پوری پیشانی پر چھا چکی تھیں۔ چند یا بالوں سے صاف تھی۔ لیکن سر کے پچھلے حصے میں بالکل سیاہ چمکدار جھرجھرے بالوں کی زلف گردن تک پہونچی ہوئی۔ ان کی گفتگو زیادہ تر آنکھوں سے ہوتی زبان کم استعمال کرتے مگر کرتے تو بہت وضاحت سے مگر مختصر۔ اور زبان زیادہ پڑھے لکھوں جیسی نہیں سیدھی سادی کسی ان پڑھ شہری کی۔ مگر گفتگو کا مغز زمین کی سطح سے آسمان پر پہونچا ہوا۔ محبت کی گفتگو' خدا ترسی کی گفتگو' خاکساری اور خاک نشینی کی گفتگو' خدمت اور قربانی اور ایثار کی گفتگو' بزرگوں کی صحبتوں کی گفتگو' کبر و غرور اور بغض و حسد سے نفرت کی گفتگو۔ زبان ادنیٰ مگر خیالات اعلیٰ آواز نرم مگر سچائی اور اخلاص کی حرارت سے گرم۔

یہ تھے آغا محمد جان خاں کابلی جو کابلی شاہ کے نام سے مشہور تھے۔ یہ کابل سے تین چار بھائیوں کے ساتھ سو سال سے بھی قبل بہار آئے۔ بہار شریف میں قیام کیا اور پھر صدر بازار میں تینوں بھائیوں نے مل کر کپڑے کی بہت اچھی دوکان کھولی جو خوب چلی اور بہت دنوں تک چلتی

www.taemeernews.com

رہی ۔مزاج بہت دین دارانہ بلکہ خدار سیدہ بزرگوں جیسا میلانِ مزاج ۔خریداروں سے تینوں بھائی موقع نکال کر دین کی ایمان کی گفتگو کرتے ۔ خدا جانے تینوں بھائیوں کے دلوں میں کیا بات آئی ۔اللہ نے اونچے مقصد کے لئے انہیں انتخاب کیا ۔اور تینوں بھائی دوکان فروخت کر کے تھوڑے سے کپڑے اپنی پیٹھ پر لادے لادے گاؤں گاؤں پھرتے کپڑے فروخت کرتے اور اس بہانے اسلام ایمان اور عمل کی باتیں پہونچاتے ترغیب دیتے ۔اسی دوران گیا ضلع کے ایک وارثی سلسلہ کے صوفی مزاج بزرگ رضا شاہ عرف حضرت نامدار شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی ۔وارثی سلسلہ میں مرید ہو گئے ۔اور ان کے سخن میں اور تیزی آگئی ۔لوگ کہتے ہیں پورے شمالی اور جنوبی بہار میں شاید ہی کوئی گاؤں ان کے تبلیغی اور تجارتی دورے سے بچ گیا ہو۔
مجھ سے ملاقات بہت دنوں بعد ہوئی جب ان پر ضعیفی پوری طرح غالب آگئی تھی ۔تجارتی مشغلہ ترک کر دیا تھا اور اللہ پر توکل کر کے بس اصلاح نفس اصلاح معاشرہ اور اصلاح ماحول میں لگ گئے ۔ راجگیر میں حضرت مخدوم بہاری کی درگاہ کو چند برسوں میں ظاہری اور باطنی صفائی سے حسنِ انتظام سے اور دینی فضا کے قیام سے چار چاند لگا دیئے ۔

تو میں کابلی شاہ کے قریب بیٹھ گیا ۔وہ ایک ایک دو دو منٹ کے وقفے سے دو ایک بات بولے تو رہے ۔

"بابو۔ دنیا بہت گندی ہو گئی ہے ۔ بابو اس گندگی کو صاف کرنا چاہیئے ۔"

"بابو۔ اللہ ہی سب کچھ کرتے ہیں ۔بابو اللہ کا تابع دار سب کو بننا چاہیئے ۔"

وہ باتیں کرتے اور باتیں کرتے کرتے اپنی چھوٹی آنکھوں کو پھیلا دیتے اور آنکھوں کی سحر انگیزی بڑھ جاتی اور پھر وہ مسکراتے مگر اس طرح مسکراتے کہ دانت نہیں کھلتے ۔بس دونوں ہونٹ پھیل جاتے ۔ اور کبھی کبھی باتیں کرتے کرتے آبدیدہ ہو جاتے ۔ وہ پٹنہ کئی بار میرے یہاں آئے ۔ ایک دو شب قیام بھی کرتے ۔ غذا بہت مختصر اور حیرت ہوتی کہ اتنی مختصر غذا پر ان کے دراز قد جسم کی نشو و نما کیسے ہوتی ہے ۔ان کا جسم کابلیوں جیسا طویل اور پھیلا ہوا ، ہڈی پر گوشت زیادہ نہیں مگر ہڈی بہت مضبوط موٹی اور چکیٹھی ۔ ہڈی اور چمڑے درمیان گوشت مختصر

www.taemeernews.com

ہے، تھا اس لئے تمام بدن کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ کمر سے قدرے جھک گئے تھے مگر چال بہت تیز اتنی تیز کہ ہم لوگوں کو اُن کے ہم قدم رہنے میں لپکنا پڑتا۔ سفید براق لباس پہنتے اور بہت خوبصورت معلوم ہوتے اور وارثی سلسلہ کی علامت ایک چادر زرد رنگ کی ہمیشہ سر سے گذرتی ہوئی کندھوں پر رہتی۔ ہمیشہ چپل پہنتے جس کا فیتہ انگوٹھے اور دوسری انگلیوں کے درمیان رہتا پاؤں کی انگلیاں اور پاؤں کی پشت پر ہڈیاں بالکل نمایاں۔ تلوے گہرے مجموعی طور پر وہ ایک خوبصورت انسان تھے۔ نماز باجماعت کے پابند اور راتوں کو تہجد پڑھنے والے۔ آرام بہت کم کرتے۔ زیادہ تر ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ اس ذکر و فکر میں لوگوں سے ملنا اور ان سے اچھی پاک صاف گفتگو تقویٰ اور طہارت کی باتیں۔ خدا سے تعلق کی باتیں اخلاق اور احسان کی باتیں خدمت اور مروت کی باتیں۔ یہ بھی ذکر و فکر میں ہی شامل تھا۔ بہت خاکساری، کوئی تصنع نہیں۔ ہر جگہ زمین پر چٹائی پر بیٹھ جاتے اور بہت مسکینی سے بیٹھتے۔ زیادہ تر گھٹنوں کو موڑ کر اکڑوں بیٹھتے۔ کبھی کبھی چار زانو بھی بیٹھ جاتے۔ اُن کی ہر ادا سے اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اظہار ہوتا۔ صرف ایک ہی چیز مجھے کبھی کبھی کھٹک جاتی کہ ان کی داڑھی کے بال کبھی بڑھے نظر نہیں آئے۔ خدا معلوم بال ہی اتنے چھوٹے تھے یا چھنٹواتے تھے۔ میں نے کبھی بال چھنٹواتے انہیں دیکھا نہیں۔ کھانے کے وقت پہلے ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے اور پھر فارغ ہو کر ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتے۔ اچھی باتوں کے علاوہ زبان سے کوئی بات کوئی شکایت کسی کی غیبت یا دنیاداری کی بات سیاست کی بات ہرگز نہ کرتے۔ وہ مجھے ہمیشہ بابو کہتے۔ نام کبھی نہیں لیتے۔ اور اکثر قطب صاحب کہتے۔ کہو قطب صاحب اچھے ہو؟ اچھا قطب صاحب میں چلا۔ ان کی نقل میں ان کے دوسرے عقیدتمند مجھے قطب ہی کہنے لگے، آپ پٹنہ کے قطب ہیں۔ اور میں ہنس دیتا۔

ایک حج تو وہ جوانی میں کر چکے تھے۔ دوسرے حج میں مکہ تشریف لے گئے۔ اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔

---

www.taemeernews.com

شہرزاد نے اپنی موت سے پہلی رات کہانی شروع کی اور کہانی ہی کی بدولت صبح کو قتل ہونے سے بچ گئی اور دوسری رات پھر اسی طرح کہانی شروع کی۔ اس طرح ہزار راتیں اپنی زندگی بچالے گئی۔ اور پھر جاوداں ہوگئی۔ ہزار راتوں کے بعد بھی اپنی کہانیوں کی بدولت زندہ رہی اور پھر کتنی ہزار راتیں زندہ رہی اور پھر زندۂ جاوید ہوگئی۔ جو اُن کہانیوں کو پڑھتا ہے شہرزاد کو دیکھتا ہے اُسے سنتا ہے اُسے پیار کرتا ہے اور وہ سب کی شہرزاد بن گئی۔ میں نے بھی خدا جانے کتنی کہانیاں کہی ہیں ہزار سے کیا کم ہوں گی۔ میں بھی زندہ ہوں اور جب تک زندہ رہوں، شاید کہانیاں کہتا رہوں گا۔ شہرزاد کا کیسۂ تخلیق خالی ہوجاتا اس لیے کہ صرف اس کی اپنی تخلیق کارفرما تھی۔ مگر کب تک؟ انشاء اللہ خاں جیسا ذہین تخیلات اور تصورات کا بادشاہ ایک بات جو کہتا پھر دوسری بار نہیں کہتا۔ اس کی زنبیل تخلیق آخر خالی ہوگی۔ اور بادشاہ کی یہ فرمائش پوری کرنے کے لیے کہ تم روزانہ ایک نئی بات مجھے ضرور کہدو، وہ گلی گلی بازار بازار مارے پھرتے تھے۔ کوئی نئی بات کہیں سے سنتے، دیکھتے اور بادشاہ سے کہکر انعام حاصل کرتے اور عتاب سے بچ جاتے۔ انشاء اللہ جیسے ذہین اور بے مثال خالق بھی دیوالیہ ہوجاسکتا ہے۔ میں کیسے دیوالیہ ہوسکتا ہوں.... میرا تو ایک مستقل سرچشمہ ہے.... میں نے اپنی پہلی سوانح "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" کا اختتام ان سطروں پر کیا تھا:

کہیں نہ جا اے پاک زندگی کہیں نہ جا.... یونہی دروازے کے پردے
سے لگی رہ۔ یوں ہی خوابوں میں آیا کر۔ یوں ہی اشارے کیا کر....

www.taemeernews.com

تو بے چین ہے تو ہم بھی چین سے نہیں ہیں .... میری آنکھیں بھی اسی پردے سے لگی ہیں، اُنہیں اشاروں پر نظریں جمی ہیں۔ وہیں سے بقیہ زندگی کا آب و دانہ آرہا ہے۔ زندگی میں لہو آرہا ہے.... لہو سے بدن میں حرارت آرہی ہے۔ حرارت سے فن کا ہیولہ بن رہا ہے۔ اور ہیولے سے غزل نکل رہی ہے، کہانی نکل رہی ہے... ہم اسی پردے کو دیکھتے رہیں گے.... انہیں اشاروں کو سمجھتے رہیں گے.... وہی داستانیں سناتے رہیں گے اور سنتے اور سناتے اور دہراتے دہراتے ہم بھی راسخ عظیم آبادی کی طرح یہ کہتے ہوئے تیرے پاس آجائیں گے۔

تاخواب مرگ ذکر تھا ان کا زبان پر
نیند آگئی ہمیں تو اسی داستان پر

اب بتائیے یہاں دیوالیہ پن کیسے آئے گا؟ اس میں میرا کیا ہے... میں تو پوسٹ مین ہوں ڈاک آتی کہیں سے ہے جس کے نام آتی ہے اُسے پہونچا دیتا ہوں۔ پونجی تو سب کچھ اُدھر ہی ہے محنت میری ہے۔ سو محنت کے لئے توانائی ادھر سے ہی آتی ہے۔ ڈاکیہ کو تنخواہ ملتی ہے۔ میری تو کوئی تنخواہ نہیں۔ میری تنخواہ میری روح کا دانہ پانی میرے دل کے لئے لہو چراغ کے لئے روغن ادھر سے ہی آتا ہے۔ ان کا سب کچھ دیا ہوا اِدھر سے ہی گذرتا ہے میری روح میرے دل میرے جگر میرے دماغ سے گذرتا ہے۔ اپنی شادابی اور طاقت سے انہیں شاداب اور قوی کرتا جاتا ہے :

پھر اور چاہیے سامان کیا غزل کے لئے
میں خوش کلام ہوں تو خوش جمال ہے پیارے

خوش جمالی اور خوش کلامی اکٹھی ہوگئی۔ پھر دیکھئے انداز گل افشانیٔ گفتار۔ غالب اپنے سامنے پیمانہ و صہبا رکھے جانے کے محتاج تھے۔ یہاں تو ہمیشہ اور ہر وقت درد کی خوش رنگیوں کا خوش بوؤں کا خوش نغمگیوں کا جھرّاٹا سرّاٹا اور فرّاٹا ہے اور رجوع بھی ادھر ہی ہے۔

www.taemeernews.com

اُدھر سے شرارا آتا ہے اِدھر سے فرار ہو جاتا ہے ۔ وہی سفید پوش خاتون جو نیند میں خواب کا فرشتہ بن کر آنکھوں میں آتی تھی اور دن کو میری ماں بن جاتی تھی، برسوں خواب میں آتی رہی مگر ظاہر نہیں کیا کہ وہ تو میں ہی رہتی ہوں جب شہید ہو گئیں تو برسوں بعد دل پر یہ راز افشا کیا اور اب مستقل تسبیح لئے سامنے بیٹھی رہتی ہیں اور بندریا ناچتی رہتی ہے ۔

میں نے درمیان تحریر کتاب کا دیباچہ لکھنا چاہا لکھنا شروع ہوا۔ لکھا لیکن وہ دیباچہ اُس معنی میں نہ ہو سکا جس معنی میں لوگ سمجھتے ہیں مجبوراً اسے بھی کتاب کا حصہ ہی بنا دیا ۔ اب سوچتا ہوں کتاب۔ یعنی یہ کتاب ختم کیسے کروں ؟ ..... "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" کا اختتامیہ ابھی دیکھا ... وہ کتاب تقریباً میں روزانہ تھوڑا مطالعہ کرتا ہوں ۔ بس کتاب اٹھائی اور کھول لی ۔ جو صفحہ نظر آیا وہیں سے دیکھنا شروع کیا اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ آگے دیکھنے کے لئے پیچھے کا کچھ حصہ پڑھ لوں ۔ جس طرح غزل کا ہر شعر غزل کا ایک جز ہونے کے باوجود اپنا ایک منفرد وجود رکھتا ہے ۔ میری تحریر کا ہر حصہ بلکہ ہر سطر ایک منفرد وجود رکھتی ہے اور اس کے لئے سیاق و سباق کی ضرورت نہیں رہتی ۔ تو میں پڑھنے لگتا ہوں اور آہستہ آہستہ اسی دنیا میں کھو جاتا ہوں کوئی مجھے پکارتا ہے تو واپس آتا ہوں ہر وقت وہاں رہ نہیں سکتا ۔ ہر وقت رہوں گا تو اس دنیا کو کیا دے سکوں گا ۔ اُس دنیا کا میں محتاج ہوں ۔ اور یہ دنیا میری محتاج ہے ۔ میں وہاں رہوں گا تو میری محتاجی تو ختم ہو جائے گی، لیکن یہ محتاج دنیا اور کنگال ہو جائے گی ۔ میں کسی کو کنگال بنا دوں یہ کیسے ممکن ہے ۔ میں یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں ۔ اگر برداشت کر سکتا تو میں بھی کچھ اور ہوتا پھر میں وہاں نظر نہیں آتا جہاں نظر آتا ہوں میں اور جگہوں پر ہوتا جہاں کی تمنا انسانوں کا چہرہ بدل دیتی ہے، لباس بدل دیتی ہے، چال بدل دیتی ہے، زبان بدل دیتی ہے، خیال بدل دیتی ہے، عزم و ارادہ بدل دیتی ہے ۔ خواہشوں، تمناؤں اور ارمانوں کی تمام زمینیں اور آسمانیں بدل دیتی ہے اس کا رُخ راستہ منزل سب کچھ بدل دیتی ہے اور یہ سب کچھ بدلوا کر اسے ملتا کچھ نہیں یا جو ملتا ہے وہ اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتا جو یہ سب کچھ نہ بدلنے والے کو ملتا ہے ۔ یعنی دو لقمے غذا دو ٹکڑے پیرہن اور دو گز زمین ۔ چاہے یہ لقمے سونے کے تھالوں

www.taemeernews.com

میں ملیں یا مٹی کے، دو ٹکڑے اطلس کے ہوں یا گاڑھے کے، اور دو گز ۲۰ لاکھ کٹھے والی زمین ہو یا ۲۰ روپے کٹھے والی۔ دو لقمے جَو کی روٹی کے وہ کر جاتے ہیں جو متنجن اور مکھن کے لقمے نہیں کرتے۔ گاڑھے کے دو ٹکڑے وہ کرشمے دکھاتے ہیں جو کمخواب اور تنزیب کے بس میں نہیں اور دو گز کے جھونپڑے میں وہ راحت ہے جو محلوں میں نہیں۔ ان کی سچی مثالیں اسی کتاب میں مل جائیں گی۔ اس دنیا کی خیریت ہے کہ وہ دو لقمے باجرے کی طرف آئے دو گز گاڑھے کی طرف لوٹے دو گز جھونپڑے کی طرف پہونچے ورنہ اس کا مقدر بڑا اندوہناک ہے۔ میں اسی لئے ایسا نہیں ہو سکتا جیسا سب لوگ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بے وفا جیسی ہے دنیا تم بھی ہو
ہم بھی دنیا کی طرح ہو جائیں کیا؟
ساری باتیں زندگی کی چھوڑ دیں
شاعری بھی چھوڑ دیں؟ مر جائیں کیا؟

تو میں ایسا نہیں ہو سکتا اسی لئے میں اپنی محبوب دنیا میں تھوڑی دیر رہ کر وہاں کی نعمتیں لا کر پھر اس محتاج اور مفلوج دنیا کو دینا چاہتا ہوں اور دیتا ہوں۔ اپنی زندگی سے، اپنی باتوں سے، اپنی شاعری سے اپنے ادب سے۔

متاعِ درد سے ہے انجمن کی انجمن خالی
یہ شئے ہم بانٹتے ہیں اہلِ محفل سے کہو۔ لینگے؟
سنا ہے درد کا سرمایہ اب دلوں میں نہیں
تمہارے پاس اگر ہے دکھاؤ کیسا ہے؟

تو دیکھو کیسا ہے؟ "وہ جو شاعری کا سبب ہوا" دیکھو کیسا ہے، "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" دیکھو کیسا ہے، "جب فصلِ بہاراں آئی تھی" دیکھو کیسا ہے؟ "ابھی سن لو مجھ سے" دیکھو کیسا ہے۔ بتاؤ کیسا ہے؟ کیا پچھلے پچاس برسوں میں..... سینے پر ہاتھ رکھ کر خدا لگتی کہو.... کیا پچھلے پچاس برسوں میں ایسی شاعری دیکھی ہے، ایسا ادب پڑھا ہے، ایسی باتیں سنی ہیں،

www.taemeernews.com

ایسی زبان، ایسا لہجہ، ایسا اسلوب نظر آیا ہے ؟ فیصلہ زبان سے سننا نہیں چاہتا۔ دلوں کا فیصلہ معلوم ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں جو اپنی یا اپنے متعلق دوسروں کی تحریر اور رائے کو تعویذ بنا کر رکھتے ہیں تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔ میرے لئے وقت ضرورت وہی ہے جب میں لکھتا ہوں۔ کیا لکھتا ہوں اس کا فیصلہ میں خود کرتا ہوں اور الحمدللہ جو فیصلہ کرتا ہوں وہ فیصلہ سچ ہوتا ہے۔ اس کی زبانی یا تحریری تائید کی احتیاج نہیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے، جو کچھ میں نے کہا ہے جو کچھ میں لکھ رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں اور انشاءاللہ جو کچھ آئندہ کہتا رہوں گا اور لکھتا رہوں گا وہ سب فیصلے ہی ہوں گے۔ ایسے فیصلے جسے کبھی کبھی دیوانے کی بڑ کہا جائے گا۔ لیکن دیوانے کی ایسی باتیں جس کی تردید کرنے کی ہمت بھی نہ ہوگی اور ہمت کر بھی لیں گے تو جب تنہائی میں ہوں گے تو بات یاد آئے گی اور ایسی آئے گی کہ بھلائی نہ جائے گی۔

ہم کو دعائیں دو کہ تمہاری اداؤں پر
ہم نے جو کہہ دیا وہ بھلایا نہ جائے گا

آج ہنستے ہیں مگر ایک وقت ایسا آئے گا
پیرہن والوں کو یاد آئے گی دیوانے کی بات

میں نے وہ بات کی ہی نہیں جو بھلانے کی ہو۔ جنہیں میں نہیں بھولا اور جنہیں میں یاد دلاتا ہوں وہ کیسے بھلائی جائے گی۔ میں اس سمندر کے اندر جو آج کل غوطہ خوروں کی دسترس سے باہر ہے، جس کی گہرائی غوطہ خوروں کی ہمت سلب کر لیتی ہے۔ میں ڈوبتا ہوں اور ابھرتا ہوں اور اس طرح ڈوبتا ابھرتا ہوں جس طرح اپنے گھر میں سردیوں کے زمانے میں کوئی لحاف سے منہ ڈھک لے اور پھر کھولے۔ اس سمندر میں غوطہ لگانا میرے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا کسی کا لحاف سے منہ ڈھکنا۔ جیسے کسی کا گھر آنگن۔

اِک قدم یہاں اپنا اِک قدم وہاں اپنا

اس سمندر سے میں جو لاتا ہوں کوئی لائے کیسے ؟ ڈوبے نہیں تو موتی پائے کیسے۔ یہ سمندر تنہا

www.taemeernews.com

میری راجدھانی ہے۔ اب یہاں کسی کا گذر نہیں۔ جہاں سے لاتا ہوں وہ بڑے سخیوں کا دربار ہے جن کی آمدنی کی کوئی حد نہیں اور خرچ کی کوئی تھاہ نہیں جتنا خرچ کرو آمدنی بڑھتی جاتی ہے۔

غزلیں بھی کہیں پُرغم کتنی اس پر بھی علاج غم نہ ہوا
دولت تو بٹی ڈھیروں ڈھیروں لیکن یہ خزانہ کم نہ ہوا

اور کسی خزانے میں یہ فراوانی نہیں ہو سکتی۔ میں نے ابتداہی میں غم محبت کو گلے لگالیا ہے۔

تجھے اے غم محبت اِدھر آ گلے لگالوں
نہ ترا کہیں گذر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

خدا نے غم اور محبت دونوں کو لامتناہی بنایا۔ نہ ان دونوں کی تقدیر میں موت نہ فنا اور نہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے۔ جہاں محبت ہوگی وہاں غم ہوگا۔ محبت سب چاہتے ہیں مگر غم کون چاہتا ہے۔ سب سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

تجھے اپنا سلام اب اے محبت
کہ ہم نے حوصلہ اتنا نہ پایا

اور سب باحسرت و یاس استعفا داخل کر کے واپس آ گئے۔ مگر ہم نے دونوں کو گلے لگایا۔ اب یہی دونوں گلے کا ہار ہیں اور انہیں کی خوشبوئیں اسباب فن اور سرمایۂ فنکار ہیں۔

جہاں تم رہو گے پیارے وہاں درد دل رہے گا
جہاں درد دل رہے گا وہاں شاعری رہے گی
کبھی آپ زخم دیں گے کبھی ہم غزل کہیں گے
جہاں آپ رہیں گے یہی دل لگی رہے گی

بتاؤ کیا یہ آسان کام ہے اور کیا آج کوئی کر سکتا ہے؟ ہم کرتے ہیں اور کر رہے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے — تو پھر کیوں نہ ایسا ہو۔؟

میرے لوح مزار پر فریاد
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد

www.taemeernews.com

محبت میں جو کچھ ہم کر گئے کس نے کیا ہوگا
جہاں سب بھول جاؤ گے وہاں ہم یاد آئیں گے

تو جن سخیوں سے میرا رابطہ ہے جن داتاؤں کے ذمہ میرے لوح و قلم کی پرورش ہے ان کا دروازہ میرے لئے کھلا ہوا ہے۔ میں بے روک آتا ہوں بے ٹوک جاتا ہوں۔ یہ دوسروں کے لئے سرحد ممنوعہ ہے۔ یہاں قدم رکھنے کی ہمت ہی کسی کو نہیں اور کوئی ہمت کرے تو آگ کی وہ لپیٹ آئے کہ چیخ کر بھاگے۔

ہم جس میں ہمیشہ رہتے ہیں دھکی ہوئی غزلیں کہتے ہیں
اس درد کی بھٹی سے ہو کر اوروں کا گذرنا مشکل ہے

رہنا کیا اس کے قریب ہو کر کوئی گذر بھی جائے تو رونیں روئیں پر آبلہ پڑ جائے، سانس رک جائے اور بولتی بند ہو جائے۔ فراق نے چند سطریں لکھنے کے لئے نعرہ لگایا:

اے اہلِ ادب آؤ یہ جاگیر سنبھالو

لیکن لکھواتے لکھواتے نعرہ بھول گئے اور اتنا کہہ کر رہ گئے:

"کلیم عاجز کی شاعری پر کچھ بھی کہتے ہوئے میں اپنے آنسو مشکل سے روک پاتا ہوں ..... اس سے آگے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

فراق کو اپنی آتشِ فراق پر ناز تھا۔ قریب آئے تو چکرا گئے۔ "بابا یہ تو آتش نمرود ہے اس کے لئے کوئی ابراہیم چاہئے۔"..... یا یوں کہئے خوشبو کی ایسی جھانس لگی کہ ہوش ہی کھو بیٹھے۔

گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلفِ یار کی بو
پھری تو بادِ صبا کا دماغ بھی نہ ملا

میں نے پینتیس ۳۵ سال پہلے کہا تھا۔ اور دعا کی تھی۔

یہ جو زخم دل کو پکائے ہم لئے پھر رہے ہیں چھپائے ہم
کوئی ناشناسِ مزاجِ غم کہیں ہاتھ اس کو لگا نہ دے

الحمدللہ میں ناشناسانِ مزاجِ غم سے اب تک محفوظ ہوں۔ اس مزاجِ غم کو سمجھنا بہت مشکل

www.taemeernews.com

بہت مشکل کام ہے۔ اداشناس مزاج غم لاکھوں کروڑوں میں کوئی ہوتا ہے۔ ہوگا کوئی۔ ایک فراق تھے سو ہوش کھو بیٹھے۔ اس کے بعد کس کی ہمت ہے۔ اور ناشناس مزاج غم کو آگے بڑھنے کی ہمت اسی لئے نہیں ہوتی کہ اس کے بعد یہ دعا بھی تھی کہ

تب و تاب عشق کا ہے کرم کہ جمی ہے محفلِ چشم نم
ذرا دیکھیو اے ہوائے غم یہ چراغ کوئی بجھا نہ دے

میں نے چراغ جلانے والے ہی کو چراغ کا محافظ بنا دیا ہے۔ یہ سلیقہ ایک عمر کے بعد حسرت کو نصیب ہوا یا نصیب ہونے کے امیدوار تھے کہ

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

میں نے کام شروع ہی کیا اس سلیقہ سے سلیقہ آیا بعد میں لیکن اس بارگاہ میں داخلہ پہلے ہی ہو چکا تھا جسے داخلہ مل گیا اسے ڈگری بھی مل گئی۔ داخلہ ہی مشکل ہے۔ ہم سینہ ٹھونک کر غالب سے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کہہ گئے ہم کر گئے۔ آپ نے قوالی چھیڑی ہم حال ہی لے آئے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از اک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

تو میں نے ابھی ابھی "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" کا اختتامیہ پڑھا۔ وہ اختتامیہ میری ماں سے قلبی اور روحانی ملاقات پہ ہوا ہے۔ ایسی ملاقاتیں تو اکثر ہوا کرتی ہیں۔ اور میں جب چاہوں تو ہو اس لئے کہ یہ ملاقات میرے ہی چاہنے پر منحصر ہے وہ تو ہر وقت سامنے اس کی منتظر ہیں مجھے دیکھتی ہیں اشارے کرتی ہیں ارے لونڈے سُن۔ ارے چھوکرے سُن اور میں منہ پھیرے ہی پھیرے کہتا ہوں۔ ذرا ٹھہریئے اماں۔ آپ یوں ہی کہا کرتی تھیں۔ ارے لونڈے ناشتہ کرلے ارے چھوکرے کھانا کھالے میں کہتا تھا اچھا اماں ذرا سا پڑھ لوں۔ ارے پہلے کھالو پھر پڑھیو۔ اوہ اماں آپ تو جان کھائے جاتی ہیں۔ کھانے کے بعد کیسے پڑھا جائے گا اماں؟ تو اماں ہر وقت آپ کی سنتا رہوں تو دنیا کو کون سنائے گا اماں؟ اس وقت تو زندگی کی اُٹھان تھی۔ جو

www.taemeernews.com

زیادتی بھی ہوتی تھی زندگی برداشت کرلیتی تھی۔ پیار بھی خوب ہضم ہوجاتا تھا اور اس کا جوہر محفوظ رہ جاتا تھا۔ اب تو زندگی کی اُٹھان نہیں اب تو اتار ہے۔ قلب اور روح بھی وہ توانائی کہاں رکھتی۔ اب تم اتنا سناؤ گی تو یہ نعمتوں کا اتھاہ سمندر کیا مجھ سے عبور کیا جاسکے گا؟ کائنات کی خوبصورتیوں، لذتوں اور توانائیوں کا نچوڑ یہ پیار کا بوجھ مجھ سے سنبھل سکے گا؟ اور سنبھال بھی لیا ہم نے تو کیا اس دنیا کا ظرف اتنا رہ گیا ہے کہ پیار کے اس خزانے کا ایک سکہ بھی اُٹھا سکے اور اٹھائے تو سنبھال کر اپنی جیب میں رکھ سکے اور رکھ بھی لے تو اس کے خرچ کا اس کے مصرف کا حق ادا کرسکے؟ اس لئے اماں ہر وقت نہیں کبھی کبھی مجھے مخاطب کرلیا کیجئے کبھی کبھی بات کرلیا کیجئے۔ بس آپ سامنے تسبیح لئے بیٹھی رہئے مجھے دیکھتی رہئے، مسکراتی رہئے یا روتی رہئے۔ مسکرائیے اس لئے کہ آپ کی عطا کردہ نعمتوں کی خیانت نہیں ہورہی ہے یہ صحیح وقت پر صحیح مقام پر صحیح ماحول میں تقسیم ہورہی ہیں اور روئیے اس لئے کہ جن میں یہ تقسیم ہورہی ہیں جنہیں یہ بانٹی جارہی ہیں وہ انہیں بھی اور سکوں میں ملا لیتے ہیں اور ان سے بھی دال چاول ساگ ستو خریدنے لگتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ رانگے کی چونّی اٹھنّی اور روپے نہیں کاغذ کے ٹکڑے نہیں جن پر سو اور ہزار کی صرف مہر ہوتی ہے۔ یہ سخیوں کے لہو کی چھن چھن کرتی ہوئی اشرفیاں ہیں جن سے زندگی پھلائی نہیں جاتی سجائی جاتی ہے۔ ان سے زمین جائداد مکان دکان نہیں بنتے ان سے انسان بنتے ہیں۔

تو آئیے اس کتاب کو جو کتاب ہونے کے باوجود صرف دیباچہ ہی ہے جیسا کہ میں نے کتاب کی ابتدا میں کیا ہے یعنی جو لکھا ہے اب تک جو کچھ شاعری کی ہے جو کچھ نثر پیش کی ہے وہ سب کا سب دیباچہ ہی تو ہے تو پھر کتاب کیا ہے؟ کتاب تو کلیم ہے تو آئیے، بقول آپ کے، اختتامیہ کی چند سطریں اُنہیں سخی اہل محبت اہل درد کے چند باقیات الصالحات پر ختم کردوں اور آپ سمجھیں یا سمجھنے کی کوشش کریں کہ جو شخص ان لوگوں کے کارواں سے ہو وہ دوسری چال کیسے چلے۔ تو میں نے ۱۹۴۸ء میں دکان شروع کی وہ دکان سلیم صاحب ہیڈ کلرک انکم ٹیکس آفس کی تھی۔ وہ مجھے جانتے تھے مانتے تھے

www.taemeernews.com

اسی محلے کے تھے ۔ پھر وہ پاکستان روانہ ہو گئے ۔ اور ان کی تمام جائداد کسٹوڈین کے قبضے میں چلی گئی ۔ چند سال بعد دوسرے S.D.O. صاحب تشریف لائے ۔ اس زمانے میں S.D.O ہی کسٹوڈین ہوا کرتے تھے ۔ انہوں نے فائل منگوا کر کرایہ دکان ایک سو بتیس[۱۳۲] روپے ماہوار سے بڑھا کر دو سو بتیس[۲۳۲] روپے ماہوار کر دیا ۔ اس زمانے میں ایک سو کا اضافہ اتنا سہل نہ تھا کہ برداشت کر لیا جاتا اور پھر مجھ خانماں برباد کی بساط ہی کیا تھی ۔ مشورہ کیا ۔ لوگوں نے کہا ۔ کسٹوڈین کورٹ کی اپیل نہیں ہوتی ۔ ضلع کورٹ ' ہائی کورٹ کسی کو پلوڑ نہیں ۔ میں ستم زدہ حواس باختہ اِن باریکیوں کو کیا سمجھتا ۔ اسی اضمحلال میں ایک صاحب کے یہاں پہونچا ۔ میری نانھیال ہلسہ میں ایک پڑوسی پڑھا لکھا کائستھ خاندان تھا ۔ دو بھائی تھے ۔ اودھ پرشاد ' دنیش پرشاد ۔ اودھ پرشاد زمینداری دیکھتے تھے ۔ دنیش پرشاد پٹنہ کے اچھے قابل ذہین اور مخلص وکیلوں میں تھے ۔ میں انہیں ماموں کہا کرتا تھا ۔ پورا خاندان ' اردو داں ' سمجھدار شائستہ اور وضع دار تھا ۔ دنیش ماموں بچپن سے مجھے جانتے تھے ۔ مجھ پر جو گذری خوب محسوس کرتے تھے ۔ اسی محلے میں اُن کا مکان تھا اور ایسے راستے پر تھا کہ اکثر کہیں جاتے ہوئے میرا گذر ان کے مکان کی طرف سے ہو جاتا تھا ۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے مقدمہ کی مسل دیکھتے رہتے یا موکلوں سے باتیں کرتے رہتے میرا گذر ہو جاتا اور میری نظر اُٹھنے سے پہلے وہ مجھے دیکھ لیتے تو پکار لیتے کلیم آجاؤ یا میں خود پہونچ جاتا ۔ وہ ایک کھاتے پیتے خوش حال زمیندار گھرانے کے نہایت ہی شائستہ شگفتہ ' پروقار فرد ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ذہین ' دوربین قانون داں ' صحیح اور صحت مند تصوف کے دلدادہ اور ایک عملی صوفی منش انسان تھے ۔ بزرگوں سے عقیدت بھی رکھتے تھے ۔ قدیم صوفیوں کے ذہنی مرید بھی تھے اور آج سے چالیس پچاس سال پہلے تک جو بچے کھچے سچے خانقاہی تھے اُن سے تعلق خدمت بھی رکھتے تھے ۔ میں راستہ سے گذر رہا تھا ' انہوں نے پکار لیا ۔ رسمی خیریت پوچھی مجھے یاد آگیا ۔ میں نے کسٹوڈین والی بات چھیڑ دی ۔ کرید کرید کر جو دریافت کرنا تھا دریافت کیا ۔ سر جھکا کر سوچنے لگے ۔ ہاں جی کورٹ میں تو اس کی اپیل نہیں ہوگی ۔

www.taemeernews.com

پھر سوچا۔ پھر کاغذ نکالا۔ لکھنے لگے۔ دو ایک صفحات لکھ کر منشی کو بلا کر ٹائپ کے لئے کہا اور مجھ سے بولے۔ چلو دہلی چلنے کی تیاری کرو۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ دہلی چلنے کی تیاری کروں؟ کیوں؟ بولے کسٹوڈین جنرل کے یہاں اپیل کریں گے۔ گرچہ وہاں بھی معمولاً قانونی گنجائش اپیل کی نہیں ہے۔ مگر ہم اپیل کریں گے۔ دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔

یعنی وہ میرے ذرا سے حال کہنے پر نہ صرف یہ کہ دردمندی سے سوچا فکر کی اور خدا کے بھروسہ پر ایک راہ نکالی، کاغذ کھینچ کر نکتہ بہ نکتہ درخواست لکھی۔ ٹائپ کرنے کو منشی کے حوالہ کیا اور یہ سب کچھ آدھے گھنٹے کے اندر کر کے۔ اپنی شاندار پریکٹس چھوڑ کر گھر چھوڑ کر منافع چھوڑ کر صرف گھاٹے کے لئے اور وہ بھی مشقت کر کے گھاٹا حاصل کرنے کے لئے بغیر میری درخواست کے بغیر میری خواہش کا پتہ چلائے دہلی چلنے کو اور وہاں جا کر میری جانب سے لڑنے کو میرا حق دلانے کو بغیر معاوضہ بغیر فیس بغیر رشتہ بغیر ناتہ یوں تیار ہو گئے جیسے حضرت تاج فقیہہؒ حضرت عارف باللہ منیری کی مصیبت سن کر فلسطین سے منیر آنے کو چل پڑے:

وہی زندہ رہنے کا فن جانتے ہیں
جو آداب دار و رسن جانتے ہیں
خرد کھیل سمجھی ہے دیوانہ پن کو
جو کرتے ہیں دیوانہ پن۔ جانتے ہیں

تو جناب شاید دو چار روز کے اندر تیاری ہو گئی۔ ہم دونوں دہلی روانہ ہوئے۔ یہ بات ۱۹۵۶ء کی ہے اور میں بی۔ اے آنرس کا امتحان دینے والا تھا۔ میرے سفر کا مناسب موقع نہ تھا، مگر ایک شخص پورا پیرہن آگ میں جھونک دینے کو تیار ہو گیا تو کلیم دامن کیا بچاتا۔ دہلی پہونچے۔ بلی ماران میں ایک معمولی سے ہوٹل میں قیام کیا جو تنگ بھی اور کسی حد تک گندہ بھی۔ شام کو بولے حضرت نظام الدین چلیں گے۔ میں تو بزرگوں کے آستانوں پر جاتا ہوں تو آنسو روک نہیں پاتا۔ بے حال ہو جاتا ہوں۔ کیوں؟ فی الحال نہیں بتا سکتا۔ تو ہم دونوں

www.taemeernews.com

حضرت محبوب الہٰی کی درگاہ پر پہونچے - میں تو مزار کے باہر ہی ایک گوشہ میں کھڑا ہوگیا۔ اور کیسے کیسے خیالات آنے لگے۔

جب جام تھا جم نہیں تھا
ساقی کی نظر میں سم نہیں تھا
اندیشۂ بیش و کم نہیں تھا

نگاہوں کے سامنے سے صدیوں کے پردے اُٹھنے لگے۔ تاریخ کے اوراق تیزی سے اُلٹنے لگے:

کیا تھے ہم اور ہو گئے کیا ہم
دیکھے ساری محفل دیکھے

ساری محفل دیکھنے لگی اور ہم رونے لگے ۔ کاروبار اشک سے فراغت ہوئی تو آنکھیں جل رہی تھیں دیکھا کہ دنیش بابو مراقبہ میں بیٹھے تھے۔ میں قریب پہونچا تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میری سرخ آنکھوں کی طرف دیکھا اور ہنسے۔ بولے کام تو بنتا نظر آتا ہے۔ چلو ہوٹل چلیں ۔

میرے دوست حسن نعیم ان دنوں وزارت خارجہ میں ڈاکٹر محمود مرحوم کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ اُن سے ملاقات کے لئے ان کے فلیٹ چلا گیا۔ وہ بھلا ہوٹل کیوں واپس آنے دیتے ہم لوگوں نے شب وہیں بسر کی۔ صبح دفتر کے وقت ہم دونوں کو کسٹوڈین آفس میں چھوڑتے ہوئے وہ اپنے دفتر گئے اور ہم پیش کار سے ملے۔ وہ بولے ابھی تو اس درخواست کے داخل ہونے ہی کی ایک مہم ہے۔ درخواست پیش کی جائے گی۔ اگر انہوں نے داخل کرنے کی اجازت دی تو پھر بحث اور زبانی عذرداری کے لئے تاریخ پڑے گی۔ آپ لوگ جائیں اگر منظور ہوگئی تو پیشی کی تاریخ کی اطلاع ایک ماہ قبل چلی جائے گی۔ ہم نے ان کی خوشامد کی۔ درخواست ابھی پیش کر دیجئے۔ ہم منظوری کی صورت میں آئندہ پیشی کی تاریخ لے کر ہی جانا چاہتے ہیں۔ کچھ ردو قدح کے بعد وہ مان گئے۔ تیس چالیس سال پہلے تک ہر ویرانہ میں بھی کوئی نہ کوئی چراغ مل جاتا تھا۔ اب تو گلشن کا بھی یہ حال ہے :

گلشن میں کوئی بوئے دمساز نہیں آتی ❊ اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

www.taemeernews.com

معلوم ہوا مسٹر پورن سنگھ کسٹوڈین جنرل ہیں، بڑے سخت آدمی ہیں۔ انتظامات کے متعلق ہی مقدمات کی پیشی سنتے ہیں۔ کرایہ داری کے مسئلے پر کوئی درخواست منظور نہیں کرتے اور اب تک کوئی مقدمہ منظور نہیں کیا گیا ہے۔ دنیش بابو نے کہا ہر چہ باد آباد آپ کی مہربانی آپ درخواست پیش کر دیں۔ ہم لوگ باہر جنرل روم میں بیٹھے رہے۔ گیارہ بجے کسٹوڈین جنرل صاحب تشریف لائے اور سیدھے دور اجلاس کی طرف چلے گئے۔ نہایت دراز قد کسی حد تک خوش رو آدمی عمر پچپن کے قریب مگر جسم اور چہرہ چالیس پینتالیس سال کا تیر کی طرح قد اور کسی کھلاڑی کی طرح جسم پینٹ اور بش شرٹ۔ سر پر بہت چھوٹے بال۔ اُن کے آنے کے آدھ گھنٹے بعد پیشکار یا پرسنل اسسٹنٹ کہیئے فائل لے کر کورٹ کی طرف گئے۔ اور شاید آدھ گھنٹہ گذرا ہوگا کہ باوردی چپراسی نے میرا نام پکارا۔ میں اُٹھا بھی نہیں تھا کہ دنیش بابو اُٹھ کھڑے ہوئے پھر میں بھی اُٹھا۔ اور کورٹ میں داخل ہوا۔ وہ فائل کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ میں مدعی کے کٹہرے میں داخل ہوگیا۔ دنیش بابو کٹہرے سے باہر کھڑے رہے حالانکہ انہیں وکیل کی حیثیت سے سامنے کرسی پر بیٹھ جانا چاہیئے تھا۔ کسٹوڈین جنرل نے پہلے میری طرف دیکھا۔

"کلیم عاجز ؟"

"جی ہاں"

"آپ کون ؟ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں ؟۔ آپ ....."

کسٹوڈین جنرل آگے کہنے کو تھے کہ دنیش ماموں بول اُٹھے۔

"میں دنیشور پرشاد ..... اِن کا وکیل"

دنیش کے جواب ختم ہونے سے پہلے کسٹوڈین جنرل کی نگاہ فائل پر پڑ چکی تھی۔ انہوں نے پھر فائل پڑھا، میرا منہ دیکھا۔ دنیشور بابو کو دیکھا اور پھر فائل دیکھنے لگے۔ پھر قلم رکھ کر آنکھیں بند کیں .... پیشکار، چپراسی اور دوسرے کلرک حیران۔ آخر مدعی کو بلایا ہی کیوں گیا ؟ یہ تو مسئلہ صرف درخواست کے داخلہ کا تھا .... مگر کسٹوڈین تقریباً تین چار منٹ تک اسی طرح کچھ سوچتے رہے۔ پھر آنکھیں کھولیں۔ Steno کو بلایا اور لکھوایا۔ آرڈر

www.taemeernews.com

انگریزی میں تھا۔ مجھے پینتیس ۳۵ سال بعد بھی وہ مختصر آرڈر تقریباً مکمل یاد ہے۔

"کسٹوڈین کوئی جج نہیں ہے وہ فیصلہ نہیں کرتا وہ فریق ہے معاہدہ کرتا ہے اور معاہدہ فریقین کی رضامندی سے بدلا جاتا ہے۔ میں آج نیا معاہدہ کرتا ہوں۔ کرایہ دو سو بتیس ۲۳۲ روپیہ سے کم ہو کر سابق کرایہ ایک سو بتیس ۱۳۲ روپیہ ماہانہ جاری رہے گا۔"

کیف و مستی میں وہی سب سے نرالے ہوں گے
جن کی تقدیر میں ٹوٹے ہوئے پیالے ہوں گے
وہ جو چاہیں گے تو ہر سمت اُجالے ہوں گے
شہر میں ڈھونڈھ بہت آنسوؤں والے ہوں گے

نہ پیشی نہ عذرداری نہ بحث نہ جرح نہ قدح۔ مسئلہ تھا تاریخ داخلہ لینے کا وہاں فیصلہ مل گیا۔ گئے تھے آگ لانے پیمبری لے کر آ گئے۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

دو تین ہی سال بعد کسٹوڈین جنرل کی طرف سے اعلان ہوا کہ تمام متروکہ جائدادیں نیلام کی جائیں گی۔ لوگ آنے لگے اور میری دوکان کو دیکھنے لگے۔ اِدھر سے اُدھر سے یہ کب کا بنا ہوا ہے؟ اس وقت تعمیری لاگت کیا ہوگی؟ اور اس وقت کیا ہو سکتی ہے؟ محلے کے لوگ بھی، ہندو مسلم بھی، جانے پہچانے بھی اور انجانے بھی۔ جانے پہچانے زیادہ انجانے کم۔

"نیلام ہوا تو مکان والے قبضہ چاہیں گے۔ آپ مکان خالی کر دیں گے نا؟"

کوئی دوسرا بولتا۔ "خالی یہ نہ کریں گے تو کسٹوڈین خود ہی خالی کرا کے قبضہ دیگا۔ یہ تو سرکاری جائداد ہے، خالی کرانے کی ذمہ دار خود سرکار ہے۔

ہم کیا کہتے؟ بات تو یہی ہے۔ اور ہم کیا کہیں گے؟ اپنے بس میں تو کچھ نہیں۔

www.taemeernews.com

نیلام ہوا تو خالی کرنا ہی ہوگا۔ خالی کر کے کہاں جاؤ گے۔ دس سال پہلے اور بات تھی۔ اب، وہ بات کہاں؟ سلیم صاحب مرحوم محلّے کے تھے۔ ہماری حالت جانتے تھے۔ مصیبت زدہ ہے، خانماں برباد ہے۔ شریف ہے، نیک ہے، ایماندار ہے۔ ہماری جائداد محفوظ رہے گی، کرائے پر دے کر چلے گئے۔ انہیں اس کا اندازہ اُس وقت، کہاں کہ مہاجروں کی تمام جائدادیں خانۂ سرکار میں جائیں گی۔ اب خالی دوکان کہاں کھوجیں گے، ڈھونڈھیں گے، کسی کونے میں کہیں ملی بھی تو دس ہزار بیس ہزار پگڑی کون دے گا؟ بی۔ اے آنرس کر چکا تھا، ام۔ اے میں اسکالرشپ کے ساتھ داخلہ ہو چکا تھا۔ خانماں بربادی پر بھی وضع داری قائم تھی۔ شیروانی پاجامہ کٹ بوٹ، گھڑی قلم سب چل رہا تھا۔ صبح سے ظہر تک کالج، یونیورسیٹی ظہر کے بعد سے دکان۔ صبح سے ظہر تک بی۔ اے آنرس گولڈ میڈلسٹ شاعر غزل خواں اور ظہر کے بعد سے "تکیہ والے، توشک والے۔ مشین بھی چلا رہے ہیں، کپڑے بھی تراش رہے ہیں، بازار جا کر تھوک والوں سے سودا بھی کر رہے ہیں۔ سامان رکشہ پر لاد کر ایک طرف خود بیٹھ کر آ رہے ہیں۔" وہ دیکھو کلیم عاجز صاحب جا رہے ہیں۔" کیا خوب کہتے ہیں، کیا خوب پڑھتے ہیں؟ تو پھر یہ رکشہ پر سامان کس کا ہے؟ بے چارے ایک دوکان کرتے ہیں تکیہ، توشک سیتے ہیں، بیچتے ہیں۔۔۔۔ اچھا تو میاں جی کے میاں جی، بجنیا کے بجنیا؟ کیا کریں بے چارے گھر بار جل گیا، جائداد لٹ گئی، کھیت کھلیان قبضہ ہو گیا، زمینداری سرکار نے لے لی۔ رہا کیا کہ شیروانی بنائیں، پاجامہ ٹوپی بنائیں۔ بیوی کو کھلائیں، بچوں کو پالیں۔ میاں جی کو بجنیا بننا ہی پڑا۔ لیکن کوئی ان کو بجنیا نہیں کہتا، دکاندار نہیں کہتا۔ تمام ماڑواڑی، پنجابی، تھوک فروش انہیں نواب صاحب کہتے ہیں، بڑی عزت کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کرتہ لنگی پہن کر، ہاتھ میں جھاڑو لے کر دوکان کی صفائی کر رہے ہیں۔ دوکان کا گرد و غبار نکال کر فٹ پاتھ تک پہونچا کر جھاڑو سے سڑک پر ڈال رہے ہیں، پھر جھاڑن لے کر سارا سامان جھاڑتے ہیں، کرسی بنچ صاف کرتے ہیں دکان لگا کر اندر غسل کرتے ہیں۔

www.taemeernews.com

کرتہ پاجامہ ٹوپی پہن کر دوکان پر بیٹھتے ہیں، خریدار آتا ہے تو کھڑے ہو کر سامان دکھاتے ہیں، خریداری ہوئی تو سامان کاغذ میں لپیٹ کر گاہک کے سپرد کرتے ہیں۔ کیش میمو بنا کر خریدار کے حوالے کرتے ہیں' پیسے لیتے ہیں۔ بکس میں رکھ کر قاعدے کا خریدار ہوا تو سلام کرتے ہیں' مصافحہ کرتے ہیں۔ بڑے بڑے خریدار آتے ہیں اور بہت پیار سے ان سے ملتے ہیں۔ پھر جلدی اندر جاکر کپڑے بدلتے ہیں۔ دھلا ہوا' استری کیا ہوا پاجامہ پالش کیا ہوا جوتہ' صاف سفید موزہ' گرمی میں ہلکی کی شیروانی اور جاڑے میں سیاہ سرخ کی شیروانی سیاہ ٹوپی۔ جیب میں گھڑی عموماً خراماں خراماں کالج یا یونیورسیٹی جاتے ہیں۔ اور جاتے ہوئے' آتے ہوئے جانے پہچانے ساہوکاروں سے' پنجابی تھوک فروشوں سے صاحب سلامت ہوتی ہے۔ آداب عرض نواب صاحب۔ ادھر سے نرسنگھ جی، اُدھر سے رام کمار آداب عرض نواب صاحب' آداب رام کمار بھائی، آداب نرسنگھ جی۔ کالج جاتے ہوئے راہ میں اکثر ڈاکٹر نصیرالدین صدر شعبہ Anatomy اسپتال ہو کر جاتے ہوئے راستے میں مل جاتے ہیں۔ "ادہو۔ السلام علیکم عاجز صاحب ادہو آپ تو Best dressed man of Patna ہیں۔" عاجز صاحب ہنس دیتے ہیں' مصافحہ ہوتا ہے اور آگے بڑھ جاتے ہیں تو یہی جھاڑو سے دکان کی صفائی کرتے ہوئے تکیہ والے' توشک والے جب اپنی وضع داری سے نکلتے ہیں تو لوگ محبت اور پیار سے نواب صاحب کہتے ہیں۔ پان کھلاتے ہیں اور Best dressed man of Patna مانے جاتے ہیں۔

تو دکان نہ رہے گی تو شیروانی جوتا پاجامہ اور نواب صاحبیت کیسے چلے گی؟ گرچہ چلانے والے تو خدا ہیں۔ کیسے کیسے حال میں چلایا اور آئندہ کیسے کیسے حال میں چلائے گا کون جانتا ہے مگر تشویش رہتی' فکر رہتی۔ دوکان نیلام ہوگی تو دکان کہاں لے جاؤں گا؟

میرے ایک رشتے کے نانا عبدالکریم عرف بکو میری نانھیال کے ایک بہت اچھے کھاتے پیتے کاشتکار تھے۔ اچھے خوبصورت آدمی، گندمی رنگ، بہت اونچی پیشانی۔ سر پر چھوٹے انگریزی بال اور ٹھوڑی پر بہت چھوٹی خشخشی داڑھی' بہت خوبصورت سلی ہوئی

www.taemeernews.com

گیا کی بیلدار ٹوپی، سفید باریک ململ کا کرتہ، مدراس کی لنگی اور سیاہ یا بادامی پمپ کا جوتہ
اِن کا ذکر دوسرے سلسلے سے "جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی" میں آگیا ہے۔ اِن کی جائداد قبضہ
ہونے سے رہ گئی تھی۔ برابر دیہات جاتے تھے، فصل وغیرہ بیچ کر لاتے تھے، اچھے
خوشحالی سے رہتے تھے۔ مگر بہت خوش حال نہیں تھے۔ اِن کی بیوی ہلسہ میں تھیں۔ وہ خود
بھی ہلسہ میں رہتے مگر اکثر میرے یہاں آکر دس بیس دن ایک ماہ پڑے رہتے۔ ہر ماہ ایک
پھیرا ہلسہ کا کرتے، دس پانچ روز رہتے پھر چلے آتے۔ ہلسہ گئے ہوئے تھے۔ اعلان ہونے
کے دو تین روز ہی بعد آئے۔ مجھے کچھ اداس غمگین دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے؟ میں نے
صورت حال بیان کی۔ خاموش رہے۔ ایک دو روز بعد بولے گھبراؤ نہیں۔ دس بیس ہزار
روپیہ کا میں سامان کرسکتا ہوں۔ وہ مقدمات کے پیروی کار بھی تھے۔ بولے کسٹوڈین کو
راضی کروں گا کہ وہ عمومی مہلت سے کچھ زیادہ مہلت دے کہ رقم کا سامان کروں۔ اس زمانے
میں جائدادیں اتنی مہنگی نہ تھیں۔ آج سے چالیس سال قبل دکان مع زمین کی قیمت بیس
پچیس ہزار سے زیادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ انہوں نے کہا دس ہزار کا سامان تو تیار رکھوں گا،
دس بارہ ہزار کے لئے مہلت کی پیروی کروں گا۔ میں نے کہا نانا یہ دکان شاہ راہ پر ہے
بہت اس کے آرزومند ہوں گے۔ پتہ نہیں بولی کہاں سے شروع ہو، کہاں تک بولی جائے۔
بولے مت گھبراؤ، اللہ پر بھروسہ رکھو۔ میں تو سو فیصد اللہ پر بھروسہ رکھتا تھا۔ اب تک بارہ
چودہ سال کون کام آیا تھا۔ نہ بھائی نہ بند، نہ اپنے پرائے۔ بھائی بند اپنے اب رہ ہی کہاں
گئے تھے۔ رہتے بھی تو کیا کرتے۔ زندگی جن مقامات سے جن حالات سے گذری اُس نے
خدا کے علاوہ اور کسی پر بھروسے کا شائبہ بھی نہ رکھا۔

نیلام کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ بکو نانا کا تصور ہی تھا کہ بولی تو کم سے کم شروع ہوتی ہے۔
سو پچاس نہیں، ہزار دو ہزار سے شروع ہوگی۔ بولی بولنے والے کو کون روکے گا جو چاہے بولے۔

نیلام کی تاریخ کا اعلان ہوا۔ اور روزانہ شام کو دو ایک فکرمندوں کی مجلس شروع ہوتی۔
ان دو ایک فکرمندوں میں ایک تو میں، ایک بکو نانا اور تیسرے وہی ہوتے جو مکان کا فیصلہ

www.taemeernews.com

کسٹوڈین جنرل سے جیت کر آئے تھے، دنیشور پرشاد وکیل۔ اور چوتھے ایک صاحب اور ہوتے۔ اس زمانے میں پٹنہ کے اکثر حلقوں میں شاہ صاحبان کا قیام تھا۔ چھجو باغ کے کسی مکان میں ایک شاہ صاحب مقیم تھے، ان کا نام شاہ لیاقت تھا۔ گردنی باغ کسی کے کواٹر میں کوئی شاہ صاحب تھے، ان کا نام یاد نہیں۔ اسی طرح گلاب باغ جہازی کوٹھی میں کسی شاہ صاحب کا قیام تھا۔ اِن شاہ صاحبان کے معتقدین میں مسلم غیر مسلم سب تھے۔ اور شام کو دربار لگتا۔ اور اس زمانے کے گرتے ہوئے رئیس اپنی ریاست، امارت کو بچانے کی فکر میں ان شاہ صاحبان کو تنکے کا سہارا سمجھتے اور اُبھرتے ہوئے رئیس اونچی سی اونچی معراج تک پہونچنے کے لئے جست کے آرزومند ہوتے۔ رئیس سے میری مراد ہر وہ صاحب اقتدار ہے جو اپنی ترقی بچانے یا ترقی حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ (Short cut) ذریعہ کا قائل ہو۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحبان یا جادو منتر سے بڑھ کر شارٹ اور کیا ہے؟ ایسے شاہ صاحبان ہیں تو نہیں مگر اسی زمانے میں، اسی دور میں ایک صاحب تشریف لاتے۔ معمولی دُھلی ہوئی مارکین کی سفید لنگی۔ اور معمولی ململ کا سفید کرتہ، ململ کی ٹوپی۔ بہت دراز قد اور تقریباً سیاہ فام، پوری لمبی داڑھی، آنکھوں پر معمولی چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی ٹہلتے ہوئے گذرتے اور بے نیازانہ گذرتے۔ کوئی ملاقاتی مل جاتا تو مختصر طور پر رکتے، مصافحہ کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ جہاں قیام کرتے وہاں ان کی خاموشی گل افشانیٔ گفتار سے بدل جاتی۔ جملے بھی چست کرتے، پھکڑ پر بھی اُتر آتے اور بہت برمحل شعر خوانی بھی کرتے اور بولتے بولتے جوش میں مصرع بھی بولنے لگتے۔ ڈانٹتے بھی اور غصہ ہو کر اُٹھ بھی جاتے۔ یہ صاحب امسھرا کی ایک خانقاہ کے سجادہ نشیں شاہ نورالحق صاحب عرف نورا شاہ تھے۔ میں ایک بار ان کی خانقاہ امسھرا گیا بھی تھا۔ بہت بڑی خانقاہ جو اُجڑ چکی تھی۔ یہ شاہ صاحب نہیں معلوم ہوتے تھے، نہ اپنی وضع قطع سے، نہ بول چال سے، نہ انداز رفتار سے، نہ ملنے ملانے کے ڈھنگ سے، نہ اپنے حالات واوقات سے۔ نماز روزہ کر لیتے، ذکر فکر کر لیتے، چلتے چلتے تسبیح پڑھ لیتے، مراقبہ یا نعرہ وغیرہ نہیں لگاتے، معمولی دینداروں جیسا بے تکلف

www.taemeernews.com

انداز تھا۔ پان بہت کھاتے تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ اوسط درجے کے عارفانہ اشعار بے ساختہ کہہ جاتے اور کہہ کر کہتے "دیکھو دیکھو شعر ہوگیا۔ ارے دنیشوا تیں گدھا ہے رے، تیں شعر سمجھا ہے رے؟ تو کاہے بیٹھا رہتا ہے۔" یہ مخاطبت دنیشور پرشاد میرے منہ بولے ماموں وکیل کی طرف ہوتی۔ جو ان کے بہت عقیدت مند تھے۔ اکثر اپنے یہاں لے جاتے مجھے بھی بلا لیتے۔ شاہ نورا صاحب مجھے بہت مانتے تھے۔ میرے اشعار بہت پسند کرتے، جھومتے اور دعا دیتے۔ اور کہتے تم میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار مرتب کر دو اور ایک دن اپنا منتشر سرمایہ مجھے بھیج بھی دیا۔ میں نے مرتب کر کے دے دیا تھا۔ مگر وہ چھپ نہیں سکا۔ تو میرے یہاں شام کو اکثر آنے والوں میں دنیشور ماموں بھی ہوتے اور ان کے ساتھ نورا شاہ بھی۔ میں تو خاموش رہتا مگر دنیشور پرشاد ان کو چھیڑتے خود بھی جملے کستے اور ڈانٹ گالیاں سنتے، سن کر چپ ہو جاتے اور بھنوب ہنستے۔ اور اکثر ڈانٹ نورا شاہ کی یہی ہوتی۔ ارے دنیشوا تیں تو گدھا ہے رے۔ اور کبھی دنیش ماموں بول اٹھتے۔ حضور گدھا نہ ہوتے تو آپ کے ساتھ کیسے رہتے۔ بس نورا شاہ ڈنڈا لے کر کھڑے ہو جاتے۔ اے تو کیا ہم دھوبی ہیں رے؟ اور پھر خود بھی ہنس دیتے اور دنیشور پرشاد کی پیٹھ ٹھونک دیتے۔

میں نے نیلام کی تاریخ سے دو دن قبل اماں کو خواب میں دیکھا۔ وہ جب مطمئن اور خوش ہوتیں تو گھر میں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک پلنگ پر دیوار کے سہارے بیٹھ کر دانتوں میں نیم کے تنکے سے خلال کرتیں اور باتیں کرتی رہتیں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ کھانے سے فارغ ہوئی ہیں۔ دیوار کے سہارے پلنگ پر بیٹھی ہیں، دانتوں میں خلال کر رہی ہیں، کبھی مسکراتی ہیں اور حسب عادت کسی سے باتیں کر رہی ہیں۔ خواب ہی میں مجھے بڑی بشاشت سی ہوئی۔ صبح اٹھا تو طبیعت ہلکی اور شگفتہ تھی۔ شام کو دیکھا دنیشور پرشاد شاہ نورا کو لئے ہوئے آ رہے ہیں۔ شاہ صاحب چھڑی پٹکتے، سینہ تانے، پان چباتے پھڑ پھڑ کرتی ہوئی لنگی کے ساتھ اکثر دوکان میں بیچ پر بیٹھ گئے، پان چلنے لگا اور باتیں ہونے لگیں۔ دوسری صبح کو نیلام کی تاریخ تھی۔ دنیشور پرشاد نے کہا "حضور کل اس مکان کا نیلام ہے کسی دوسرے

www.taemeernews.com

نے لے لیا تو کلیم دکان کہاں لے جائیں گے ؟" بس نورا شاہ تڑپ کر اُٹھے "۔ اے تیں ہمیشہ گدھا رہا اور ہمیشہ گدھا رہے گا۔ اے مکان کون لے سکتا ہے ؟ کلیم نہیں چاہتے کہ دوسرا لے۔ ان کی ماں نہیں چاہتیں کہ کوئی دوسرا لے۔ پھر دوسرا کون لے سکتا ہے ؟ کیوں جی کلیم تمہاری ماں چاہتی ہیں نا کہ تم لو ؟" میں تو خبط ہو گیا اور ہکا بکا سب کو دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں نورا شاہ اُٹھے اور دنیشور ماموں سے کہا "چل بے گدھے اُٹھ تو ہمیشہ گدھا ہی رہے گا۔" اور دنیشور پرشاد بول اُٹھے "حضور ہم گدھے ہیں تب آپ کے ساتھ ہیں نا۔" اور شاہ صاحب نے اپنا ڈنڈا بلند کیا، پیٹھ پر لگانے کا ارادہ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے دکان سے اتر گئے۔ مجھے رات کا خواب یاد آگیا اور میں جھوم گیا۔ عشار کی نماز پڑھی۔ دیر تک تلاوت کرتا رہا اور روتا رہا۔ صبح کو ۹ بجے سرکاری نیلام کار آگئے۔ دکان بند کر دی گئی۔ اور باہر کھڑے ہو کر اعلان ہوا۔ دکان نیلام ہو رہی ہے جسے بولنا ہے اپنی بولی بولے۔ باہر صرف میں تھا اور بکو نانا۔ بکو نانا نے ٹوپی اتار کر رکھ دی۔ کرتے اور لنگی میں کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ مجمع جم گیا۔ مجھے یاد نہیں آغاز کیسے ہوا۔ مگر یہ یاد ہے کہ جب بولی مانگی گئی تو سامنے کھڑے ہوئے ایک شخص، لمبا کرتہ اور لنگی اور ٹوپی پہنے ملک ہوٹل کے مالک ملک دوست محمد نے پہلی بولی دی "بیس ہزار روپے" اور مجمع میں ایک لہر چل پڑی۔ ایں پہلی بولی بیس ہزار؟ اور میں نے افسردگی کے ساتھ ملک جی کو دیکھا اور نگاہیں بولنے لگیں کہ ایں ملک جی آپ ؟ آپ ؟۔ آپ سے اتنا تعلق مسجد کی ملاقات ؟ ہر وقت کی صاحب سلامت۔ آپ، آپ ؟ لیکن وہاں آپ اور جناب کا کیا سوال وہ تو نیلام تھا اور نیلام میں سب کچھ نیلام ہوتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے چیز بھی سامان بھی انسان بھی۔ دیکھا کہ بکو نانا کا سینہ پھول گیا وہ گرج کر بولے "بائیس ہزار" اور میں نے حیرت سے بکو نانا کو دیکھا۔ وہ پان چبا رہے تھے۔ اور چہرے پر جلال تھا۔ ملک جی کی آواز آئی تیئیس ہزار۔ بکو نانا نے ہاتھ اُٹھایا۔ پچیس ہزار۔ دوست محمد ملک اگلی صف سے پیچھے چلے گئے۔ نیلام والے نے کہا پچیس ہزار۔ پچیس ہزار ایک۔ پچیس ہزار۔۔۔۔ فوراً مجمع سے ایک آدمی بولا چھبیس ہزار۔ دیکھا تو بغل میں

www.taemeernews.com

"سادھنا اوشدھالیہ" کے منیجر کھڑے تھے۔ میرے بالکل ہم دیوار تھے۔ ان کے کارخانے والوں کا حکم تھا کہ بہرحال دکان نیلام لے لی جائے۔ اُن کے ساتھ پیسے کا کیا سوال تھا؟ بکونانا جوش میں گویا دیوانہ پن کے انداز میں ہنس دیئے۔

"۲۶ ہزار کیا بولتا ہے بول ۲۷ ہزار۔ ہم بولتا ہے اٹھائیس ہزار اٹھائیس ہزار ... سادھنا اوشدھالیہ کے منیجر بنگالی تھے بہت نالٹے قد کے۔ بکونانا کی ہلکی ڈانٹ سن کر ایک لمحہ وہ ہچکچائے اور پھر جوش میں آکر ہاتھ اُٹھایا "تیس ہزار" اور بکونانا نے اسے مہلت نہ دی دیکھا ان کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے ہیں اور اسے پھڑپھڑاتے ہوئے ہونٹ سے وہ بول اُٹھے "بتیس ہزار" اور رونے لگے اور اُنہیں آنسو بھرے آنکھوں اور تھرآتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ گھبراؤ نہیں کلیم ہم ایک لاکھ میں بھی اسے لے لیں گے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ ایک لاکھ کیا تیس چالیس ہزار بھی ان کا سرمایہ نہیں تھا۔ مگر شاید آنسوؤں اور تھرآتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا ہوا یہ چیلنج بنگالی بابو کو مرعوب کر گیا اور اس نے آواز لگائی ___ "بتیس ہزار چار سو" اور بکونانا بولے "بتیس ہزار آٹھ سو" دونوں کے ہاتھوں میں سوڈا واٹر کی بوتل کا ابال تیزی سے نیچے آنے لگا۔ دونوں کی ڈور ڈھیلی ہوگئی۔ شاید پتنگ کٹ چکی تھی اور نیچے گر رہی تھی دیکھئے کس کے ہاتھ لگے۔ "بتیس ہزار آٹھ سو" پر نیلام کی ہتھوڑی بلند ہوئی۔ بتیس ہزار آٹھ سو ایک۔ بتیس ہزار آٹھ سو۔ دو۔ بنگالی جی بول اُٹھے "بتیس ہزار آٹھ سو پچیس" اور جیسے سپاہی آخری زخم کھا کر گرنے لگے۔ بکونانا بولے "بتیس ہزار آٹھ سو پچاس" اور تھک کر بیٹھنے لگے اور نیلام کار نے بتیس ہزار آٹھ سو پچاس۔ ایک اور پھر جلدی جلدی بتیس ہزار آٹھ سو پچاس نہ کہہ کر صرف "تین" کہا اور ہتھوڑی ماردی۔

بنگالی بابو اور نیلام کار دونوں پر اماں کے نیم کے تنکے کا خلال چل گیا۔ طلسم ہوش رُبا میں پرواز کرتے ہوئے عفریت سے جنگ کے دوران شہنشاہ نوراافشاں جادو نے اپنی انگوٹھی انگلی سے نکال کر عفریت پر پھینک ماری وہ انگوٹھی عفریت کی گردن میں بھاری طوق بن کر اُسے شہنشاہ نوراافشاں جادو کے قدموں میں لے آئی۔ خلال کا تنکا انگوٹھی

www.taemeernews.com

سے بہت ناتواں اور کمزور ہے۔ مگر وہ شہنشاہ کی انگلیاں تھیں۔ یہ شہید کی انگلیاں تھیں۔ انگوٹھی بیداری میں کارگر ہوئی تنکہ خواب میں بھی کام کر گیا۔

سینے کے زخم، پاؤں کے چھالے کہاں گئے؟
اے حسن تیرے چاہنے والے کہاں گئے؟
خلوت میں روشنی ہے نہ محفل میں روشنی
اہلِ وفا، چراغِ وفا۔ لے کہاں گئے؟

Printed at
CITY PRINTS
2446, Ballimaran, Delhi-110006